اپریل 2024
دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیاں پڑھیے
ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
قیمت 200 روپے
بانی
معراج رسول

اپریل 2024
دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیاں پڑھیے
ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
قیمت 200 روپے
بانی
معراج رسول

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر : لبنیٰ خیال
نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر

مارکیٹنگ و سرکولیشن مینجر
محمد شہزاد خان
0333-2256789

قارئین کی کرم فرمائیاں اور کج ادائیاں
نامہ و پیام، محبتیں، عنایتیں اور شکایتیں

انسانی معاشرے میں ظلم و جبر کے خلاف جدوجہد
جہاں درندگی کو آہنی ہاتھوں سے روکنا تھا

زمانۂ ماضی سے جڑے وہ عکس
جو وقت کی دھول میں پھر اُبھر آئے تھے

ضرورت کے رشتے میں بندھ کر خونی رشتے
سے دوری کے اختیاری عمل کا نتیجہ

اس بد باطن کا ماجرا جسے
ظاہر کی خوبصورتی عزیز تھی

ہم مزاج فنکار دوست بھائیوں کی
خوشگوار انداز میں کی جانے والی سراغرسانی

لمحوں کو خوش گوار اور لبوں کو مسکراہٹ سے
ہمکنار کر دینے والی فنکاری کے داؤ پیچ

جلد54 • شمارہ 04 • اپریل 2024 • زرِ سالانہ 3000 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 200 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من...... السلام علیکم!

قابلِ عزت اور محترم قارئین کے لیے اپریل کا شمارہ حاضر ہے۔ ماہِ صیام کی بابرکت اور روح افروز ساعتیں اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہی ہیں۔ آج پندرھواں روزہ رکھنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ رسالہ جب آپ کے ہاتھوں کی زینت بنے گا...... عید کی آمد آمد ہوگی۔ عالمِ اسلام کو ہماری طرف سے عید کی 'پیشگی' مبارک باد۔ گو کہ عید روزہ داروں کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے روزوں کا انعام ہے، اکرام ہے...... بجا صحیح...... مگر حالات واقعات کا تقاضا ہے کہ عید نہایت سادگی سے منائی جائے...... کیونکہ ہمارے دینی بھائی فلسطین میں کڑی مصیبت سے گزر رہے ہیں...... روزانہ موصول ہونے والی خبریں نہایت دردناک ہیں۔ نہتے، بے بس مسلمان زندگی کی بقا کے لیے خوفناک جنگ سے نبرد آزما ہیں۔ غزہ میں جاری خوں ریزی روکنے کے لیے عملی اقدامات کی اشد ترین ضرورت ہے...... لیکن اتنے عرصے سے جاری اس قتل و غارت گری کی زبانی کلامی سب مذمت کر رہے ہیں مگر عملی طور پر کوئی ان کا ساتھ دینے کو تیار نہیں۔ یقین کامل ہے کہ فلسطینیوں کی حوصلہ مندی اعلان کرتی ہے کہ وہ دعا کے حصار میں ہیں۔ دعا ایک پورا فلسفہ ہے۔ جو لوگ اس کی قوت اور تاثیر سے آگاہ ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اسلامی طرزِ حیات میں اس کا کتنا گہرا عمل دخل ہے۔ دعا ہر امتحان میں راستہ بناتی ہے...... ہر آشوب سے نجات دلاتی ہے۔ ''یہ بستیاں ہیں کہ مقتل دعا کیے جائیں'' یا اللہ دعا کے طفیل ان پر آسانیوں کے بادل پھیلا دے۔ ایسی ہی صورتِ حال سے ملکِ خداداد پاکستان بھی گزر رہا ہے...... حالیہ انتخابات کے بعد نئی حکومت کی جانب سے ملک کو مسائل سے نکالنے اور آگے بڑھانے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ موجودہ صورتِ حال میں سب سے بڑی ضرورت اور اہمیت یہ ہے کہ مشترکہ جدوجہد کا آغاز کیا جائے اور ساتھ دیا جائے۔ اتحاد و یگانگت کے بغیر ترقی کی شاہراہ پر سفر ممکن نہیں۔ قارئین کو ایک دفعہ پھر عید کی مبارک باد دیتے ہیں...... اور تمام تر باتوں کو اس مصرعے میں قید کرتے ہیں کہ

وہ حرف کیا کہ رقم ہو تو روشنی بھی نہ ہو

ملتان سے جنید علی کی تعلیمی سرگرمیاں اور جاسوسی کے لیے ان کی دل داریاں ''جاسوسی جو ہم سب کا پسندیدہ ڈائجسٹ ہے جس کی اپنی ہی انفرادیت ہے، اس منفرد جریدے جس کی انفرادیت کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا تو امید ہے اس سے وابستہ آپ تمام قارئین بخیر و عافیت سے ہوں گے۔ آج کل یہ سچ ہے کہ دل لکھنے کی جانب نجانے کیوں مائل نہیں ہوتا۔ تبصرے کے لیے الفاظ ہی ذہن میں نہیں آتے۔ یہ lazyness وقت کے ساتھ ساتھ ہی ختم ہو گی خیر اب اس کاہلی کی صفائی بھی بنتی ہے تو آئے دن یونیورسٹی میں کوئی نہ کوئی ایونٹ ہوتا ہے جس میں ہماری شرکت لازمی ہوتی ہے۔ تمام تر مصروفیت کے باوجود ہم نے جاسوسی سے اس بار عہدِ وفا کرتے ہوئے جلد پورے شمارے کا پوسٹ مارٹم کر ہی لیا ہے جو کچھ اس طرح ہے کہ سرورق لگتا ہے ایڈیٹر نے ظفر صاحب کے سر پر کھڑے ہو کر اپنی کڑی نگرانی میں بنوایا ہے تب ہی سرورق کچھ کچھ آیا ہے۔ (نہیں بھی یہ گستاخی ہم نہیں کر سکتے) فہرستی صفحے کے دلکش تازہ انداز نے اس وقت کی یاد تازہ کر دی جب ہمارا ڈیئر جاسوسی اب کی طرح سلم اینڈ اسمارٹ نہیں تھا۔ پھر ذرا جاسوسی والوں کی چینی نکتہ چینی دیکھنے کے لیے آگے پہنچے۔ ایڈیٹر جتنی طویل باتیں شروع میں کرتی ہیں اگر اس کی جگہ خطوط میں اسمال بریکٹ میں نصب شدہ اپنی برجستہ جوابی کارروائیاں زیادہ کریں تو محفل میں چار کیا آٹھ چاند لگ جائیں گے (بھی چار چاند کچھ کم نہیں ہوتے) مگر نہیں کرنی ہے اپنی مرضی...... خیر فاطمہ راجپوت نے کافی عرق ریزی سے سابقہ شماروں پر تبصرہ کیا اور امید ہے اب اگلی بار بھی حاضری یقینی ہوگی۔ اقبال بھائی کی حاضری بھی ہمیشہ کی طرح خوب تھی اور دلی دعا ہے اللہ پاک بھابی صاحبہ کو صحت و تندرستی عطا فرمائے تاکہ وہ آپ کے لیے مزے مزے کے کھانے پکائیں۔ کوٹری سے جاسوسی کی مستقل تبصرہ نگار و نمائندہ حمیرا رفیق کی آمد بھی بہت خوب تھی۔ آپ کے بھائی کاشف آپ کے ادبی ذوق کا اس قدر خیال رکھتے ہیں بہت خوشی ہوئی جان کر وہیں آپ کا گلہ سر آنکھوں پر اور اس بار کچھ بہتری کی کوشش کی ہے۔ ہمارے یار حسنین بھائی کی گستاخیاں تو ہر ماہ ہی بہت پسند آتی ہیں کہ ان کی موجودگی میں ہی محفل میں ہر طرف خوشگواریت بکھری ہوتی ہے اور کوئی تو ہے جو ایڈیٹر کو خاموشی توڑنے پر مجبور کر ہی دیتا ہے پھر آخر بھائی کس کا ہے ہم۔ آفاق احمد کا خط دیکھ کر دلی سکون سا ہوا اب ایڈیٹر کہیں گی جی آپ تو یہ ہی کہیں

گے۔ دیرینہ ساتھی عاتکہ کامران کی آخر میں پسندیدگی ہمیں بھی پسند آئی وہیں اس بار بھی انور یوسف، سہانا شیخ، احتشام الحق اور سلمان سلیم غیر حاضر تھے تو جلدی سے ہمارے حکم کی تکمیل کرتے ہوئے حاضر ہوں ورنہ ایڈیٹر جرمانہ کرنے میں ماہر ہیں اور یہ آپ سب اچھے سے جانتے ہیں ٹھیک ہے نا۔ اعتزاز سلیم وصلی اور سیربناراض بھی کافی ٹائم سے غیر حاضر ہیں کیوں؟ اِن باکس میٹریل بھی جاسوسی کی انفرادیت واضح کر رہا تھا۔ اولین صفحات پر دوستوں کے بھیس میں چھپے دشمنوں کے خلاف صف شکن یعنی جوہر کی عملی کارروائیاں ایچ اقبال کے قلم سے دیکھنے کو ملیں جو بہتر تھیں۔ جوہر کی بہادری عروج پر تھی۔ عابد جو ایک سچا ساتھی تھا، وہ نہیں رہا وہیں شاخاں کی ویڈیو شیطان کی ہیڈ منسٹر ثانیہ کی زندگی کا چراغ بجھانے کی وجہ ثابت ہوئی کہ جب بازیاب ہوئی تو خود نے خودکشی کرلی۔ نعمان احمد شیخ کی کہانی اچھی کوشش تھی۔ ماہر سراغ رساں انسپکٹر جنید یعنی ہم نے اکرم حسین کے مجرم کو آخر میں پکڑ ہی لیا جو اپنے شاطر پلان کے بعد بھی کامیاب نہیں ہوسکا اور اتنے سالوں بعد بھی مجرم پکڑا گیا۔ بھٹی صاحب کی تحریر بھی بہتر رہی یعنی شکاری میں منصور جو خود کو بہت اسمارٹ سمجھ رہا تھا آخر میں خود ہی صنفِ نازک یعنی شکاری مس زینت کی اداؤں کا اسیر ہونے کے لیے بنائے ہوئے جال میں آکر خود ہی شکار بن گیا۔ قاتل مسیحا چار اقساط پر مشتمل حسبِ روایت مغل صاحب کے قلم سے ایک شاہ کار تحریر تھی جس میں عمران جونیئر کی دیدہ دلیری خاص کر آخری قسط کے سینز اور حالات و واقعات مصنف نے بہت ہی عمدگی سے لکھے تھے اور سسپنس، ایکشن و تھرل کیا ہی خوب انداز میں اس بار بھی سیریز لکھی گئیں۔ امید ہے آگے بھی یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ مظہر سلیم بھی کافی وقت بعد آئے اور اگرچہ الیاس ایوب کی چھٹی کو انجوائے نہیں کرسکی مگر بوب کی وجہ سے شارٹی اور کرنل جیسے خطرناک بہروپیے آخر کار قانون کے شکنجے میں آہی گئے۔ عمران قریشی کی ہلکی پھلکی تحریر میں نبیل کے تماشے نے اچھے سے لطف اندوز کیا اور واقعی ضرورت کے وقت گدھے کو بھی ڈیش بنانا پڑتا ہے جیسے نبیل نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کیا جو کارِزیاں ثابت ہوا۔ جمال دستی کی سنگل والی تو عجیب ہی کیس نکلی جس کی محبت میں شیراز صاحب پاگل ہو رہے تھے ویسے یہ پیشہ ورانہ زنی جیسے لوگ کتنی چالاکی سے پلان بناتے ہیں اور اپنے مقاصد۔۔ میں کامیاب بھی ہوجاتے ہیں مگر عزتِ نفس نہیں رہتی۔ ایک تلخ معاشرتی پہلو اجاگر کرتی مگر دلچسپ کہانی تھی۔ انور ظہیر رہبر نے مختصر الفاظ میں کچھ بہتر دینے کی بہتر کوشش کی۔ اب چلتے ہیں اپنے پسندیدہ سلسلہ وار ناول یعنی دہر کی طرف۔ جس کی ہر قسط پہلے سے زیادہ سنسنی خیز ہوتی ہے۔ جاسم 2023ء میں آگیا ہے وہیں گزشتہ اقساط میں کامل کی کارکردگی عروج پر تھی۔ سلور کوئین کے لیٹسٹ ڈیوڈ جو پہلے والے سے بھی گیا گزرا ہے اس کا جو جاسم نے حشر کیا ہے، سلور کوئین مزید جاسم کی طبیعت سے اچھے سے واقف ہوجائے گی۔ اب دیکھتے ہیں 2023ء میں آکر جاسم کیسے ان دشمنوں کے ناپاک عزائم کو مٹی میں ملائے گا۔ ناول دلچسپی کے ساتھ اپنی منازل طے کر رہا ہے ویل ڈن حسام صاحب اینڈ کیپ اِٹ اَپ۔ سرورق کے دونوں رنگ اس بار بہت ہی زبردست اور منفرد تھے جن کی اپنی ہی دلچسپی اور اپنا ہی انداز تھا۔ دونوں نئے لکھنے والوں نے خوب لکھے۔ لذت و کیف کے پُرآزار سانحات ابراہیم عبدالہادی کے قلم سے موجودہ دور کے معاشرتی تلخ موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے ایک دل خراش تحریر تھی وہیں بہت سی پوشیدہ حقیقتیں بھی تحریر میں شامل تھیں جو فائزہ، دانش، بلال اور اجالا جیسے لوگوں کے لیے عبرت ناک تھیں جو شیطان کے بچھائے ہوئے جال میں آکر مثبت رجحان کی جانب مذکور نہیں ہوئے اور تباہی و بربادی کی جانب دھنستے چلے گئے۔ تحریر میں کافی پختگی تھی اور موجودہ دور کے لحاظ سے کافی سبق آموز تھی۔ امجل بھٹی بھی آخری صفحات پر آخری قفل میں بڑی شان سے منفرد و سنسنی خیز موضوع کے ساتھ حاضر تھے جس کی سنسناہٹ اور پُراسراریت ہر صفحے پر عیاں تھی۔ قفل شاہ کی قسمت میں اگرچہ نور نہیں تھی مگر خیر ایک بہت بڑی بدی کی خوفناک معرکہ آرائی سے توقفل شاہ اور اس کے ہمدم نبرد آزما ہوگئے اور یہ تحریر بھی بہت پسند آئی۔ ہاں تو ہم نے اپنی دانست کے مطابق پوسٹ مارٹم کی رپورٹ تیار کردی ہے اب اجازت دیں اگلے ماہ ملتے ہیں ان ہی جاسوسی کے سنسنی خیز صفحات پر گڈ بائے۔''

کراچی سے محمد اقبال لکھتے ہیں ''مارچ دو ہزار چوبیس کا شمارہ ہاتھ آیا تو ہم نے سوچا ماہِ رمضان سے پہلے اس سے دو، دو ہاتھ کرلیں ورنہ رمضان میں ایک ہی نشست میں کہانیاں پڑھنے کا موقع کم ملتا ہے اور اگر موقع نکال لیا جائے تو لعنت ملامت سننی پڑتی ہے کہ ماہِ رمضان کے تقدس کا خیال کرو، اس کے پڑھنے سے کوئی ثواب نہیں ملے گا، وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال جناب ٹائٹل مناسب تھا۔ حسینہ کے ساتھ دو مرد حضرات موجود ہیں۔ اوپر پستول والے صاحب تو جنٹلمین لگ رہے ہیں۔ جبکہ دوسرے صاحب ڈبلیو ڈبلیو ای کے ایک جانے مانے ریسلر نظر آرہے ہیں۔ لگ تو حسینہ بھی ایک ریسلر ہی رہی ہے۔ فہرست میں ایچ اقبال کی انٹری ہوئی ہے مگر اسما قادری، یعقوب بھٹی، زویا صفوان کی کمی محسوس ہوئی۔ اداریہ بہت عمدگی سے لکھا گیا اور ہم ہر دعا پر آمین کہتے رہے۔ شعر بہت خوب صورت ہے۔ محفل میں فاطمہ راجپوت دسمبر 23ء، جنوری اور فروری 24ء کے شماروں پر اپنے بھاری بھرکم تبصرے کے ساتھ پہلے نمبر پر موجود ہیں، بے شمار مبارکاں۔ کوٹری سے حمیرا رفیق کے مختصر تبصرے اچھے لگتے ہیں۔ تصویرِ کائنات میں رنگ خواتین سے ہی ہیں۔ ان کی

شمولیت سے چارنہیں آٹھ چاند لگ جاتے ہیں۔محمد حسنین صاحب نے جم کر تبصرہ کیا ویلڈن صاحب۔جنید علی جلد آؤٹ ہو گئے یعنی مختصر تبصرہ۔کوٹری سے آفاق احمد اور حیدر آباد سے عاتکہ کامران کی شمولیت اچھی لگی۔شروعات ایچ اقبال کی صف شکن سے کی۔فارمولا کہانی لگی۔کوئی خاص مزہ نہیں آیا۔جوہر ایک غریب گھرانے کا کھلنڈرا سا نوجوان ہے جو اپنے بھائی کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے ایمانداری سے پولیس کی نوکری کرتا ہے مگر محکمے کی کالی بھیڑوں کی نظر میں کھٹکتا ہے، اپنی ایمانداری کی بدولت جسے چیف منسٹر کے کہنے پر ترقی ملتی ہے جو اسی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دیتا ہے بس مناسب لگی کہانی۔عمران قریشی کی تماشا پڑھی۔کہانی پڑھ کر یہی مصرع ذہن میں آیا کہ چور کو پڑ گئے مور۔ڈاکٹر جعفر حسین جو کہ ایک نفسیات کا ڈاکٹر تھا کو نبیل اسلم نے واقعہ در واقعہ سنا کر نفسیاتی کر دیا، بھئی خوب، مزہ آگیا۔ہلکے پھلکے انداز میں لکھی گئی کہانی عمدہ لگی۔حسام بٹ کی دہر کی یہ قسط بہت سنسنی خیز رہی۔کامل نے بہت حاضر دماغی اور بہادری سے ڈیوڈ کے ہرکاروں کو بھرپور چوٹ ماری۔جاسم کے تو کیا ہی کہنے۔ایشار نے جاسم کو اَپ ڈیٹ کر کے اس کی صلاحیتوں میں اضافہ کر دیا اور یہ اضافہ ڈیوڈ اور اس کی کوئین کو بھاری پڑنے والا ہے۔جاسم نے جس طرح ڈیوڈ کا انجام کیا ہے اس سے دل کو بہت تسکین ہوئی۔اب میڈم کوئین کی بے بسی کا انتظار ہے کہ جاسم اس کے غرور کو کس طرح ملیامیٹ کرتا ہے ویلڈن حسام بٹ۔طاہر جاوید کی قاتل مسیحا کا آخری حصہ ایک ہی نشست میں پڑھا۔سنسنی خیز کہانی کا خوب صورت انجام ہوا۔جادو رائے اور مائرہ کی ساری چالبازیاں دھری رہ گئیں۔سارے کردار اپنی جگہ بھرپور رہے۔ماہین نے ان کرداروں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے بھرپور ہمت دکھائی۔بالآخر نیند کی حالت میں ہی صحیح عمران سے محبت کا اظہار تو کر دیا۔عمران کی شرارتیں اپنی جگہ جوں کی توں ہیں۔ان کا ملن کب اور کس طرح کریں گے مغل صاحب اس کا انتظار رہے گا۔اکبل بھٹی کی آخری قتل روٹین سے ہٹ کر لگی۔ابراہیم عبدالہادی کی بلائے جاں بہترین لگی۔عبدالرب بھٹی کی شکاری بھی تجسس اور سنسنی سے بھرپور رہی، اچھی لگی۔“

کوٹری سے حمیرا رفیق کی دلی خواہش ”مارچ کا جاسوسی حسبِ سابق اسی روٹین سے ملا کہ بھائی صاحب کے منت ترلے کرنے پڑے کہ بھیا کاشف جاسوسی ڈائجسٹ لا دو۔اس نے بھی موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا سمجھ تو گئے ہوں گے آپ لوگ۔بہرحال جاسوسی ہاتھ میں آتے ہی ان چھوٹی موٹی باتوں کو بھول جاتی ہوں۔ٹائٹل اچھا لگا۔فہرست بھی اچھی تھی مگر میری فیورٹ اسما قادری اس بار بھی غائب تھیں۔درخواست ہے کہ آئندہ شمارے میں اسما قادری کی کہانی بھی شائع کی جائے۔اداریہ بہت عمدگی سے تحریر کیا گیا، تمام باتیں درست ہیں۔پہلے نمبر پر فاطمہ راجپوت کو دیکھ کر بہت اچھا لگا۔انہوں نے اپنے تبصرے میں اگلی پچھلی سب کسر برابر کر دی، زبردست تبصرہ کیا۔دوسرا طویل تبصرہ محمد حسنین کا تھا، بہت عمدگی سے لکھا۔اس بار محمد اقبال صاحب نے بھاگ دوڑ میں کچھ مختصر تبصرہ کیا۔جنید علی کا تبصرہ بھی ان کی مصروفیت کے باعث مختصر تھا۔میرے شہر کوٹری کے آفاق احمد کی آمد اچھی لگی۔پڑوسی شہر کی عاتکہ کی آمد بھی اچھی لگی۔سب سے پہلے دہر پڑھی۔حسام بٹ نے اس قسط میں واضح طور پر جاسم اور اس کی ٹیم کا پلڑا بھاری رکھا۔کامل نے اپنے طور پر دشمنوں کو ناکوں چنے چبوا دیے تو دوسری طرف جاسم کی ٹیم نے بھی بھرپور کارکردگی کا مظاہرہ کیا، سب سے پہلے تو ایشار نے جاسم کو اس سارے سسٹم سے گزارا جس کا جاسم بے چینی سے منتظر تھا یعنی جاسم کی ٹریننگ مکمل کر دی۔اب وہ آزادی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ بغیر کسی ویزے کے سفر کر سکتا ہے۔جاسم نے ڈیوڈ کے رنگ میں بھنگ ڈالتے ہوئے ڈیوڈ کو اس انجام تک پہنچایا جس کا وہ حق دار تھا۔اب سلور کوئین کی باری ہے، ویلڈن حسام بٹ صاحب۔طاہر جاوید مغل کی قاتل مسیحا تیز رفتاری سے اپنے انجام کو پہنچی۔ان کی ہر کہانی کی طرح یہ کہانی بھی ہر بار ایک ہی نشست میں پڑھی۔ماہین کی دلیری نے بہت متاثر کیا۔ایسے ہی تو عمران اس کو پسند نہیں کرتا۔وہ بھی عمران کی طرح ہر بار اپنی کارکردگی سے حیران کر دیتی ہے۔رائے اور اس کی ٹیم اپنے انجام کو پہنچی، آئندہ تابش کی ٹیم کا سامنا اس سے نہیں ہوگا۔میں تو ہر ماہ طاہر جاوید مغل کی کہانی پڑھنا چاہتی ہوں جو کہ ممکن نہیں مگر خواہش تو کی جا سکتی ہے۔پہلی کہانی کے طور پر صف شکن، ایچ اقبال کی پڑھی بہت زیادہ متاثر نہ کر سکی۔نیکی اور بدی کی خوف ناک معرکہ آرائی آخری قتل میں پڑھی۔اکبل بھٹی نے ایک عمدہ کہانی ترتیب دی۔چھوٹی کہانیوں میں عمران قریشی کی تماشا اچھی لگی۔سرخ دھبا انور ظہیر رہبر کی بہت اچھی لگی۔اتنا ہی رسالہ پڑھ پائی ہوں۔محفل میں حاضر رہنے کے لیے فوری تبصرہ ارسال کر دیا ہے۔“

بہاولپور سے سلمان سلیم کی مصروفیت اور تیکھا موڈ ”جاسوسی کی محفل میں شامل تمام دوستوں کو سلام اور دعائیں کہ آپ تمام دوست خوش و خرم رہیں۔وطنِ عزیز میں الیکشن ہوئے مگر کسی مثبت تبدیلی کی امیدیں نہ جانے کب پوری ہوں گی۔ایک طرف فلسطینیوں کی قربانیاں دل کو سوگوار کیے ہوئے ہیں تو وہیں دوسری طرف ہمارے ملک کے حکمرانوں کی اپنی سیاسی سرگرمیاں اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی سازشیں ہی آئے دن دیکھنے کو ملتی ہیں اور رمضان شریف میں مہنگائی کا احوال ایک الگ مسئلہ بنا ہوا ہے جو ہمارا قومی المیہ بنتا جا رہا ہے۔اس ماہِ رمضان میں ہماری والدہ کو ہم سے بچھڑے تین سال ہو گئے ہیں جو

پہلے کرونا میں ہنستے مسکراتے صرف دو پل میں دل کے اٹیک سے انتقال کر گئی تھیں تو ہر رمضان اب ان کے بغیر ادھورا سا لگتا ہے۔ نہ وہ رونقیں رہیں نہ وہ دعائیں اور برکتیں وقت گزر جاتا ہے صبر آ جاتا ہے مگر والدین خاص کر ماں ایک ایسا رشتہ ہے جس کی کمی کوئی پوری نہیں کر سکتا جن کی ممتا کی چھاؤں میں زندگی کے کتنے سال گزارے اور یقین نہیں تھا کہ ان کی دائمی جدائی برداشت کرنی ہوگی۔ آپ سب سے درخواست ہے کہ میری والدہ مرحومہ کو اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔ (یقیناً۔ اللہ تعالیٰ آپ کی والدہ کو جنت الفردوس میں متمکن فرمائے) اگرچہ اس ماہ ایک سوگواری کی فضا شامل حال رہی مگر اس بار بھی جنید بھائی نے اپنی من مانیاں کرتے ہوئے مجھ سے تبصرہ لکھوا ہی لیا پھر میں انہیں انکار بھی نہیں کر سکتا تھا مگر شاپ کی مصروفیت اور کچھ طبیعت کی خرابی کے سبب مکمل شمارے پر تبصرہ کرنا تو مشکل تھا لیکن خیر جاسوسی پوری شان سے اس بار بھی موصول ہوا اور سرورق کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ دوشیزہ کی زلفیں ایسی تھیں جیسے صفائی کرنے والا برش ہو وہیں ساتھ والے نحوست زدہ بابے کی شاید فرشتہ روح قبض کر رہا تھا جسے اوپر والے فوجی صاحب اپنی گولی سے صفحہ ہستی سے مٹا رہے تھے۔ خطوط کی محفل میں ان تمام ساتھیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو مجھے یاد رکھتے ہیں۔ سرورق کے رنگوں سے آغاز کیا اور پہلا سرورق کافی گہرائی سے مصنف نے آج کی نوجوان نسل پر لکھا۔ جو دن گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسی خرافات کی جانب جا رہی ہے اور ہمارا معاشرہ تنزلی کی جانب رواں دواں ہے۔ یہ تحریر آج کے حساب سے ایک المیہ ہے مگر پڑھنے والوں کے لیے بہت بڑا سبق بھی ہے۔ دوسرے رنگ میں انجل بھٹی نے ناول میں خوب سسپنس پھیلایا جو ہمیں پسند آیا۔ ناول کا پلاٹ مزید کچھ بہتر ہو سکتا تھا مگر خیر تحریر اچھی رہی۔ ایچ اقبال اپنے روایتی انداز میں شامل تھے جس میں جوہر کا کردار اہمیت کا حامل تھا۔ بہتر کوشش تھی۔ دہرا اور قاتل سیجا ابھی مصروفیات کے سبب پڑھ نہیں سکا۔ مختصر تحریروں میں بے زبان، سرخ دھبا اور چھٹی بھی بہتر انداز میں لکھی گئی معیاری تحریریں تھیں۔ جاسوسی کو پڑھ کر وقتی طور پر ہی انسان کا موڈ باغ و بہار ہو ہی جاتا ہے تو دعا ہے کہ یہ ڈائجسٹ ایسے ہی ترقی کی راہ پر گامزن ہو۔“

کوٹری سے آفاق احمد کی پسندیدگی ”مارچ کا جاسوسی بک اسٹال پر دو چکر لگانے کے بعد حاصل کر سکا۔ وہ بھی آخری پرچہ اسٹال پر موجود تھا۔ ٹائٹل اچھا لگا۔ ٹائٹل پر موجود تینوں نفوس تقریباً ایک ہی سمت دیکھ رہے ہیں۔ حسینہ اچھی لگ رہی ہے۔ چشمے والا نجانے کس کا نشانہ لیے کھڑا تھا۔ دوسرا اپنی آنکھوں اور پریشانی کے عالم میں نظر آ رہا ہے۔ فہرست مناسب لگی۔ اداریہ ہمیشہ کی طرح اچھا لگا۔ محفل میں فاطمہ راجپوت اپنے طویل تبصرے کے ساتھ پہلے نمبر پر براجمان ہیں، اچھا لگا۔ حمیرا رفیق کا مختصر تبصرہ بہت اچھا لگا۔ عاتکہ کامران کی حاضری بھی اچھی لگی۔ محمد حسنین، محمد اقبال اور جنید علی کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ کہانیوں میں قاتل سیجا کا آخری حصہ پڑھنے کی ہی بے تابی تھی جو بک اسٹال کے دو چکر لگائے۔ طاہر جاوید مغل نے بہت عمدگی سے کہانی کا اختتام کیا۔ مایا رانی کا کردار بھی خوب تھا۔ رامے نے دولت خرچ کر کے مایا رانی کا تختہ پلٹ دیا۔ مگر بدصورت اور دولت کی حرص نے رامے پروڈکشن کی بالآخر جان لے ہی لی۔ ماہین نے تو کمال ہی کر دیا جس بہادری سے اس نے حالات کا مقابلہ کیا، مزہ آ گیا۔ تابش اپنی ٹیم کے ساتھ بخیر واپس ہو گیا۔ زبردست اینڈ ہوا۔ حسام بٹ کی دہر بہت عمدگی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ جاسم اور کامل یہودیوں کو خوب بھاری پڑ رہے ہیں۔ کامل نے ڈیوڈ کے حواریوں کے ساتھ جو تیز رفتار ایکشن کیا، مزہ آ گیا اور اس مزے کو جاسم نے مزید دوبالا کر دیا۔ ایشار اور جاسم کی کیمسٹری بھی اچھی لگ رہی تھی۔ اب دونوں کا سامنا کہاں ہوتا ہے، آگے جا کر معلوم ہوگا۔ ایشار کی مدد کی بدولت جاسم نے ڈیوڈ اور سلور کوئین کو ناکوں چنے چبوا دیے ہیں اور چنے چبوانے کے ساتھ ڈیوڈ کو بھی جاسم نے پیس کر رکھ دیا ہے۔ آخر میں جاسم نے جس طرح سلور کوئین کا ذکر کیا ہے، مزہ آ گیا۔ بہت عمدہ حسام بٹ صاحب اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ آخری قتل انجل بھٹی کی ایک الگ تھلگ سی تحریر تھی۔ جس میں خیر و شر کا ٹکراؤ ہوا۔ بالآخر شر ہار گیا خیر کی فتح ہوئی۔ تحریر اچھی لگی۔ ایچ اقبال کی صف شکن بہت زیادہ اچھی نہیں لگی۔ احمد نعمان شیخ کی بے زبان اچھی رہی۔ شکاری بھی عبدالرب بھٹی کی اچھی کوشش تھی۔ مظہر سلیم ہاشمی کی چھٹی بھی پسند آئی۔ عمران قریشی کی کیا بات ہے۔ کیا خوب صورت تماشا تحریر کیا ہے۔ جمال دستی کی سگنل والی بھی اچھی لگی۔ سرخ دھبا انور ظہیر رہبر کی اچھی کوشش تھی۔“

ملتان سے محمد حسنین کے دل شکن احساسات ”مارچ کا جاسوسی رمضان شروع ہونے سے پہلے مل گیا تھا لیکن پڑھنے کی توفیق روزوں میں ہی مل سکی۔ ٹائٹل پر تین تین چہرے موجود تھے لیکن باباجی نے اپنے دہشت بھرے ایکسپریشن سے میلہ لوٹ لیا۔ ٹائٹل والی لڑکی بھی اچھی تھی لیکن اس کو جو وگ پہنائی گئی ہے، وہ بہت بری تھی۔ (وگ آپ نے پہنائی تھی جو اتنے یقین سے فرما رہے ہیں) کونے والے فلمی ہیرو نے پستول ہاتھوں میں اٹھا کر احساس دلایا کہ ٹائٹل جاسوسی کا ہی ہے۔ دس میں سے ساڑھے سات نمبر والا ٹائٹل رہا۔ اداریے میں آپ کی باتیں کسی بھی حساس پاکستانی کے دل کی آواز تھیں لیکن خودغرض معاشرے ہمیشہ اپنا ہی سوچتے ہیں۔ فلسطین

کے بھائی بہنوں کی پکار شاید ہمارے حکمرانوں کو سنائی نہیں دیتی یا وہ اپنے آقاؤں کی خوشنودی کے لیے سننا ہی نہیں چاہتے۔ اسلام آباد کی فاطمہ راجپوت کا تبصرہ دیکھ کر بینا راجپوت کی یاد آگئی جو بڑے عرصے سے غائب ہیں۔ تبصرہ اچھا تھا اور پچھلے کئی مہینے کی کہانیوں کی یاد دلا گیا۔ محمد اقبال کی بھاگ دوڑ اور حمیرا رفیق کی کالی پسند آئی۔ اپنی گستاخیاں آپ کے ہاتھوں نظرانداز ہونے پر شکر گزار ہوں۔ ہی ہی ہی۔ بھائی جنید نے پتا نہیں کیا پڑھنا شروع کر دیا ہے کہ خط سکڑتا ہی چلا جا رہا ہے۔ (اس دفعہ کا پڑھ لینا) آفاق احمد اور عاتکہ کامران کے تبصرے بھی اچھے رہے۔ قاتل مسیحا کی آخری قسط پڑھی۔ کیا ہی کمال کہانی تھی۔ طاہر جاوید مغل کی نسبتاً طویل عمران دانش سیریز کی کہانی پڑھنے کے بعد احساس ہوا کہ ان کی لکھی قسط وار کا کس قدر بے چینی سے انتظار ہو رہا ہے۔ انہیں بھی چاہیے کہ اب ضد چھوڑیں اور جاسوسی کے لیے ایک عدد دھماکے دار طویل سلسلہ وار ناول لکھ ہی ڈالیں۔ (پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ) جنگل شاید اگلے ماہ سے شروع ہو اس کا بھی انتظار ہے۔ حسام بٹ کی دہر کی یہ قسط نہایت دلچسپ رہی۔ کامل کو جس طرح متحرک دکھایا گیا ہے تو ایسا لگا کہ اسے پراپر سائڈ ہیرو بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جاسم آخرکار پہنچ گیا تین سال آگے۔ نئے ڈیوڈ کے ساتھ اسے کوئی مسئلہ تو نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن سلور کوئین کو ڈک پہنچانے کے لیے یہ قدم اچھا ہے۔ سرورق کی کہانیوں میں انجل بھٹی کی آخری قفل اچھی تھی لیکن ابراہیم عبدالہادی کی بلائے جاں پڑھنے کا مزہ کچھ دوبالا ہی تھا۔ پہلی بار انہیں پڑھا قلم پر گرفت سے متاثر ہوا۔ (بہت گہری نظر ہے) انجام اجالا کو برتری دینے پر تھوڑا افسوس ہوا کیونکہ کہانیوں ناولوں میں کم از کم برے کا برا انجام دیکھنے کی خواہش رہتی ہے۔ احمد نعمان شیخ کو پہلی بار پڑھا۔ ان کی پہلی کاوش بے زبان پسند آئی۔ انگریزی کہانیوں جیسی تھی جو بالکل سیدھی ہونے کے باوجود آخر میں کچھ نہ کچھ ٹیڑھا پن لیے ہوتی ہیں۔ امید ہے انہیں مزید پڑھنے کا موقع ملتا رہے گا۔ عبدالرب بھٹی جاسوسی ڈائجسٹ کا ایک بڑا نام ہیں۔ ان سے توقع بھی اس لیے بڑی ہی ہوتی ہے۔ ان کی شکاری کا آغاز اچھا رہا لیکن اختتام کافی بھونڈا سا لگا۔ مظہر سلیم ہاشمی بڑے عرصے بعد نظر آئے۔ ان کی چھٹی مناسب ترجمہ رہی لیکن ان کی پچھلی کہانیوں جیسی نہیں تھی۔ (آپ کی رائے سے اختلاف کیسے کر سکتے ہیں) ان سے کچھ بڑا لکھوائیں یا اتنے وقفے کے بعد بھی چھوٹی چھوٹی کہانیاں کب تک لکھتے رہیں گے؟ (جب تک بڑے نہیں ہو جاتے) عمران قریشی کی تماشا پڑھ کر بہت غصہ آیا۔ اگر میں روزے سے نہ ہوتا تو یقیناً کچھ کہتا۔ بس سمجھ لیں کہ کچھ ایسے ہی جذبات تھے جیسے کہانی میں ڈاکٹر کے تھے۔ سگنل والی ہمارے معاشرے اور اس میں پھیلی گداگری کے زہر پر ایک بھرپور طنز تھی۔ شیراز علی کے ایک بھکارن پر عاشق ہونے کی بس وجہ سمجھ نہیں آئی لیکن باقی کہانی نے متاثر کیا۔ زیبی اور اس کے گروہ جیسے لوگوں نے ہی بیرونِ ملک مقدس مقامات پر جانے والے پاکستانیوں کو بدنام کیا ہوا ہے۔ انور ظہیر رہبر نے بھی سرخ دھبا کے نام سے ایک بہت اچھی ترجمہ کہانی پیش کی۔ ایچ اقبال نے ابتدائی صفحات پر صف شکن پیش کی جو بڑے حوالوں سے میرے لیے دل شکن ثابت ہوئی۔ اچھی بھلی چلتی کہانی میں کوئی ایسی بات آ جاتی تھی جیسے بریانی کھاتے الائچی منہ میں آ جائے۔ کہانی کی سب سے بڑی خوبی اس کی روانی تھی۔ واقعات میں جھول ہوتے کے باوجود اس کی رفتار نے احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ کب ختم ہو گئی۔ شاخاں کا کردار دلچسپ رہا۔ چیف منسٹر ثانیہ ولن کے کردار کے لیے کچھ کمزور رہی۔ ہیپی اینڈنگ نے دل خوش کر دیا۔"

لاہور سے انجم فاروق ساحلی کی طویل غیر حاضری کے بعد حاضری "امید ہے آپ اور ادارہ کے دیگر احباب بخیر و عافیت ہوں گے۔ مارچ کا جاسوسی ڈائجسٹ اپنی روایتی شان کے ساتھ منظرِ عام پر آیا۔ قارئین کے خطوط جامع اور مفصل تھے۔ انہوں نے کہانیوں کا گہرا مطالعہ کیا۔ ادارتی گفتگو بھی اچھی رہی۔ بے زبان میں فرانزک لیب کے مراحل اور تفتیش خوب تھی۔ کہانی اچھی تھی۔ بڑا اور چھوٹا کارٹون بھی خوب تھے۔ ٹائٹل پر لڑکی کے بال کچھ مصنوعی معلوم ہوئے۔ میں جاسوسی ڈائجسٹ کو جانتا ہوں اور یہ میرے مزاج کو پہچانتا ہے۔ سگنل والی کا موضوع اور اختتام مغربی ہے۔ سرخ دھبا نئے انداز کی تحریر تھی۔ کوئی بھی انسانی تخلیق کامل نہیں ہو سکتی۔ کامل ذات تو قدرت کی ہے جس نے ہمارے اردگرد اتنی بڑی کائنات پھیلا رکھی ہے۔ قاتل مسیحا سنسنی خیز انداز میں مکمل ہوئی۔ دہر تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ صف شکن بھی اچھی رہی۔ باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔ جاسوسی ڈائجسٹ اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک اچھا اور معیاری جریدہ ہے۔ نئے لکھنے والوں کو جاسوسی کے پرانے رائٹرز کی تحریریں پڑھ لینی چاہئیں۔ تصاویر کو فہرست میں آویزاں کرنا صرف جاسوسی ڈائجسٹ سے مخصوص ہے۔ قارئین کے جامع تبصرے ان کی وابستگی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ملکِ عزیز میں نئی حکومت تشکیل پا چکی ہے۔ جہاں لوگ خوش ہیں۔ وہاں گلے شکوے اور دھاندلی کی آوازیں بھی اٹھ رہی ہیں۔ ہمارے ملک میں سیاسی عدم استحکام ہے۔ ذاتی مفاد کو ملکی مفاد پر ترجیح دی جائے تو پھر ایسا ہی ہوگا۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

صغیر احمد، لاہور۔ آفاق احمد خان، کوئٹہ۔ راحیل علی، کراچی ...... حنا، حیدر آباد۔

جنگل میں جہاں طاقت ور کی حکومت ہوتی ہے وہاں کمزور، بے بس اور مجبور اپنی مرضی سے نہیں جی سکتا۔ جنگل کا قانون طاقت ور کو بادشاہی تو سونپ دیتا ہے لیکن وہاں تہذیب نہیں ہوتی جس کا ثبوت صدیوں سے آباد جنگل ہیں جہاں صرف درندگی کا راج ہے۔ یہی جنگل کا قانون اگر انسانی معاشرے میں در آئے تو پھر تہذیب اپنی موت آپ مر جاتی ہے۔ تمدن نوحہ کناں ہوتا ہے اور انسانی تذلیل کا نظام مضبوط ہو جاتا ہے۔ ایک ایسے ہی نوجوان کی داستان جس کی ہمت، شجاعت اور حوصلہ انسانی تذلیل کے اس نظام سے ٹکرا گیا تھا۔ وہ ان طاقت وروں کے سامنے سینہ سپر ہو گیا جو اپنی طاقت منوانا ہی انسانی عزت و وقار کی علامت سمجھتے تھے۔ محبت و الفت کے سازِ پر مست الست نوجوان جو موت سے آنکھیں ملانے کی جرات رکھتا تھا۔

انسانی معاشرے میں ظلم و جبر کے خلاف
جدوجہد جہاں درندگی کو آہنی ہاتھوں سے روکتا تھا

ہمارے علاقے میں ہونے والا سالانہ میلا سجا ہوا تھا۔ میں ایک ٹیکری پر کھڑا اپنے سامنے پھیلے ہوئے منظر کو دیکھ رہا تھا۔ میلے کا آخری دن ہونے کے باعث یوں دکھائی دے رہا تھا، جیسے پورا علاقہ ہی یہاں اُمنڈ آیا ہے۔ دوپہر ڈھل رہی تھی اور لوگ اس وقت بھی جوق در جوق آ رہے تھے۔ میلے کے سجے ہوئے میدان میں کہیں اسپیکرز پر فلمی گانے بج رہے تھے۔ کہیں عجیب و غریب مخلوق دکھانے والوں کی آواز اونچی ہو جاتی، کسی طرف ڈھول کی تھاپ تھی، کوئی شہنائی پر لوک دُھن چھیڑے ہوئے تھا تو کوئی سپیرا بین بجا رہا تھا، ایک عجیب شور تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہاں پر موجود سب لوگ اپنی اپنی خوشیوں میں مست ہیں۔

تین دن کے اس میلے کا انتظار علاقے بھر کے لوگ سارا سال کرتے تھے۔ یہی وہ واحد تفریح تھی جہاں سے لوگ نہ صرف خوشیاں کشید کیا کرتے تھے، بلکہ بہت سوں کی تو اچھی خاصی کمائی ہو جاتی تھی۔ بارہ تیرہ ایکڑ سے زیادہ کا وہ رقبہ کسی کی ملکیت نہیں تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے کی وہ جگہ یونہی پڑی ہوئی تھی۔ یہیں ہر برس ٹھنڈی میٹھی رُت میں میلا لگتا تھا۔ یہ ایک ایسی جگہ تھی، جس کے چاروں طرف چھوٹے بڑے گاؤں، بستیاں اور ڈھاریاں

تھیں۔ جن کے چرواہے اپنا ڈھور ڈنگر یہاں چراتے تھے۔ یوں جیسے کبھی کی مشترکہ چراگاہ ہو۔

اکتوبر کے اوائل ہی سے لوگ تیاریاں شروع کر دیتے تھے، بارہ اکتوبر کو یہ میلا تین دن رہ کر ختم ہو جاتا تھا۔ یہاں پر ہر طرح کی عارضی دکانیں سج جاتی تھیں۔ لوگ میلا دیکھنے کی تیاریاں شروع کر دیتے تھے۔ سب سے زیادہ شہ زوروں کی تیاریاں دیکھنے والی ہوتی تھیں۔ یہی وہ میلا تھا جہاں علاقے کے سبھی شہ زور اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کر کے نہ صرف داد وصول کرتے بلکہ بہت سارا انعام بھی حاصل کرتے تھے۔ یہ شہ زور داد اور انعام سے بڑھ کر اپنے گاؤں کی عزت اور مان رکھنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دیا کرتے تھے۔ یہ خاص مقابلے روزانہ عصر سے مغرب تک ہوتے تھے۔

پہلے دن وزن اٹھانے کا مقابلہ ہوتا تھا، بڑے بڑے نامی شہ زور وہاں آتے اور زیادہ سے زیادہ وزن اٹھا کر میدان کا چکر لگاتے۔ کوئی ایک جیت جاتا تو رات ہونے سے پہلے پہلے پورے علاقے میں جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر پھیل جاتی تھی۔

میلے کا دوسرا دن پہلوانوں کا ہوتا تھا۔ جن کی ہتھ جوڑی تو کئی مہینے پہلے ہو جاتی تھی، پھر اسی مناسبت سے تیاری کر کے میدان میں اترتے تھے۔ جس خلیفہ یا گاؤں کے پہلوان زیادہ جیت جاتے، سال بھر وہ اسی پر فخر کرتے تھے۔ تیسرا دن بڑا اہم ہوتا تھا، اس دن تھپڑوں والی کبڈی ہوتی تھی۔ یہ بہت سنسنی خیز کھیل ہوتا تھا۔ عالمی کبڈی میں تو یہ اصول ہوتا ہے کہ دو شہ زور آمنے سامنے آجاتے ہیں، ایک نے ہاتھ لگا کر نکلنا ہوتا تھا، اور دوسرے نے اسے پکڑنا ہوتا تھا۔ پکڑا گیا یا نکل گیا اسی پر کسی نہ کسی کو نمبر مل جاتا تھا۔ مگر ہمارے اس علاقے میں کھیلی جانے والی یہ تھپڑوں والی کبڈی کچھ مختلف تھی۔ دو شہ زور پہلوانوں کی طرح آمنے سامنے آجاتے تھے۔ ایک ہاتھ لگانے کے لیے سینے پر زور سے تھپڑ جڑتا ہے، سامنے سے بھی تھپڑ ہی پڑتا، یوں پھر ایک دوسرے پر تھپڑوں کی بارش ہو جاتی، ایک دوسرے کو رگیدا جاتا، یہاں تک کہ کوئی ایک ہار مان لے۔ ایک طرح سے یہ وحشیانہ کھیل تھا، لیکن یہ نئی نسل کو لگتا تھا، ورنہ کہنے والے یہی کہتے ہیں کہ دراصل کبڈی کھیلی ہی ایسے جاتی ہے، باقی سب میں توڑ دو بدل کر لیا گیا ہے۔

پچھلے چار برس سے ہمارا گاؤں یہی کبڈی جیت جاتا تھا۔ اگرچہ گاؤں میں کئی دوسرے لڑکے بھی شہ زور تھے لیکن میرا چچازاد بھائی ذیشان وہ واحد شہ زور تھا جس کے بل بوتے پر ہم ہر برس جیت جاتے تھے۔ رب نے ذیشان کو جسم بھی بہت خوب صورت دیا تھا۔ اسے دیکھ کر ہی مجھے بھی لڑکپن سے جسم بنانے کا شوق ہو گیا تھا۔ میں کبڈی بھی کھیل لیتا تھا، مار کھانے اور مار دینے کا حوصلہ بھی رکھتا تھا لیکن مجھے کھیلنے نہیں دیا جاتا تھا۔ میں چونکہ یونیورسٹی پڑھنے چلا گیا تھا اس لیے ڈر تھا کہ کہیں چوٹ لگ گئی تو تعلیمی کیریئر ضائع ہو جائے گا مگر یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ گاؤں میں میلا ہو، اس میں ذیشان بھائی کی کبڈی ہو اور میں دیکھنے نہ جاؤں۔

مجھے ذیشان بھائی سے پیار بہت تھا اور وہ بھی میرا بہت خیال رکھتا تھا۔ میں اس کے ساتھ ہی میدان میں آپہنچا تھا۔ میلے سے ذرا فاصلے پر درختوں کے جھنڈ کے پاس ہم نے اپنا ڈیرا جما لیا تھا۔ وہیں ہم نے موٹر سائیکل اور جیپ کھڑی کی تھی۔ ہماری کبڈی ٹیم پوری ہو چکی تھی۔ اس وقت ہمارے گاؤں کی ٹیم کے شہ زور درختوں کے جھنڈ تلے لنگوٹ کس رہے تھے۔ لنگوٹ کس کر، تیل مالش کر کے، خود کو تھوڑا گرما کے، وہیں۔ یہ میدان میں جانا تھا۔ جہاں لوگ ان شہ زوروں کی فنکاریاں دیکھنے کو بے تاب تھے۔

میدان میں لگے ہوئے اسپیکر سے کبڈی کی دونوں ٹیموں کو بلایا جانے لگا تھا۔ ہوا کے دوش پر یہ اعلان پورے میلے میں گونجا تو دکانوں کا رش ٹوٹنے لگا۔ لوگوں کی توجہ خریداری سے ہٹ کر کبڈی میچ کی طرف ہو گئی۔ میں ٹیکری سے اتر آیا۔ ہماری ٹیم تیار ہو کر اس میدان کی جانب بڑھنے لگی۔ ہمارے ساتھ گاؤں سے آئے لوگ تھے جن میں دو ڈھولچی بھی تھے۔ جیسے ہی ہم چلے، ڈھول بجنے لگے۔ کچھ سن چلے بھنگڑا ڈالنے لگے۔ میلے میں آئے لوگ بھی ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگے، ایک جلوس کی صورت میں ہم میدان میں جا پہنچے۔

ایک بڑے سے دائرے میں لوگ ہی لوگ تھے۔ سامنے مچان بنی ہوئی تھی، جہاں شامیانے کے نیچے کرسیوں پر علاقے کے معززین بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسری ٹیم موجود تھی، ان کے ساتھ بھی ڈھولچی آئے تھے۔ ڈھول کی تھاپ سے میدان گونج رہا تھا۔ اسپیکر پر دونوں طرف کے کھلاڑیوں کے نام لے کر ان کی تعریفیں کی جا رہی تھیں۔ گویا کے میدان لگانے اور لوگوں کو گرمانے کی پوری کوشش ہو رہی تھی۔ ہم جیسے ہی وہاں پہنچے تو کئی طرف سے نعرے بازی شروع ہوئی۔ ہماری ٹیم میدان میں اتر چکی تھی۔ میں اپنے گاؤں والوں کے ساتھ بالکل پیچھے کھڑا تھا۔ میرا لہو بھی گرم تھا اور اندر جوش بھرا ہوا تھا۔ ہماری ٹیم کی قیادت میرا بھائی ذیشان کر رہا تھا۔ اس نے سیاہ لنگوٹ پہنا ہوا تھا اور میدان میں شیر کی طرح گھوم رہا تھا، جیسے اپنے شکار پر جھپٹنے کو پوری طرح تیار ہو۔ اسی شور شرابے میں

دونوں ٹیمیں آمنے سامنے قطاروں میں کھڑی ہو گئیں تو علاقے کے سیاسی نمائندے دیگر معززین کے ہمراہ اسٹیج سے نیچے اترے اور ٹیموں تک آ گئے۔ تعارف وغیرہ کی رسمی کارروائی ہوئی پھر وہ واپس کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔

ریفری کی تیز وسل پر ایک دم سے خاموشی ہو گئی، جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ عوام نے دم سادھ لیا، ڈھول بجنا بند ہو گئے۔ ٹاس ہوا اور پہلا "ساہ" ڈالنے ذیشان چل پڑا۔ اس نے لکیر پر مٹی کو ہاتھ لگایا، کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کی اور رب کو یاد کرتا ہوا مخالفین کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے سے ایک شہ زور نکلا، وہ ذیشان کے سامنے آ گیا۔ اس نے مٹی اٹھا کر ذیشان کے تیل لگے جسم پر ملنی شروع کر دی۔ ذیشان نے بھی اس کے بدن پر مٹی مل دی۔ تبھی وہ آمنے سامنے ہوئے۔ مخالف شہ زور انتظار کرنے لگا کہ ذیشان کب اسے ہاتھ لگاتا ہے۔ ذیشان نے اس کے سینے پر ہاتھ مار کر "ہاتھ لگانے" کی رسم پوری کر دی۔ تبھی سامنے سے ایک زناٹے دار تھپڑ ذیشان کے سینے پر پڑا۔ چٹاخ کی آواز گونج کر رہ گئی۔ اب ذیشان کو وہاں سے جانا نہیں تھا، یا تو وہ سامنے والے کو بے بس کرتا، یا خود اپنی بے بسی کا اعلان کرتا۔ تیسری صورت کوئی نہیں تھی۔ ذیشان نے زور دار تھپڑ اس کے سینے پر دے مارا۔ دونوں میں تھپڑ بازی شروع ہو گئی۔ ذیشان پیچھے ہٹتا جا رہا تھا، یہ اس کا مخصوص داؤ تھا۔ عین اس وقت جب مخالف شہ زور پورے جوش سے اس پر حاوی ہونے والا تھا، ذیشان نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈالا اور اسے رُبڑہ لگا دی، سامنے والا توازن نہ رکھ پایا اور اپنی ہی جونک میں قلابازی کھاتا ہوا دور تک گھسٹتا چلا گیا۔ جیسے ہی وہ اٹھا، ذیشان نے وہی داؤ آزمایا، وہ پھر گھسٹتا گیا، پھر وہ پورے جوش سے اٹھا تو ذیشان نے پھر وہی داؤ لگایا، وہ سر کے بل زمین سے ٹکرایا اور پھر نہ اٹھ سکا۔ اس نے اپنی بے بسی ہاتھ اٹھا کر ظاہر کر دی۔ ذیشان ایک فاتح کی حیثیت سے واپس اپنی جگہ پر آ گیا۔ ایک شور تھا جو عوام میں مچ گیا۔ نعرے بازی، داد و تحسین، سیٹیاں اور نجانے کیا کیا۔

لمحہ بہ لمحہ کھیل دلچسپ ہوتا جا رہا تھا۔ اس وقت کھیل انتہائی سنسنی خیز مرحلے میں جا پہنچا، جب پانچ منٹ کا وقت رہ گیا تھا۔ اس میں زیادہ سے زیادہ تین یا چار "ساہ" پڑ جاتے۔ اگر وہ سارے نمبر بھی لے لیتے تو بھی ہماری جیت یقینی ہو گئی تھی۔ ہمارے سات نمبر زیادہ تھے اور پچھلے چار برس کی طرح اس بار بھی ہماری جیت یقینی تھی۔ ہمارے لڑکوں میں انتہائی درجے کا جوش بھر گیا تھا۔ ایسے میں ذیشان "ساہ" ڈالنے چل پڑا۔ وہ مخالف ٹیم کے سامنے جا کھڑا ہوا تو ان کا ایک شہ زور باہر نکلا، اس نے آتے ہی تھپڑ کے بجائے گھونسا مارا، جو ذیشان کی ناک پر لگا۔ گھونسا لگتے ہی ناک کی دائیں جانب سے خون بہنے لگا۔ یہ سراسر کھیل کی خلاف ورزی تھی۔ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ سہواً ہو گیا ہے، یہ بالکل جان بوجھ کر کیا گیا تھا۔ جواباً ذیشان نے بھی اس کی ناک پر تاک کر گھونسا مارا جو اسے نہیں لگا۔ کیونکہ وہ چوکنا تھا کہ سامنے سے ایسا وار ہو سکتا ہے۔ اگلے ہی لمحے ذیشان نے اس کی بغل کے نیچے مکا مارا، وہ دہرا ہو گیا۔ اسی وقت ذیشان نے اس کی گردن پر کہنی ماری اور اس سے الگ ہو گیا۔ ریفری نے دونوں کو الگ الگ کر دیا تاکہ وہ پھر سے کھیل شروع کریں۔ اصول کے مطابق ذیشان نے سامنے والے حریف کے سینے پر تھپڑ مارا، اس نے پھر سے ذیشان کی ناک پر مکا جڑ دیا۔ اب جبکہ کھیل کے اصول کی خلاف ورزی ہو گئی تھی، ذیشان نہیں رکا، اس نے حریف کو پکڑ لیا۔ ایک طرح سے فری اسٹائل میں لڑائی شروع ہو گئی۔ اس دوران ان دونوں کو چھڑانے کے چکر میں مخالف ٹیم کے چند کھلاڑی تیزی سے آگے بڑھ آئے۔ اسی دوران کچھ ہوا، بس چند لمحے ہی لگے تھے، ذیشان ہوا میں اچھلا اور زمین پر جا گرا تھا، گرتے ہی اس کی دلدوز کراہ بلند ہوئی، اس نے ران کے قریب سے اپنی دائیں ٹانگ کو پکڑ لیا۔ ذیشان کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ بلاشبہ حریفوں نے جان بوجھ کر ذیشان کی ٹانگ توڑ دی تھی۔

پہلے تو مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں؟ پھر جیسے مجھے ہوش آیا، میں انتہائی تیزی سے آگے بڑھا، اس سے پہلے کہ ہمارے گاؤں والوں اور ان کے گاؤں والوں کے درمیان ... ہونے والی لڑائی میں زمین پر پڑا ذیشان کچلا جاتا، میں بھاگ کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ میں اس کے اوپر تن کر کھڑا ہو گیا۔ کئی افراد مجھ سے ٹکرائے، اسی دوران میں نے دیکھا، مخالف ٹیم کا ایک کھلاڑی آگے بڑھا، اس نے ذیشان کی پسلیوں میں ٹھوکر ماری، یہ ان کی نفرت کی انتہا تھی۔ ایک بے بس اور مجبور شخص پر اپنا غصہ نکالنے کو کسی طور بھی مردانگی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں اس کھلاڑی کے پیچھے نہیں گیا بلکہ پوری جان سے ذیشان کو اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈال لیا۔ میں اسے رش والی جگہ سے فوراً باہر لے جانا چاہتا تھا۔ ذیشان ایک شہ زور تھا، اس کا وزن کافی زیادہ تھا، اسے اٹھا کر چلنے میں مجھے دانتوں پسینا آ گیا۔ چند قدم ہی چلا تھا کہ مجھ پر اور ذیشان پر کئی طرف سے تھپڑ پڑے۔ یہ انتہائی کمینگی تھی۔ میں رکا نہیں بلکہ بڑھتا چلا گیا۔ میں جلد از جلد ذیشان کو لے کر جیپ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ میرے پیچھے کئی بندے آ گئے۔ انہوں نے ذیشان کو بڑی احتیاط کے ساتھ پچھلی سیٹ پر لٹایا تو ذیشان درد کی شدت سے چلا اٹھا۔

"اسد! لگتا ہے ران کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔"

"بھائی، رب خیر کرے گا، بس تھوڑا حوصلہ رکھ، ابھی اسپتال پہنچ جاتے ہیں۔" میں نے ذیشان کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ میں تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا، کبڈی کے دو کھلاڑی جو ذیشان کے بہت قریب تھے، وہ بھی بیٹھ گئے تو میں نے جیپ آگے بڑھا دی۔ ہچکولے لگنے سے بھائی کے منہ سے بے ساختہ کراہیں نکلنے لگی تھیں۔ ساتھیوں نے جیپ کے اندر پڑے ہوئے کپڑے اٹھائے اور جہاں درد ہو رہا تھا، وہاں سے باندھ دیا، جس سے درد کی شدت کافی کم ہو گئی۔

تقریباً آدھے گھنٹے میں ہم تحصیل سطح کے اسپتال میں جا پہنچے۔ وہاں انہوں نے چند انجکشن دینے کے ساتھ فرسٹ ایڈ دے دی اور پھر ہمیں ضلعی اسپتال ریفر کر دیا گیا۔ میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار تھا۔ میں نے راستے ہی میں یونیورسٹی میں موجود اپنے کلاس فیلو اظہر کو فون پر ساری صورتِ حال بتا دی تھی، ساتھ میں یہ بھی تاکید کر دی تھی کہ کچھ لڑکے ساتھ میں لے کر آ جائے، ممکن ہے ہمیں خون کی ضرورت پڑے۔ میں جانتا تھا کہ گھر والوں کو پتا چل گیا ہو گا۔ ارسلان بھائی سب سے بڑے تھے۔ انہوں نے اپنی آمد کے بارے میں مجھے فون پر بتا دیا تھا۔ ہم ڈیڑھ گھنٹے میں بہاول پور اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں جا پہنچے۔ ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی کوئی دس بارہ لڑکے موجود تھے۔ اگلے آدھے گھنٹے میں مختلف ٹیسٹ اور ایکسرے کے بعد ذیشان کو آپریشن تھیٹر لے جایا گیا۔ ذیشان کی ٹانگ کی ہڈی ران کے قریب سے ٹوٹ گئی تھی۔ اس کا ایک سرا گوشت میں پیوست ہو گیا تھا۔ جس سے اندر ہی اندر خون رسنے لگا تھا۔ اب آپریشن میں نجانے کتنا وقت لگتا۔ میں آپریشن تھیٹر کے باہر اپنے یونیورسٹی فیلوز کے پاس آ گیا۔ وہ سب تفصیلات جاننا چاہ رہے تھے، میں انہیں تفصیل بتانے لگا۔

رات گئے ذیشان کا آپریشن ہو گیا تو اسے انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا۔ وہ اس وقت بے ہوش تھا۔ میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ ہی ارسلان بھائی کو ہاسٹل بھیج دیا، تاکہ وہ آرام کر سکیں اور صبح تازہ دم ہو کر آ ئیں۔ وہ چلے گئے اور میں اکیلا ذیشان کے پاس بیٹھا رہا۔ اسی دوران میرا فون تھرتھرایا۔ میں نے فون جیب سے نکال کر دیکھا، وہ فریحہ کی کال تھا۔ میں نے باہر جا کر کال ریسیو کر لی۔

"تم بہاول پور میں ہو؟" اس نے کسی بھی تمہید کے بغیر تیزی سے پوچھا۔

"ہاں، ایمرجنسی میں آنا پڑا، وہ دراصل......" میں .... تحمل سے بتانے لگا۔

"مطلب وہ تمہارے کزن والی بات ٹھیک ہے؟ تم اس وقت اسپتال میں ہو؟" اس نے تصدیق طلب لہجے میں پوچھا۔

"ہاں، اس کا آپریشن ہو گیا ہے اب آئی سی یو میں ہے۔" میں نے بتایا تو وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔

"اچھا، میں یہاں اسپتال میں آ گئی ہوں، پارکنگ میں گاڑی کھڑی کی ہے......" اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتی، میں نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"ارے اس وقت تم کہاں، تم صبح......" میں کہہ رہا تھا کہ اس نے فون بند کر دیا۔ وہ تھی ہی ایسی شدت پسند قسم کی، اپنی مرضی کرنے والی، ایک بار کہہ دیا تو بس کہہ دیا۔ میں فون جیب میں رکھ کر وارڈ سے باہر نکل گیا۔

فریحہ عرف فرحی میری یونیورسٹی فیلو تھی۔ وہ قانون پڑھ رہی تھی لیکن ہمارے درمیان بہت... اچھا تعلق ہی نہیں خوبصورت قربت بھی تھی۔ ہماری فیکلٹی ایک تھی، ہمارے ڈیپارٹمنٹ اوپر نیچے تھے۔ اس کی شخصیت، انداز اور رکھ رکھاؤ بہت شاندار تھا۔ دو برس گزر جانے کو تھے لیکن اس کی ذات یا کردار پر کسی نے انگلی اٹھانے کی ہمت نہیں کی تھی۔ کیونکہ وہ ایسا موقع ہی نہیں دیتی تھی۔ وہ ایک بولڈ، باوقار اور ہمت والی لڑکی تھی۔ وہ شہر کے نامی وکیل ظفر چوہدری کی بیٹی تھی۔ اس کا ایک بھائی امریکا جا چکا تھا۔ ان کا خاندان شہر بھر میں پھیلا ہوا تھا۔ نجانے میرے اور اس کے درمیان ایسا کیا تھا کہ ہم میں ایک اچھا تعلق بنتا چلا گیا۔ مجھے ذیشان بھائی کو دیکھ کر جسم بنانے کا شوق تو تھا ہی، اس لیے شہر کا بہترین جم جوائن کر لیا تھا۔ فرحی سے میرا آسامنا وہیں ہوتا تھا۔ چہرہ شناسی سے بات گپ شپ تک پہنچی اور پھر ہم میں ایک اچھا تعلق بن گیا۔ ایک اچھے تعلق سے اتنی زیادہ قربت ہو گئی تھی کہ بات دوستی سے بھی آگے جا پہنچی تھی۔ ہم اکثر یونیورسٹی سے باہر... بھی ملتے رہتے تھے۔ کبھی لانگ ڈرائیو پر یونہی نکل گئے۔ کبھی کسی اچھے ہوٹل میں کھانا کھا لیا اور کبھی اس کی بہت قریبی سہیلی شائستہ کے گھر چلے جاتے۔ وہاں بیٹھ کر لمبی لمبی گپ شپ چلتی رہتی۔

وہ مجھے سامنے کاریڈور میں آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے نیلی جینز پر آف وہائٹ کرتہ پہنا ہوا تھا، گلے میں گہرے نیلے رنگ کا آنچل تھا۔ اس کے ہاتھ میں شاپنگ بیگ تھے۔ میں اسے دیکھ کر رک گیا، وہ میرے قریب پہنچی تو میں نے کہا۔

"اتنی رات ہو گئی ہے اور تم......"

"ارے رات ہو گئی ہے تو کیا ہوا۔ میں کون سا جنگل میں پھر رہی ہوں۔ اپنے کزن کا سناؤ، اب کیسا ہے وہ؟" اس نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہتے ہوئے پوچھ لیا۔

''بتایا ہے نا آپریشن ہوگیا ہے، ابھی بے ہوش ہے، کچھ گھنٹوں بعد ہوش آجائے گا۔'' میں نے کہا تو وہ چند لمحے کھڑی سوچتی رہی پھر بولی۔

''دیکھو، جو مصیبت آنا تھی، وہ آگئی، اب اس کا مقابلہ تو کرنا ہی ہے۔ حوصلے ہی سے سارا کام ہوگا۔''

''حوصلہ ہی تو ہے۔'' میں نے دھیمے سے کہا۔

''مجھے پورا یقین ہے تم نے کچھ نہیں کھایا ہوگا، یہ لو کھانا کھاؤ۔'' اس نے شاپنگ بیگ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو مجھے احساس ہوا، میں نے دوپہر سے کچھ کھایا تھا نہ پیا تھا۔ وہیں وارڈ ہی میں ایک بینچ پر بیٹھ کر میں نے وہ شاپنگ بیگ کھولا، ٹفن، پانی، ٹشو ہر شے تھی۔ فرحی میرے سامنے بیٹھ کر بولی۔

''یہ تم لوگ ایسی کبڈی کھیلتے ہی کیوں ہو جس میں......''

''مجھے یہ بتاؤ، کون سا ایسا کھیل ہے جو بالکل محفوظ ہے؟ چوٹ کا اندیشہ تو ہر کھیل میں ہوتا ہے، ہاں لیکن جب تک کھیل کو محفوظ رکھا جائے۔ ذیشان بھائی کے ساتھ تو انہوں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔'' میں نے پُرسکون لہجے میں بتایا۔

''کیسے کہہ سکتے ہو تم؟'' اس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''یار وہ چار برس سے جیت رہا تھا، یوں سمجھو علاقے میں ایسا شہ زور تھا جس کی ٹکر کا ابھی کوئی پیدا نہیں ہوا تھا۔ حسد، کینہ اور دشمنی کھا گئی اُسے۔'' میں نے دکھ سے کہا تو اس نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

''جس طرح اسے چوٹ لگی ہے، میرا خیال ہے اب وہ کبھی کھیل نہیں پائے گا؟''

''ہاں ایسا ہی ہے۔ خیر ٹیم تو ہماری اس بار بھی جیت گئی ہے لیکن اس کی قیمت بہت زیادہ دینی پڑی ہے۔'' میں نے دکھ سے کہا۔

''اچھا تم کھانا کھاؤ، باتیں تو ہوتی رہیں گی۔'' اس نے میرا دھیان کھانے کی طرف دلایا۔ میں نے ڈٹ کر کھانا کھایا تو فرحی نے سامان سمیٹ لیا۔ وہ کچھ دیر میرے پاس رہی پھر اٹھ کر چلی گئی۔ میں اٹھا اور آئی سی یو کے باہر جا بیٹھا۔

ہم ایک ہفتہ اسپتال میں رہے۔ میرا کھانا پینا فرحی ہی کی ذمے داری رہی۔ کبھی ان کے گھر کا ملازم دے جاتا، کبھی وہ خود آجاتی، یا پھر شائستہ دے جاتی۔ فرحی کبھی اکیلی اور کبھی شائستہ کے ساتھ اسپتال روزانہ آتی، کچھ دیر بیٹھ کر چلی جاتی۔ وہ دونوں بھی ذیشان بھائی سے اچھی طرح متعارف ہوگئی تھیں۔ انہی دنوں میں ذیشان بھائی سے پتا چلا کہ یہ سب دشمنوں نے کیسے کیا تھا۔ یہ صرف ایک بندے کا کام نہیں تھا، جب حریف ٹیم کے کئی لوگ اردگرد اکٹھے ہوئے تو دو تین نے مل کر بھائی کو اوپر اچھالا، جیسے ہی وہ زمین پر گرا، ایک آدمی نے اس کی ران پر چڑھ کر دباؤ ڈالا۔ جس کی وجہ سے یہ ران کی ہڈی ٹوٹی تھی۔ میرے دماغ میں غصہ تو بہت تھا لیکن اس وقت میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

ہم ذیشان بھائی کو لے کر گاؤں واپس آگئے۔ یہاں ملنے عیادت کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ سب کی یہی رائے تھی کہ ذیشان کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، وہ غلط ہوا۔ پنڈ شاہ پور والوں نے اچھا نہیں کیا۔ اس دوران یہ بھی پتا چلا کہ انہوں نے ایسا کرنے کی سازش بہت پہلے ہی تیار کر لی تھی، اس مقصد کے لیے دو تین لوگ باہر سے بھی بلائے گئے تھے۔

☆☆☆

ذیشان بھائی کی ٹانگ ٹوٹنے اور کبھی کبڈی نہ کھیل سکنے کے باعث ہمارے خاندان پر ہی نہیں پورے گاؤں پر سوگواریت طاری تھی۔ نجانے کیوں ان دنوں میرے دل میں یہی خیال آتا تھا کہ اب اگر اپنے خاندان کی اور گاؤں کی لاج رکھنی ہے تو مجھے کبڈی کھیلنا ہوگی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ سب کے ہی دل میں ایسا خیال ہے لیکن کسی نے اس بابت ایک لفظ بھی اپنے منہ سے نہیں کہا تھا۔ میں ایک ہفتے مزید گاؤں میں رہا اور پھر واپس یونیورسٹی آگیا۔

اگلے دن میں کلاس لے کر باہر نکلا تو کچھ لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ فرحی بھی کھڑی دکھائی دی۔ وہ اکثر وہیں دکھائی دیتی تھی۔ ہم بھی وہیں بیٹھ جاتے یا پھر کینٹین میں چلے جاتے۔ اس نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا، مجھے لگا جیسے وہ میرے انتظار میں ہے، میں اس کے قریب گیا تو باتیں کرتے ہوئے ہم کینٹین میں آبیٹھے۔ وہ مجھ سے گاؤں کا احوال پوچھتی رہی۔ میں بتاتا رہا۔ ہمارے سامنے جوس کے گلاس رکھے ہوئے تھے۔ ایک افسردگی ہم میں موجود تھی۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا، جو ہوگیا تھا۔

اس وقت ہم اپنے اپنے طور پر سوچتے ہوئے خاموشی سے جوس پی رہے تھے۔ ہم سے چند قدم کے فاصلے پر ایک میز خالی پڑی تھی، جہاں پر تین چار لڑکے آکر بیٹھ گئے۔ یہ لڑکے ہمارے ہی علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں، ایسا اکثر ہوتا تھا۔ یونیورسٹی میں کثیر تعداد ہمارے ہی خطے اور علاقے سے تعلق رکھنے والی لڑکے لڑکیوں کی تھی۔ وہ وہاں آکر کھاتے پیتے اور اپنے مطلب سے مطلب رکھتے۔ یہ عام سی بات تھی لیکن ان لڑکوں کا یوں آکر قریب کی میز پر بیٹھنا اتفاق نہیں تھا۔ وہ بہت سوچ سمجھ کر وہاں آکر بیٹھے تھے کیونکہ

تے ہی اُن میں سے ایک لڑکے نے بلند آواز میں اپنے ساتھی سے پوچھا۔
"ارے، یہ وہی اسد نہیں، جس کے کزن کو پچھلے دنوں کبڈی کے میدان میں کتّوں کی طرح گھسیٹا گیا تھا؟"
"سنا ہے ٹانگ بھی توڑ دی وڈھے کبڈر کی۔" دوسرے نے تضحیک بھرے انداز میں کہا تو ایک دم سے میرا غصہ عروج پر پہنچ گیا۔ میں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس میز پر رکھ دیا۔ وہ باتیں کر رہے تھے لیکن بلند آواز میں سنا مجھے رہے تھے۔
"بس جی ٹٹ گئی تڑک کر کے۔" ایک نے کہا تو تضحیک آمیز قہقہہ فضا میں بلند ہوا، جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔
"میرا خیال ہے، اب تو وہ کبھی کبڈی نہیں کھیل سکے گا۔" ایک نے افسوس بھرے لہجے میں کہا تو سامنے والا نفرت سے بولا۔
"او بی مار دتا اے او ہناں دا۔" (او ئے بیج ہی ختم کر دیا ہے ان کا)
"کیا مطلب؟" کسی نے پوچھا تو تضحیک آمیز لہجے میں کہا گیا۔
"اب کوئی ان کے گھر کا یا ان کے گاؤں کا بندہ پنڈ شاہ پور والوں کا سامنا نہیں کر سکتا۔"
میرا غصہ اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ میں ایک دم سے اٹھنے لگا۔ تبھی فرحی نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہولے سے بولی۔ "رُکو ذرا......"
"تم سن رہی ہو فرحی......" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔
"سن بھی رہی ہوں اور سمجھ بھی رہی ہوں، وہ پوری تیاری سے لڑنے آئے ہیں، ورنہ آتے ہی یوں بات نہ کرتے۔" اس نے تحمل سے کہا تو میرے اندر غصہ مزید بڑھ گیا۔ اردگرد بیٹھے ہوئے لڑکے لڑکیاں ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔
"اگر کوئی حملہ کر دے تو کیا خاموشی سے سنتے رہیں، کوئی مزاحمت نہ کریں۔" میں نے غصے سے کہا۔
"تم کچھ نہیں کرو گے، جب تک میں نہ کہوں، رُکو تم۔" فرحی نے کہا، اس نے بڑے سکون سے اپنا گلاس میز پر رکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ چار قدم کا فاصلہ اس نے ایک لمحے میں طے کر لیا۔ اس نے جاتے ہی ایک لڑکے کا کالر پکڑ کر سرد لہجے میں کہا۔
"پنڈ شاہ پور والوں سے جب سامنا ہو گا، تب دیکھی جائے گی، تم اس وقت بولو، کیا چاہتے ہو؟"
کینٹین میں بیٹھے کافی.... لوگ پوری طرح متوجہ ہو گئے۔ یہ ان کے لیے بالکل نیا تماشا تھا۔ شاید ان لڑکوں کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔ ان کے چہروں پر سکوت طاری ہو گیا، کئی لمحوں تک وہ بول ہی نہیں سکا پھر جھجکتے ہوئے بولا۔
"تم سے ہماری کوئی بات نہیں ہے، ہم تو ویسے ہی تبصرہ کر رہے تھے۔"
"تمہارا کیا مطلب ہے، ہم پاگل ہیں، بچے ہیں، جو تمہاری بات نہ سمجھ سکیں، بولو کیا مقصد ہے تمہارا؟" فرحی نے ایک دم غصے سے کہا۔
"میں نے کہا نا تمہاری ہماری کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے سختی سے کہا۔
"تو پھر بتا، کس بہنوئی کو یہ سب سنا رہا ہے؟" فرحی نے ایک دم سے حد پار کر دی، میں پوری طرح لڑنے بھڑنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ وہ اپنی تضحیک برداشت نہ کر سکا، گھوم کر اٹھا اور اس نے تھپڑ مارنے کو ہاتھ بلند کیا ہی تھا کہ فرحی نے اس کے تھپڑ جڑ دیا۔ چٹاخ کی آواز گونجی تو اردگرد ہونے والا شور تھم گیا، لحہ بھر کے لیے ایک سکوت طاری ہوا پھر شور ہونے لگا۔ میں اپنی کرسی سے اٹھ چکا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سامنے سے اس طرح کا رسپانس ملنے والا ہے۔ اس نے بڑھ کر فرحی کو پکڑنا چاہا کہ اس کے ایک ساتھی نے جست لگائی اور ان دونوں کے درمیان آ گیا۔ باقی ساتھیوں نے بھی اس لڑکے کو پکڑا اور اسے وہاں سے لے جانے لگے، وہ جانتے تھے کہ اگر وہ لڑکا فرحی پر ہاتھ اٹھا دیتا تو اس کا نتیجہ کتنا بھیانک نکلنے والا تھا۔ تبھی وہ بولی۔
"سمجھا دو اِسے...... اسد اکیلا نہیں ہے، اس تک پہنچنے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑے گا تم سب کو۔ اب اگر کسی نے آنکھ اٹھا کر دیکھا، یا زبان سے ایک لفظ بھی نکالا تو وہ اپنا بندوبست کر لے۔"
"میں نے تمہیں کچھ کہا جو تم......" اس لڑکے نے غصے میں کہنا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹ کر تیزی سے دہاڑتے ہوئے بولی۔
"وہ میرے ساتھ بیٹھا ہے، اگر ہمت ہے تو بولو، کہو اسے کچھ......"
"میں تمہیں بھی دیکھ لوں گا، اور اس...... کو بھی۔" اس نے شدید غصے میں کہا تو گالی پر میرا دماغ سلگ اٹھا۔ میں تیزی سے آگے بڑھا تو کئی لڑکے درمیان میں آ گئے۔ وہاں کافی شور مچا ہوا تھا۔ اُن لڑکوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ نکل جائیں۔ وہ کینٹین سے نکل گئے تو فرحی میرا ہاتھ پکڑ کر ٹیبل تک لے آئی۔

ہم کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ تبھی وہ بولی۔

”اسد، جو ہونا تھا، وہ ہو گیا، کچھ لوگ جہاں تم لوگوں کے ساتھ ہمدردی کریں گے وہاں اپنی دشمنی اور کینہ نکالنے کے لیے تم لوگوں کو اکسائیں گے بدلہ لینے کے لیے۔ مگر تمہیں بہت احتیاط سے کام لینا ہے، جیسے ابھی یہ لوگ، لگتا ہے، یہ خود نہیں آئے، انہیں کسی نے بھیجا ہے۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو، لیکن تمہارا رویّہ بھی تو ٹھیک نہیں رہا، بات تو بڑھ گئی ہے، پہل تو ہو گئی، جو وہ چاہتے تھے، وہ ہو گیا۔“ میں نے کہا۔

”یہ تو ہونا ہی تھا، تم کیوں اٹھ کر ان کے گلے پڑنے لگے تھے؟ غصہ تو آتا ہے لیکن وقت کیسے سنبھالنا ہے، یہ دیکھنا پڑتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی، پھر بولی، ”تم ان کے ساتھ لڑتے نا، تو ابھی تم اپنی ہڈیاں سینک رہے ہوتے، وہ سمجھ دار تھے، ایک لڑکی پر ہاتھ اٹھانے کا مطلب جانتے تھے، اس لیے نکل گئے۔ یہ وقت تو سنبھال لیا، اب محتاط ہونا ہوگا۔“

”میں سمجھ رہا ہوں فرحی، معاملہ صرف ذیشان بھائی تک محدود نہیں کچھ دوسرا ہو سکتا ہے۔ لیکن بھلے کچھ ہو جائے، مجھے بدلہ تو لینا ہے ذیشان بھائی کا۔“ میں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

”اور میں صرف ایک بات جانتی ہوں، جب تک شکار ہدف پر نہیں آ جاتا، اور جب تک پورا یقین نہ ہو کہ شکار پر کیا گیا نشانہ خطا نہیں جائے گا، اس وقت تک وار کرنا فضول ہوتا ہے۔“ اس نے پُرسکون لہجے میں سمجھایا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن خون کھولتا ہے۔ وہ یہ سب کر کے بھی آزاد پھر رہے ہیں اور ہمیں اب تک اسی اخلاقیات نے مارا ہوا ہے۔“ میں نے دبے دبے غصے میں کہا۔

”تو جاؤ، جا کر ان پر حملہ کر دو، دو تین بندے مار دو، پھر کیا ہوگا، یہی نا پولیس، تھانہ کچہری، دولت کا پانی کی طرح بہانا، بس یہی نا، کیا ہوگا؟ کچھ بھی نہیں، تم جیل میں اور قصہ ختم۔ تم وہی کرو گے جو تمہارے دشمن چاہتے ہیں۔“ اس نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔

”آخر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا نا؟ تم مجھے بزدل بنا رہی ہو؟“ میں نے احتجاج بھرے لہجے میں کہا۔

”ہاں، کرنا تو ہے لیکن میں تمہیں بزدل نہیں بنا رہی، سوچ سمجھ کر کچھ بھی کرنے کو کہہ رہی ہوں۔ جیسا انہوں نے کیا۔ سوچو وہ محض کھیل کھیل میں تمہیں ایسی چوٹ دے گئے ہیں جو تم برسوں تک سہلاتے رہو گے اور ابھی کیا تھا، یہی کہ یونیورسٹی میں لڑکوں کی لڑائی ہو گئی۔ یہی نا.....؟“ اس نے سمجھاتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، انہوں نے طاقت سے ہی نہیں سازش بھی کی ہے، اور کر رہے ہیں۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

”میں اسے سازش نہیں، عقل کہوں گی، صرف طاقت کچھ نہیں کرتی، ساتھ میں عقل بھی استعمال کرنا پڑتی ہے۔ تم جانتے نہیں، میں اپنے پاپا کے ساتھ روزانہ نت نئے کیس پڑھتی ہوں، سب جھوٹ ہوتا ہے، وہاں طاقت نہیں عقل لڑتی ہے۔ حقیقت کچھ اور ہوتی ہے، کاغذوں میں کچھ دوسری کہانی ہوتی ہے۔“ اس نے تحمل سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو فرحی، پہلے تو مجھے یہ سمجھنا ہوگا، یہ اچانک ہمارے دشمن پیدا کیوں ہو گئے ہیں؟ وہ کیوں ہمیں ختم کرنا چاہتے ہیں؟ میں نہیں سمجھتا یہ معاملہ صرف کھیل کے میدان والا ہے۔“ میں سوچتے ہوئے بولا۔

”اسد، میں کہہ رہی ہوں نا ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا، آگے بہت کچھ ہو سکتا ہے۔“ اس نے پُرسکون انداز میں کہا۔

”تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ میں نے اکتاہٹ بھرے لہجے میں پوچھا۔

”طاقت...... تمہیں صرف طاقت حاصل کرنا ہوگی، ایسی طاقت، جس سے تم انہیں رگید سکو۔ ایسی طاقت جس سے تم خود پر قابو رکھ سکو، صبر کرنے کی طاقت، تاکہ وقت پر چوٹ لگا سکو، ایسی چوٹ جو وہ کئی برس یاد رکھیں۔“ اس نے تحمل سے کہا تو میرے دماغ میں کئی خیال ابھرے میں نے کہا۔

”اچھا چھوڑو، یہ جوس گرم ہو رہا ہے، اسے ختم کرو۔“

میرے یوں کہنے پر اس نے چونک کر میری طرف دیکھا، پھر گلاس اٹھا لیا۔ فضا مکدر ہو چکی تھی۔ ہم وہاں سے اٹھے تو میں فرحی کے ساتھ پیدل چلتا ہوا، پارکنگ تک گیا۔ وہ کار اسٹارٹ کر چکی تو میری طرف دیکھ کر بولی۔

”اسد، حوصلہ رکھنا، یہ لوگ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، لیکن تمہیں حد درجہ محتاط رہنا ہوگا۔ سمجھتے ہونا۔“

”ہاں، میں محتاط رہوں گا۔“ میں نے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی

”گڈ بوائے...... اپنا خیال رکھنا۔“

اس نے کار آگے بڑھا دی اور میں ہاسٹل کی طرف چل دیا۔

اس دوپہر سے لے کر رات گئے تک کئی ایسے سوال تھے، جنہوں نے مجھے بے چین کر کے رکھ دیا لیکن یہ بے چینی انتہائی فضول تھی۔ جتنے بھی سوال ہوں، جب ان کا جواب ہی میرے پاس نہیں تو ان پر سوچنا وقت کے زیاں کے سوا کچھ نہیں

تھا لیکن ایک سوال کا جواب میرے پاس تھا، اگر اب یونیورسٹی میں رہنا تھا تو انتہائی احتیاط کی ضرورت تھی۔ ہر بار تو فرحی میرے پاس نہیں ہو سکتی تھی۔ دوسرا میں خود شرمندگی محسوس کر رہا تھا کہ میرے لیے ایک لڑکی لڑے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وقت فرحی نے جو کیا ٹھیک کیا، وقت سنبھال لیا۔ مگر ایسا ہر بار تو نہیں ہو سکتا تھا۔ اس رات مجھے فرحی پر بہت پیار آیا۔ وہ میرے لیے کسی بھوکی شیرنی کے مانند ان لڑکوں پر جھپٹ پڑی تھی حالانکہ مجھے لڑنا چاہیے تھا۔ تبھی میں نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا۔ میں زمینداروں کا بیٹا ہوں، گن، پسٹل چلانا ہمارے لیے کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں تھی۔ میں نے یونیورسٹی میں رہ کر یہاں کے دشمنوں کا سامنا کرنے کی ٹھان لی۔ میری الماری میں پسٹل رکھا تھا، میں نے اسے نکال کر رکھ لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی معلوم کرنا تھا، آخر ان کی یہ چڑھائی مجھ پر ہی کیوں تھی؟ میں نے یہ سب کچھ وقت پر ڈالا اور سکون سے سو گیا۔

☆☆☆

میں کلاس میں پوری تیاری کے ساتھ گیا تھا۔ کینٹین میں ہونے والے واقعے کی بازگشت پھیل گئی تھی۔ ہمارے اردگرد کے ہر اسٹوڈنٹ کو اس بارے پتا چل گیا تھا۔ کلاسز آف ہونے تک اسی پر باتیں ہوتی رہیں۔ فرحی حسبِ معمول باہر والے لان میں موجود تھی۔ وہاں تھوڑی دیر گپ شپ کے بعد میں ہاسٹل چلا گیا۔

اسی شام جب ہم چند دوست ڈائننگ ہال سے کھانا کھا کر اپنے کمروں کی طرف جانے کے لیے نکلے تو کاریڈور میں وہی لڑکے دکھائی دیے۔ میں ایک ہی نگاہ میں بھانپ گیا۔ اس بار ان کی تعداد آٹھ دس کے قریب تھی۔ میں نے لاشعوری طور پر نیفے میں اُڑسے ہوئے پسٹل کو محسوس کیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو، بھلے مجھے جتنی بھی مار کھانی پڑے، لیکن ایک آدھ کو پھڑکا دینا ہے، پھر بعد میں دیکھا جائے گا، کیا ہوتا ہے۔ نجانے کیوں میں لاشعوری طور پر اپنی شدید بے عزتی محسوس کر رہا تھا۔ بلاشبہ اس میں ہزیمت والا غصہ بھی تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جو مجھ پر بدمعاشی اور غنڈا گردی والی زبردستی کی چڑھائی تھی، مجھے اس کا بھی سدِباب کرنا تھا کہ بعد میں ان کی ہمت نہ پڑے۔

میں کاریڈور کے بالکل درمیان کھڑا تھا۔ میرے کچھ دوست ڈائننگ ہال سے باہر آ گئے تھے۔ میں ان کے حملے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ میں نے خود پر قابو رکھا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ جیسے ہی ان کے قریب پہنچا، وہی لڑکا میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا، جسے کل فرحی نے تھپڑ مارا تھا۔ اس نے آتے ہی میرے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے نفرت سے کہا۔

"بلا اپنی معشوق کو...... بزدل، لڑکیوں کو آگے کرتا ہے، اب آ، میں کھڑا ہوں تیرے سامنے، لڑ میرے ساتھ۔"

اس کی آواز کاریڈور میں گونج کر رہ گئی۔ میرے دوست بیچ بچاؤ کرانے کے لیے آگے بڑھے، تبھی اس لڑکے سے تھوڑا پیچھے کھڑے ایک لڑکے نے کاربین نکالی اور للکارتے ہوئے بولا۔

"اوئے، کوئی درمیان میں نہ آئے، جو آیا وہ اپنے انجام کا خود ذمے دار ہوگا، چلو ہٹو پیچھے، معاملہ ان کا ہے، انہیں ختم کرنے دو۔"

میرے ساتھ والے خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔ میں جانتا تھا کہ ایسا ہی ہوگا، کوئی کسی کی لڑائی اپنے ذمے کیوں لے گا۔ میرا کوئی ایسا گروپ نہیں تھا، جو لڑائی بھڑائی میں اس طرح سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا۔ یہ سب کچھ چند لمحوں میں ہو گیا۔ تبھی اس نے پھر میرے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"اوئے...... بول اب...... ابھی تو میں تیرا بندوبست کروں گا، صبح اس کا ہوگا...... تو نے کیا سمجھا تھا میں چپ کر جاؤں گا۔"

"دیکھو میں نہیں جانتا تم کون ہو، میری تمہاری کوئی لڑائی نہیں ہے، نہ اپنی کوئی دشمنی ہے، اس لیے......" لفظ میرے منہ ہی میں تھے کہ اس نے زوردار ٹھوکر میرے پیٹ میں ماری، میں دہرا ہو گیا۔ ایک اذیت ناک لہر میرے بدن میں پھیل گئی۔ میں جیسے ہی جھکا، اس نے میرے شانوں کے درمیان گھونسا مار دیا، میں مزید جھک گیا۔ مجھے لگا جیسے میرا کھایا پیا باہر آ جائے گا، میرا سر چکرا کر رہ گیا۔ تبھی اس نے ایک اور ٹھوکر ماری جو میرے ماتھے پر لگی۔ میں الٹ کر گرا اور چاروں شانے چت ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے اندر جان ہی نہیں رہی، اسی لمحے اس نے میرے دائیں جانب پسلیوں میں ٹھوکر ماری تو فطری طور دہرا ہو گیا، یہ اذیت ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی۔ میں نے یہ مار یونہی کھائی تھی۔ میں چاہتا تھا، کسی طرح اس کاربین والے سے بچ جاؤں، مجھے اپنے نیفے میں اڑسے پسٹل کا پورا خیال تھا۔ مجھے بس مناسب وقت چاہیے تھا، اسے نکالنے کے لیے۔ میں نے اپنی ساری قوت کو سمیٹا اور پوری قوت لگا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اٹھنے کے دوران میں نے اپنا پسٹل نکال لیا، جب تک میں نے سیفٹی کیچ ہٹایا، اس نے جھپٹا مار کر پسٹل چھین لینا چاہا، یہ پسٹل میں نے اسے پکڑانے کے لیے تو نہیں نکالا تھا۔ میں نے اسے جھکائی دی اور فائر کر دیا۔ دھماکے کی زوردار آواز کاریڈور میں پھیل گئی۔ وہ فائر کسی کو نہیں لگا تھا لیکن دہشت

پھیل گئی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کاربین والا فائر کرے گا، وہ میری نگاہوں میں تھا، میں ایک ہی لمحے میں چند قدم پیچھے ہٹا اور سامنے کھڑے کاربین والے کی ٹانگوں میں فائر جھونک دیے۔ اس کی چیخ فضا میں بلند ہوئی۔ جیسے ہی اس کے ساتھی لڑکے پیچھے کی جانب بھاگے، میں نے ان کی طرف پسٹل کر کے فائر کر دیے۔ وہ بھاگ رہے تھے، میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ وہ کاربین والا میری نگاہ میں تھا، اس کی ایک ٹانگ میں فائر لگا تھا۔ میں نے تاک کر اس کا نشانہ لیا اور دو تین فائر کر دیے۔ نجانے فائر اس کے کہاں لگے تھے، لیکن چند قدم کے بعد وہ گر گیا۔

میرے سامنے کاریڈور خالی ہو چکا تھا۔ مجھ پر حملہ کرنے والا اور جس کے ہاتھ میں کاربین تھی، وہ دونوں کاریڈور کے فرش پر پڑے تھے۔ غصے اور اذیت سے میرا دماغ پھٹ رہا تھا۔ میں نے اپنا سارا غصہ اپنے سامنے پڑے ہوئے حملہ آور پر نکالنا شروع کر دیا۔ میں نے اسے فرش سے اٹھایا اور کئی تھپڑ اس کے منہ پر مارے۔ ڈائننگ ہال سے کئی لڑکے نکل آئے، کسی نے مجھے قابو کیا، اور کئی لڑکوں نے ان دونوں کو قابو کر لیا۔ تبھی ایک لڑکے نے سرگوشی کے سے انداز میں مجھ سے پوچھا۔

"تیرے پاس پسٹل کہاں سے آیا؟"

یہ ایک ایسا سوال تھا جو مجھے بھی مشکوک بنا سکتا تھا۔ بعد میں یہ ثابت بھی ہو جاتا کہ میں بھی لڑائی کے لیے تیار تھا، مگر میں نے بڑے سکون سے کہا۔

"اسی بے غیرت سے چھینا ہے۔"

"اوئے اچھا، مطلب یہ لوگ باقاعدہ اسلحے کے ساتھ حملہ آور ہوئے تھے۔" اس نے حیرت سے کہا تو ایک اور لڑکا بولا۔

"تو اور کیا، وہ جو پڑا ہے، اس کے پاس کاربین ہے، وہ نکالو، کہیں فائر ہی نہ کر دے۔"

یہ کہنا تھا کہ لڑکے اس کی طرف بھاگے اور کاربین نکال لی۔

"یار ان کا خون نکل رہا ہے انہیں اسپتال پہنچاؤ جلدی۔"

"ارے، ارے چھوڑو ہمارے ہی کھاتے نہ پڑ جائیں، پڑے رہیں۔"

"اوئے مر جائیں گے؟"

"اوئے مرنے دو، ہم نے کہا تھا حملہ کرو۔"

یہ اور ایسی کئی آوازیں آنے لگیں۔ ڈائننگ ہال میں فائرنگ ہو جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ فوراً ہی انتظامیہ کے لوگ اکٹھے ہونا شروع ہو گئے۔ اگلے دس پندرہ منٹ میں انہیں اسپتال کے لیے اٹھا لیا گیا اور مجھے سپرنٹنڈنٹ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ میرے ساتھ کئی لڑکوں کی بھی گواہی تھی۔ انہوں نے کرید کرید کر پوچھنا شروع کر دیا، ظاہر ہے ان کی ذمے داری تھی۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹا اسی طرح گزر گیا۔ پولیس نے آ کر بیان لیے۔ میں نے اپنا موقف ایک ہی رکھا۔ مجھے فرحی کی بات یاد تھی۔ میں نے یہی کہا کہ کل دوپہر کے وقت میرے ساتھ بیٹھی ایک لڑکی کو انہوں نے چھیڑا، کافی ہنگامہ ہوا، اس لڑکی نے ایک کو تھپڑ بھی مارا تھا۔ اس ہنگامے کے بہت سے لوگ گواہ ہیں۔ ابھی آ کر ان لوگوں نے مجھ پر حملہ کیا، مجھے مارا، جب یہ مجھ پر فائر کرنے لگے تو ناچار میں نے اس کا پسٹل چھین لیا اور اپنی جان بچانے کے لیے ان پر فائر کیے۔ یہ اسلحہ انہی کا ہے، سب لوگ اس کے گواہ ہیں۔ اے ایس آئی نے پوری تفصیل سنی، اس کا رویہ عجیب سا تھا۔ تبھی اس نے پوچھا۔

"وہ لڑکی کون ہے؟"

"اس کا نام فریحہ ہے اور وہ بیرسٹر ظفر چوہدری کی بیٹی ہے۔" میں نے جیسے ہی کہا تو اے ایس آئی کا رویہ بدل گیا۔ وہ نرمی سے بولا۔

"ٹھیک ہے، اس واقعے کی ایف آر درج ہوگی، اپنا بیان لکھوانے تھانے چلنا ہوگا۔"

"میں اپنے وکیل سے مشورہ کر کے بیان دوں گا، باقی اگر ابھی مجھے ساتھ لے کر جانا ہے تو چلیں۔" میں نے آفر کی۔

"جانا تو پڑے گا۔" اس نے نرمی سے کہا۔

"تو چلیں، میں تیار ہوں۔" میں نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

مجھے وہ اپنے ساتھ لے کر چل پڑے۔ میں چند قدم ہی چلا تھا کہ میرے ایک ہاسٹل فیلو نے میرے قریب آ کر پوچھا۔

"اگر کسی کو اطلاع کرنی ہے تو بتاؤ؟"

"فریحہ کو بتا دو فون کر کے۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا اور پیچھے ہٹ گیا۔

رات کافی ہو گئی تھی۔ میں محرر کے کمرے میں ایک بینچ پر بیٹھا تھا۔ تھانے کے کچھ لوگ وہاں پر تھے جو اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ مجھے یہی کہا گیا تھا کہ انسپکٹر آئے گا تو معاملات آگے بڑھیں گے۔ میں خاموشی سے بیٹھا رہا۔ تقریباً گیارہ بجے کے قریب مجھے اپنے کچھ ہاسٹل فیلو آتے ہوئے دکھائی دیے، ان کے ساتھ ہی مجھے فرحی کا چہرہ دکھائی دیا۔ جیسے ہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی، اس کا تنا ہوا چہرہ ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور چند قدم کے بعد وہ مجھ تک آ پہنچی۔

ن نے آتے ہی پوچھا۔
"تم ٹھیک ہو؟ مطلب کسی نے کچھ کہا تو نہیں؟"
"نہیں، جب سے لایا گیا ہوں، یہیں بیٹھا ہوں۔" میں
نے بتایا۔
"اوکے۔" اس نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا اور پھر
کچھ فاصلے پر بیٹھے محرر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
"انسپکٹر صاحب ابھی پہنچے یا نہیں؟"
"ابھی تک نہیں پہنچے۔" اس نے منمناتے ہوئے جواب
یا۔
"میں یہاں اس سے سائڈ میں بات کر رہی ہوں، آپ
کو کوئی اعتراض تو نہیں؟" اس نے پوچھا۔
"نہیں، لیکن وہ جب صاحب......" اس نے کہنا چاہا تو
ہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔
"میرے ساتھ وکیل پہنچنے والے ہیں، میں آپ کی
ات سمجھتی ہوں۔" یہ کہتے ہی اس نے میرا بازو پکڑا اور باہر
رآمدے میں لے گئی، پھر بولی، "ساری بات جلدی سے
تاؤ۔" میں نے سب بتایا تو وہ بولی، "بالکل ٹھیک کیا تم نے،
ٹل اسی پر ڈال دیا، یہ ہوتی ہے عقل۔"
"تم نے ہی دی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو
س نے بھی ہلکے سے مسکراتے ہوئے بتایا۔
"پاپا کی بات ہو گئی ہے۔ ابتدائی رپورٹ تو لکھی جا چکی
ہے، باقاعدہ ایف آئی آر درج نہیں ہوئی۔ باقی ابھی دیکھتے ہیں
کیا ہوتا ہے، تمہیں اپنے اسی بیان پر قائم رہنا ہے، کیونکہ میں
ن سب کو اسی بیان پر پکا کر کے آئی ہوں، سمجھے تم۔"
"اوکے، میں سمجھ گیا۔" میں نے اس کی بات سمجھتے
ہوئے کہا پھر اپنے ہاسٹل فیلوز کی طرف دیکھا اور انہیں قریب بلا
یا۔ وہ بھی آ گئے۔ ہمیں ابھی کچھ دیر ہی ہوئی تھی باتیں کرتے
ہوئے کہ انسپکٹر کی گاڑی تھانے میں داخل ہوئی۔ لمحوں میں دو
سپاہی میرے پاس آ گئے۔
تھوڑی دیر بعد ہم انسپکٹر کے کمرے میں تھے۔ اتنے
میں فرحی کے پاپا کے بھیجے ہوئے ایک وکیل بھی آ گئے۔ دو گھنٹے
کی بک بک کے بعد ہم یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ
حملہ آور نے حملہ کیا اور پھر جو کچھ ہوا، وہ ہماری مزاحمت تھی۔
"دیکھیں جی، صبح ان زخمیوں کی رپورٹ آ جائے، پھر
ایف آئی آر درج کرتے ہیں، باقی پھر جو قانونی معاملہ ہو گا۔"
اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو اگلے آدھے گھنٹے میں سب چلے
گئے۔ بالکل آخر میں فرحی گئی۔ اب مجھے صبح تک تھانے ہی میں
رہنا تھا۔

پوری رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ دن نکل آنے کا
احساس ابھر آیا تھا، نیلگوں روشنی کا سحر طاری تھا۔ میری آنکھوں
سے نیند غائب تھی۔ ساری رات میں یہی سوچتا رہا تھا کہ آنے
والے دن میں کیا ہوگا؟ میں قانونی موشگافیوں کے بارے میں
کچھ نہیں جانتا تھا۔ لیکن اِدھر اُدھر سے جو معلومات ملی تھیں، ان
سے یہی اندازہ تھا کہ آج کسی وقت وہ مجھے مجسٹریٹ کے سامنے
پیش کریں گے، وہاں ریمانڈ ہوگا، یا ضمانت ہوگی، کیا ہوگا؟ اس
بارے مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ اس سب کے باوجود میں بالکل بھی
پریشان نہیں تھا۔ مجھے فرحی پر پورا بھروسا تھا۔ میں جانتا تھا کہ
اگر میں یہاں پڑا ہوا جاگ رہا ہوں تو سوئی وہ بھی نہیں ہوگی۔ وہ
کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال لے گی۔
سورج ابھر آیا تھا۔ تھانے میں لوگوں کے آنے سے
ہلچل ہونے لگی تھی۔ ایک نحیف سا سنتری میرے پاس آیا، اس
کے ہاتھوں میں چائے کا ایک کپ اور چھوٹی سی پلیٹ میں تین
بسکٹ تھے۔ اس نے وہ میرے قریب رکھ کر بڑے احسان
مند لہجے میں کہا۔ "لے بھئی باؤ، ناشتا کر لے۔"
میں نے چائے بسکٹ کی طرف دیکھا، پھر سنتری کی
طرف اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "کس نے بھیجے ہیں یہ؟"
"بس جی آ گئے ہیں، کسی اللہ کے بندے نے بھیج دیے
ہیں، آپ کھاؤ۔" اس نے یوں کہا جیسے بہت ہی پُراسرار معاملہ
ہو۔ تبھی میں نے اصرار کیا۔
"پھر بھی مجھے بتاؤ تو، میں ایویں ہی یہ ناشتا کر لوں۔"
اس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میری عقل پر ماتم
کر رہا ہو، پھر ہولے سے چہرہ گھما کر اس نے حوالات کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ دیکھ رہے ہو، سیاہ کرتے والے
بندے کو، وہ جس کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں، وہ سامنے؟"
میں نے دیکھا تو وہ بھی میری طرف دیکھ رہا تھا، وہ اپنی
بھاری مونچھوں کے نیچے مسکرا رہا تھا، یہاں تک کہ اس کی
مسکان اس کی آنکھوں سے بھی عیاں ہو رہی تھی۔ تبھی میں نے
اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "ہاں دیکھ رہا ہوں، کیا اس
نے بھیجا ہے یہ ناشتا؟"
"ہاں نا، پتا نہیں کیوں تم پر مہربان ہو گیا ہے۔" سنتری
نے کہا۔
"چل اُسے میری طرف سے شکریہ کہہ دے۔" میں
نے ایک دم فیصلہ کرتے ہوئے کہا اور چائے کا کپ اٹھا لیا۔
جوشاندہ نما چائے اور آٹے والے بسکٹ ٹھونس کر میں
نے کپ ایک طرف رکھا اور حوالات میں موجود اس شخص کی
طرف دیکھا، وہ اب بھی ویسے ہی مسکرا رہا تھا۔ میں نے

اشارے سے اس کا شکریہ ادا کیا اور ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ یہی کوئی پانچ سات منٹ گزرے ہوں گے، میں نے سامنے سے فرحی کو آتے دیکھا۔ اس کے پیچھے وہی رات والا وکیل تھا۔ فرحی نے آتے ہی مجھ سے پوچھا۔

"کیسی کٹی رات؟"

"تمہیں یاد کرتے ہوئے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ہنس دی، پھر نرمی سے بولی۔

"اچھا، میں ذرا انسپکٹر سے مل لوں، پھر آتی ہوں۔"

تقریباً پندرہ منٹ بعد وکیل اور فرحی میرے پاس آگئے۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے آتے ہی کہا۔

"چلو، اٹھو چلیں، میری بات ہوگئی ہے۔"

"فرحی، وہ جو تم رات کہہ رہی تھیں مجسٹریٹ......" میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ارے چلو، راستے میں بتاتی ہوں۔"

میں اس کے ساتھ چل دیا۔ باہر آکر اس نے ساتھ آئے وکیل کا شکریہ ادا کیا، پھر مجھے اپنے ساتھ بٹھا کر چل دی۔ بڑی سڑک پر آتے ہی بڑے ڈرامائی انداز میں بولی۔

"وہ جن لوگوں کو تم نے فائر مارے تھے نا، وہ رات ہی اسپتال سے غائب ہوگئے ہیں۔"

"غائب ہوگئے مطلب، ان سے تو چلا بھی نہیں جاتا ہوگا، انہیں تو ٹریٹمنٹ کی، خون کی ضرورت ہوگی، وہ کیسے جاسکتے ہیں؟" میں نے ایک دم سے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا تو وہ سمجھاتے ہوئے بولی۔

"پہلی بات تو یہ ہے تھانے میں صرف لڑائی کی رپورٹ درج ہوئی تھی، کیا ہوا، کیسے ہوا، اس کی ایف آئی آر نہیں ہوئی۔ دوسرا، اگر وہ غائب نہ ہوتے، تو یہ طے تھا کہ انہوں نے حملہ کیا، سامنے سے مزاحمت ہوئی اور ان کے فائر لگے، یہ حملہ تو ان کے گلے میں پڑ جانے والا تھا، سو...... انہوں نے بھاگ جانے ہی میں عافیت جانی۔"

"لیکن کیسے، وہ کیسے جاسکتے ہیں اکیلے۔ وہ......" میں نے پوچھنا چاہا تو وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"کیا یہ تمہارا پرابلم ہے، وہ کیسے گئے؟ یار آخر ان کے پیچھے بھی لوگ ہوں گے، جنہیں کوئی سمجھ بوجھ ہوگی، وہ انہیں اٹھا کر لے جاسکتے ہیں۔"

"میں وہی سوچ رہا ہوں، یہ کوئی اتفاقی معاملہ نہیں ہے۔ اب مجھے لگ رہا ہے کہ یہ صرف ذیشان بھائی والا معاملہ بھی نہیں، میرے خیال میں کوئی ایسا کھیل کھیلا جارہا ہے جس کا مجھے علم نہیں۔"

"اور نہ ہی تمہیں اندازہ ہوگا؟" یہ کہتے ہوئے اس نے لمحہ بھر کو سانس لی، پھر بولی۔ "دیکھو اسد...... یہ جو انہوں نے اسپتال سے بھاگ جانے والا معاملہ کیا ہے، یہ کوئی چھوٹی موٹی بات نہیں، اس سے دشمن کی ذہنیت کا پتا چلتا ہے۔ وہ کس سطح پر کیا سوچ رہے ہیں، اور وہ کیا کرسکتے ہیں، اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔"

"مثلاً کیا، کیا کہتی ہو تم؟" میں نے سمجھنے کے لیے پوچھا۔

"انہوں نے جب یہ محسوس کیا کہ اب بات نہیں بنے گی، اور اگر بنائی بھی گئی تو بھی سامنے آنا پڑے گا تو ایک دم سے منظر سے غائب ہوگئے، یہ ان کی مجرمانہ ذہنیت کو ظاہر کرتا ہے۔ صرف یہ چھوٹی موٹی لڑائی، دنگا یا فساد کرنے والوں کی ذہنیت نہیں ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ اب اگر وہ اسپتال میں رہتے تو ایف آئی آر میں رجسٹرڈ ہوجاتے، وجہ عناد کی تفتیش ہوتی، مطلب جیسے جیسے بات آگے بڑھتی، وہ لوگ بے نقاب ہوجاتے...... اگر وہ معمولی لڑائی جھگڑے والے ہوتے تو حالات یہ نہیں ہونے تھے، سمجھے کچھ؟"

"ہاں میں سمجھ گیا۔ اب مجھے بہت زیادہ محتاط ہونا پڑے گا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا تو کار میں خاموشی چھا گئی۔ فرحی مجھے جو سمجھانا چاہتی تھی وہ سمجھا چکی تھی۔ ہم باتیں کرتے ہوئے اس راہ پر آگئے جو شائستہ کے گھر کی طرف جاتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ ابھی وہ مجھے وہاں لے جانا چاہتی ہے۔ وہ مجھے اس کے گھر اتار کر چلی گئی۔

☆☆☆

اس وقت شائستہ آفس جانے کے لیے تیار تھی لیکن میری آمد پر رک گئی۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"لگتا ہے اسد تم کافی مشقت سے گزرے ہو؟"

"لڑائی بھڑائی میں اور ساری رات تھانے میں گزارنے کے بعد یہ حالت تو ہوتی ہے نا بندے کی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"پانی گرم کروں ٹکور شکور کے لیے۔" اس نے مزاح سے پوچھا۔

"مجھے چوٹیں نہیں لگیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔

"چلو پھر فریش ہوجاؤ، میں ناشتا بناتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ میرے کپڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہ کپڑے بھی خاصے گندے ہوگئے ہیں، خیر میں تمہیں کچھ کپڑے دیتی

ہوں۔ وہ نہا کر پہن لینا۔ یہ ابھی دھلوا دیتی ہوں۔"

میں فریش ہو کر کمرے میں آیا تو بیڈ پر ناشتا رکھا ہوا تھا۔ میں نے ناشتا کیا اور بیڈ پر لیٹ گیا۔ یہ بہت اچھا ہوا تھا کہ فرحی مجھے یہاں چھوڑ گئی تھی۔ میں ایک بھرپور نیند لینا چاہتا تھا۔ میں نجانے کب سو گیا۔ میری آنکھ کھلی تو فرحی میرے دائیں طرف بیڈ پر بیٹھی ہوئی فون میں مصروف تھی۔

"جاگ گئے۔" اس نے پیار سے کہا اور فون سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"بہت زبردست نیند آئی ہے۔" میں نے خمار آلود لہجے میں کہا تو اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ساری رات کے جاگے ہوئے تھے نا۔"

"تم کہاں چلی گئی تھیں۔" میں نے پوچھا۔

"مجھے پاپا کو بتانا تھا تمہارے بارے میں۔ پھر میں نے سوچا کہ تم آرام کرلو، میں نے شائستہ کو فون پر بتا دیا تھا۔" اس نے دھیمے سے بتایا۔

"فرحی تم نے میرے لیے بہت کچھ کیا۔ تھینک یو یار۔" میں نے کہا تو نجانے میرے لہجے میں اتنا پیار کہاں سے سمٹ آیا۔ بلاشبہ وہ میں نے پورے دل سے کہا تھا۔ میری بات سن کر وہ ذرا سا مسکرائی پھر میرے سینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"ابھی شکریہ کہا ہے نا، پھر نہیں کہنا۔ جتنا ہمارا تعلق ہے، اس میں تم یہ کہہ سکتے ہو؟"

"نہیں، مجھے نہیں کہنا چاہیے تھا۔" میں نے فوراً اعتراف کرلیا۔

"اسد...... وقت اپنے ساتھ کیسے حالات لاتا ہے، ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے، لیکن جو وقت ہماری دسترس میں ہے، جو ہمیں اچھے لگتے ہیں، اور وہ جو دل کو اچھے لگتے ہیں، ان کی قدر کرنا چاہیے۔ تم مجھے دل سے اچھے لگتے ہو۔" اس نے خمار آلود لہجے میں کہا تو میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے اپنا ہاتھ روکا اور دھیرے سے پیچھے کھینچتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم کوئی حد پار کر جائیں۔"

"میں نے بھی تو پیار سے......" میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے تیزی سے بولی۔

"نہ...... بالکل نہیں...... پیار کرنے کا حق صرف مجھے ہے، تمہیں نہیں...... یہ آج سے ذہن میں رکھ لو...... بس......"

اس نے کہا تو میں مسکرا دیا۔ اپنا ہاتھ میں نے ہٹایا تو وہ پھر سے میرے سینے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اس کے لمس میں کوئی جادوئی احساس تھا، مجھے سکون محسوس ہونے لگا۔

"ٹھیک ہے یہ حق صرف تمہارا ٹھہرا۔" میں نے ہولے سے کہا تو وہ میرے مزید قریب ہوتے ہوئے دھیمے سے بولی۔

"لوگ رومانس کے بارے میں جو بھی خیال کریں، جو بھی تھیوری رکھتے ہیں لیکن میرے نزدیک، جہاں جسم کی طلب ہو وہاں رومانس ختم ہو جاتا ہے۔ مجھے تم سے پیار ہے...... بس......"

میں آنکھیں موندے لیٹا رہا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کوئی ایسی لڑکی نہیں جسے اپنی کوئی 'غرض' ایسا کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ وہ بس اپنے پیار کا اظہار کر رہی تھی۔ میں کسی بھی قسم کی کوئی پیش رفت کرکے اپنے آپ کو اس کی نگاہوں سے گرانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کبھی میرے چہرے پر ہاتھ پھیرتی، کبھی سینے پر، کبھی گردن سہلاتی رہی۔ یہاں تک کہ میں سو گیا۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو وہ بھی میرے ساتھ پڑی سو رہی تھی۔ مجھے ایک انجانی سی خوشی محسوس ہوئی۔ اس کے اطمینان سے سونے کی وجہ میری ذات پر اس کا اعتماد تھا۔ میں کافی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ میرے دل میں اس کے لیے پہلی بار بڑے خوب صورت جذبات ابھر رہے تھے۔

سہ پہر کے وقت ہم تینوں نے لنچ لیا۔ شائستہ نے میرے کپڑے تیار کروا دیے تھے۔ میں نے کپڑے تبدیل کر لیے تھے۔ کچھ دیر بعد فرحی مجھے ہاسٹل کے گیٹ تک چھوڑ گئی۔

اگلے دو تین دن تک میں نے دیکھا، ہاسٹل کی فضا میں ایک عجیب قسم کی اجنبیت آ گئی تھی۔ پڑھاکو، شریف اور ایسے معاملات سے دور رہنے والے لڑکے، مجھ سے کنارہ کر گئے۔ کچھ محتاط ہو گئے، گروپ بازی کرنے والے، لڑائی فساد اور دنگا کرنے والے، مجھے کئی بار مل چکے تھے۔ دو دن میں ڈپارٹمنٹ بھی نہیں گیا پھر ایک شام میں واپس گاؤں چلا گیا۔

☆☆☆

گاؤں میں ہمارا بڑا گھر تھا۔ ایک طرف تایا جی نور محمد اور ان کا خاندان رہتا تھا، دوسری طرف میرے بابا دین محمد رہتے تھے۔ اگرچہ مکان دو تھے لیکن ہمارا صحن مشترکہ تھا۔ ایک بڑا سا لکڑی کا پھاٹک بھی مشترکہ استعمال میں تھا۔ میں اپنے والدین کا اکلوتا ہی تھا۔ جبکہ میرے تایازاد ارسلان اور ذیشان تھے۔ ان سے بڑی ایک بہن تھی جو خود بال بچوں والی تھی۔ ارسلان کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کی بیوی اور ہماری بھابی رضیہ دونوں گھروں کی ہی بہو تھی۔ میرے بابا اور تایا کی زمینداری بھی مشترکہ تھی۔ سارے کام اب ارسلان بھائی کی ذمے داری میں تھے۔ ہم بڑوں کے بعد اسی کو درجہ دیتے تھے۔ اس لیے میں نے گاؤں آتے ہی ارسلان بھائی سے ساری بات شیئر کی۔ وہ

کافی دیر تک سوچتے رہے پھر بولے۔
''میرے خیال میں وہ لڑکے کوئی مجرم نہیں تھے، وہ بزدل تھے ڈر گئے، اسی لیے کسی پھڈے میں پڑنے کے بجائے غائب ہوگئے۔''
''اکیلے کیسے جاسکتے تھے، وہ......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات قطع کرتے ہوئے تیزی سے بولے۔
''او میاں، تیری وکیل دوست نے تجھے زیادہ ہی ڈرا دیا ہے، یہ جو ایسے لڑکے ہوتے ہیں، ان کے یار بیلی بھی تو ہوتے ہیں نا، کیا تمہارے دوست نہیں ہیں؟ وہ لے گئے۔ لڑکوں کے لیے یہ کون سا مشکل کام ہوتا ہے۔''
''تو کیا میں بابا جی سے بات کروں؟'' میں نے پوچھا۔
''یار اتنی کون سی آفت آگئی ہے، ایسی کیا ضرورت ہے، وہ پریشان ہوں گے۔'' انہوں نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔
''یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے، انہیں اگر پتا چل گیا تو ناراض ہوں گے۔'' میں نے جتاتے ہوئے کہا۔
''دیکھ یار، ذیشان کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ حسد ہے، سراسر کمینگی، بدمعاشی کہہ لو۔ میں نے ذیشان سے کہا بھی تھا کہ اس بار میلے میں کبڈی میچ نہ کھیلو، نقصان ہوگا، نہیں مانا، اب پڑا ہے۔ وہ کوئی شوقے لڑکے ہوں گے، خیر ان کا بھی پتا چل جائے گا، وہ کون سا آسمان پر اُڑ گئے ہوں گے۔'' انہوں نے بڑے پیار سے سمجھایا۔
''ٹھیک ہے، لیکن مجھے دوبارہ ہاسٹل تو جانا ہے وہاں پھر......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ بولے۔
''اوئے یار، تمہارے دو ماہ تو رہ گئے ہیں امتحان میں، اِدھر رہو سکون سے، بس امتحان دے آنا۔ وہ اگر کوئی اتنے ہی پھنے خان ہوئے اور یہاں تک بھی آگئے تو دیکھ لیں گے۔'' ارسلان بھائی نے مجھے حوصلہ دیتے ہوئے کہا تو میں کافی حد تک مطمئن ہوگیا۔
میں نے طے کرلیا کہ اب امتحانوں تک یہیں گاؤں میں وقت گزارنا ہے۔ میں نے اپنا ایک معمول بنالیا اور دن گزرتے گئے۔
ان دنوں میرا فون کا استعمال کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا۔ روزانہ فرحی سے بات کرنا ہوتی تھی۔ ہاسٹل میں موجود دوستوں سے گپ شپ بھی لگاتا، کچھ علاقے کے دوستوں سے رابطہ رہتا۔ فرحی کا یہی کہنا تھا کہ میں سب کچھ بھول کر سکون سے گاؤں میں رہ کر امتحان کی تیاری کروں۔ اس نے کبھی بھی ملنے ملانے کی بات نہیں کی تھی، کیونکہ ہمارے درمیان کوئی ایسا عاشقی والا معاملہ ہی نہیں تھا۔ ہاسٹل کے کئی دوست باقاعدہ کلاسز لے رہے تھے۔ روز ہی کسی نہ کسی کا مطالبہ ہوتا کہ میں واپس ہاسٹل لوٹ آؤں۔ زیادہ اگر ہوتا تو دھمکی لگا دیتے کہ تمہاری پراکسی لگانا چھوڑ دیں گے۔ میں ان کی سنتا رہتا، انہیں کیا بتاتا۔ سو میں نے اپنی ساری توجہ کتابوں میں لگادی۔
ایک معمول تھا، صبح ناشتا وغیرہ کرکے میں کھیتوں میں موجود ڈیرے پر چلا جاتا۔ وہاں سب طرح کی سہولیات تھیں۔ ڈیرے سے باہر ٹیوب ویل لگا ہوا تھا، جب دل کرتا وہاں درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ جاتے۔ وہاں گاؤں کے سنگی ساتھی آجاتے، گپ شپ چلتی رہتی، گاؤں اور اردگرد کے علاقے کی جو خبر ہوتی وہ سب ملتی رہتی تھی۔ دوپہر تک واپس آجاتا، کھانا وغیرہ کھا کر ذیشان بھائی کے پاس چلا جاتا، ان کے ساتھ گپ شپ میں شام ہوجاتی، پھر رات گئے تک پڑھتا، یہی معمول تھا۔
ان دنوں میں اپنے ایک پرانے دوست ندیم عرف دیمے کو بہت یاد کیا کرتا تھا، کہیں نہ کہیں سے اس کا ذکر آ ہی جاتا۔ ہمارا بچپن ایک ساتھ گزرا تھا، وہ بڑا رازدار بندہ تھا۔ میٹرک سے زیادہ نہیں پڑھ سکا تھا، میں میٹرک کے بعد تھیال چلا گیا۔ پتا چلا کہ وہ لاہور کہیں چلا گیا ہے، بس عید شب رات گاؤں آتا تھا۔ پھر بھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وقت اور حالات انسان کو کہیں کا کہیں لے جاتے ہیں۔ انہی دنوں ہمارے بچپن کا دوست خالد بھی دبئی سے آگیا۔ اس نے بھی پانچ سات جماعتیں پڑھی تھیں، پھر ویلڈنگ کا کام سیکھ کر دبئی چلا گیا، وہاں اب وہ ٹھیکیدار تھا، خوب پیسہ بنا رہا تھا۔ جب میں نے اسے آخری بار دیکھا تھا، وہ پتلا سا تھا، لمبا قد اور سانولے رنگ کا عام سے نین نقش، اب جب اسے دیکھا تو اس کے بدن پر کافی چربی چڑھ آئی تھی، سر سے تھوڑا گنجا بھی ہوگیا تھا، چہرے پر داڑھی مونچھیں، جس سے اس کی رنگت بڑی بھلی لگتی تھی۔ وہ آیا تو ڈیرے پر محفلوں کا رنگ ہی بدل گیا۔ یہاں تک کہ دوپہر کا کھانا بھی وہیں پکنے لگا۔ گاؤں کے کئی یار بیلی وہیں اکٹھا ہوجاتے۔ یوں بڑے اچھے دن گزر رہے تھے۔

☆☆☆

اس دن سہ پہر خالد اور میں ذیشان بھائی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کچھ بے چینی محسوس کررہا تھا۔ کافی دیر تک میں اسی انتظار میں رہا کہ وہ کچھ بتائے، پھر میں نے خود ہی پوچھ لیا۔
''بھائی، خیریت ہے نا، کافی بے چینی محسوس کررہے ہو؟''
''یار، دو دن پہلے تک تو سب ٹھیک تھا، یہ کل سے ران

میں کافی تکلیف ہے۔'' انہوں نے بتایا۔
''تو ڈاکٹر کو دکھا دیتے ہیں۔'' خالد نے جھٹ سے کہا۔
''اس کے لیے تو پھر بہاول پور جانا پڑے گا نا۔'' بھائی نے کافی حد تک پراگندہ لہجے میں کہا۔
''بھائی زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے لگ جائیں گے۔ آپ تیاری پکڑیں، میں ڈاکٹر سے بات کرتا ہوں۔'' میں نے اپنی جیب سے فون نکالتے ہوئے کہا تو انہوں نے سر کے اشارے سے عندیہ دے دیا۔ میں نے ڈاکٹر سے بات کی تو انہوں نے صبح کا وقت دے دیا۔
اگلی صبح ہم بہاول پور کے لیے نکل پڑے۔ راستے میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ فرحی کو بھی بتا دیا کہ میں بہاول پور آرہا ہوں۔ ہم نے ڈاکٹر کو چیک کروایا۔ ایکسرے بھی ... ہوئے۔ بارہ بجے کے قریب ہم وہاں سے فارغ ہو گئے۔ اس دوران فرحی وہیں آگئی تھی۔ اس نے کھانے کی آفر کی، لیکن دوست ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ اس لیے تھوڑی ٹھہر کر وہ چلی گئی اور ہم ہاسٹل آگئے۔ کافی دیر وہاں گپ شپ لگائی، کھانا کھایا اور واپس گاؤں کے لیے چل دیے۔
ابھی ہم بہاول پور سے نکلے ہی تھے کہ مجھے گاؤں سے ہی ایک دوست کی کال آگئی۔
''اوئے...... اپنا میاں امین قتل ہو گیا ہے۔''
''وہ کیسے کس نے قتل کیا؟'' میں نے پوچھا تو اس نے تفصیل بتائی۔
ہمارے گاؤں سے چند ایکڑ دور ایک نہر بہتی تھی۔ یہیں سے سارے کسانوں کو فصلوں کے لیے پانی ملتا تھا۔ اسی نہر پر موجود ایک 'موگھے' کا تنازعہ کافی عرصے سے دو فریقین کے درمیان چل رہا تھا۔ ایک طرف ہمارے گاؤں کے لوگ تھے اور دوسری جانب پنڈ شاہ پور والے۔ میاں امین اس تنازعے میں سب سے بڑا فریق تھا۔ اس کی فصلوں کا پانی کم ہو جاتا تھا۔ اس کا موقف درست تھا، اس لیے اس کے حق میں فیصلہ ہو گیا تھا۔ صبح کے وقت وہاں 'موگھے' پر پانی باندھنے کے لیے کچھ لوگوں کے ہمراہ میاں امین گیا تو دوسری پارٹی بھی آگئی۔ ان کے درمیان تلخ کلامی ہوئی۔ دونوں طرف سے کافی لوگ تھے۔ وہاں جھگڑا ہوا اور میاں امین قتل ہو گیا۔ یہ بڑی افسوس ناک خبر تھی۔ ہم تینوں تبصرہ کرتے ہوئے گاؤں جا پہنچے۔ واپسی میں ہمیں شام ہو چکی تھی۔
خالد اور میں نے ذیشان بھائی کو ان کے کمرے میں لٹایا۔ ہمارے بیٹھتے ہی بھابی نے چائے بھجوادی۔ ہم نے سوچا کہ چائے پی کر ہی میاں امین کے گھر کی طرف جاتے ہیں۔
وہاں پتا نہیں کتنا وقت لگ جاتا۔ ہم اس وقت چائے پی رہے تھے کہ ملازمہ نے بتایا کہ باہر کچھ پولیس والے آئے ہیں۔ اس وقت ارسلان بھائی گھر پر نہیں تھے۔ میں نے سوچا کہ پولیس اہلکار یہاں ڈیوٹی کے دوران بھوکے ہوں گے یا انہیں کسی شے کی طلب ہو گی۔ انہوں نے میّت والے گھر سے مانگنے کے بجائے، ہمارے ہاں آجانا مناسب سمجھا۔ میں نے ادھورا کپ وہیں چھوڑا اور اٹھ گیا۔ میں پھاٹک کھول کر باہر آیا ہی تھا کہ ایک اے ایس آئی آگے بڑھا، اس نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔
''اوئے، اسد منیر تیرا ہی نام ہے؟''
مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا، تبھی میں نے حیرانی سے پوچھا۔
''نام تو میرا ہی ہے مگر تم اتنی بدتمیزی سے کیوں پوچھ رہے ہو؟''
لفظ میرے منہ ہی میں تھے کہ میرے دائیں بائیں سے پولیس مین آگے بڑھے، انہوں نے مجھے کالر سے پکڑا اور دھکا دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی کئی طرف سے مجھ پر تھپڑوں، گھونسوں کی بارش ہو گئی۔ میں سمجھ ہی نہیں پایا کہ یہ ہوا کیا ہے، مجھے اس وقت ہوش آیا جب انہوں نے کسی بوری کی طرح مجھے اپنی پولیس وین میں ڈال لیا۔ اگلے ہی لمحے وین جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔
وین تھانے کے اندر آچکی تو انہوں نے مجھے اتارا۔ سارے راستے جو سوال میرے دماغ میں گھوم رہا تھا، بے ساختہ وہی سوال ان سے پوچھا۔
''اوہ بھائی، مجھے یوں کیوں پکڑ کر لائے ہو؟ وجہ کیا ہے؟''
میرے سوال کا کسی نے جواب نہیں دیا اور مجھے سیدھا انسپکٹر کے کمرے میں لے گئے۔ انسپکٹر رمضان سامنے بیٹھا ہوا تھا، وہ چند لمحوں تک مجھے دیکھتا رہا، پھر اپنی پتلون ٹھیک کرتا ہوا اٹھا، میرے پاس آیا اور اگلے ہی لمحے ایک زناٹے دار تھپڑ میرے منہ پر جڑ دیا۔ تذلیل کا احساس میرے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ مجھے یہ سوچنے کی فرصت ہی نہ ملی، اس نے دوسرا تھپڑ مار دیا، پھر ایک ہی سانس میں کئی گالیاں بک دیں۔ میرے کان سنسنا اٹھے۔ مجھے ان تھپڑوں کی تکلیف تو بھول گئی لیکن ان گالیوں کی تذلیل بھری اذیت نے مجھے اپنی ہی نگاہوں میں گرا دیا۔ وہ حقارت سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔
''تم تو پڑھے لکھے لگتے ہو، تم نے بھی ان لڑائی جھگڑوں

میں پڑ کے بندہ ہی قتل کر دیا، بڑی بات ہے یار۔"

اس کا اتنا ہی کہنا تھا کہ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ یہ کیا کہہ دیا اس نے؟ یہاں تو بکری چوری کے کیس میں بندے کو ذلیل کر دیا جاتا ہے، یہ تو پھر قتل کیس تھا۔ کہتے ہیں کہ تین سو دو کسی درخت پر لکھ دیں تو وہ سوکھ جاتا ہے۔ یہ میرے ساتھ کیا ہوا؟ کس نے پھنسا دیا مجھے؟ میرے حواس بحال ہوئے تو میں سمجھ گیا کہ مجھے جان بوجھ کر سازش کے تحت پھنسایا جا رہا ہے۔ چند لمحوں کے لیے تو میرے دماغ نے کام کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں نے حوصلہ پکڑا، خود پر قابو پایا اور دبے دبے غصے میں پوچھا۔

"یہ کس نے کہا آپ سے؟"

"بتا دیں گے تجھے، چل......" اس نے اچانک سختی سے کہا اور مجھے کندھے سے پکڑ کر دھکا دے دیا۔ تبھی وہاں موجود پولیس والے مجھے دھکے دیتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے اور سامنے موجود حوالات میں بند کر دیا۔ جہاں کچھ دوسرے لوگ بھی پڑے ہوئے تھے۔

تذلیل کے احساس سے میرا دماغ ٹھکانے پر نہیں تھا۔ میاں امین تو میرے گاؤں کا تھا، ایک طرح سے ہمارا ہی آدمی تھا۔ اول تو میں وہاں پر تھا ہی نہیں، اگر ہوتا بھی تو میاں امین کو بچانے کی کوشش کرتا۔ یہ سب کیسے ہو گیا؟ مجھے ہی پکڑ کر بند کر دیا، مجھ پر ہی الزام لگا دیا گیا؟

"اوئے، ابھی سے گھبرا گیا ہے، ابھی تو اس قتل کو لمبا چلنا ہے۔" ایک شخص نے میری طرف دیکھ کر طنزیہ انداز میں کہا تو میں اسے پہچان گیا۔ اس کا تعلق پنڈ شاہ پور ہی سے تھا۔ تبھی میں نے سکون سے کہا۔

"میں گھبرایا نہیں، اس بے غیرتی پر حیران ہوں، جو مجھے لا کر یہاں بند کر دیا گیا ہے۔"

اس پر وہاں موجود دو تین لوگوں نے قہقہہ لگا دیا، پھر اسی نے کہا۔ "دیکھ لے پھر...... ایسا بھی ہو جاتا ہے۔"

"صبح دیکھنا، تمہارے ساتھ ہوتا کیا ہے، جب تمہارا ریمانڈ ملا، کہانی تو پھر شروع ہونی ہے۔" دوسرے نے کہا اور قہقہہ لگا دیا۔

"یہ جال ہے جال، جو اس میں ایک بار پھنس گیا، وہ نہیں نکلتا۔" اس نے عجیب لہجے میں کہا جس کی مجھے سمجھ نہیں آئی۔ میں نے اس پر اس لیے بھی دھیان نہیں دیا کہ مجھے سلاخوں کے پار خالد اور ارسلان بھائی دکھائی دیے۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ میری جانب آئے۔ بھائی نے سکون سے کہا۔

"اسد تم فکر نہ کرنا، میں نے ساری بات سن لی ہے۔"

"یہ سازش ہے۔" میں نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"میں جانتا ہوں۔ فکر نہیں کرو، میں دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اندر کی طرف چلے گئے۔ میرے سامنے خالد تھا، میں نے اس نے کہا۔

"یار میرا فون گھر رہ گیا ہے، اس میں فرحی کا نمبر ہو گا، اسے کال کر کے بتا دو، سب کچھ......"

"میں نے بتا دیا ہے۔" اس نے دھیمے سے کہا۔

میں رات بھر حوالات میں دوہری اذیت سے گزرتا رہا۔ میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اس سوال کی اذیت جس کا جواب میرے پاس نہیں تھا، دوسرا میرے ساتھی قیدی تھوڑی دیر بعد کوئی نہ کوئی جملہ اچھال دیتے تھے، جس سے مجھے دماغی ٹیس محسوس ہوتی تھی۔ رات گئے جب دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے میری آنکھ لگی تو مجھے جگا دیا گیا۔ یہ ایک الگ طرح کی اذیت تھی۔

دن چڑھ آیا تھا۔ فرحی کی راہ تکتے میری آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ وہ ابھی تک پہنچی نہیں تھی۔ حوالاتیوں کو عدالت لے جانے کے لیے گاڑی تیار تھی۔ نجانے کیوں دیر کر رہے تھے۔ پھر حوالات کا دروازہ کھلا اور ہمیں ہانک کر گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔

ہمیں مجسٹریٹ کی عدالت کے باہر بٹھا دیا گیا۔ سب سے پہلے مجھے خالد دکھائی دیا، وہ پریشانی میں کچھ کاغذ اٹھائے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا مجھ تک آ پہنچا، اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے بات کرتا ایک سنتری نے ڈانٹ کر کہا۔

"اوئے، قریب نہیں آنا۔"

"اُو یار، مجھے ان کاغذات پر دستخط لینے ہیں۔" خالد نے غصے میں کہا۔

"صاحب اجازت دیں گے تو......" اس نے کہنا چاہا تو میں بولا۔

"اوئے آنے دے، تیرا خرچہ چل جائے گا۔"

اس سنتری نے میری طرف دیکھا، میں نے جیب سے دو نوٹ نکالے اور اس کی مٹھی میں دے دیے۔ خالد نے مجھ سے دستخط کروائے تو میں نے پوچھا۔

"فرحی کا کوئی فون آیا؟"

"وہ خود آ رہی ہے۔ یہ سب کچھ اس نے مجھے کرنے کو کہا ہے۔"

"اوکے، ٹھیک ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا تو وہ واپس چلا گیا اور لان میں سکون سے بیٹھ گیا۔

آدھا گھنٹا بھی نہیں گزرا تھا، مجسٹریٹ کی عدالت کے

باہر ایک سیاہ رنگ کی مہنگی کار آکر رکی۔ اس کی پچھلی نشست سے پہلے فرحی اور پھر اس کے پاپا چوہدری ظفر باہر آگئے۔ اگلی نشست سے ایک وکیل باہر نکلا۔ فرحی میری طرف بڑھی اور وہ دونوں برآمدے میں جا کھڑے ہوئے۔ فرحی نے میرے قریب آکر مزاحیہ انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''سوہنیو...... پھر پھنس گئے ہو؟''

''اب میں کیا بتاؤں، یہ تمہیں بھی معلوم ہے کہ میں......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ بولی۔

''فکر نہ کرو، میں اتنا کچھ لے آئی ہوں، جو کافی سے بھی زیادہ ہے۔ ابھی بلاوا آجاتا ہے۔ یہاں سے فارغ ہو کر ملتے ہیں۔'' اس نے کہا اور عدالت کی طرف چل دی۔ سامنے چوہدری ظفر اور وکیل نہیں تھے۔ دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ ہماری طلبی ہوگئی۔

جیسے ہی ہم کٹہرے میں آئے، کارروائی شروع ہوگئی۔ پولیس کی طرف سے مجھ پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ میں نے لوہے کی راڈ میاں امین کے سر پر ماری تھی۔ جس میں عینی شاہدین نے مجھے یہ راڈ مارتے ہوئے دیکھا تھا۔

کہتے ہیں کہ جھوٹوں کے دیس میں سچ کہنے والے کو جھٹلایا جاتا ہے، لیکن جھوٹوں کو انہی کے جھوٹ سے جھٹلایا جانا بھی ایک سچائی ہے۔ میری طرف سے پہلی دلیل یہی دی گئی کہ میں موقع پر تھا ہی نہیں، میں کلاس روم میں تھا، وہاں میری حاضری لگی ہوئی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بحث کے بعد چوہدری ظفر یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ پولیس نے سراسر غلط کیا، ملزم وہاں تھا ہی نہیں۔ لہٰذا یہ گرفتاری بالکل ناجائز ہے، پولیس نے دھوکے میں یا بھول کر میرے موکل کو گرفتار کیا ہے، اس لیے ریمانڈ اور ضمانت تو ایک طرف میرے موکل کو فوری طور پر رہا کیا جائے۔ چونکہ میں ایف آئی آر میں نامزد تھا، اس لیے ریمانڈ تو نہیں دیا، ضمانت پر رہائی دے دی جس کی کاغذی کارروائی کرنا تھی۔

☆☆☆

پورا ایک ہفتہ اسی کشمکش میں گزر گیا۔ میرے خاندان میں پہلی بار ان واقعات کو سنجیدگی سے لیا گیا۔ ارسلان بھائی بھی سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ آخر یہ ہو کیا رہا ہے۔ ایسا تو ہوتا ہی نہیں کہ قتل بھی ہمارے بندے کا ہو اور اس میں نام بھی میرا آجائے۔ یہ تو طے تھا کہ ذیشان بھائی کی ٹانگ کھیل میں اتفاقاً نہیں ٹوٹی، اسے جان بوجھ کر توڑا گیا تھا، اس میں ملوث لوگ بھی سامنے آچکے تھے۔ ان کے بارے میں کوئی لائحہ عمل سوچنے کا فیصلہ کرلیا گیا تھا۔ کوئی کیسے وار کر جائے اور پھر وہ

ہمارے سامنے دندناتا ہوا پھرتا رہے۔ لیکن میاں امین والی اُفتاد نے سب کچھ بھلا کر رکھ دیا تھا۔ میاں امین کے گھر والوں نے ظفر چوہدری ہی کو اپنا وکیل رکھ لیا تھا۔ میرے بابا نے خاموشی سے ان کی کافی مالی مدد کردی تھی۔ تاکہ مقدمہ درست انداز میں لڑا جا سکے۔

ایک رات میں فرحی سے بات کر رہا تھا۔ تب میں نے یہ خیال ظاہر کیا تو وہ انتہائی سنجیدگی سے بولی۔

''اسد...... منافق اور سازشی یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ اُس کی منافقت یا سازش کا پتا نہیں چلے گا لیکن پتا چل جاتا ہے۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''ظاہر ہے منافقت اور سازش کسی حلال جسم میں تو پرورش نہیں پاتیں، اس لیے ان بدبودار لوگوں کی طرح یہ بھی بدبودار چیزیں ہوتی ہیں، جلد یا بدیر ان کا پتا چل جاتا ہے۔'' اس نے سکون سے کہا۔

''اگر یہ پتا چل جائے نا تو......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''پتا کرنا پڑتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''اوئے، بات سن، یونیورسٹی کے معاملات تک میں سمجھ رہی تھی کہ یہ سب اتفاق ہو سکتا ہے۔ یہاں یونیورسٹی میں سو دنگے فساد ہوتے ہیں۔ لیکن نہیں...... تمہارے والا یہ معاملہ کچھ دوسرا ہی ہے۔ کوئی طاقت ور بندہ اس کے پیچھے ہے، ورنہ عام طور پر پولیس اتنا بڑا رسک نہیں لیتی، اور نہ ہی اس حد تک جاتی ہے کہ پارٹی بن جائے۔'' اس نے سمجھاتے ہوئے کہا تو میں نے پوچھا۔

''میرا کسی طاقتور بندے سے کیا لینا دینا، جو مجھ پر پولیس چڑھ دوڑی۔''

''یہ تو مجھے پتا نہیں لیکن...... پولیس کے پاس بہت زیادہ اختیار ہے، اور یہاں قانون موم کی ناک بنا ہوا ہے۔ اسے ہی تو جنگل کا قانون کہتے ہیں، جہاں صرف طاقت ور کی حکمرانی ہوتی ہے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو فرحی، یہ جنگل کا قانون ہی تو ہے۔'' میں نے اس سے پوری طرح اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

''بس اسے سمجھو، غور کرو......'' یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے رکی پھر کہتی چلی گئی۔ ''میں نہیں کہتی تم محتاط رہو، کیونکہ اگر نہیں رہو گے تو مارے جاؤ گے۔ میں صرف اتنا کہوں گی، تم کو خوف زدہ نہیں ہونا، کیونکہ خوف اعصاب کو توڑ کر رکھ دیتا ہے۔''

''میں یہ سب کچھ نہیں چاہتا، تمہیں بھی پتا ہے یہ سب مجھ

پر مسلط کیا جارہا ہے۔" میں نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا تو وہ بولی۔

"ممکن ہے تمہیں کسی دوسرے ٹریک پر لے جارہا ہو۔"

"مجھے دوسرے ٹریک پر......؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ظاہر ہے تم مزاحمت کرو گے۔ کم از کم اپنا بچاؤ تو کرو گے نا، تمہاری سیدھی سادی زندگی کا ٹریک تو بدل ہی جائے گا نا اس لیے اپنا دھیان رکھو، اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھو۔"

"وہ تو اب کھل گئے ہیں، میرے خاندان والے، ہمارے بہی خواہ، سب پریشان ہیں۔" میں نے بتایا۔

"مگر تمہیں خوف زدہ نہیں ہونا۔ تم نے امتحان دینا ہے، اور پاس بھی ہونا ہے۔" اس نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا تو میں ممنونیت سے بولا۔

او۔کے......میں سمجھ گیا۔"

"اپنے دشمن کی طرف سے کبھی غافل مت ہونا، پوری خبر رکھنا، سمجھو تم آدھی جنگ جیت گئے۔" اس نے کہا تو اس کے ساتھ ہی ہماری باتوں کا رخ بدل گیا۔

مجھے ہمیشہ پنڈ شاہ پور والوں کے بارے میں جاننے کی دلچسپی رہتی تھی۔ خاص طور پر ان لوگوں کے بارے جنہوں نے ذیشان بھائی پر ظلم کیا تھا۔ ایک دن ایسی ہی اطلاع سامنے آئی تھی کہ جس لڑکے نے ذیشان بھائی کی ٹانگ پر چڑھ کر زور لگایا تھا، اس کی شادی ہو رہی تھی۔ یہ شادی اس کی کزن کے ساتھ اسی گاؤں میں تھی۔ جس طرح دوسری خبریں سنی تھیں، میں نے وہ خبر بھی سن لی تھی۔ مجھے نہیں احساس تھا کہ یہ خبر بعد میں میری زندگی میں کس قدر اہم ثابت ہونے والی تھی۔ نجانے کیوں میں یہ خبر سن کر بے چین ہو گیا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ بالکل شادی والے دن جب وہ دولہا بنا ہوا ہو تو اسے داغی کر دوں۔

میں شاید اتنا نہ سوچتا، لیکن اگلی ہی صبح جب میں ڈیرے پر گیا تو خالد کے ساتھ ہمارا پرانا سنگی ندیم عرف دیما بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر ایک خوشگوار حیرت ہوئی۔ وہ کم از کم سات آٹھ برس بعد مل رہا تھا۔ وہ درمیانے قد کا، عام سائز کا تھا۔ پہلی نگاہ میں اس کا سڈول بدن بتا رہا تھا کہ وہ کسرت کا عادی ہے۔ کیونکہ میں بھی جم جاتا تھا، مجھے پتا چل گیا تھا، اس کا رنگ کافی صاف ہو گیا تھا، کلین شو، خوب صورت ہیئر اسٹائل، پہلی نگاہ میں لگتا تھا جیسے کوئی کاروباری آدمی ہو۔ وہ بڑی گرم جوشی سے گلے ملا۔ کچھ دیر حال احوال کے بعد میں نے پوچھا۔

"تمہارا تو فون نمبر ہی نہیں مل رہا تھا، میں نے اور خالد نے کئی بار کوشش کی، ہر بار بند جا رہا ہوتا تھا تمہارا فون۔"

"او یار بس اسے مجبوری ہی سمجھو، کئی نمبر آئے اور کئی گئے، جس پر تم کال کر رہے تھے، وہ پرانا نمبر اب نجانے کہاں ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں نے پوچھا۔

"کیا مطلب؟ بندے کے پاس ایک نمبر......"

"چھوڑو یار، تم میرے بارے میں نہیں جانتے۔ میرا کام ہی کچھ ایسا ہے، اس میں یہ سب کرنا پڑتا ہے۔" ندیم نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر ایک دم بات بدلتے ہوئے بولا۔ "یہ بھی میں نے کل گھر فون کیا تو پتا چلا کہ میاں امین قتل ہو گیا، اور الزام تم پر لگا ہے، ذیشان بھائی کے ساتھ کیا ہوا، خالد بھی آیا تو بس مجھ سے رہا نہیں گیا، میں رات آ گیا، یہ سب ہوا کیا ہے؟"

"وہ تمہیں تفصیل سے معلوم ہو جائے گا، لیکن تم یہ بتاؤ، وہاں کرتے کیا ہو؟" خالد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا تو وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

"کوئی سیدھا کام نہیں کرتے، سمجھو عوام کو لوٹتے ہیں۔"

"یہ دھندا تم نے کب سے شروع کر دیا؟" خالد نے پوچھا تو وہ چند لمحے خاموش رہا، اس کے چہرے پر حزن و ملال کی کیفیت اتر آئی تھی، پھر اس نے ایک طویل سانس لی اور کہتا چلا گیا۔

"جب سے مجھے اپنی بھوک کا احساس ہوا۔ جب سے مجھے یہ پتا چلا کہ میں لاکھ کوشش کر لوں، زمین پر کیڑا بن کر ہی جیوں گا، کبھی مجھے انسان نہیں سمجھا جائے گا، میری غربت مجھے بزدل اور کمزور ہی نہیں، بے غیرت بھی بنا دے گی۔ دیکھو اپنے اردگرد، کتنے لوگ اپنے دل میں حسرتیں ہی نہیں کینہ بھی رکھے ہوئے ہیں، ان کا بس نہیں چلتا، ورنہ ظالموں کے خلاف پھٹ پڑیں، میں غربت سے نہیں بے غیرتی سے نکلنا چاہتا تھا۔"

"اس کا مطلب یہ تو نہیں تم غیر قانونی کام......" خالد نے کہنا چاہا تو وہ ایک دم پھٹتے ہوئے بولا۔

"بکواس نہیں کرو، تم تو دبئی میں تھے، اچھا کماتے تھے، جب میں اور میری ماں اسپتالوں میں ذلیل و خوار ہوتے رہے، میری ماں میرے ہاتھوں میں سسک سسک کر مر گئی، کس نے میرا ساتھ دیا، تم نے، اس نے، کسی نے نہیں، اکیلے میں نے بھگتا سب کچھ......تم نصیحت کرتے ہو مجھے۔"

"تم سچ کہتے ہو یار......ہم تیرے گنہ گار ہیں، ہم تم سے معافی مانگتے ہیں۔" خالد نے بلا جھجک اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے، پھر اس کے پیروں پر ہاتھ رکھ کر بولا، "میرا یقین کر دیے...... مجھے بالکل پتا نہیں تھا، تمہارے ساتھ کیا بیت رہی

ہے۔ مجھے تو چھ ماہ بعد پتا چلا جب تم یہاں نہیں تھے۔''

''وقت گزر جاتا ہے میری جان، مگر وقت کے لگائے ہوئے زخم ساری زندگی تازہ رہتے ہیں۔'' ندیم نے دکھ بھرے لہجے میں کہا

''یہ تم ٹھیک کہتے ہو، ہم دونوں تو خیر اب بھی غریب ہیں، یہ اسد پھر چوہدری ہے، زمینداروں کا بیٹا ہے، اسے تو......'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''میں میٹرک کے بعد اپنے ننھیال چلا گیا تھا، چار سال بعد واپس آیا ہوں تو یونیورسٹی چلا گیا۔ یہ ممکن نہیں کہ مجھے پتا چلے اور میں کچھ نہ کروں، پوچھو، اس سے، یہ کبھی مجھے ملا ہی نہیں۔''

''اچھا چھوڑ، یہ بتا یہ سارا چکر ہے کیا؟'' ندیم نے پوچھا تو اسے میں نے اختصار کے ساتھ ...... ساری بات بتا دی۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا، پھر بڑے پُرسکون لہجے میں بولا۔

''یہ سارا چکر کس کا ہے، اس کے بارے پتا کرنا کوئی مشکل تو نہیں۔''

''کیا کہہ رہے ہو، کیسے؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''یار سامنے کی بات ہے، پولیس نے تمہارا نام ڈالا ایف آئی آر میں، ظاہر ہے جس نے یہ نام ڈلوایا، اسے تو انسپکٹر جانتا ہے نا؟ اب یہ تو ممکن نہیں کوئی سامنے بھی نہ آیا ہو اور نام ڈال دیا۔''

''اوئے تیری خیر۔'' خالد کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''پھر جب بندہ سامنا آگیا تو پتا چل جائے گا کہ اُسے کیا تکلیف ہے۔'' دیپے نے آرام سے کہا۔

''بات تو پھر وہیں آگئی نا، بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا، اب اس انسپکٹر سے کون پوچھے، وہ کیوں بتائے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کے لیے دو ہی باتیں ہیں میری جان...... یا تو تم اتنے طاقت ور ہو کہ اس انسپکٹر کے منہ میں ہاتھ ڈال کر وہ نام نکلوالو، یا چپ چاپ ظلم سہتے رہو، کبھی تو وہ سامنے ہی آجائے گا۔'' اس نے کافی حد تک طنزیہ انداز میں کہا۔

''تم طاقت کسے کہہ رہے ہو؟ اب میں جا کر اس کے گریبان پر ہاتھ تو نہیں ڈال سکتا۔'' میں نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا تو وہ بولا۔

''یہ بات،...... یہ بات جو تم کہہ رہے ہو، اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالنا پڑے گا، یہی وہ طاقت ہے جو حوصلے کے بغیر نہیں آتی۔ پیسہ بھی یہ طاقت نہیں دیتا، جو پیسہ خرچ کر کے کام لیتا ہے، اس میں ایسی طاقت نہیں ہوتی۔۔ اس کا گریبان پکڑو، حلق میں ہاتھ ڈالو اور نام نکال لو۔''

''سوچنے کی حد تک تو یہ بات بالکل ٹھیک ہے لیکن اس پر عمل کرنا، کم از کم اسد کے بس کی بات نہیں، یہ سیدھا سیدھا جرم ہے۔'' خالد نے سمجھاتے ہوئے کہا تو ندیم بولا۔

''اور وہ تم لوگوں کے ساتھ قانون برت رہا ہے۔ ہاں بالکل، وہ جو کچھ کر رہا ہے ٹھیک کر رہا ہے اور تم لوگوں کے ساتھ ہونا بھی چاہیے۔ آخر تم لوگ ظلم سہنے کے جو عادی ہو چکے ہو، وہ ماریں پیٹیں، ذلیل کریں، لیکن تم لوگوں کی غیرت کبھی نہیں جاگے گی۔ کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو......''

''چل مان لیا، میں اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال لوں گا، لیکن پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ وہ ردِعمل جانتے ہو تم؟'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''یہ جو دو اور دو چار کرتے ہیں نا، یہ کچھ نہیں کر سکتے، چھوڑو اس بات کو...... جو ہو رہا ہے، اسے ہونے دو۔'' ندیم نے اکتاتے ہوئے کہا۔

''یار ہمیں میاں امین کے گھر والوں کا ساتھ دینا چاہیے۔ ان لوگوں نے تو ہمارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی؟'' خالد نے صلاح دیتے ہوئے کہا۔

''یار تم جانو، اور تمہارے کام، میں ایک دو دن ہوں یہاں پر، پھر مجھے چلے جانا ہے۔ پھر نجانے زندگی میں ملاقات ہو یا نہ ہو۔ میرے اپنے کافی پھڈے ہیں، میں کسی نئے معاملے میں کیوں پھنسوں۔'' اس نے انتہائی اجنبیت سے کہا اور دور سے کھیتوں کی پگڈنڈی پر گاؤں کے کچھ دوستوں کو آتا دیکھ کر بات بدل دی۔ ہم دوپہر تک وہیں بیٹھے رہے، پھر میں انہیں اپنے گھر لے آیا۔ وہاں کھانا وغیرہ کھا کر وہ لوگ چلے گئے۔

میرے دماغ سے ندیم کی بات نہیں نکل رہی تھی۔ انسپکٹر نے جو میری تذلیل کی تھی، وہ میرے دماغ کو کب سے سلگا رہی تھی۔ مجھے یہی ایک طریقہ سمجھ میں آرہا تھا۔ میرے دماغ میں یہی آرہا تھا کہ بھلے نام پتا چلے یا نہ چلے مگر اس سے بدلہ تو مجھے لینا ہے۔ وہ کوئی لوہے کا تو نہیں بنا ہوا، وہ بھی تو گوشت پوست کا انسان ہے، اسے بھی دکھ ہوتا ہوگا۔

☆☆☆

اسی شام جب میں فریش ہو کر ذیشان بھائی کے پاس گیا تو مجھے اچانک اپنے کمرے میں پا کر چونک گیا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے جلدی سے آنسو صاف کرنے کے ساتھ مجھ سے چھپانے کی کوشش کی تو مجھے بڑا عجیب سا لگا۔ میں ایک دم سے تڑپ گیا، نجانے کون سا ایسا دکھ ہے، جو

وہ اپنے سینے میں سمائے بیٹھا ہے۔ میں اُس کے بیڈ پر جا بیٹھا اور حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا بات ہے بھائی، اتنا پریشان کیوں ہو؟''

''کچھ نہیں یار، بس ایویں......'' اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کچھ تو ہے، ٹانگ درد کر رہی ہے یا کوئی...'' میں نے پوچھنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''اونہیں یار......بس چھوڑ، جا اماں سے جا کر چائے کے لیے کہہ آ۔''

''بھائی، تم نے اتنا بڑا زخم جھیلا، لیکن نہیں روئے۔ یہ جو تمہارا رونا ہے نا، یہ مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے، بول بات کیا ہے؟'' میں بضد ہو گیا۔

''اسد کوئی بات نہیں ہے، بس یوں بستر پر پڑا ہوں نا، اسی لیے اپنی بے بسی پر دکھ ہو رہا ہے۔'' اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''دیکھو بھائی، میں بچپن سے تمہیں دیکھ رہا ہوں، تم نے آج تک اتنی بے بسی محسوس نہیں کی، میں نے کبھی تمہیں روتے ہوئے نہیں دیکھا، پھر آج کیوں؟'' میرے لہجے میں احتجاج تھا۔ پہلی بار وہ تلخی سے بولا۔

''یار تم چھوڑو اور جاؤ اپنا کام کرو، مجھے میرے حال پر چھوڑ دو نا۔''

''نہیں بھائی، ایسے نہیں، چلو یہ تو مانو، کوئی بات تو ہے نا؟'' میں نے بڑے مان سے پوچھا تو اس نے آنکھیں بھر کر میری طرف دیکھا اور پھر سمجھانے والے لہجے میں بولے۔

''دیکھ یار، کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں، انہیں بتایا نہیں جا سکتا۔ بلکہ اپنی یادوں سے بھی کھرچ کر پھینک دینا چاہیے ایسی باتوں کو۔''

''مجھے بتاؤ، جو بھی آپ کے دل میں ہے بتائیں، پلیز......'' میں نے منت ریز لہجے میں کہا۔

''اسد یار تم ضد کر رہے ہو۔ میں مانتا ہوں میرے دل میں بات ہے لیکن اس کی حیثیت اس پانی کی طرح ہے جو ہاتھ میں نہیں ٹھہرتا، جب کوئی شے دسترس میں نہ ہو تو کچھ کہنا فضول ہوتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے گہری سانس لی پھر کروٹ لیتے ہوئے بولا۔ ''جاتے ہوئے دروازہ بند کر جانا۔''

میں بت بنا وہاں کھڑا رہا۔ پہلی بار اس نے مجھ سے یوں اجنبیوں کی طرح بات کی تھی۔ مجھے یہ تو یقین ہو گیا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے لیکن مجھے تکلیف بھی محسوس ہوئی کہ بھائی نے مجھ پر اعتماد نہیں کیا۔ میں دکھی من سے باہر آ گیا۔ میرا جی بھر آیا تھا۔ کوئی تو دکھ ہے جو بھائی کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ اتنا شکست خوردہ، اس قدر بے بس، جس کے لفظوں میں کوئی امید نہیں تھی۔

رات ڈھل چکی تھی۔ میں چھت پر چارپائی پر لیٹا یہی سوچے جا رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا تو میں اٹھا، جوتے پہن کر منڈیر تک جا کر نیچے دیکھا۔ ابھی بابا تو آئے نہیں تھے، اماں بھی کسی کام کاج کے لیے اندر تھیں۔ میں سیڑھیوں سے نیچے اترا اور باہر والے پھاٹک کی طرف چل پڑا۔ گاؤں کی گلیاں سنسان تھیں۔ دور ایک مکان کی نکڑ پر بلب جل رہا تھا۔ میں نے باہر آ کر ندیم کو فون کر دیا۔

''اُوئے خیر ہے، اتنی رات کو فون کر دیا۔'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''اتنی رات کہاں ہو گئی، ابھی تو نو بھی نہیں بجے، خیر مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔'' میں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''ابھی کرنی ہے بات؟'' اس نے مزید حیرت سے پوچھا۔

''ہاں باہر آؤ، میں تمہارے گھر کی طرف آ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ اور فون کال ختم کر دی۔ میں ٹہلتا ہوا اس کے گھر تک جا پہنچا۔ وہ اپنے گھر کے باہر میرے انتظار میں کھڑا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

''ہاں بول، کیا بات ہے؟''

''یار پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا ہے ذیشان بھائی ہم سے کچھ چھپا رہے ہیں۔'' میں نے کہا اور آج شام ہونے والی رُوداد سنا دی۔

''دیکھ یار، مجھے تو اتنا پتا نہیں، لیکن تم ان کے زیادہ قریب رہے ہو، تم نے محسوس کیا ہے تو ٹھیک کیا ہو گا۔'' اس نے سکون سے کہا اور سگریٹ کا گہرا کش لے کر دھواں فضا میں اچھال دیا۔

''اب پتا کیسے چلے؟ یہی مسئلہ ہے۔'' میں نے بے چینی سے کہا تو اس نے چند منٹ تک سوچا پھر بولا۔

''یار، ایک ہی بندہ ہے جو اس کے بارے میں سارا کچھ بھلے نہ سہی لیکن تھوڑا بہت ضرور بتا سکتا ہے۔ مطلب کچھ نہ کچھ مل سکتا ہے اُس سے۔''

''کون، کون ہے وہ؟'' میں نے جلدی سے پوچھا تو وہ بولا۔

''ذیشان بھائی کی کبڈی ٹیم کا کوچ یا وہ خلیفہ، کیا نام ہے اُس کا......''

''چاچا خدا بخش......'' میں نے تیزی سے کہا۔

"اللہ تیرا بھلا کرے، یہ خلیفہ لوگ جو ہوتے ہیں نا اپنے شاگردوں کی دائی ہوتے ہیں، انہیں سب پتا ہوتا ہے۔ اسی سے پتا لگ سکتا ہے۔" اس نے پورے اعتماد سے کہا۔

"چل پھر چلتے ہیں اس کی طرف۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"دیکھو، مجھے تمہارے ساتھ جانے میں کوئی حرج نہیں، کون سا اس نے مجھے منہ میں ڈال لینا ہے لیکن...... جو بات وہ تمہیں اکیلے میں بتا سکتا ہے، ہو سکتا ہے وہ میرے سامنے نہ کہے۔" اس نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا تو میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے میں جاتا ہوں اکیلا ہی۔"

"نہیں میں بھی چلتا ہوں، اِدھر اُدھر کہیں بیٹھ جاؤں گا۔" اس نے کہا اور میرے ساتھ ہی چل دیا۔ ہم ٹہلتے ہوئے چاچا خدا بخش کے گھر کے سامنے آ گئے۔ ندیم تھوڑا آگے جا کر گلی میں ایک چھکڑے پر بیٹھ گیا اور میں نے دروازہ بجا دیا۔ تھوڑی دیر بعد چاچا خدا بخش کھنکھارتا ہوا باہر نکلا۔ دروازہ کھول کر مجھے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں حیرت سمٹ آئی، پھر حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

"خیر ہے اسد پُتر، اس وقت رات کو آنا ہوا ہے تیرا۔"

"چاچا، تم سے ایک بات کرنی ہے، جس نے مجھے بہت بے چین کر رکھا ہے، اگر تم مہربانی کرو تو......"

"ہاں ہاں پُتر بتا کیا بات ہے، آ، اندر آ جا، بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔" اس نے مجھے راستہ دیتے ہوئے کہا۔

میں دروازے کے اندر چلا گیا۔ ڈیوڑھی ہی میں چارپائی پڑی تھی۔ اس نے مجھے وہاں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اندر چلا گیا۔ چند منٹ بعد آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک پیڑھا تھا۔ وہ میرے سامنے رکھ کر اس پر بیٹھ گیا۔ سکون سے بیٹھنے کے بعد بولا۔

"ہاں، اب کر بات کیا کرنی ہے؟"

"چاچا، اگر تم مجھے سچ بتا سکو تو بتانا، ورنہ انکار کر دینا۔ دوسری کوئی......" میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

"اُو پُتر پوچھ تو سہی......"

"وہ بات ذیشان بھائی کے بارے میں ہے۔" میں نے کہا تو چاچا تھوڑا سا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، جس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔ تبھی میں نے آج شام والی بات کہہ دی۔ میں جوں جوں بتاتا جا رہا تھا، چاچا کے چہرے پر ایک ملال اترتا جا رہا تھا۔ میں کہہ چکا تو وہ بولا۔

"تو نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔ لیکن پُتر یہ ایک ایسا راز ہے جو دفن ہی رہے تو اچھا ہے۔ جیسے ہی یہ راز باہر آیا، بہت بڑی بربادی ہونے کا اندیشہ ہے۔ پہلے ہی ہم بڑا نقصان بھگت چکے ہیں۔"

"کیسا نقصان......؟" میں نے تحمل سے پوچھا۔

"کیا ذیشان جیسا ہیرا پُتر، ایک کنکر کے مانند ہو گیا ہے، میری اتنے برس کی محنت یوں ضائع ہو جائے گی۔ یہ نقصان ہی نہیں ہے؟ ایسا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔"

"ہاں اس جیسا شاگرد آپ کو شاید ہی پھر کبھی ملے۔" میں نے اعتراف کرتے ہوئے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

"بہت شاگرد ہیں میرے، نامی گرامی بدمعاش بھی ہیں اور بہت زیادہ شریف لوگ بھی ہیں۔ جس نے کھیل کو صحیح معنوں میں کھیل کر دکھایا، وہ ذیشان پُتر ہی تھا، اب وہ ساری زندگی کھیل نہیں سکے گا، اس کا مجھے بے حد دکھ ہے۔"

"کیوں ہوا یہ سب......؟" میں اصل مدعا پر آیا تو چاچا ایک دم خاموش ہو گیا، اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے بتائے یا نہ بتائے۔ سو میں نے اسے ہمت دلانے کے لیے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا، "چاچا کیا تم لوگ اتنا ہی ڈر گئے ہو، اتنا خوف کھا گئے ہو دشمنوں سے، تم لوگوں کے منہ سے بات نہیں نکلتی، تالے لگ گئے ہیں۔"

"اوئے نہیں اوئے...... ساری زندگی ہو گئی، تیرا چاچا خوف زدہ نہیں ہوا، پنڈ شاہ پور والوں کی کیا اوقات ہے جو مجھے ڈرا لیں۔" اس نے جذبات میں بہہ کر پنڈ شاہ پور والوں کا نام لے لیا تو ایک دم سے میں چونک گیا۔ پھر ذرا سا دم لے کر بولا، "اس میں ذیشان کی کوئی غلطی نہیں تھی، سلمٰی اس پر خود عاشق ہو گئی تھی، اب میں تو ذیشان کو محتاط رہنے کا ہی کہہ سکتا تھا نا اور آفرین ہے پُتر ذیشان پر اس نے میرے کسی حکم سے کوتاہی نہیں کی۔"

"اصل معاملہ کیا بنا؟" میں نے تحمل سے پوچھا۔

"مجھے اپنے لڑکوں ہی سے پتا چلا تھا کہ پنڈ شاہ پور کی رہنے والی چوہدری الیاس کی بیٹی سلمٰی عاشق ہو گئی ہے اپنے ذیشان پر تو میرے لیے یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں تھی۔ پہلوانوں، شہ زوروں، کھلاڑیوں پر عاشق ہو ہی جاتی ہیں لڑکیاں۔ یہ بھی سچ ہے کہ عورت سے دوری ہی پہلوانوں، شہ زوروں، کھلاڑیوں کے لیے بڑی ضروری ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ کئی دنوں تک چلتا رہا تو ایک دن میں نے ذیشان سے پوچھ ہی لیا۔"

"اس نے کیا بتایا؟" میں نے پوچھا۔

”سلمیٰ نے کسی شادی پر ذیشان کو دیکھا تھا اور دل دے بیٹھی۔ اب ذیشان کی اتنی توجہ نہیں تھی۔ اس کے سامنے تو میلے والا میچ تھا، یہ پچھلے برس کی بات ہے، میلا جیت لیا۔ اس بار میلے سے پہلے کہیں اس کے گھر والوں کو پتا چل گیا تو انہوں نے پُتر ذیشان کو داغی کر دیا۔

”مطلب سارا فساد اسی سلمیٰ نامی لڑکی کا ہے۔“ میں نے تیزی سے کہا۔

”نہیں، اُس کا نہیں،...... اس کی وجہ سے ہوا ہے۔ کیسے ہوا، اندر کی کہانی کیا ہے، میں بالکل نہیں جانتا کیونکہ میں نے پوچھا نہیں، لڑکوں سے باتیں سنی ہیں ممکن ہے درست ہوں یا غلط بھی ہو سکتی ہیں۔“ چاچا نے حتمی انداز میں کہا تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ تبھی میں نے کہا۔

”چاچا، مجھے یہ بتا، پنڈ شاہ پور والوں کے شہ زور یہی دو چار ہیں، تمہارے پاس اتنے زیادہ ہیں، پھر بدلہ کیوں نہیں لیا؟“ میں نے پوچھا۔

”ذیشان نے منع کر دیا تھا۔ لڑکے گئے تھے اُس کے پاس...... اب تو بس وہ اگلے برس کا انتظار کر رہے ہیں۔“ چاچا نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا۔

”پر چاچا...... میں اگلے برس تک انتظار نہیں کرنے والا۔“ میں نے دبے دبے غصے میں کہا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے میرے بازو کو زور سے پکڑتے ہوئے کہا۔

”تم چاہے غلط کرو یا صحیح، میں تمہارے ساتھ ہوں، وہ اپنا وار کر چکے، اب بدلہ لینا ہمارا حق بنتا ہے۔“

”انتظار کرنا چاچا۔“ میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ چاچا مجھے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ میں باہر آ گیا۔

تھوڑی دور چھکڑے پر بیٹھا ہوا ندیم اٹھ بیٹھا۔ میں اس کے پاس پہنچا تو وہ میرے ساتھ چل پڑا۔ میں نے اسے ساری بات بتا دی۔ وہ کافی دیر تک خاموش رہا، پھر چوک تک آتے ہوئے اسے چپ ہی لگی رہی۔ آخرکار میں نے اس سے پوچھا۔

”تم کچھ بولتے کیوں نہیں؟“

”اس میں بھلا بولنے والا کچھ ہے، عورت کا معاملہ ہے، اس میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔“ اس نے بے رخی سے کہا۔

”یار جس کی وجہ سے میرے بھائی کی زندگی خراب ہو گئی، اسے کچھ بھی نہ کہا جائے، بقول چاچا کے، وہ لڑکی خود ذیشان بھائی پر فریفتہ ہوئی تھی۔“ میں نے اپنی طرف سے دلیل دیتے ہوئے کہا۔

”دیکھ میری بات سن...... مان لیا قصور سارا اسی لڑکی کا ہوگا لیکن ذیشان بھائی کیوں رو رہا ہے، اسے کیا دکھ ہے؟ اگر تو اسے اپنے ساتھ زیادتی کا دکھ ہے، لڑکی سے اس کا کوئی تعلق نہیں، پھر کوئی بات بنتی ہے۔“ اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

”تمہارا خیال ہے بھائی کا کوئی......“ میں نے تیزی سے کہا۔

”ہو سکتا ہے۔ کیونکہ بھائی نے کوئی واویلا نہیں کیا، کسی کو نہیں بتایا، اتنی بڑی زیادتی سہہ کر بھی خاموش ہے۔ اس کا مطلب یہی بنتا ہے نا۔ دونوں طرف سے اس لڑکی کا نام سامنے نہیں آیا۔“ اس نے سکون سے کہا۔

”تمہاری دلیل ماننے والی ہے۔ لیکن اگر بھائی کا تعلق نہ ہوا تو......؟“ میں نے ضدی لہجے میں کہا کیونکہ میرا من نہیں مان رہا تھا۔

”دیکھ اسد...... یہ لڑکی کا معاملہ ہے۔ جس کا ہمیں پوری طرح کوئی علم نہیں کہ اصل کہانی کیا ہے۔ اس لڑکی کے گھر والے کس شدت سے اپنا غصہ ظاہر کر چکے ہیں۔ سو اگر ہاتھ ہی ڈالنا ہے تو بہت سوچ سمجھ کر، نہیں تو اسے چھوڑ دیا جائے، یہ معاملہ گلے پڑ سکتا ہے۔“ اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو، تم ذرا سا بھی غلط نہیں کہہ رہے ہو۔ لیکن اگر کچھ بھی ہے تو کسی کی زندگی خراب کرنے کا کسی کو کیا حق ہے؟“

”یہ تم سوچ رہے ہونا میری جان، تمہاری کوئی بہن ہوتی، تمہیں ایسے ہی کسی معاملے کا پتا چلتا تو تمہارا ردِعمل کیا ہوتا؟“ اس نے انتہائی جذباتی سوال میرے سامنے رکھا تو میں چونک گیا۔ کیا ندیم ایسا بھی سوچ سکتا ہے؟

”تو پھر اب کیا کیا جائے؟“ میں نے ہار مانتے ہوئے پوچھا۔

”اسے وقت پر چھوڑ دو۔“ اس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

”تیسرے دن سلمیٰ کی شادی ہے۔ وہ پرائی ہو جائے گی، اس کے بعد ہمارا اس سے کوئی جھگڑا ہی نہیں رہے گا۔ میرے بھائی کی زندگی برباد کرنے والی، اپنی زندگی میں خوشیاں منائے، ایسا تو ممکن نہیں ہے۔“ میں نے انتہائی غصے میں کہا، مجھے خود پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔

”مجھے بتاؤ، میں کیا کر سکتا ہوں؟“ اس نے انتہائی تحمل سے پوچھا، جس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ ہم تھوڑی دیر خاموش کھڑے رہے، تبھی میں نے اکتاتے ہوئے کہا۔

”چل گھر چلتے ہیں، صبح اس پر مزید بات کریں گے۔“ وہ خاموشی سے اپنے گھر کی طرف چل دیا اور میں اپنے

گھر کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

میں ساری رات بے چین رہا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں۔ بھائی بھی مجھے کوئی بات بتانے کو تیار نہیں تھا۔ میرا من چاہ رہا تھا کہ سیدھا پنڈ شاہ پور جاؤں، اور سلمٰی کو اٹھا کر لے آؤں۔ اس دوران جو بھی سامنے آتا ہے، اسے گولی ماردوں۔ جذبات میں یہ سب تو میں سوچتا گیا لیکن پھر خیال آیا اس طرح تو میں سلمٰی کی خواہش پوری کروں گا۔ وہ جو بھائی کا ساتھ چاہتی تھی، اس کی امید برآئے گی۔ لیکن اس کے بعد جو خون خرابا ہونا تھا، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ مان لیا میں اکیلا ان کے ساتھ لڑ پڑتا ہوں لیکن کب تک لڑوں گا۔ آخر میری لاش بھی یہیں کہیں کھیتوں میں پڑی ہوگی۔ وہ سلمٰی کو واپس لے گئے تو اس سارے خون خرابے کا فائدہ؟

صبح ہوتے ہی میں ذیشان بھائی کے گھر چلا گیا۔ صحن میں داخل ہوتے ہی تائی اماں نے مجھے دیکھا، پھر ہولے سے پوچھا۔

”پُتر ناشتا کرے گا؟“

”ہاں تائی جی۔“ میں نے کہا۔

”چل جا بھائی کے پاس، میں بھیجتی ہوں۔“ تائی نے کہا تو میں بھائی کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ افسردہ سا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے کرسی کھینچ کر اس کے بیڈ کے پاس کی اور اس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”یہ سلمٰی والا معاملہ کیا ہے؟“

میرے یوں پوچھنے پر اُس کے چہرے پر کوئی جذبہ نہیں اُبھرا، جیسے تھا، ویسا ہی رہا۔ وہ کچھ پل میری طرف خالی نگاہوں سے دیکھتا رہا، پھر اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”آخر تم نے اپنی ضد پوری کرلی ہے نا، نہیں مانی میری بات۔“

”بھائی اگر تم ہی مجھے بتادیتے تو......“ میں نے کہا اور جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”کیا چاہتے ہو تم؟“ اس نے قدرے سختی سے پوچھا۔

”اصل بات کیا ہے؟“ میں نے پوچھا تو وہ پھر میری طرف دیکھنے لگا، چند پل یونہی خاموشی میں گزر گئے تو وہ بولا۔

”وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور میں اُس سے، اس کے گھر والوں کو پتا چلا تو انہیں اچھا نہیں لگا اور انہوں نے اپنا غصہ اس میلے پر نکال لیا۔ اتنی سی بات ہے۔“

”وہ اب بھی کرتی ہے محبت؟“ میں نے پُرسکون لہجے میں پوچھا تو بھائی نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔

”تم چاہتے کیا ہو؟“

”میں تو بہت کچھ چاہتا ہوں، ہر اُس بندے کو ماردینا چاہتا ہوں، جس نے تمہاری زندگی خراب کی، اس عورت سمیت جس کی وجہ سے یہ سب ہوا۔“ میں نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا۔

”تم سلمٰی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ خود...تم پر مرمٹی اور جب تم نے توجہ نہیں دی تو اس نے اپنے گھر والوں کو بتادیا اور......“ میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔

”یہ آدھا سچ ہے اسد...... پورا سچ نہیں۔“

”پورا سچ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا تو وہ چند لمحے سر جھکائے بیٹھا رہا، پھر سر اٹھا کر کہتا چلا گیا۔

”یہ سچ ہے کہ اس نے پہلی بار مجھے اپنے ہی گاؤں میں ایک شادی پر دیکھا تو دل دے بیٹھی تھی۔ یہ واقعہ کوئی ڈھائی برس پہلے ہوا تھا۔ وہ کوئی پہلی لڑکی نہیں تھی۔ ہاں مگر وہ پہلی لڑکی تھی جو مجھے اچھی لگی تھی۔ وہ شہر میں پڑھتی تھی، میں وہاں جاب کرتا تھا۔ وہ عام لڑکیوں سے زیادہ نڈر، من مرضی والی اور بے باک تھی۔ وہ اتنی حوصلے والی ہے کہ خود کار ڈرائیو کر کے اپنی سہیلیوں کو کالج لے جاتی رہی ہے۔ یہاں علاقے میں بڑی باتیں ہوئیں، مگر اس نے کسی کی پروا نہیں کی۔ وہ کافی حد تک منفرد ہے اسی لیے مجھے بھی اچھی لگنے لگی۔ کچھ عرصہ پہلے سے ہماری ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ہمارے درمیان یہ طے ہوگیا تھا کہ ہم ان کے ہاں جا کر باقاعدہ رشتہ مانگیں گے اور اس کے بعد شادی کرلیں گے۔“

”تایا جی کو۔ بتایا تھا پھر؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ نوبت ہی نہیں آئی، اس کے گھر والوں نے صاف انکار کردیا کہ ایک تو وہ غیر برادری میں شادی کسی صورت نہیں کریں گے۔ دوسرا اس کا باپ اپنے بھائی کو زبان دے چکا تھا، سلمٰی کی ہر صورت شادی اپنے چاچا زاد شہزاد ہی سے ہونی ہے۔“

”پھر تم دونوں نے ہار مان لی؟“ میں نے جذباتی لہجے میں پوچھا۔

”بات یہاں تک رہتی تو ٹھیک تھی۔ لیکن سلمٰی نے اپنے کزن سے شادی کرنے سے انکار کردیا، بلکہ سرے سے شادی ہی نہ کرنے کا فیصلہ سنادیا۔ اسی وجہ سے ان کے گھر میں طوفان آگیا۔“ بھائی نے پُرسکون لہجے میں بتایا تو مجھے ایک دم سے

غصہ آ گیا۔ میں تلخی سے بولا۔
''ٹھیک ہے، یہ اُن کے گھر کا معاملہ تھا، وہ بھلے اپنی لڑکی کو گھر میں قتل کر کے دفن کر دیں، ماریں نہ ماریں، اس کا غصہ تم پر کیوں اتارا گیا؟ یہ ظلم کیوں کیا انہوں نے؟''
''میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسا ہوگا، میلے پر شہزاد نے باہر سے چار بندے بھیجے تھے، صرف مجھے ٹارگٹ کرنے کے لیے، اور وہ کر گئے۔ اگر مجھے شک بھی ہوتا نا، میں انہیں ایسا نہیں کرنے دیتا۔'' آخری لفظ کہتے ہوئے اس کا لہجہ روہانسا ہو گیا، اس نے چند لمحے خود پر قابو پایا اور پھر بھیگے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اس سے اچھا تھا وہ مجھے گولی مار دیتے یار، یوں داغی کر کے اذیت ناک زندگی تو نہ دیتے۔''
''انہوں نے تو میرے ایک بھائی کو داغی کیا ہے، میں ان کے ٹبر کو داغی کروں گا، یہ میرا وعدہ رہا بھائی۔'' میں نے دانت پیستے ہوئے کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا، پھر تیزی سے سمجھاتے ہوئے بولا۔
''نہیں...... نہیں میرے بھائی...... ہمیں ایسی کوئی دشمن داری نہیں بنانی، تمہیں ایک اچھی زندگی جینا ہے، میں نے تمہارے بارے میں بڑے خواب دیکھے ہیں، تم اپنا امتحان مکمل کرو، پھر لاہور چلے جاؤ، وہاں اکیڈمی جوائن کرو، تمہیں سی ایس ایس پاس کرنا ہے۔ اس دشمنی کا کوئی فائدہ نہیں۔''
''مگر بھائی تم جب بھی لاٹھی کے سہارے چلو گے، کیا اس وقت بھول جاؤ گے؟ اتنا بڑا کیا جرم کہ انہوں نے تمہاری زندگی برباد کر دی۔ نہیں بھائی، میں تمہارے خواب پورے کروں گا لیکن کم از کم شہزاد کی ٹانگیں توڑ کر، سلمٰی کو اپاہج کر کے...... جو اس......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولا۔
''اس میں سلمٰی کا کیا قصور؟ وہ تو آج بھی میری محبت کا دم بھرتی ہے۔ اس کا بس نہیں چل رہا کہ وہ اُڑ کر میرے پاس آجائے۔ میں نے ہی اسے روکا ہوا ہے۔''
''کیوں روکا ہوا ہے آنے دو اُسے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔
''پھر خون خرابا کون روکے گا؟ میں تو بیڈ پر پڑا ہوں۔ خود دوسروں کا محتاج ہوں۔ اس کا دفاع کیسے کر پاؤں گا؟ پاگل ہو گئے ہو کیا۔'' اس نے اکتاہٹ سے کہا تو میں نے حتمی لہجے میں کہا۔
''بلاؤ اُسے...... میں روکوں گا ہر طوفان کو......''
''بکواس بند کرو، پاگل ہو گئے ہو......'' بھائی نے دہاڑتے ہوئے کہا، اتنی دیر میں تائی اماں کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کا...... چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ انہوں نے آتے ہی ایک زوردار تھپڑ ذیشان بھائی کے چہرے پر مارا اور دہاڑتے ہوئے بولیں۔
''اوئے بزدل، تم نے میرا دودھ پیا ہوا ہے، مجھے یہ پتا ہوتا نا کہ تم کسی چوہے کی طرح یہاں کمرے میں پنڈ شاہ پور والوں کے ڈر سے پڑے رہو گے تو میں تمہیں پیدا ہی نہیں کرتی۔ تم نے آج تک ہمیں اصل بات نہیں بتائی...... ہم نے تمہاری چوٹ کو قسمت کا لکھا سمجھا۔ افسوس ہے تم پر۔''
''اماں یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' اس نے حیرت سے اپنی ماں کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بولیں۔
''افسوس یہ ہے پُتر، تم نے کم از کم مجھے ہی اصل وجہ بتا دی ہوتی۔ وہ کون ہوتے ہیں میرے پُتر کو داغی کرنے والے۔''
''اماں جانے دے...... یہ پہلے ہی پاگل ہو رہا ہے، تمہاری شہہ پا کر کچھ بھی الٹا سیدھا کر دے گا۔ ان لڑائیوں میں گھر کے گھر برباد ہو جاتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا ہمارا گھر اُجڑ جائے۔'' اس نے احتجاجی لہجے میں کہا۔
''تیرا کیا خیال ہے، اب گھر آباد ہے؟'' تائی اماں نے پوچھا تو بھائی نے سر جھکا لیا۔ تبھی میں نے کہا۔
''بلاؤ اُسے، میں سنبھالوں گا سلمٰی کو......''
''بلاؤ اُسے میں سامنا کروں گی دشمنوں کا...... پہلی گولی میں کھاؤں گی...... تم نے ہمیں مرا ہوا سمجھ لیا ہے...... میں انہیں چیر کے رکھ دوں گی......'' تائی اماں نے بپھرتے ہوئے کہا تو بھائی روہانسا ہوتے ہوئے بولا۔
''پاگل مت بن، اسد......''
میں کچھ نہیں بولا۔ میں آگے بڑھا اور میں نے اس کے سرہانے پڑا فون اٹھا لیا پھر اسے دیتے ہوئے بولا۔ ''میری بات کرواؤ اُس سے۔''
وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا، پھر تائی کی طرف دیکھا اور سیل فون پر نمبر ملانے لگا۔ میں نے دیکھا، اس نے ''جان'' کے نام سے نمبر محفوظ کیا ہوا تھا۔ مجھے احساس ہو گیا کہ دونوں طرف آگ برابر کی تھی۔ چند لمحوں بعد نمبر مل گیا تو بھائی نے اسپیکر آن کرتے ہوئے کہا۔
''یہ اسد تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔''
اس نے یہ کہہ کر فون میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے بڑے سکون سے کہا
''بھابی......''
''ہاں بول اسد۔'' اس نے دبی دبی آواز میں کہا۔
''یہ تم لوگوں نے اچھا نہیں کیا میرے بھائی کے

ساتھ۔"

"میں واری تیرے بھائی پر، میں صدقے جاؤں جیون جو گیا۔ میں نے نہ کل چاہا تھا نہ آج ...ایسا چاہوں گی۔ یہ شہزاد نے اپنی غیرت دکھانے کی کوشش کی ہے۔ میں اسے ساری زندگی معاف نہیں کروں گی۔" اس نے غصے سے کہا۔

"یہ کیسی محبت ہے تمہاری، میرے بھائی کو زندہ درگور کر کے خود شادی کر رہی ہو، وہ بھی شہزاد کے ساتھ، جسے تم ساری زندگی معاف نہیں کروگی، حیرت ہے؟" میرے لہجے میں دبادبا غصہ تھا۔ تبھی اس نے تیزی سے کہا۔

"اور میں کیا کروں؟ میں پہلے شادی کرنا چاہتی تھی نہ اب کرنا چاہتی ہوں۔ میرے پاس دو ہی راستے ہیں، ایک خودکشی کا راستہ ہے وہ بھلے گلے میں پھندا ڈال کے کرلوں یا پھر شادی کر کے کرلوں، ایک ہی بات ہے۔"

"اور دوسرا......" میں نے پوچھا۔

"وہ یہ کہ تیرا بھائی ایک بار مجھے کہہ دے کہ میں آجاؤں تو میں فوراً آجاؤں گی، بس مجھے ذرا سا حوصلہ دے دے، میں ساری دنیا سے ٹکرا جاؤں گی۔" اس نے دبنگ لہجے میں کہا تو میں نے حتمی لہجے میں پوچھا۔

"اگر یہ کہہ دے تو آجاؤ گی یا تمہیں ان لوگوں سے نکال کر لانا پڑے گا؟"

"میں خود آجاؤں، ابھی کہے، اگلے آدھے گھنٹے بعد میں اس کے پاس ہوں گی، یہ بھی تماشا دیکھ لے۔" اس نے جارحانہ انداز میں کہا۔

"تیار ہو جاؤ...... میں تمہیں لینے آرہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے بھائی کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔

"اسد ذِتے داری لے رہا ہے تو آجا۔ سنبھال لے گا تجھے۔"

"بات سن ذیشان مجھے صرف تیری دُلہن بننا ہے، بول شادی کرے گا تو میں آئی......"

"آجا میں ہی تیرے ساتھ شادی کروں گا۔"

"میں آئی۔" اس نے کہا اور کال کاٹ دی۔ تبھی میں نے فون بیڈ پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"تائی، یہاں سنبھال لینا، میں جارہا ہو سلمٰی کو لینے۔"

"جا پتر......رب سائیں کے حوالے......" تائی نے کہا تو میں تیزی سے نکلا اور سیدھا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

یہ میرے لیے زندگی کا سب سے بڑا رسک تھا۔ میں نے فقط سلمٰی کے کہنے پر پنڈ شاہ پور جانے کی تیاری کر لی تھی۔

میں نے الماری سے اپنا پسٹل نکالا، اسے استعمال کیے کافی دن ہو گئے تھے۔ کسی دوست کی شادی پر یونہی ہوائی فائرنگ کی تھی۔ اس کے بعد اسے صاف کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کے ساتھ دو میگزین پڑے تھے، وہ اٹھائے، انہیں اپنی قمیص کے نیچے چھپایا اور کسی کو کچھ بتائے بغیر باہر نکل گیا۔ صحن میں میری جیپ کھڑی تھی۔ میں اس پر بیٹھا گیٹ سے باہر آگیا۔

میں ابھی گاؤں سے نکلا ہی تھا کہ ذیشان بھائی کا فون آگیا۔ میں نے وہ کال ریسیو کی تو وہ تیزی سے بولا۔

"کہاں ہو تم؟"

"میں گاؤں سے باہر ہوں، نہر کے پل تک پہنچنے والا ہوں، پنڈ شاہ پور کی طرف جارہا ہوں۔" میں نے سکون سے کہا تو وہ جلدی سے بولا۔

"رک جاؤ، سلمٰی اُدھر سے نکل پڑی ہے۔"

"کیا واقعی؟ کیسے، مطلب پیدل نکل آئی ہے وہ؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں، کار پر ہے۔" اس نے بتایا۔

"کار پر، کیا میں سامنے سے جا کر لے آؤں اُسے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، تم یہیں گاؤں کے پاس رکو، وہ یہیں آئے گی تو سارا گاؤں دیکھے گا کہ وہ خود آئی ہے، تم لاؤ گے تو معاملہ کچھ دوسرا ہو جائے گا۔" اس نے تیزی سے کہا تو میں بولا۔

"چلو ٹھیک ہے، میں واپس آجاتا ہوں۔"

"یہ بھی ہوسکتا ہے اس کے پیچھے کچھ لوگ ہوں، احتیاط اچھی ہوتی ہے، واپس آجا میرے ویر۔" اس نے کہا تو میں نے کال بند کی، جیپ روک کر موڑی اور واپس گاؤں آگیا۔ جس گلی میں ہمارا گھر تھا، اس کے چوک میں پہنچا تو ذیشان بھائی کے دو دوست اسی چوک میں بیٹھے ہوئے تھے، اس کا مطلب تھا کہ اس نے اپنے دوستوں کے ذریعے بندوبست کر لیا تھا۔ مجھے انہیں دیکھ کر نہیں، بھائی کے حوصلہ پکڑنے کی بے حد خوشی ہوئی۔ وہ جو ہمت ہار بیٹھا تھا، ایک دم سے پُرجوش ہو گیا تھا۔ میں نے جیپ چوک ہی میں روک دی۔ میں نے دیکھا سامنے سے ذیشان بھائی کا ایک اور دوست موٹر سائیکل پر آرہا تھا۔ اس وقت مجھے خیال آیا تو میں نے ندیم کو فون کر دیا کہ وہ فوراً خالد کو لے کر پہنچے۔

ہم سب ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے اس راہ کی جانب تک رہے تھے، جہاں سے سلمٰی کو آنا تھا۔ ہمارے پھاٹک کے باہر میری اماں اور تائی اماں دونوں آکر کھڑی ہو گئی تھیں۔ یوں چوراہے پر جیپ کا کھڑے ہونا، ارد گرد کچھ لوگوں

کا ایک ہی طرف دیکھنا، میرے گھر والوں کا باہر نکل آنا، یہ خلاف معمول منظر تھا۔ دھیرے دھیرے لوگوں کا تجسس بڑھا تو وہ گھروں سے جھانکنے لگے، عورتیں اور بچے تک باہر نکل آئے۔ کئی لوگ تو پوچھنے لگے، یوں کیسے کھڑے ہو؟ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک خلا تھا جو اس منظر میں کہیں رُک گیا تھا۔ ہر کسی کے چہرے پر سوالیہ نشان بکھرا ہوا تھا۔ میری بے چینی عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ میں نا اور ہاں کے درمیان اٹک گیا تھا۔

بیس منٹ سے بھی اوپر وقت گزر گیا تھا۔ اچانک ایک سفید چھوٹی کار مڑتے ہوئے گلی کے سرے پر نمودار ہوئی۔ ہمارا اور اس کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا۔ بریک لگتے لگتے وہ میری جیپ سے چند فٹ کے فاصلے پر آرکی۔ تھوڑی دھول بیٹھی تو ڈرائیونگ سیٹ سے سلمٰی نمودار ہوئی۔ وہ ایک لمبی، پتلی اور خوب صورت لڑکی تھی۔ اس نے سبز اور پیلے رنگ کے کامبی نیشن کا شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا، اسی طرح کا آنچل اس کے سر پر تھا۔ اس نے کار کا دروازہ بند کیا اور میری جیپ کی جانب بڑھ آئی۔ میں جلدی سے سیٹ چھوڑ کر نیچے اتر آیا۔ وہ بالکل میرے مقابل آ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی پھیلی ہوئی تھی۔

”ویلکم بھابی...... میں ہوں اسد۔“

”چل، بتا کہاں ہے ذیشان۔“ اس نے کہا تو سنجیدگی اسی طرح اس کے چہرے پر چھائی رہی۔

”آؤ میرے ساتھ۔“ میں نے کہا اور گھر کی جانب چل پڑا۔ میں نے اردگرد دیکھا سبھی لوگ حیرت سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ بلاشبہ ان میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہوں گی۔ لیکن میں نے کوئی توجہ نہیں دی اور گھر کے سامنے آ گیا جہاں میری اماں اور تائی اماں کھڑی تھیں۔

”اماں، یہ سلمٰی ہے۔“ میں نے کہا تو تائی اماں نے بانہیں پھیلا دیں۔ وہ دونوں سے باری باری ملی اور ہم اندر چلے گئے۔

ذیشان بھائی بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ سلمٰی جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی، اس نے اٹھنے کی کوشش کی جس پر اس کی کراہ نکل گئی۔ سلمٰی تیر کی طرح آگے بڑھی اور اس کے پیر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ بھائی نے بہت مشکل سے اس تک اپنا ہاتھ پہنچایا، پھر اسے سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں رونا نہیں...... میری قسمت میں ہی ایسا تھا۔“

”قسمت سے ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن ہوا تو میری وجہ سے ہے نا، میں کبھی معاف نہیں کروں گی انہیں۔“ وہ بلکتے ہوئے بولی تو تائی اماں نے کہا۔

”چل بس کر بیٹی، اب تم اپنے گھر میں آ گئی ہو تو رونا نہیں، صبر کر۔“

تائی اماں کے یوں کہنے پر وہ ان کے گلے لگ کر رونے لگی۔ اماں نے اسے خاموش کیا اور انہیں وہیں چھوڑ کر ہم باہر آ گئے۔

☆☆☆

سلمٰی کا ہمارے گھر آ جانا کوئی جیت نہیں تھی بلکہ ہم سب کا امتحان شروع ہو گیا تھا۔ اگر یہ کوئی کہے کہ پنڈ شاہ پور والوں کو یا سلمٰی کے باپ چوہدری الیاس کو یہ پتا ہی نہیں ہوگا کہ اس وقت سلمٰی کہاں ہے؟ تو اسے احمقانہ سوچ ہی کہا جا سکتا ہے۔ سہ پہر ہو چکی تھی۔ ابھی تک کسی طرف سے کوئی پتا نہیں کھڑکا تھا۔ ایک گومگو کی کیفیت تھی لیکن ہمارے صحن میں طوفان آیا ہوا تھا۔ ہم سب گھر والوں کے درمیان سلمٰی بیٹھی ہوئی تھی۔ معاملہ یہی زیر بحث تھا کہ سلمٰی کا نکاح ابھی اور اسی وقت ذیشان سے پڑھا دیا جائے۔ لیکن تایا اڑا ہوا تھا۔

”پرسوں اس کی برات آنی ہے نا، تو پرسوں ہی اس کا نکاح یہاں اسی گھر میں ہوگا۔ یوں چوروں کی طرح نکاح نہیں کرنا، پورا پنڈ اس شادی میں شامل ہوگا۔“ تایا نے اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا تھا۔

”پر بھائی بات سن...... دشمن خاموش تو نہیں بیٹھے گا نا، وہ تو......“ بابا نے انہیں سمجھانا چاہا تو وہ انتہائی سنجیدگی سے بولے۔

”اسی لیے تو میں چاہتا ہوں کہ انہیں دو دن کا وقت دوں۔ وہ اگر ہماری بہو کو ہم سے چھین کر لے جا سکتے ہیں تو لے جا کر دکھائیں۔ میں دیکھتا ہوں کون کرتا ہے سامنا...... ہم نے آج تک شرافت سے زندگی گزاری ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں لوگ ہمیں مٹی میں رول دیں۔“

”یار وہ پولیس کا سہارا لے سکتے ہیں۔“ بابا نے ایک نیا پہلو سامنے رکھا۔

”پولیس کو بھی دیکھ لیتے ہیں، ہماری بہو اب ہماری عزت ہے۔ اس نے جو گھر سے یہاں تک آنے کا فیصلہ کیا ہے، ہم اس کی لاج رکھیں گے۔ بھلے ہمارا سارا گھر کٹ جائے۔“ تایا نے پورے مان سے کہا۔

”بابا...... آپ کی بہو بھی آپ کی پوری لاج رکھے گی۔ میں قربان ہو جاؤں گی لیکن آپ کی عزت پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔“ سلمٰی نے اعتماد سے کہا تو تایا نے ہاتھ اٹھا کر فیصلہ دے دیا۔

”بس...... جو بھی ہو جائے، ذیشان اور سلمٰی کی شادی

پرسوں ہوگی، اس راہ میں جو بھی رکاوٹ ہوگی، اسے دیکھ لیں گے۔" یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہے، پھر میری طرف دیکھ کر بولے۔ "اسد پُتر...... یہ اب تیری ذمّے داری ہے۔ بھلے سیاہ کر سفید کر۔"

"جی تایا جی، میں جان لڑا دوں گا۔" میں نے کہا تو وہ سر ہلا کر رہ گئے۔

میں ہی نہیں سب جانتے تھے کہ اگر تایا نے ایسا کوئی فیصلہ کر لیا ہے تو یہ محض جذباتی فیصلہ نہیں تھا، انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر اور حالات کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کیا تھا۔ مجھے ان پر پورا بھروسا تھا۔ یہ سچ تھا کہ آج تک ہمارے خاندان نے کبھی کسی کا بُرا نہیں چاہا تھا۔ ہمارے دادا ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ انہوں نے یہاں آ کر زمینیں آباد کیں اور شرافت سے رہتے چلے آئے تھے۔ اب اگر کوئی ہم سے ہی بدمعاشی کرے تو اسے جواب دینا تو بنتا تھا۔ ہماری شرافت دیکھ کر ہی شرپسند سر چڑھ آئے تھے۔ تایا جی نے ہم سب کو کچھ باتیں سمجھا دیں جن میں سب سے اہم یہی تھا کہ حوصلہ رکھنا ہے، کسی پر ظلم نہیں کرنا۔

میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ نجانے کیوں میرا دماغ کہہ رہا تھا کہ میں فرحی سے بات کر کے اسے تازہ صورتِ حال کے بارے میں بتا دوں۔ وہ کوئی نہ کوئی اچھا مشورہ ہی دے گی۔ میں نے اسے کال کر دی۔

میری فرحی سے بات ہوئی تو میں نے سب کچھ اسے بتایا۔ وہ کافی دیر تک مزے سے میری باتیں سنتی رہی۔

"یہ ہوتا ہے عشق...... دیکھ لو سلمٰی نے اپنا سب کچھ ذیشان کے لیے چھوڑ دیا، کاش مجھے بھی کسی سے ایسا طوفانی عشق ہو جائے یار۔"

"ایسے طوفانی عشق میں خون بھی بڑا بہتا ہے، ٹانگ بھی تڑوانی پڑتی ہے، تمہارا عاشق تڑوائے گا ٹانگ......"

"کسی نے کیا توڑنی ہے ٹانگ، ہاں اگر ٹوٹی تو میرے ہاتھوں ہی ٹوٹے گی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے قہقہہ لگا دیا۔

"ایسا عشق ہی نہ کرو، جس میں خون خرابا ہو، ٹانگیں تڑوانی پڑیں۔" میں نے کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"ویسے ایک بات ہے، جس اسی میں ہے۔"

"ہاں مگر دشمن بھی بڑھ گئے ہیں، اب پتا نہیں کیا ہوگا؟" میں نے کہا تو وہ سنجیدگی سے بولی۔

"اب جو ہونا ہے، وہ ہو جائے گا۔ لیکن تم نے ذرا سا بھی حوصلہ نہیں چھوڑنا، کوئی جتنا بھی بڑا دشمن سامنے آئے، ہمت دکھانی ہے۔"

"وہ تو ہو جائے گا، پر یہ جو پولیس کو استعمال کرتے ہیں نا، یہ درمیان میں ایک نئی بدمعاشی ہے، سیدھے آئیں جو کرنا ہے، کریں آر یا پار۔" میں نے اکتاہٹ بھرے لہجے کہا۔

"وہ بھی اسی معاشرے کا حصہ ہیں، وہ کون سا کہیں باہر سے آئے ہیں۔ تم اسے شطرنج کا کھیل سمجھو...... جو شاطر ہوتا ہے، وہ مہرے چلا کر ہی چال چلتا ہے، اب یہ ہمارا معاشرہ، کہیں مہرہ ہے، کہیں شاطر...... کہیں شاطر مہرے بنے ہوتے ہیں اور کہیں مہرے ہی شاطر بن جاتے ہیں، یہی رنگ ہیں دنیا کے......"

"یہی رنگ ہیں جو بندے کو گھما کر رکھ دیتے ہیں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ میرے حالیہ حالات پر مجھے بہت کچھ سمجھانے لگی۔

اس وقت مغرب ہو گئی تھی جب ہماری گلی میں ہلچل مچی۔ ایک دم سے ہی پولیس کی دو تین گاڑیاں چوک سے مڑ کر ہماری گلی میں آ گئیں۔ ہم اپنے گھر کے تھڑے پر دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ اور سچی بات یہ تھی کہ ان میں ذیشان بھائی کے کبڈی والے دوست زیادہ تھے جو ایک طرح سے ہماری سیکیورٹی کے لیے ہمارے ہاں موجود تھے۔ خالد بھی وہیں تھا اور ندیم کی باتیں بھی ختم نہیں ہو رہی تھیں۔ پولیس کو آتے دیکھ کر اس کی باتیں بھی ایک دم سے ختم ہو گئیں۔ وہ تینوں گاڑیاں ہمارے گھر کے باہر آ کر رک گئیں۔ ان میں سے کئی پولیس والے باہر آ گئے۔ میرے سامنے وہی اے ایس آئی آ گیا جو چند دن پہلے مجھے یہیں سے زدوکوب کر کے لے گیا تھا۔ اس نے گاڑی سے اتر کر اپنا پسٹل نکالا اور ہماری طرف دیکھا۔ مجھ پر نگاہ ٹکا کر مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے میں اس کی بات سمجھا ہی نہیں ہوں۔ وہ چند قدم آگے بڑھا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔

"اوئے...... جا اندر سے اس لڑکی کو لا، جسے تو نے اغوا کیا ہے۔"

میں اپنی جگہ کھڑا رہا اور سخت لہجے میں بولا۔

"تمیز سے بات کر...... وہ میری بھابی ہے اور دوبارہ اس کا نام لیا تو تیری زبان کھینچ لوں گا۔"

"مطلب تو سیدھے طریقے سے نہیں مانے گا۔" اس نے حقارت سے کہا اور اپنے لوگوں کو اندر جانے کا اشارہ کیا تو میں نے اونچی آواز میں للکارتے ہوئے کہا۔ اس دوران وہاں موجود ہر بندہ اٹھ کر پھیل گیا۔

"رک جاؤ، کوئی آگے نہ بڑھے، جو بھی اندر گیا، وہ خود ذمّے دار ہوگا۔"

"تیری تو......" یہ کہتے ہوئے اے ایس آئی نے گالی دی اور میری طرف بڑھا۔ اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹک دیا۔ اس نے پھر ہاتھ بڑھایا تو میں نے اس کی کلائی پکڑ کر کہا۔

"مجھے مجبور مت کر......"

"تو نے جو کرنا ہے کر......" اس نے کہا تو میں نے ایک جھٹکا دیا۔ وہ سیدھا چارپائی کے پاس جا کر گرا۔ اسی لمحے پولیس والوں نے گنز تان لیں۔ یہی وہ چاہتے تھے۔ میں بھی جانتا تھا کہ ایسے ہی ہوگا لیکن اس وقت پیچھے کھڑے حیدر کی آواز آئی۔

"جس کسی نے بھی فائر کرنے کی کوشش کی وہ اپنی موت کا خود ذمے دار ہوگا۔"

اس آواز پر سب نے پلٹ کر دیکھا، حیدر نے اپنے گن نکال کر اسے بولٹ مار دیا تھا۔ شاید پولیس والوں کو اتنی دلیرانہ مزاحمت کا احساس نہیں تھا۔ اتنے میں تھوڑے سے فاصلے پر کار آ کر رکی۔ اس میں سے تایا کے ساتھ گاؤں کے تین معتبر بندے اتر کر آ گئے۔ وہ کہیں بیٹھے تھے۔ پتا چلتے ہی گھر پہنچ آئے۔ انہوں نے اے ایس آئی کی طرف دیکھ کر اونچی آواز میں پوچھا۔

"ہاں بھئی کیا معاملہ ہے؟ اِدھر آ کر ہمیں بتا......"

شاید اے ایس آئی کو تھوڑی بہت سمجھ آ گئی تھی اس لیے وہ تایا کے پاس جا کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور سکون سے بولا۔

"آپ کا یہ لڑکا اسد، ساتھ والے پنڈ شاہ پور سے ایک لڑکی اغوا کر کے لایا ہے، ہم اسے بازیاب کروانے آئے ہیں۔"

"اوہ اچھا...... لیکن پُتر ایسی تو کوئی بات نہیں ہے، وہ ہماری بہو ہے اور خود چل کر آئی ہے اپنے گھر...... تمہیں کس نے کہا؟" تایا نے بڑے تحمل سے کہا تو وہ دھیمے سے لہجے میں بولا۔

"اس لڑکی کے باپ نے درخواست دی ہے، پرچہ ہو گیا ہے، ہم تو اسی کی تعمیل میں آئے ہیں۔"

"نہیں پُتر...... ایسا نہیں۔" یہ کہہ کر انہوں نے سامنے کھڑے پولیس والوں کی طرف دیکھا، پھر پوچھا، "تم اپنے ساتھ لیڈی پولیس لائے ہو؟"

"نہیں جی، ہمارے پاس نہیں ہے۔ وہ......" اس نے کہنا چاہا تو تایا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ایسے نہیں کرتے پُتر...... اب وہ ہوتی تو میں اسے اندر بھیج دیتا، وہ خود پوچھ کے آ جاتی میری بہو سے...... وہ بیان دے دیتی۔"

"دیکھیں جی ہم تو حکم کی تعمیل کروانے آئے ہیں، آپ کے لڑکوں نے ہمارے ساتھ بدتمیزی کی ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔" اس نے کوئی بات بنتے نہ دیکھ کر کہا تو تایا بولے۔

"دیکھو میری بات سنو...... یہ جس طرح تم اتنا بڑا لشکر لے کر آئے ہو، یہ کوئی اچھی بات ہے...... پچھلی بار جو تم نے کیا...... ہم نے سوچا اس بار بھی تم ایسا ہی کرو گے...... اس لیے میرا پتر تم واپس جاؤ...... میں خود آؤں گا صبح تھانے، وہیں آ کر بات کریں گے۔"

"لیکن بزرگو، کسی کو تو ہمارے ساتھ جانا پڑے گا، ہمیں کارروائی بھی تو ڈالنی ہے۔" اس نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

"میں کہہ رہا ہوں نا، واپس جاؤ جا کر جو مرضی کارروائی ڈالو۔" تایا نے حتمی لہجے کے ساتھ ذرا سخت انداز میں کہا۔

"بزرگو...... میں سمجھا رہا ہوں یہ کارِ سرکار میں مداخلت کا پرچہ بھی ہو سکتا ہے۔ آپ ایسے نہ کرو......" اس نے پھر وہی بات کہی تو تایا نے خود پر قابو رکھتے ہوئے دبے دبے غصے میں کہا۔

"بیٹا، میرے خیال میں تمہیں میری بات سمجھ میں نہیں آ رہی؟ یا میں تمہیں دوسری طرح سمجھاؤں؟"

یہ سن کر وہ تھوڑا سا گھبرایا لیکن ویسے ہی بیٹھا رہا۔ تایا نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔

"اوئے ارسلان کدھر ہے، اسے کہو ذرا کال ملائے۔"

"ابا جی میں نے بتا دیا ہے، میری بات ہو گئی ہے۔" تھوڑی دور کھڑے ارسلان بھائی نے کہا تو تایا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا کہتا ہے؟"

"وہ بات کرتا ہے ابھی۔" اس نے کہا۔ لفظ ابھی اس کے منہ ہی میں تھے کہ اے ایس آئی کا فون بج اٹھا۔ دوسری طرف سے نجانے اسے کس نے کیا کہا، وہ کال بند کرتے ہی سکون سے اٹھا اور اپنی پولیس وین کی جانب بڑھ گیا۔ اگلے چند منٹ میں وہ سب وہاں سے جا چکے تھے۔

بعد میں مجھے ارسلان بھائی سے پتا چلا کہ تایا کے ایک پرانے دوست کا بیٹا اس وقت انہی کے اداروں سے متعلق ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ تایا نے دوپہر ہی میں اس سے ساری بات کر لی تھی۔ وہ رات ہم نے گھر کے تھڑے پر بیٹھ کر گزار دی تھی۔

☆☆☆

نمبردار کے گھر میں پنچایت بیٹھی تھی۔ ہماری طرف سے

صرف پانچ بندے بلائے گئے تھے، اسی طرح پنڈ شاہ پور کے بھی پانچ ہی بندے تھے۔ ان دس بندوں کے علاوہ شہر سے کچھ لوگ آئے تھے۔ ان میں ڈی ایس پی بھی موجود تھا۔

کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد نمبردار اصل مدعے پر آ گیا۔ اس نے بات کی شروعات کی۔

''دیکھیں جی سارا معاملہ ہم لوگوں کے سامنے ہے، حقیقت کیا ہے، ہم سب جانتے ہیں۔ کیا ہوا کیسے ہوا کو چھوڑ کر ہمیں اس مسئلے کو حل کرنا ہے۔ یہ تھانہ کچہری ہمارے مسئلے کا حل نہیں، انہیں اس لیے بلایا کہ ہم سب مل کر یہ معاملہ طے کر لیں۔ میرے لیے سارے بھائی ایک جیسے ہیں۔''

''دیکھیں، ہم مانتے ہیں ہمارے لڑکوں کی طرف سے زیادتی ہوئی ہے، کھیل میں ایسا ہو جاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں گھر کی بچیوں کو اس لڑائی میں شامل کر لیا جائے، انہیں ورغلایا جائے۔ ہمارا ایک ہی مطالبہ ہے، ہماری بیٹی ہمیں واپس دے دی جائے۔'' چوہدری الیاس نے دبے دبے غصے میں اپنا موقف بیان کر دیا۔

''ہاں بھئی نور محمد، تم کیا کہتے ہو؟'' نمبردار نے پوچھا۔

''یہ چوہدری الیاس کوئی ٹھیک بات نہیں کر رہا ہے، جب یہ درست بات کرے گا، ہم بھی بات کر لیں گے۔''

''میں کیسے بات ٹھیک نہیں کر رہا، میری بیٹی اس وقت تمہارے گھر میں ہے، یہ لڑکا اسد اسے لے کر آیا ہے اور......'' چوہدری الیاس نے شدت سے کہا تو نمبردار بولا۔

''چوہدری الیاس تم سیانے بندے ہو، اس طرح کیسے بات ہوگی۔ میں جانتا ہوں، میں نے تصدیق کی ہے، سلمٰی بیٹی خود آئی ہے، تم کیوں الزام لگا رہے ہو۔ ایسے تو بات نہیں بنے گی۔''

''دیکھو جی جو مجھے پتا ہے، میں نے وہی کہا ہے۔ چلیں چھوڑیں اس بات کو، میری بیٹی مجھے واپس کریں، میں سب کچھ بھول جاؤں گا۔'' چوہدری الیاس نے کہا تو تایا بڑے سکون سے بولا۔

''اس کا جواب یہی بنتا ہے اور آپ سب بھی میری بات کی تائید کریں گے، جو بیٹی کا فیصلہ ہوگا، ہم وہی مان لیں گے۔''

''بات تو ٹھیک ہے۔'' نمبردار نے کہا اور باقی سب سے تصدیق چاہی۔ اس پر کافی گرما گرمی رہی۔ بہت سی باتیں کی گئیں لیکن آخرکار معاملہ یہیں پر ختم ہوا کہ سلمٰی سے پوچھ لیا جائے، جو وہ کہتی ہے، ویسا ہی کرنا پڑے گا۔ سلمٰی نمبردار کے گھر میں بیٹھی تھی۔ اس کے پاس نمبردار کی بیوی تھی۔ ڈی ایس پی کے ساتھ چار پانچ معتبر بندے اُس کے پاس چلے گئے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ واپس آئے تو انہوں نے آ کر اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''دیکھیں جی، بیٹی اپنے والد کے ساتھ واپس نہیں جانا چاہتی۔ اس کی وجہ اس نے یہ بتائی ہے کہ میری وجہ سے ذیشان کی زندگی کو برباد کر دیا گیا۔ میں نے جب شہزادے سے شادی کرنے کی ہامی بھر لی تھی اور مجھ سے وعدہ کیا گیا تھا کہ ذیشان سے دشمنی نہیں کی جائے گی تو انہوں نے ذیشان کو داغی کیوں کیا؟ دوسری وجہ اس نے یہ بتائی ہے کہ اگر مارنا ہی تھا تو پہلے مجھے مارتے، میں بھی اتنی ہی گنہگار تھی جتنا ذیشان تھا۔ منع کرنے کے باوجود شہزادے نے ایسا کیوں کیا۔''

''تو وہ شہزادے......'' پنڈ شاہ پور کے ایک بندے نے کہنا چاہا تو ڈی ایس پی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''پوری بات سن لو پہلے۔''

''بیٹی نے یہ کہا ہے کہ اُسے اغوا نہیں کیا گیا۔ وہ خود اپنی کار ڈرائیو کر کے آئی ہے اور ذیشان سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ یہ بیان وہ کسی بھی جگہ دینے کو تیار ہے۔''

''لو جی سن لیا سب نے......اب میں گھر آئی بیٹی کو کیسے نہ رکھوں۔ سلمٰی میری بہو ہی نہیں بیٹی بھی ہے، میرے گھر میں اس کی اتنی ہی عزت ہے جتنی ایک بیٹی کی ہوتی ہے۔'' تایا نے ایک دم سے فیصلہ سنا دیا۔ تبھی ڈی ایس پی نے کہا۔

''دیکھیں جی قانونی طور پر تو اب ہم کچھ نہیں کر سکتے، آپ نے جو درخواست دی ہے، وہ اب غیر موثر ہو گئی ہے۔ میں نے بیٹی سے کہا ہے کہ وہ اپنا بیان مجھے ایک کاغذ پر لکھ کر دے دے۔ باقی اب آپ جانیں، جو فیصلہ بھی آپ کریں۔''

پنچایت میں ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔

''پتا نہیں کیا مجبوری ہے میری بیٹی کی...... ممکن ہے یہ لوگ اُسے بلیک میل کر رہے ہوں...... ورنہ اس طرح میرا خون میرے خلاف نہیں جا سکتا۔ ڈی ایس پی صاحب کچھ کریں...... یہ ظلم ہو رہا ہے۔'' چوہدری الیاس نے دہائی دیتے ہوئے کہا تو تایا انتہائی سکون سے بولے۔

''دیکھو جی...... یہ بات بالکل غلط اور ناجائز ہے کہ ہم اس کی کسی مجبوری کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ وہ آج ذیشان کے ساتھ نکاح کرنے سے انکار کر دے، ہم خود ہاتھ باندھ کر پنڈ شاہ پور چھوڑ آئیں گے۔''

ان کے یوں کہنے پر ایک بار پھر پنچایت میں خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد نمبردار نے چوہدری الیاس سے پوچھا۔

''کیوں بھائی جی...... کوئی ثبوت، کوئی دلیل ہے

تمہارے پاس؟''

وہ خاموش رہا تو تایا پھر بولے۔ ''جس طرح وہ چوہدری الیاس کی بیٹی ہے، اسی طرح وہ ہماری بھی ہے۔ وہ چل کر ہمارے ہاں آگئی ہے تو اب ہمیں اس کا مان رکھنا ہے۔ میں کل ہی اس کا نکاح پڑھوا دیتا، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ کل سے میرے چھوٹے بھائی دین محمد کے گھر میں ہے۔ وہ کوئی گری پڑی نہیں، ہماری ہونے والی بہو ہے۔ سو...... میں ایک صلاح دیتا ہوں۔''

''ہاں بولو...... نور محمد کیا صلاح ہے؟'' نمبردار نے پوچھا۔

''میں کہتا ہوں دشمنی چھوڑیں۔ ابھی اور اسی وقت ہم دونوں بچوں کا نکاح پڑھواتے ہیں۔ اسی میں دونوں گھروں کی عزت ہے۔ چوہدری الیاس بیٹی کو رخصت کرے۔''

''یار بات تو ٹھیک ہے۔ جب، بیٹی ہی ذیشان سے شادی کرنا چاہتی ہے تو کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔'' پنچایت کے ایک معتبر شخص نے کہا۔

''قانونی طور پر بھی ہم نہیں روک سکتے۔'' ڈی ایس پی بولا۔

''تو بسم اللہ کریں...... کیوں چوہدری الیاس، اسی میں ہم سب کی عزت ہے۔'' نمبردار نے سنجیدگی سے پوچھا تو وہ دھیمے سے بولا۔

''جب میرا خون ہی مجھ سے بغاوت کر گیا ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

اس کے اتنا ہی کہنے کی دیر تھی، پنچایت میں ایک سکون کی لہر دوڑ گئی۔ فوری طور پر مولوی صاحب کو بلوا لیا گیا۔ ذیشان بھائی کو چارپائی پر ڈال کر نمبردار کے گھر لایا گیا۔ وہیں نکاح پڑھوا دیا گیا۔ پنچایت اس اعلان کے ساتھ اٹھ گئی کہ چونکہ دونوں گھروں میں رشتے داری ہو گئی ہے اس لیے کوئی دشمنی نہیں رہی لیکن نجانے کیوں میرا دل نہیں مان رہا تھا۔

☆☆☆

وہ شادی کا تیسرا دن تھا۔ میں اور بھابی سلمٰی صحن میں بیٹھے تھے۔ یونہی باتوں کے دوران میں میرے دماغ میں ایک خیال آ گیا۔ میں نے دبے دبے لہجے میں پوچھا۔

''بھابی...... ذیشان بھائی کے ساتھ تو جو دشمنی شہزاد نے کی، وہ تو سمجھ میں آتا ہے لیکن مجھے میاں امین کے قتل میں پھنسانا، یونیورسٹی میں مجھ پر غنڈوں سے حملہ کروانا، یہ سب کیا تھا؟''

''اسد سچ پوچھو تو ہم بھی پریشان تھے۔ میرے ابا کو تو بالکل بھی اس کا علم نہیں تھا۔ یہ شہزاد کی کوئی کارستانی ہو تو ہو...... لیکن جب اس سے پوچھا گیا تو اس نے بھی انکار کیا تھا۔''

''مطلب، میرے ساتھ جو ہوا، وہ شہزاد نے کیا اور نہ پنڈ شاہ پور والوں نے۔ تو پھر یہ کون ہو سکتا ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''میں کچھ نہیں کہہ سکتی، ہاں لیکن پوچھ کر بتا سکتی ہوں شاید......'' اس نے بھی تذبذب میں کہا تو ہمارے درمیان موضوع ہی بدل گیا۔ لیکن یہ سوال میرے ذہن میں کہیں اٹک کر رہ گیا۔

اسی شام میں خالد اور ندیم کے ساتھ ڈیرے پر بیٹھا تھا۔ مختلف باتوں کے دوران میں اپنا یہ خیال ان کے سامنے رکھا تو خالد نے کہا۔

''یار تم بھی نا...... کبھی کبھی مجھے لگتا ہے، تم کوئی بے وقوف قسم کے بندے ہو۔ دیکھو میری بات سنو...... دشمن صرف دشمن ہوتا ہے...... کس طرف سے، کیسے وار کرے گا، یہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ تم کیا سمجھتے ہو، اب چوہدری الیاس سے رشتے داری ہو گئی ہے تو وہ تم لوگوں کا خیر خواہ ہو گا؟''

''اوئے وہ رشتے دار ہی نہیں ہوتا جو خیر خواہ ہو۔'' ندیم نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تو خالد بولا۔

''خیر یہ تو ایک مذاق ہے، میں یہ کہتا ہوں...... اب تمہیں زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تمہیں اس بندے کی تلاش ضرور کرنی چاہیے جس کی وجہ سے یہ سب ہوا تھا۔''

''ہاں...... ورنہ یہ خطرہ تیرے سر پر منڈلاتا رہے گا۔'' ندیم نے لقمہ دیا تو میں خاموش ہو گیا۔ اس معاملے میں اب ان سے کیا بات کرنا تھی وہ بھی میری طرح انجان تھے۔

دن یونہی گزرتے جا رہے تھے۔ چونکہ خالد بھی دو ماہ کی چھٹی پر آیا تھا، اس لیے وہ گاؤں میں ہی تھا۔ اس نے ندیم کو بھی کہیں جانے نہیں دیا۔ وہ درمیان میں کبھی کبھی دو چار دن نکال کر کہیں چلا جاتا اور پھر واپس آ جاتا تھا۔ ہمارا ڈیرا ویسے ہی آباد تھا۔ میرے امتحان قریب آ رہے تھے۔ فرحی سے میرا رابطہ تھا۔ ہمارے درمیان یہ طے تھا کہ اب امتحان دینے ہی یونیورسٹی آنا ہے۔ مجھے...... پتا تھا اس کے بھی امتحان ہونے والے ہیں، جو اس کے لیے بہت اہم تھے۔ اس کے بعد اسے باقاعدہ وکیل بن کر اپنے باپ کے ساتھ وکالت کرنی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس بار اگر میں گیا تو بہت وقت ایک ساتھ گزرے گا۔ میں نے سوچا اس کے لیے امتحان زیادہ اہم

ہیں، پھر اس کے بعد تو وقت ہی وقت ہوگا۔ جب چاہیں جتنا وقت ساتھ گزاریں گے۔

ابھی دنوں ایک ولیمے میں شہر جانا تھا۔ ہمارے جاننے والے وہ لوگ پہلے گاؤں ہی میں رہتے تھے، پھر وہ شہر شفٹ ہو گئے تھے۔ گاؤں سے کئی لوگوں کو جانا تھا۔ چونکہ خالد نے بھی جانا تھا، ہمیں بھی دعوت تھی سو میں بھی تیار ہو گیا۔ ہم نے جاتے ہوئے ندیم کو بھی ساتھ لے لیا۔ ولیمے کی دعوت ایک شادی ہال میں تھی جہاں سے رات گئے فراغت ہوئی۔ جیپ ہمارے پاس تھی۔ ہم بڑے اطمینان سے واپس گاؤں کی طرف چل پڑے۔ ہم شہر سے باہر گاؤں جانے والی سڑک پر آئے تو سامنے پولیس کا ناکا لگا ہوا تھا۔ یہاں پر کبھی کبھی عارضی طور پر ناکا لگ جایا کرتا تھا۔ یہ ایک معمول تھا۔ اب اس میں اتنا گھبرانے کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے جیپ لے جا کر ناکے پر روک دی۔ ہیڈ لائٹس ابھی آن تھیں اور جیپ بھی اسٹارٹ تھی۔ میں نے باہر دیکھا تو وہی انسپکٹر رمضان کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ چند پولیس والے تھے۔ اس نے میری طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ یوں جیسے کوئی فتح مندی کا احساس ابھر آیا ہو۔ اس نے مجھے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ میں نیچے اتر آیا تو اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے حقارت سے پوچھا۔

"سنا ہے تم کافی بڑے بدمعاش ہو، لڑکیاں اٹھا لیتے ہو؟"

"میں تمہارے سوال کا جواب نہیں دوں گا کیونکہ یہ ایک فضول سوال ہے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں تلخی آ گئی۔

"دیکھ پتر...... تم لوگوں کی پہنچ جہاں تک بھی ہو، لیکن پانی ہمارے ہی پلوں کے نیچے سے گزرنا ہے۔ میں چاہوں تو ابھی تمہیں حوالات میں لے جا کر بند کر دوں۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"کب تک......؟" میں نے پوچھا۔

"جب تک تمہاری بدمعاشی نہ نکل جائے۔" اس نے سختی سے کہا تو میں نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی کیوں روکا ہے؟"

اس نے جواب دینے کے بجائے ایک تھپڑ میرے منہ پر مار دیا۔ میں سیدھا بھی نہیں ہو پایا تو اس نے دوسرا تھپڑ جڑ دیا۔ میں لمحے میں پیچھے ہٹا تو وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

"اس لیے روکا۔ اور اسی طرح میں تمہاری بدمعاشی نکالتا رہوں گا۔"

اس کا قہقہہ جلتی پر تیل کا کام کر گیا تھا۔ میرا دماغ پھر گیا۔ میں اس پر حملہ کرنے ہی والا تھا کہ خالد نے مجھے پیچھے آ کر پکڑ لیا۔ پھر مجھے گھما کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف دھکیل دیا۔

"لے جا اِسے...... اور سمجھا دے، اس کی بدمعاشی بند ہے آج سے۔"

خالد نے مجھے دھکیل کر سیٹ پر بٹھاتے ہوئے تیزی سے کہا۔

"چل...... چھوڑ اسے...... تو چل...... چل جلدی کر نکل......"

"نہیں یار...... اس سے تو پوچھ کیوں ہاتھ اٹھایا ہے مجھ پر؟" میں نے دہاڑتے ہوئے کہا۔

"مار دے گا مجھے...... آ رک...... میں دیکھوں تیری بدمعاشی...... آ جا سامنے۔" انسپکٹر نے کہا تو میں اپنے پاؤں پر پلٹا۔ میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ تذلیل کے احساس سے میرا دماغ پھٹنے والا ہو گیا تھا۔ خالد مسلسل مجھے سمجھاتے ہوئے دھکے دے رہا تھا۔

"ابھی نہیں اسد...... میری بات سمجھ...... نکل جلدی یہاں سے......"

اس نے مجھے سیٹ پر بٹھا دیا، میں سلگتے دماغ کے ساتھ جیپ کو گیئر لگا کر چل دیا۔ مگر میرا خون مسلسل کھول رہا تھا۔ میں تھوڑا سا آگے گیا تو مجھے خیال آیا، یہ ندیم جیپ کے اندر ہی کیوں بیٹھا رہا، یہ باہر کیوں نہیں آیا؟ میں نے اس کا اظہار کیا تو وہ بولا۔

"میں تمہاری طرح بے وقوف نہیں کہ جا کر اپنی بے عزتی کراؤں۔"

"یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟" خالد نے غصے سے کہا۔

"یہ بکواس نہیں حقیقت ہے۔ جب اِسے پتا تھا کہ سامنے وہی انسپکٹر کھڑا ہے تو اسے نیچے جانا ہی نہیں چاہیے تھا، اِسے دیکھ کر وہ......"

"اس نے اِسے اترنے کے لیے کہا تھا۔" خالد نے کہا۔

"ہاں یہی بات...... غور اس بات پر ہونا چاہیے، اس نے اسے کیوں بلایا، میں شرط لگانے کو تیار ہوں، وہ جان بوجھ کر وہاں کھڑا تھا۔" ندیم نے پورے اعتماد سے کہا تو خالد غصے میں بولا۔

''اب تم پہلے سے بھی بڑی بکواس کر رہے ہو، کیونکہ تمہارے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے کہ تم نیچے کیوں نہیں اترے۔''

''میں نے کہا نا شرط لگا لو، دس منٹ بعد جا کر دیکھنا، کم از کم وہ انسپکٹر وہاں نہیں ہوگا۔'' ندیم نے پھر اسی اعتماد سے کہا۔

''تم ایسے کیوں کہہ رہے ہو؟'' میں نے تلخی سے پوچھا۔

''اس لیے میری جان...... وہ انسپکٹر ڈیوٹی نہیں کر رہا تھا۔ یہ جو کچھ بھی اس نے کیا ہے، ذاتی طور پر کیا ہے۔'' اس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''یار اب میں تمہیں کیا بتاؤں، کئی برس ہو گئے ہیں، انہی پولیس والوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے۔ اب بھی سمجھ نہیں آئے گی۔'' اس نے بھی تلخی سے جواب دیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے وہ جان بوجھ کر وہاں کھڑا تھا، ہمارے انتظار میں کہ ہم وہاں سے گزریں اور وہ ہمیں ذلیل کرے۔'' خالد نے ہتک آمیز لہجے میں کہا۔

''ہاں ایسا ہی تھا۔'' یہ کہہ کر اس نے سانس بھری پھر بولا۔ ''یار میں نے تم لوگوں سے پہلے بھی کہا ہے۔ اسد کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں یہ بندہ لازماً شریک ہے، اس وقت بلی کے گلے میں گھنٹی والی بات کہہ کر میرا کہا نظر انداز کر گئے تھے۔''

''سیدھی بات یہ کہو نا کہ انسپکٹر ہمارے دشمنوں کے ساتھ ملا ہوا ہے؟''

''سو فیصد نہیں ہزار فیصد...... میں ثابت کروں گا۔'' ندیم نے اپنے اسی اعتماد سے کہا تو خالد جھٹ سے بولا۔

''چل ٹھیک ہے، اگر یہ ثابت ہو گیا، تو تم جو چاہو گے میں وہی کروں گا۔''

''یہ گھوڑا اور یہ گھوڑے کا میدان...... ابھی دس پندرہ منٹ بعد واپس چلو، اگر وہ ہوا تو میرے ساتھ جو مرضی کرنا۔'' اس نے اعتماد سے کہا تو میں نے جیپ روک دی۔

جیپ رکنے کے بعد ہم تینوں میں ایک نامعلوم سی خاموشی در آئی۔ میرے اندر کا انسان ذلت برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ مجھے لگا ندیم مجھے چیلنج کر رہا ہے۔ خالد نے کہا۔

''تم پاگل ہو اسد...... اس کمینے...... کی بات پر وہی کرنے جا رہے ہو جو وہ انسپکٹر چاہتا ہے۔''

''خالد...... اگر یہ سچ ہوا تو......؟'' میں نے بڑے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

''تو پھر اس کا کہنا درست ہوگا۔'' اس نے دھیمے سے کہا لیکن اس کے لہجے میں کافی حد تک خوف گھلا ہوا تھا۔ میں نے اگلے ہی لمحے گیئر لگایا اور جیپ موڑنے لگا۔ اگلے دس منٹ میں ہم اسی ناکے پر جا پہنچے۔ میں ایک بار تو ناکے سے سیدھا نکل گیا۔ آگے جا کر جیپ موڑی اور واپس ناکے پر آ گیا۔ میں نے جیپ اس انداز میں روکی کہ ہیڈ لائٹس میں وہاں موجود پولیس والے صاف دکھائی دیں۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں صرف تین کانسٹیبل کھڑے تھے۔ میں نے اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ایک کانسٹیبل کو اشارے سے بلایا۔ وہ قریب آ گیا۔ میں نے بلا جھجک اس سے پوچھا۔

''یہ ناکا کس لیے لگایا ہے؟''

''چیک کرنے کے لیے ...... لیکن آپ جائیں جی......'' اس نے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ظاہر ہے وہ مجھے پہچان چکا تھا۔ دس پندرہ منٹ پہلے ہم یہیں سے تو ذلیل ہو کر گئے تھے۔

''کہاں ہے وہ انسپکٹر......؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ چلے گئے ہیں۔'' اس نے اونچی آواز میں کہا تو میں نے پوچھا۔

''کتنی دیر ہو گئی اُسے گئے ہوئے؟''

''او یار آپ جاؤ...... کیوں ہمارے لیے مشکل بنا رہے ہو، جاؤ۔'' اس کانسٹیبل نے اکتاہٹ سے کہا تو میں نے جیپ بڑھا دی۔

''کیوں، غلط کہا تھا میں نے......؟'' ندیم نے سخت لہجے میں کہا۔

''تمہیں یہ احساس کیسے ہوا؟'' خالد نے پوچھا۔

''یار بات سن...... ساری پولیس ایسی نہیں ہے۔ بہت اچھے اچھے لوگ بھی ہیں اس میں...... لیکن بہت کم تعداد میں ایسے بھی ہیں جو اپنے ذاتی مفاد کے لیے بڑی بڑی قانون شکنی کر جاتے ہیں۔ میرا یقین ہے، یہ بندہ دشمن سے ملا ہوا ہے۔ کیوں، کیسے، کیا مفاد ہے، یہ میں نہیں جانتا۔'' ندیم نے تفصیل سے جواب دیا تو میں نے پوچھا۔

''تیرے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''ابھی تو صرف گھر جانا چاہیے۔ پھر سوچتے ہیں۔'' اس نے کہا تو میں نے جیپ بھگا دی۔ گاؤں پہنچنے تک میں نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا تھا۔ ہمارے درمیان خاموشی تھی۔ ندیم سگریٹ سلگا کر چپ چاپ کش لے رہا تھا۔ میں نے پہلے خالد کو اتارا، پھر جیسے ہی میں نے جیپ بڑھائی تو میں نے ندیم

کی طرف دیکھ کر کہا۔

"مجھے انسپکٹر سے بدلہ لینا ہے؟"

"اس وقت میں تمہاری دماغی حالت سمجھ رہا ہوں لیکن سوچنے بات کرنا آسان ہوتا ہے، اس پر عمل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔" اس نے کہا اور زور سے کش لے کر باقی سگریٹ پھینک دی۔

"اسی لیے تو تم سے کہہ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"دیکھ دو باتیں ہیں، ابھی دونوں بھائی چلتے ہیں، جہاں ملتا ہے، جس جگہ بھی وہ ہمارے ہاتھ لگتا ہے، وہیں اس کا کام کر دیتے ہیں۔"

"اور دوسری بات؟" میں نے پوچھا۔

"تھوڑا اس کے بارے میں پتا کرتے ہیں، کیا کرتا ہے، کدھر جاتا ہے، کوئی موقع دیکھ کر......" اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"تم تو یہاں رہتے نہیں، کیسے پتا کرو گے؟ مجھے بتاؤ میں پتا کروا دیتا ہوں۔" میں نے کہا تو اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بڑے پُرسکون لہجے میں بولا۔

"تم نہیں کر سکو گے، یہ میرا کام ہے مجھے کرنے دو، لیکن اس انسپکٹر کا کام ہو جائے گا، یہ طے ہو گیا۔"

"کیسے کرو گے تم؟" میں نے اصرار کیا۔

"یار یہ جتنے دو نمبر کام ہوتے ہیں، یا دو نمبر کام کرنے والے کے ماتھے پر نہیں لکھا ہوتا، مگر کوئی بھی منشیات خریدنے والا بندہ، جوا کھیلنے والا یا کوئی بھی دھندا کرنے والا، اجنبی جگہ پر بھی جا کر اپنا مقصد حل کر لیتا ہے۔ تم فکر نہ کرو، کل شام تک کوئی اطلاع دوں گا۔" اس نے بڑے اعتماد سے کہا تو میں خاموش رہا پھر چند لمحوں بعد پوچھا۔

"تمہیں رقم بھی چاہیے ہو گی، صبح میں تمہیں......"

"اوئے رقم کو مار گولی۔ ابھی تم جاؤ اور سکون سے سو جاؤ۔ رات بہت ہو گئی ہے، سکون سے سونے کی کوشش کر، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے کہا۔

اتنے میں اُس کا گھر آ گیا تھا۔ میں نے اسے اتارا اور واپس گھر آ کر سونے کی کوشش کرنے لگا مگر میری آنکھوں سے تو نیند اُڑ چکی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ کسی کا بھی سہارا مت لوں۔ ابھی نکلوں، جہاں بھی وہ مجھے ملے، میں اسے اُڑا دوں۔ میں دماغی طور پر پاگل ہو چکا تھا۔

ساری رات پاگلوں کے مانند سوچتا رہا۔ خیالوں ہی خیالوں میں نجانے کیا کچھ کرتا رہا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا۔ اُس رات مجھے پتا چلا ذلت کی اذیت کیا ہوتی ہے۔ انسپکٹر نے جو کچھ کیا تھا، مجھے ذہنی طور پر توڑنے کے لیے کیا تھا۔ اس وقت میں بالکل ٹوٹا ہوا تھا۔ اس وقت میں ایسا گرم لوہا تھا، جسے جس صورت میں بھی چاہیں ڈھالا جا سکتا تھا۔ مجھے کسی پل قرار نہیں آ رہا تھا۔

میں ناشتا کرنے کے بعد تھوڑی دیر ذیشان بھائی کے پاس ٹھہرا، اس سے گپ شپ کے بعد میں ڈیرے پر چلا گیا۔ مجھے ندیم کا انتظار تھا۔ کچھ دیر بعد خالد آ گیا لیکن ندیم کا کہیں پتا نہیں تھا۔ نجانے کیوں مجھے ایک دھڑکا سا بھی لگا ہوا تھا کہ ندیم سے کہیں کچھ غلط نہ ہو جائے۔ ہم سے کچھ بھی نہ ہوا اور ہم دھر لیے جائیں۔ میں نے کئی بار خالد کو بتانے کی کوشش کی لیکن ہر بار رُک گیا۔ کچھ دیر بعد خالد ہی نے مجھے بتایا۔

"وہ صبح صبح میرے پاس آیا تھا، موٹر سائیکل لے کر چلا گیا۔ کہہ رہا تھا، شہر جانا ہے۔"

"یہ نہیں بتایا، کس کام سے گیا ہے؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"نہیں، یہ تو نہیں بتایا، پر اس کا پتا بھی نہیں وہیں شہر میں موٹر سائیکل بیچے اور وہیں سے سیدھا لاہور نکل جائے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے زوردار قہقہہ لگایا تو میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

"چل کوئی بات نہیں، اپنا بچپن کا بیلی ہے، اتنا تو حق بنتا ہے نا اُس کا۔"

شاید میری ہنسی پھیکی تھی اس لیے خالد نے میری طرف دیکھتے ہوئے بڑے گہرے لہجے میں پوچھا۔

"اوئے...... کہیں رات والی بات تم نے دل سے نہیں لگا لی۔"

"سچی بات تو یہ ہے خالد...... وہی مجھے بے چین کیے ہوئے ہے۔" میں نے صاف گوئی سے کہہ دیا۔

"مجھے بھی بہت دکھ ہو رہا ہے، پر ہم کیا کر سکتے ہیں۔" اس نے بے چارگی سے کہا تو مجھے غصہ آنے لگا، میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"یار کرنے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے، بس بندے کا حوصلہ ہونا چاہیے۔ کچھ بھی ہو جائے، میں اسے معاف نہیں کرنے والا۔"

"میں کب کہتا ہوں تم اسے معاف کرو، میری طرف سے ابھی اس کے گولی مار دو یار، لیکن...... اسے گولی مارنے کے بعد اگر خود پھنس جانا ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کہ دشمن کو زندہ رہنا چاہیے۔ اس نے جتنی اذیت

تمہیں دی ہے، کم از کم اس سے کہیں زیادہ وہ ذلت اٹھائے۔ مزہ تو پھر ہے، دشمن مر گیا، بات ختم۔" خالد نے نفرت بھرے لہجے میں کہا تو میری سوچ میں ایک ٹھہراؤ آ گیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا، دشمن کو سزا تو تبھی ملتی ہے نا کہ وہ زندہ رہے۔ شاید ہم اسی موضوع پر مزید بات کرتے مگر ہمارے دوست آ گئے۔ میرا وہاں من نہیں لگ رہا تھا، میں اٹھا اور گھر آ گیا۔ دوپہر کو کھانا وغیرہ کھا کر میں لیٹا تو شام ہونے کو آ گئی۔ سورج مغربی اُفق میں چھپ جانے کی تیاری میں تھا۔

اس وقت میں ذیشان بھائی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میرے سامنے چائے کا مگ رکھا تھا۔ ایسے میں میرا اسیل فون بجا۔ وہ ندیم کی کال تھی۔

"کہاں ہو؟" اس نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

"میں گھر پر ہوں، تم کہاں غائب تھے؟" میرے پوچھنے پر اس نے کہا۔

"اچھا باہر آؤ، میں چار پانچ منٹ بعد تمہارے پاس ہوں گا۔"

اس نے کال بند کر دی تو میں نے جلدی سے چائے حلق میں اُنڈیلی اور باہر نکل گیا۔ میں پھاٹک سے ذرا ہٹ کر کھڑا تھا۔ دو تین منٹ ہی میں وہ آ گیا، مجھے دیکھتے ہی بولا۔

"چل آ بیٹھ پیچھے، کچھ بتانا ہے۔"

میں نے کوئی سوال نہیں کیا اور اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ وہ مجھے گاؤں سے باہر ایک کھیت کنارے لے گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہاں جا کر میں نے کہا۔

"اتنی احتیاط کر رہا ہے، کوئی ایسا ہی راز ہے کیا؟"

"یار بہت کام کی بات ہاتھ لگی ہے، اگر ہم چاہیں تو آج رات ہی انسپکٹر کو پکڑ سکتے ہیں۔"

"کیا مطلب تمہارا؟" میں نے پوچھا۔

"شہر میں ایک بندہ چھادا دلال، میرا پرانا واقف کار ہے۔ میرے پاس لاہور میں بھی رہا ہے۔ بڑے کام کا بندہ ہے۔ جب سے یہاں آیا ہوں، اس سے کافی ملاقاتیں رہی ہیں۔ آج بھی میں اسی کے پاس گیا تھا۔"

"اچھا پھر......؟" میں نے پوچھا۔

"اس سے یہ پتا چلا ہے کہ وہ ایک طوائف کے گھر جاتا ہے۔ اس طوائف کو اس نے اپنی باندی بنا لیا ہے، وہی اس کا خرچہ پانی چلاتا ہے، طوائف کا سارا کام ٹھپ ہو گیا ہے۔ وہ پھنسی پڑی ہے اس انسپکٹر کے پاس۔" اس نے تفصیل سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے، ہم وہیں......" میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹ کر تیزی سے بولا۔

"ہاں، جو بھی کرنا ہو، وہیں جا کر ہم اس کا کام تمام کر سکتے ہیں۔"

"اچھا ایک بات بتاؤ، اس نے اتنی آسانی سے تمہیں یہ ساری تفصیلات کیسے دے دیں؟ کیا وہ......" میں نے سوچتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"اسے میں نے کون سا بتایا ہے کہ میں انسپکٹر کے بارے میں پوچھ رہا ہوں، وہ تو اپنا ہی دکھڑا سنا رہا تھا، اس کا بھی تو سارا کام ٹھپ پڑا ہے۔ وہ تو مجھے یوں لگا جیسے اس کی ذاتی دشمنی ہو۔" ندیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ذاتی دشمنی ہو سکتی ہے۔" میں نے کاندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔

"ہاں نا، سارا کاروبار ٹھپ ہے ان کا، بھتا الگ، بدمعاشی الگ۔" اس نے کہا تو میں نے ایک دم سے پوچھا۔

"کب جاتا ہے؟"

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا پھر دبے دبے جوش سے بولا۔ "یہی تھوڑی دیر بعد۔"

"چل ٹھیک ہے، آ جا چلتے ہیں۔"

اس نے مجھے گھر چھوڑا اور اپنے گھر چلا گیا۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ اس میں جذبات اُبلتے رہتے ہیں، کبھی کوئی جذبہ غالب آ جاتا ہے تو کبھی کوئی۔ اس وقت مجھے احساس ہی نہیں تھا کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں۔ مجھ پر ایک احساس چھایا ہوا تھا کہ میں نے اس انسپکٹر سے اپنی تذلیل کا بدلہ لینا ہے اور بس...... پھر اس کے بعد کیا ہوگا، وہ دیکھا جائے گا۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، تھانے میں بلا کر تھپڑ مار دیے، وہ بھی بلاوجہ۔ اس میں کسی کا قصور نہیں، ہم نے اپنے معاشرتی سیٹ اَپ میں یہ قبول کر لیا ہے، ایسی تذلیل کو ہم برداشت کرتے آئے ہیں، دوسری طرف تھانہ کلچر کو پروموٹ کرنے والا ایک گروہ ہمارے معاشرے ہی میں موجود ہے۔ یہاں تک کہ ہم نے اسے ذہنی طور پر قبول کر لیا ہے۔

کوئی دوسرا وقت ہوتا تو شاید میں اس کی بات پر یقین بھی نہ کرتا، سو طرح کے سوال کر کے کسی طرح تصدیق کرتا، کسی سے کوئی مشورہ کر لیتا۔ لیکن اس وقت میرے دماغی حالت کچھ عجیب سی تھی۔ میں اپنی تذلیل پر مر جانے کو ترجیح دے رہا تھا۔ میں نے یہ رسک بھی اسی لیے لے لیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا کہ میں مر جاؤں گا، مرتا ہوں تو مر جاؤں کوئی بات نہیں لیکن اس سے اپنا بدلہ ضرور لینا ہے۔

گاؤں سے باہر ندیم میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں اس کے

ساتھ چل پڑا۔ شہر تک پہنچنے میں ہمیں آدھے گھنٹے سے بھی زیادہ وقت لگ گیا۔ ہم نے اس گلی میں ایک چکر لگایا جہاں وہ طوائف رہتی تھی۔ گلی میں لگے ہوئے اسٹریٹ لائٹ کے پول سے روشنی آرہی تھی لیکن گلی میں اتنا اندھیرا تھا کہ فوری طور پر کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ وہ علاقہ نیا بنا ہوا تھا، اس میں چھوٹی چھوٹی کوٹھی نما گھر تھے۔ اسی گھر کے باہر کار کھڑی تھی جو اس بات کی نشاندہی کر رہی تھی کہ انسپکٹر اندر موجود ہے۔ دوسرے چکر پر ندیم نے موٹر سائیکل اس گھر کے پاس روک دی۔ وہ موٹر سائیکل سے اترا اور دروازے کو ہلکا سا دبایا، وہ اندر سے بند تھا۔ وہ ایک دم سے پریشان ہو گیا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا، پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

''تم ذرا کار کے پیچھے ہو جاؤ، میں بیل بجانے لگا ہوں۔ جو بھی آجائے، تم اس وقت باہر آنا جب میں اندر جاؤں۔''

کچھ کہے بغیر میں کار کی اوٹ میں ہو کر نیچے بیٹھ گیا۔ یہاں سے دروازہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بیل بجا دی۔ تقریباً تین منٹ یونہی گزر گئے۔ اندر سے کوئی نہیں آیا، ندیم نے دوسری بار بیل بجا دی۔ تبھی اندر سے کھٹکا ہوا۔ پھر گیٹ تھوڑا سا کھل گیا۔ چوکھٹ میں انسپکٹر کھڑا تھا۔ اس نے ندیم کو سر سے پاؤں تک دیکھا تو ہولے سے ندیم نے کہا۔

''سر جی، آپ یہاں سے فوراً نکل جائیں۔

''او خیر ہے؟ تم کون ہو؟'' اس نے تھوڑی حیرت اور زیادہ بارعب لہجے میں پوچھا۔ اس کی آواز کی لڑکھڑاہٹ سے میں پہچان گیا کہ وہ نشے میں ہے۔ تبھی ندیم نے ہولے سے کہا۔

''سر جی میں اسی محلے کا ہوں، کچھ دیر بعد محلے والے یہاں آنے والے ہیں، وہ کوئی غلط ملط پلان کر رہے تھے، میں نے سوچا کہ آپ کو خبردار کر دوں۔''

اس کا اتنا کہنا ہی تھا کہ انسپکٹر ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے ندیم کو اندر بلانے کے لیے اشارہ کیا تو ندیم بلا جھجک اندر چلا گیا۔ اس نے گیٹ سے ہٹ کر پوچھا۔

''کون لوگ ہیں جو غلط ملط پلان بنا رہے ہیں، کیا پلان ہے؟''

ندیم کے اندر جاتے ہی میں بھی اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔ اور تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔ میں نے جاتے ہی اس کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا، شاید میرے اندر جوش زیادہ بھر گیا تھا۔ میں نے پے در پے تھپڑ گھونسے مارنے شروع کر دیے۔ دو چار لمحوں کے بعد اسے بھی مزاحمت کی سوجھی، اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے اپنا ہاتھ ایک جھٹکے سے چھڑایا اور اسے گھما کر دیوار پر دے مارا۔ وہ ابھی سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ میں نے پھر اسے پکڑا اور دیوار میں سر مار دیا۔ وہ پیچھے ہٹا تو اس کا چہرہ خون سے بھر چکا تھا۔ وہ بڑا بھیانک لگ رہا تھا۔ وہ فرش پر گر گیا۔ میں نے اسے گردن سے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے پورے جوش سے میرا ہاتھ پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ آخر وہ بھی تربیت یافتہ تھا، میں گرتے گرتے بچا، اس وقت تک اس نے مجھے بازو سے پکڑ لیا تھا۔ اس کا خون میں نے اپنے ہاتھوں پر محسوس کیا، وہ مجھے نیچے گرانے کی کوشش میں تھا، میں نے اس کے دونوں...... ہاتھوں کو مروڑا، پھر پلٹ کر اسے گھمایا اور گیٹ میں دے مارا۔ ایک چھناکا ہوا، میں نے زور سے ٹھوکر اس کی پسلیوں میں ماری تو وہ گیٹ کے ساتھ گھسٹتا ہوا نیچے کی طرف ہوتا چلا گیا۔ اس وقت تک ندیم داخلی دروازے کو باہر سے بند کر چکا اور میں اسے گھسیٹ کر تھوڑا اندھیرے میں لے آیا۔ تبھی میں نے پسٹل نکالا اور اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

''بول، اس کا نام بتا جس کے کہنے پر تو یہ ساری بے غیرتی کر رہا ہے۔''

''تت...... تیرے ساتھ...... بہت بُرا...... ہونے والا ہے۔'' اس نے اٹکتے ہوئے کہا تو میں بولا۔

''مگر تو بھی نہیں سوچ سکتا، تیرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔''

''کیا کر لے گا تو؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔

''وہ سب، جو تو نے ابھی نہیں سوچا۔'' میں نے یونہی کہہ دیا۔ ''تیرے بیوی بچے اور ماں باپ بھی ہیں نا، نہیں بتائے گا تو ان سے پوچھ لیں گے، پر تیری بے غیرتی کا پورا بدلہ لیں گے۔'' میں نے ہولے سے کہا تو اس نے چونک کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں پھیل چکی تھیں۔

''جلدی بتا......'' میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، اندر سے دروازہ بجنے کی آوازیں آنے لگیں، اس کے ساتھ ہی کوئی عورت پکارنے لگی تھی، بلاشبہ وہ طوائف ہی ہو سکتی تھی۔ میں نے ندیم کی طرف دیکھا، وہ آنکھیں پھاڑے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اگر اس عورت نے شور مچا دیا تو...... یہی سوال ہم دونوں کے دماغ میں گونج رہا تھا۔

دشمنی کے رازداں دشمن کون تھے،
باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیں

زندگی کے روزمرہ کے اُمور نبھانا کبھی کبھی انتہائی کٹھن ہو جاتا ہے۔ اس علاقے کے لوگ بھی اپنے کاروبار میں ہونے والے نقصان سے پریشان تھے اور کسی بھی طرح کا تدارک چاہتے تھے... مگر انتظامیہ ان کا مطالبہ ماننے کے لیے تیار نہ تھی... اپنا مزید نقصان کرتے ہوئے انہوں نے ایک دوسرا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا...

زمانۂ ماضی سے جڑے وہ عکس جو وقت کی دھول میں پھر اُبھر آئے تھے......

عکسِ ماضی

سیریناراض

ہال نُما کمرے میں ڈیری فارمز کے مالکان کا ہنگامی اجلاس جاری تھا۔ اس وسیع وعریض کمرے میں دو درجن سے زیادہ افراد موجود تھے لیکن اُن میں سے کسی ایک کے چہرے پر بھی اطمینان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک تو باہر کی فضا میں حدّت اور حبس کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اس پر شرکائے اجلاس کے دل و دماغ کا درجۂ حرارت بھی کافی بڑھا بلکہ چڑھا ہوا تھا۔ دودھ کے تقسیم کار (ڈسٹری بیوٹرز) کے ایک چھوٹے سے مطالبے نے ڈیری فارمز کے مالکان کو اشتعال انگیز جیسی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا جس کے نتیجے میں وہ ایک

اہم میٹنگ بلانے پر مجبور ہو گئے تھے تاکہ اس مسئلے کا کوئی حل نکالا جاسکے۔

یہ واقعہ آج سے ستتر سال پہلے کا ہے لہٰذا دودھ کی مقدار اور قیمت کو لے کر اپنے دماغ کو الجھانے کی ضرورت نہیں۔ مارچ انیس سو سینتالیس میں امریکی ریاست لوزیانا کے شہر نیواورلینز کے ملک ڈسٹری بیوٹرز نے ڈیری فارمز کے مالکان سے مطالبہ کیا کہ انہیں ہنڈریڈ ویٹ (کم و بیش ساڑھے پینتالیس لیٹرز) دودھ پر پونا ڈالر (پچھتر سینٹ) کی رعایت دی جائے۔ پہلے انہیں دودھ کی مذکورہ مقدار پونے چھ ڈالرز میں مل رہی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ اس قیمت کو گھٹا کر پانچ ڈالرز کر دیا جائے۔ یہ کوئی اتنا بڑا مطالبہ نہیں تھا کہ جس کے ردِعمل کے طور پر بدامنی اور قانون شکنی کی صورتِ حال پیدا کر دی جائے۔

نیواورلینز سے شروع ہونے والے اس ہنگامے نے دیکھتے ہی دیکھتے جنگل کی آگ کے مانند نیواورلینز کے بعد امائیٹ، پرش، ٹیمن جیسا ہو الغرض، پورے لوزیانا ہی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہال میں موجود ہر شخص کے چہرے پر تناؤ اور آنکھوں سے، ملک ڈسٹرک بیوٹرز کے لیے غصہ جھلکتا تھا۔

"یہ لوگ میرے بچوں کے منہ کا نوالہ چھیننے کی سازش کر رہے ہیں......!" عمر رسیدہ رے فورڈ کوپر نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

رے فورڈ کی اپنی اولادیں چالیس کا ہندسہ عبور کر چکی تھیں۔ "بچوں" سے اس کی مراد ان کے بچے تھی۔

"ہماری خاموشی ان کا حوصلہ بڑھا سکتی ہے۔" فلیچر کروئی نے تپے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہمیں فوری طور پر کوئی سخت قدم اٹھانا ہوگا۔"

"ہم ان کے مطالبے کا منہ توڑ جواب دیں گے۔" مرلے واکر نے بڑے عزم سے کہا۔ "ہم چپ بیٹھنے والوں میں سے نہیں ہیں۔"

"بس...... تو طے ہو گیا۔" فلیچر کروئی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "ہم اسٹرائیک پر جا رہے ہیں۔"

"بالکل...... ہمیں یہی کرنا چاہیے۔" رے فورڈ نے فلیچر کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "اس مسئلے کا واحد حل ہڑتال ہی ہے اور وہ بھی غیر معینہ مدت تک......!"

اس گرما گرم میٹنگ میں شریک تمام ڈیری فارمز مالکان نے اسٹرائیک پر اتفاق کر لیا۔

اس اجلاس کے اختتام پر جین پریئر (جے پی) نے مرلے واکر کے شانے پر ہاتھ رکھ کر گہری سنجیدگی سے کہا۔

"مرلے! جب میں اس طرف آ رہا تھا تو اس بلڈنگ کے باہر میں نے تمہاری بہن کو کھڑے دیکھا تھا۔ اسے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

مرلے نے چونک کر جے پی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "کس قسم کی مدد؟"

"تم باہر جا کر خود اُس سے پوچھ لو۔" جے پی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "اس کی حالت ٹھیک نہیں۔ وہ کسی پریشانی میں لگتی ہے......!"

مرلے نے پست قامت جے پی سے استفسار کیا۔ "کیا وہ میرا انتظار نہیں کر سکتی؟"

"میرے خیال میں نہیں۔" جے پی نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "تمہیں فوراً اس کے پاس جانا چاہیے۔"

مرلے، جے پی کو بچپن سے جانتا تھا۔ کیپل فارم ہاؤس کے بزنس میں بھی وہ ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ اس نے جے پی کی بات کو سنجیدگی سے لیا اور میٹنگ والی بلڈنگ سے باہر نکل کر اپنی بہن روتھ کے پاس پہنچ گیا اور...... روتھ کی حالت کو دیکھ کر اسے ذہنی دھچکا لگا۔

روتھ کی آنکھوں کے آس پاس مار پیٹ کے سیاہ اور نیلے نشانات نظر آ رہے تھے اور اس کی ناک کے نچلے حصے میں خون کی پپڑی بھی دکھائی دے رہی تھی۔

"یہ سب کیا ہے روتھ؟" مرلے نے انتہائی دکھ سے پوچھا۔

"پچھلی رات کلیٹس جب گھر آیا تو وہ نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔" روتھ نے جواب دیا۔ "اس کے بعد کیا ہوا ہوگا، تم اس کا اندازہ لگا سکتے ہو۔"

کلیٹس ہینڈری، روتھ کا شوہر تھا۔ وہ ایک ایسی فیکٹری میں کام کرتا تھا جہاں لکڑی کے حوالے سے کئی شعبے تھے اور اس کی ڈیوٹی آرا مشین پر تھی۔ یہ خاصی ٹف جاب تھی۔ وہ اس کام سے جتنا تھکتا، اتنی ہی زیادہ شراب نوشی کرتا اور اس کے بعد جوا کھیلنا بھی اس کے روزمرہ میں شامل تھا۔ وہ اپنی کمائی کو جوئے اور شراب کی نذر کر دیتا تھا۔ نتیجتاً گھر میں مار پٹائی بھی معمول کا حصہ تھی۔

"میں جب بھی اس سے پیسوں کی بات کرتی ہوں تو اسے بہت غصہ آتا ہے۔" روتھ نے زخمی لہجے میں بتایا۔ "وہ بالکل پاگل ہو جاتا ہے اور پھر......!"

"کیا اس سے پہلے بھی کلیٹس نے کبھی تمہاری اتنی بُری حالت کی ہے؟" مرلے نے اپنے غصے کو ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"نن...... نہیں!" وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔

''اتنی بیدردی سے کبھی نہیں...... ایسا پہلی بار ہوا ہے۔''
''کلیٹس اس وقت کہاں ہے؟''
''مجھے نہیں معلوم......'' روتھ نے جواب دیا۔ ''وہ صبح گھر سے نکل گیا تھا۔ اس نے کچھ بتایا نہیں اور میں نے بھی پوچھنا ضروری نہیں سمجھا۔ زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ وہ فیکٹری گیا ہوگا تاکہ اپنی شراب اور جوئے کے لیے تھوڑے پیسے کما لے۔''

روتھ کا ایک، ایک لفظ درد میں ڈوبا ہوا تھا۔ مرلے نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر چابیوں کا گچھا برآمد کیا۔ ''میری گاڑی اس بلڈنگ کی عقبی جانب پارکنگ میں کھڑی ہے۔'' وہ چابیوں کے گچھے کو روتھ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اس میں گاڑی اور گھر دونوں کی چابیاں ہیں۔ تم آنائی گھر جا کر اپنے کمرے میں آرام کرو۔ اس منحوس کے سیلن زدہ کابک میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''میں اگر یہ گاڑی لے جاؤں گی تو آپ گھر کیسے آؤ گے؟''

''یہاں والی میٹنگ کا ایک مرحلہ تو گزر گیا ہے لیکن بہت سا کام باقی ہے۔'' مرلے نے بتایا۔ ''ہم لوگوں نے اس میٹنگ میں جو فیصلہ کیا ہے، اسے عملی جامہ پہنانے کی منصوبہ بندی کرنا ہے۔ جے پی بھی اندر موجود ہے۔ وہ اپنی گاڑی میں مجھے ڈراپ کردے گا۔ تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

روتھ نے مرلے کے ہاتھ سے چابیاں لیں اور کہا۔ ''آپ اپنا خیال رکھنا۔''

''بالکل رکھوں گا۔ اپنے ساتھ، ساتھ تمہارا بھی!'' مرلے نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''مجھے گھر آنے میں دیر ہو جائے گی۔ تم کھانا کھانے کے بعد آرام سے سو جانا۔ اس تلخ موضوع پر ہم کل صبح بات کریں گے۔''

روتھ نے اثبات میں گردن ہلائی اور پارکنگ کی سمت بڑھ گئی۔ مرلے واپس اس بلڈنگ میں آ گیا جہاں جے پی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ مرلے پر نگاہ پڑتے ہی جے پی نے پوچھ لیا۔

''روتھ کو کیا ہوا ہے؟'' اس کے استفسار سے تشویش جھلکتی تھی۔

''اسی بدذات کلیٹس کا ایشو ہے۔'' مرلے نے کڑوے لہجے میں جواب دیا۔ ''پچھلی رات کلیٹس نے روتھ پر تشدد کیا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں ہو رہا۔ ابھی تو میں نے روتھ کو اپنے گھر بھیج دیا ہے۔ کل صبح اس کے مسئلے کا کوئی پائیدار حل نکالوں گا۔''

''میں تمہاری تکلیف اور روتھ کے لیے تمہارے جذبات کو سمجھ سکتا ہوں مرلے!'' جے پی نے اپنائیت بھرے انداز میں کہا۔ ''کلیٹس دراصل لاتوں کا بھوت ہے اور تم تو جانتے ہی ہو کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔''

''ہاں، میں جانتا ہوں۔'' مرلے نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''اس اسٹرائیک کو پہلے کامیاب بنالیں۔ اس کے بعد کلیٹس کو بھی میں دیکھ لوں گا۔''

ڈیری فارمز کے مالکان کی یونین کی یہ میٹنگ امامیٹ کی ایک عمارت میں رکھی گئی تھی۔ امامیٹ کی اپنی ایک جغرافیائی حیثیت تھی۔ یو ایس ہائی وے ففٹی ون اور ایلی نوائے سینٹرل ریلوے کی لائن امامیٹ کے اندر سے ہو کر گزرتی تھیں۔ وہ لوگ ان دونوں نقل و حمل کے راستوں کو اپنے قبضے میں لا کر، شمالی علاقوں سے آنے والے دودھ کو بہ آسانی نیو اورلینز کی طرف جانے سے روک سکتے تھے۔

زبانی میٹنگ کے بعد انہوں نے اسٹرائیک کے حق میں باقاعدہ پولنگ بھی کرا ڈالی تھی تاکہ اگر کسی کے دماغ میں کچھ اس منصوبے کے برعکس چل رہا ہو تو اسے سامنے لایا جا سکے۔ قصہ مختصر، وہ لوگ ایک حتمی فیصلے تک پہنچ گئے کہ...... دودھ اور دودھ سے بنی ہوئی کسی بھی پروڈکٹ کو اس وقت تک نیو اورلینز میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا جب تک ان کی اسٹرائیک نتیجہ خیز ثابت نہ ہو جائے یعنی...... ملک ڈسٹری بیوٹرز اپنے مطالبے سے باز آ جائیں۔

دودھ کے ڈسٹری بیوٹرز نے ساڑھے پینتالیس لیٹرز یعنی ''ہنڈریڈ ویٹ'' دودھ پر صرف پچھتر سینٹ (پونا ڈالر) کی رعایت کا مطالبہ کیا تھا۔ نیو اورلینز کے ملک ڈسٹری بیوٹرز کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ڈیری فارمز کے مالکان کی یونین اس مطالبے کو اپنی انا کا مسئلہ بنا کر لوزیانا اسٹیٹ میں دودھ اور دودھ سے تیار ہونے والی تمام مصنوعات کی ترسیل اور تقسیم کو ناکام بنانے کی دُھن میں اپنا اور دوسروں کا عظیم نقصان کر بیٹھیں گے۔

پُرتشدد ہڑتالی بھلا مثبت انداز میں کہاں سوچتے ہیں!

☆☆☆

مرلے واکر اور جین پر یئر لابلینک عرف جے پی کی دوستی بہت پرانی تھی۔ وہ دونوں ایک ساتھ پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے اور ان کے فارم ہاؤس بھی ایک دوسرے کے نزدیک ہی تھے۔ پہلے ''واکر ڈیری فارم'' آتا تھا اور اس

کے بعد، سڑک کی دوسری جانب ''لابلینک ڈیری فارم'' واقع تھا۔ اس وقت وہ دونوں جے پی کی گاڑی میں میٹنگ بلڈنگ سے اپنے فارمز ہاؤس کی طرف جارہے تھے۔ گاڑی کے اسٹیئرنگ پر جے پی کا قبضہ تھا۔

''روتھ کو گلیئس سے شادی نہیں کرنا چاہیے تھی۔'' جے پی نے مرلے کی جانب دیکھے بغیر گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''وہ کوئی اچھا انسان نہیں ہے۔''

''میرے والدین نے روتھ کو روکنے کی بہت کوشش کی تھی۔'' مرلے نے ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس سرپھری لڑکی نے ان کی ایک نہیں سنی۔''

''اور تم نے اس موقع پر کیا کردار ادا کیا تھا؟'' جے پی نے پوچھا۔ ''تمہارا فرض تھا کہ اس ناداں لڑکی کو ایسی غلطی کرنے سے روکتے...... اس گلیئس کے بارے میں بتاتے اور سمجھاتے۔''

''میں کچھ بھی نہ کرسکا۔'' مرلے نے افسوس ناک انداز میں کہا۔ ''میں ان دنوں جولین کے چکر میں پھنسا ہوا تھا۔ گھر میں کیا ہورہا ہے، مجھے اس کی پروا نہیں تھی لیکن جب جولین مجھے ٹھینگا دکھا کر ایک امیر سیلز مین کے ساتھ چلی گئی تو میرے دماغ نے نارمل انداز میں سوچنا شروع کیا مگر اس وقت تک بہت دیر ہوچکی تھی۔''

''جولین......!'' جے پی نے سوچ میں ڈوبے لہجے میں کہا۔ ''میں نے سنا ہے، اب وہ چار بچوں کی ماں ہے!''

''اچھا ہی ہوا کہ جولین مجھے چھوڑ کر اس دولت مند سیلز مین کی بیوی بن گئی۔'' مرلے نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''اگر اس کے یہ چار بچے مجھ سے ہوتے تو ''واکر ڈیری فارم'' میں میرا ہاتھ بٹا رہے ہوتے۔ گائے، بھینس کا دودھ نکالنا اور ان کے گوبر کو ٹھکانے لگانے سے تو بہتر ہے کہ وہ پڑھ لکھ کر کسی اور صاف ستھرے بزنس میں چلے جائیں گے۔''

''تمہاری ہمت ہے کہ تم اپنے والدین کے بغیر ہی اکیلے اس ڈیری فارم کو سنبھالے ہوئے ہو......'' جے پی نے کہا۔ ''یہ کوئی آسان کام نہیں ہے مرلے اور...... یہ حقیقت ہم دونوں ہی جانتے ہیں۔''

''جے پی! تم خوش قسمت ہو کہ تمہارے والدین زندہ ہیں اور ان کا سایہ تم پر موجود ہے۔'' مرلے نے حسرت بھرے انداز میں کہا۔ ''ماں، باپ کا ساتھ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو مرلے!'' جے پی نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ایک معاملے میں، میں خاصا بدقسمت واقع ہوا ہوں۔''

''کون سا معاملہ؟'' مرلے نے چونکتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''ابھی تک میری شادی نہیں ہوئی۔''

''اس کا کوئی خاص سبب؟'' مرلے نے پوچھا۔

''کافی عرصے پہلے کی بات ہے، مجھے ایک لڑکی سے محبت ہوگئی تھی۔'' جے پی نے خواب ناک لہجے میں جواب دیا۔ ''لیکن اس نے کسی اور مرد سے شادی کرلی اور...... مجھے آج تک موقع نہیں ملا کہ اسے بتا سکوں، اس سے بچھڑ کر میں کتنا اداس، کتنا اکیلا ہوگیا ہوں۔''

''مجھے یہ موقع ملا تھا......'' مرلے نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے جولین کو بتایا تھا کہ اگر وہ مجھے نہ ملی تو میں اس کے بغیر کیسا محسوس کروں گا۔ اس نے میرے جذبات کا مذاق اڑایا اور اگلی ہی صبح وہ میرے ارمانوں کو کچل کر اس سیلز مین کی قیمتی گاڑی میں بیٹھ کر ہمیشہ کے لیے مجھے چھوڑ گئی۔''

''تمہاری لو اسٹوری ایک دوسرے سے کافی ملتی جلتی ہے۔'' جے پی نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اس موضوع پر ہم پھر کبھی تفصیل سے بات کریں گے۔ تمہارا فارم ہاؤس آگیا ہے۔''

مرلے واکر نے جے پی کا شکریہ ادا کیا اور اس کی گاڑی سے اتر کر اپنے گھر کی جانب بڑھ گیا۔

وہ دومنزلہ فارم ہاؤس مرلے کے لیے بہت زیادہ اہمیت کا حامل تھا کیونکہ اس کی اور روتھ کی پیدائش اسی گھر میں ہوئی تھی۔ یہ ایک طرح سے اس کے والدین کی آخری نشانی بھی تھی مگر ان کی وفات کے بعد وہ بالکل اکیلا ہوگیا تھا۔ روتھ پہلے ہی گلیئس سے شادی کرکے یہاں سے جاچکی تھی۔ آخری مرتبہ اس گھر میں ایک سال پہلے کچھ لوگ دیکھے گئے تھے جو اس کے والدین کی آخری رسومات کے لیے وہاں جمع ہوئے تھے۔ اب کبھی کبھار جے پی کافی پینے کے لیے تھوڑی دیر مرلے کے پاس رک جایا کرتا تھا اور بس......!

مرلے نے گھر کے اندر پہنچنے کے بعد سب سے پہلے روتھ کا جائزہ لیا۔ وہ اپنے کمرے میں سکون سے سو رہی تھی۔ وہ اپنی بہن کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

ناشتے کی میز پر مرلے اور روتھ ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔ ناشتا روتھ نے تیار کیا تھا اور کچن کی جانب سے اٹھنے والی اشتہا انگیز خوشبو نے مرلے کو بیدار ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

''مما کے جانے کے بعد آج پہلی بار میں کسی کے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کر رہا ہوں۔'' مرلے نے کہا۔ ''اور یہ سب مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ تمہیں واپس گھر آ جانا چاہیے......''

''تاکہ تمہارے لیے کھانا بنا سکوں؟'' روتھ نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''کھانا بنانا تو ایک ثانوی معاملہ ہے۔'' مرلے نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں تمہیں کلیٹس کے ظلم و ستم سے محفوظ کرنا چاہتا ہوں اور اس طرح تم فارم ہاؤس کے کام میں میری مدد بھی کر سکو گی۔''

''آپ میرے معاملات کو نہیں سمجھتے......'' روتھ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''ہاں...... شاید......!'' مرلے نے سرسری انداز میں کہا۔

اس کے بعد روتھ کے استفسار پر مرلے نے اسے اسٹرائیک کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ پوری بات سننے کے بعد روتھ نے کہا۔

''آپ یہ خطرہ مول کیوں لے رہے ہو؟''

''کون سا خطرہ؟'' مرلے نے اُلجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

''اس اسٹرائیک سے پورے علاقے کا امن و امان برباد ہو جائے گا اور یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہو......''

''اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔'' مرلے نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ ''یہ ڈیری فارم ہمارے والدین نے دن رات کی کڑی محنت کے بعد کھڑا کیا تھا روتھ۔ ہمیں اس کاروبار کو مزید آگے لے کر جانا ہے اور لالچی تقسیم کار ہمارے بزنس کو تباہ کرنے پر تُلے بیٹھے ہیں۔ ایک بات اور......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''اگر آج میں اپنے حق کے لیے کھڑا نہیں ہوں گا تو ڈیڈی کی روح کو بہت تکلیف ہو گی۔ تمہیں معلوم ہے نا، ہمارے والدین نے ہمیشہ حق اور سچ کا ساتھ دیا تھا۔''

قبل اس کے کہ روتھ، مرلے کی وضاحت کے جواب میں کچھ کہتی، ڈرائیو وے میں کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ مرلے نے اپنی سیٹ چھوڑ دی اور داخلی دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ اس دوران میں گاڑی والا مذکورہ دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں، مرلے کا بہنوئی کلیٹس ہینڈری تھا۔

''کیا میری بیوی یہیں پر ہے؟'' کلیٹس نے مرلے کو دیکھتے ہی سوال کر دیا۔

کلیٹس ہینڈری قد میں مرلے واکر سے کہیں زیادہ تھا جیسا کہ مرلے اپنے دوست جے پی سے۔ مرلے نے گردن اٹھا کر کلیٹس کو دیکھا اور بیزار کن لہجے میں کہا۔

''روتھ تم سے ملنا نہیں چاہتی۔''

''اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے میں ہوں نا......!'' کلیٹس نے مرلے کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اُسے پیچھے دھکیلا۔ ''میاں، بیوی کے معاملات میں دخل دینے والے تم کون ہوتے ہو؟''

کلیٹس کے دھکے نے مرلے کا توازن بگاڑ دیا۔ وہ لڑکھڑایا اور دو قدم پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا۔ اس اثنا میں روتھ بھی باہر نکل آئی تھی۔ اس نے کلیٹس کو مرلے سے اُلجھتے دیکھا تو اپنے بھائی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا۔

''بھائی! اب ٹھیک ہے۔ آپ اندر جاؤ......!''

مرلے نے مڑ کر اپنی بہن کی آنکھوں میں دیکھا اور بے یقینی سے پوچھا۔ ''کیا تم کلیٹس کے ساتھ جانا چاہتی ہو؟''

روتھ نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''تم نے تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ میں تمہارے معاملات کو نہیں سمجھتا۔'' مرلے نے شکایت بھری نظر سے روتھ کو دیکھا۔ ''شاید تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔'' پھر وہ اپنے بہنوئی کو مخاطب کرتے ہوئے بآوازِ بلند بولا۔

''کلیٹس! اگر آئندہ کبھی تم نے میری بہن پر ہاتھ اٹھایا تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہو گا۔''

''کیا کرو گے تم؟'' کلیٹس نے تپانے والے انداز میں پوچھا۔

''میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔'' مرلے نے واشگاف الفاظ میں جواب دیا۔

کلیٹس نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا اور تحقیر آمیز انداز میں کہا۔ ''یہ کام تمہارے بس کا نہیں ہے مرلے......!''

مرلے بے بسی سے اسے گھور کر رہ گیا۔

☆☆☆

گزشتہ روز والی میٹنگ میں یہی طے پایا تھا کہ آج صبح سات بجے نیواورلینز کی طرف جانے والے تمام راستوں پر ناکابندی کر کے ایک، ایک گاڑی کو چیک کیا جائے گا اور اس امر کو یقینی بنایا جائے گا کہ دودھ اور دودھ سے تیار کردہ اشیا کو نیواورلینز جانے سے روکا جائے۔

آج صبح کلیٹس کی آمد اور روتھ کی بات نے مرلے کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ اس نے اپنے مویشیوں کے کھانے پینے کا مناسب بندوبست کیا اور جے پی کو ریلیف دینے کے لیے ''سائٹ'' پر پہنچ گیا۔ جے پی صبح سات بجے سے وہاں ڈیوٹی دے رہا تھا۔

''ابھی تک تو معاملات ٹھیک چل رہے ہیں۔'' جے پی نے رپورٹ پیش کرنے والے انداز میں بتایا۔ ''یونین کے ڈرائیورز نے تو آج اپنے ٹرک نکالے ہی نہیں ہیں۔ ان کی ہمدردیاں پوری طرح ہمارے ساتھ ہیں اور جو دوسرے ڈرائیورز ہیں، وہ بھی ہمارے لیے کوئی مشکل کھڑی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔''

''تمہارے خیال میں ہماری اسٹرائیک کامیاب جارہی ہے؟'' مرلے نے پوچھا۔

''قبل از وقت کچھ کہنا مناسب نہیں ہوگا۔'' جے پی نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر وہ موضوع تبدیل کرتے ہوئے مرلے سے مستفسر ہوا۔ ''روتھ اب کیسی ہے؟''

''وہ بدذات صبح ہی صبح آدھمکا تھا۔'' مرلے نے بُرا سامنہ بناتے ہوئے جواب دیا۔ ''وہ روتھ کو لے گیا ہے۔''

''تمہیں روتھ کو اس کے ساتھ نہیں جانے دینا چاہیے تھا۔'' جے پی نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''تم جانتے ہو، کلیٹس ایک حیوان ہے۔''

''ہاں، میں جانتا ہوں۔'' مرلے نے سرسری انداز میں کہا۔ ''مگر روتھ ایک بالغ لڑکی ہے اور کلیٹس کی بیوی بھی۔ میں زبردستی اسے روک نہیں سکتا تھا جبکہ روتھ بھی اپنی مرضی سے اُس کے ساتھ جانے کو تیار تھی۔''

''میں تمہاری مجبوری کو سمجھ سکتا ہوں مرلے۔'' جے پی نے معتدل انداز میں کہا۔ ''بہرکیف...... اللہ روتھ کی حفاظت کرے۔''

''آمین!'' مرلے نے بے ساختہ کہا۔

چند منٹ تک وہ دونوں روتھ اور کلیٹس کے ایشو پر بات کرتے رہے پھر جے پی اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا اور مرلے دوسرے ہڑتالیوں کی مدد کے لیے سرگرم عمل ہو گیا۔ ان لوگوں نے جنوب کی سمت سے آنے والے ٹریفک کو پوری طرح بلاک کر رکھا تھا۔ اس ٹریفک میں درجن بھر کوپے اور سیڈان گاڑیاں بھی شامل تھیں۔ ان کے علاوہ اتنے ہی ٹرک بھی قطار میں کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے کسی کو بھی بغیر چیکنگ کے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔

کم وبیش تین بجے سہ پہر ایک ٹرک اپنی باری پر، وہاں پہنچا جس مقام پر چیکنگ کا عمل جاری تھا۔ اس جگہ وزنی رکاوٹیں کھڑی کی گئی تھیں۔ مذکورہ ٹرک میں کافی بلندی تک کارٹن بھرے ہوئے تھے۔ ٹرک کا ڈرائیور ایک غصیل اور بدتمیز شخص تھا۔ اس نے اپنی سائڈ کا شیشہ گرا کر برہمی سے پوچھا۔

''یہ تم لوگوں نے کیا تماشا لگا رکھا ہے؟''

مرلے نے دیکھا، اس کا ایک ساتھی لیسٹر ڈرائیور کے نزدیک پہنچ گیا پھر اس نے تحمل انداز میں ٹرک ڈرائیور کے سوال کا جواب دیا۔

''آج ڈیری فارمز کے مالکان نے نیواورلینز کے ڈسٹری بیوٹرز کے ایک ناجائز مطالبے کے خلاف اسٹرائیک کی ہے۔'' لیسٹر نے ڈرائیور سے کہا۔ ''یہ چیکنگ اسی سلسلے میں ہے۔''

''میرا اس معاملے سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔'' ڈرائیور نے برہمی سے کہا۔ ''مجھے جانے دو۔ میں لمبی قطار میں کھڑے رہ کر پہلے ہی کافی وقت برباد کر چکا ہوں اور...... میرے اس ٹرک میں دودھ نام کی کوئی شے موجود نہیں ہے...... سمجھے تم؟''

''ہم تمہارے ٹرک کی چیکنگ کیے بغیر تمہیں آگے جانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔'' لیسٹر نے معتدل انداز میں کہا۔ ''ہمارے ساتھ تعاون کرو۔ چند منٹ ہی کی تو بات ہے۔''

''میں نے کہہ دیا نا کہ میرے ٹرک میں دودھ یا کوئی بھی ڈیری پروڈکٹ نہیں ہے۔'' ڈرائیور نے جارحانہ لہجے میں کہا۔ ''میں تمہاری اس واہیات اسٹرائیک کی وجہ سے دو گھنٹے لیٹ ہو چکا ہوں۔ اب میں اپنا ایک منٹ بھی یہاں برباد نہیں کروں گا۔''

ڈرائیور کے ساتھ لیسٹر کی بحث جاری ہی تھی کہ اس دوران میں فلیچر کروئی نے ٹرک کا عقبی حصہ کھولا اور اس کے حکم پر ٹرک کی تلاشی کا کام شروع ہوگیا۔ اس صورتِ حال

نے ڈرائیور کا دماغ خراب کر دیا۔

اس نے ایک جھٹکے سے ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھولا اور اچھل کر باہر آ گیا۔ اس نے وحشیانہ انداز میں لیسٹر کو دھکا دے کر زمین پر گرا دیا۔ قبل اس کے کہ ہڑتالیوں میں سے کوئی ڈرائیور کی گوشمالی کرتا، وہ اپنے ٹرک کی عقبی جانب پہنچ چکا تھا اور اب...... اس کے ہاتھ میں اعشاریہ تین دو کیلی بر کا ایک ریوالور نظر آ رہا تھا۔

''میرے ٹرک سے باہر نکلو...... ابھی کے ابھی۔'' اس نے ٹرک کے پچھلے حصے میں موجود ہڑتالیوں کو گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ''ورنہ میں تم سب کو شوٹ کر دوں گا۔''

مرلے سبک قدموں سے چلتے ہوئے گن بردار ڈرائیور کے سامنے آ گیا۔ ''اس کی تو بالکل ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے ریوالور کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ ''چند منٹ صبر کر لو۔ چیکنگ کے بعد ہم تمہیں یہاں سے جانے دیں گے۔''

''بھاڑ میں گئی تمہاری چیکنگ اور اسٹرائیک......'' ڈرائیور نے طیش کے عالم میں کہا۔ ''اگر تم لوگوں نے میرے ٹرک کو فوراً فری نہیں کیا تو میں تم میں سے ایک، ایک کو چن کر قتل کر دوں گا۔''

فارم ہاؤسز کے مالکان اور ان کی یونین کے دیگر افراد خالی ہاتھ اتنا بڑا مشن کرنے نہیں آئے تھے۔ انہیں اس بات کا احساس اور اندازہ تھا کہ اس ہڑتال کے جواب میں کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے چنانچہ کسی بھی قسم کی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے انہوں نے مناسب بندوبست کر رکھا تھا۔

''کوئی گولی چلے گی اور نہ ہی کسی کی لاش گرے گی۔'' لیسٹر نے اعشاریہ تین آٹھ کیلی بر کی لمبی نال والی گن مسلح ٹرک ڈرائیور کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر ٹکاتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''تم اپنا ریوالور اس بندے کے حوالے کر دو جو تمہارے سامنے کھڑا ہے۔''

صورتِ حال کی سنگینی کو محسوس کرتے ہی ڈرائیور نے اپنا ریوالور مرلے کے حوالے کر دیا اور مرلے نے مذکورہ ریوالور کو اپنی جیب میں رکھ لیا۔

اگلے دو منٹ میں، ٹرک کے عقبی حصے میں چیکنگ کا کام کرنے والے ہڑتالی باہر نکل آئے۔ ان کی رپورٹ کے مطابق، اس ٹرک میں ملک یا کوئی بھی ڈیری پروڈکٹ موجود نہیں تھی۔ گویا وہ ڈرائیور بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس تسلی کے بعد ڈرائیور کو جانے کی اجازت دے دی گئی۔

اسٹیئرنگ سنبھالنے سے پہلے اس ڈرائیور نے مرلے کی طرف دیکھتے ہوئے ناگواری سے کہا۔ ''میرا ریوالور واپس کرو۔''

''میرے خیال میں کسی بھی قسم کا آتشیں اسلحہ تمہارے پاس نہیں ہونا چاہیے۔'' مرلے نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم نے اس ریوالور کے بل پر ہمیں جس طرح دھمکایا تھا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر یہ ریوالور تمہاری کسٹڈی میں رہا تو تم غصے کی حالت میں کسی بھی انسان کی جان لے سکتے ہو۔''

ڈرائیور چند لمحات تک کینہ توز نظروں سے مرلے کو گھورتا رہا پھر اس کے دماغ میں پتا نہیں کیا آئی کہ وہ اپنے ریوالور کو بھول کر ٹرک پر سوار ہوا اور وہاں سے چلتا بنا۔

اس کے جانے کے بعد مرلے نے لیسٹر سے کہا۔ ''اچھا ہوا، تم اپنے ساتھ گن لے کر آئے ہو۔ تمہاری وجہ سے ہم سب بال بال بچ گئے۔''

''ہم کوئی مٹھائی بانٹنے نہیں نکلے۔'' لیسٹر نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''یہ ایک احتجاجی ہڑتال ہے۔ کسی وقت کوئی بھی ناخوشگوار واقعہ پیش آ سکتا ہے۔ ہم سب کو ذہنی اور جسمانی طور پر تیار رہنا چاہیے اور ہماری یونین کو اس خود حفاظتی پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔''

پھر وہ فلیچر کروئی کی طرف متوجہ ہوا اور اس سے پوچھا۔ ''ویسے اس ٹرک کے عقبی حصے میں بھرے ہوئے کارٹنز میں تھا کیا؟''

''سگریٹس...... ٹیکس کی مہر کے بغیر......!'' فلیچر نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے میں نے ایک کارٹن میں سے سگریٹ کا ایک ڈنڈا (دس سے بارہ سگریٹ پیکٹس والی پیکنگ) پار کر لیا ہے۔ وہ بدبخت کوئی چور سگریٹ ڈیلیوری والا تھا۔ اسی لیے اسے جانے کی بھی جلدی تھی کہ کہیں ہم اس کے بغیر ٹیکس کی مہر والے سگریٹ اپنے قبضے میں لے کر اسے پولیس کے حوالے نہ کر دیں۔''

مرلے کچھ بھی نہیں بولا لیکن اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ ڈرائیور اپنے ریوالور کے مطالبے سے اچانک دست بردار ہو کر وہاں سے آناً فاناً فرار کیوں ہو گیا تھا۔

''مالِ مفت پر صرف اسموکرز ہڑتالیوں کا حق ہے۔'' لیسٹر نے سگریٹ کا وہ ڈنڈا پانچ سگریٹ نوش افراد میں تقسیم کرتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''جاؤ، مزے کرو اور اپنی ڈیوٹی پر توجہ دو۔ ابھی بہت سا کام باقی ہے۔''

دن کے باقی حصے میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں
یا۔ مرلے اپنی شفٹ ختم کر کے گھر واپس آگیا۔ وہ گھر جو
یک بار پھر خالی ہو گیا تھا۔ گزشتہ رات اس کی بہن روتھ
ہاں موجود تھی۔ بہرحال اسے اپنی تنہائی کے ساتھ رہنے کی
ادت سی ہو گئی تھی۔

جب وہ ڈنر کرنے کے لیے بیٹھا تو پہلی بار اسے
حساس ہوا کہ اس کی جیب میں ایک ریوالور بھی تھا۔
عشاریہ تین دو بور کا وہ ریوالور اتنا معصوم اور ننھا منا تھا کہ
یب کے اندر اس کی موجودگی مرلے کو محسوس ہی نہیں ہوئی
ھی۔ ایک تو اس کا لباس ڈھیلا ڈھالا تھا۔ دوسرے وہ دن
ھر اتنا مصروف رہا تھا کہ ٹرک ڈرائیور والے ریوالور کی
رف اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ ڈنر کے لیے جب وہ
یٹھنے لگا تو اس کی جیب میز کے پائے کے ساتھ ٹکرا... گئی تھی
س کے نتیجے میں، دھات اور لکڑی کے تصادم کی مخصوص
آواز پیدا ہوئی تھی۔

بہرکیف، اس نے ریوالور کو جیب سے نکال کر
ڈائننگ ٹیبل کے ایک کونے میں رکھ دیا اور ڈنر کے بعد
سونے کے لیے لیٹ گیا۔ آج دن بھر کی دوڑ دھوپ نے
سے بُری طرح تھکا دیا تھا۔ سو، بستر پر جاتے ہی اسے نیند
آگئی۔

☆☆☆

اگلی صبح اپنے مویشیوں کے ضروری کاموں سے فارغ
ہونے کے بعد جب مرلے گھر سے نکلنے لگا تو لیسٹر کی نصیحت
اس کے ذہن میں تازہ تھی۔ اس نے ڈبل بیرل شاٹ گن
اپنے پک اپ ٹرک میں رکھی اور یو ایس ہائی وے ففٹی ون،
امامیٹ کے شمال میں پہنچ گیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں وہ گزشتہ
روز بھی ڈیوٹی کر چکا تھا۔

رے فورڈ کوپر نے اسے دیکھا تو نزدیک آگیا۔
"میں نے سنا ہے......" رے فورڈ نے اس کے چہرے پر
نگاہ جما کر کہا۔ "کل تمہارے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی......؟"

"ایسا کچھ خاص نہیں تھا۔" مرلے نے کہا۔ "میں
نے سنبھال لیا......"

"گڈ...... مجھے امید ہے، آج تم کل سے زیادہ تیار
ہو کر آئے ہو گے۔"

"ہاں بالکل!" مرلے نے بڑے اعتماد سے جواب
دیا۔ "ایک شاٹ گن میرے ٹرک میں رکھی ہے۔ جو ہو گا،
دیکھا جائے گا۔"

"خدا کرے، ہمیں اس کے استعمال کی ضرورت
پیش نہ آئے۔"

"ہاں۔" مرلے نے سرسری انداز میں کہا۔ "ہمیں
مثبت سوچنا چاہیے اور حالات سے اچھے کی امید بھی رکھنا
چاہیے۔"

اس روز بھی، ان کی کھڑی کی ہوئی رکاوٹوں کی وجہ
سے کوپے، سیڈان، اسٹیشن ویگن، پک اپ ٹرک اور دیگر
گاڑیوں کی ایک طویل قطار نظر آرہی تھی۔ ہڑتالی ایک، ایک
گاڑی کو اچھی طرح چیک کرنے کے بعد آگے بڑھنے کی
اجازت دے رہے تھے۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے
ان گاڑیوں کی جانب بڑھ گئے۔

"میں نے گزشتہ رات تمہارے بہنوئی کو دیکھا تھا۔"
رے فورڈ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

مرلے نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔
"کلیٹس......؟"

"ہاں!" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔
"میں کل ڈیوٹی کے بعد گھر جا رہا تھا کہ "ڈی ولاز" میں
تھوڑی دیر کے لیے رک گیا۔ اس کیسینو کا بار بہت مشہور
ہے اور میں خود کو بہادر بنانے کے لیے اس بار میں چلا گیا تھا
تاکہ اپنی بیوی کا سامنا کرنے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہ
آئے۔ میری بیوی اس سب کے خلاف ہے جو ہم کر رہے
ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے، اسٹرائیک......؟"

"ہاں، وہ کہتی ہے، تم لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا
ہے جو ساڑھے سینتالیس لیٹر دودھ پر صرف پچھتر سینٹ کی
کمی کو لے کر سڑکوں پر نکل آئے ہو۔" رے فورڈ نے
بیزاری سے کہا۔ "اسے کیا پتا کہ قطرہ، قطرہ مل کر سمندر بنتا
ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو، رے فورڈ۔" مرلے نے
تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "صرف تمہاری ہی
نہیں، اور بھی کئی لوگوں کی بیویاں اسی انداز میں سوچتی
ہیں۔ خیر......" وہ لمحے بھر کو رکا پھر ان الفاظ میں اضافہ کر
دیا۔

"تم مجھے کلیٹس کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے؟"

"میں نے اسے ڈی ولاز کے کیسینو میں دیکھا تھا اور
وہ بھی بہت بُری حالت میں۔" رے فورڈ وضاحت کرتے
ہوئے بولا۔ "مجھے پتا چلا ہے کہ وہ اپنی رقم ہارنے کے علاوہ
قرض لے کر بھی جوا کھیلتا رہتا ہے اور کیسینو والوں کا اس پر
بہت سارا ادھار چڑھا ہوا ہے جس کی وصولیابی کے لیے وہ

لوگ کوئی بھی سنگین قدم اٹھا سکتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ کیسینو کے پالتو غنڈے جب قرض کی وصولی کے لیے جاتے ہیں تو وہ مقروض کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اپنے مطلوبہ بندے کو خالی پا کر وہ اس کی جان لینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ مجھے لگتا ہے، تمہارا بہنوئی کسی بڑے وبال میں پھنسنے والا ہے۔ اگر اس نے جلد از جلد کیسینو کا حساب بے باق نہیں کیا تو اس کی سلامتی کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ تم سمجھ رہے ہو نا، میں کیا کہہ رہا ہوں......؟“

مرلے، رے فورڈ کی بات کو گہرائی تک سمجھ چکا تھا اس لیے اس نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا اور کلیمنس کے ان تشویشناک حالات کو اپنے ذہن کے خاص الخاص خانے میں محفوظ کر لیا۔

اسی وقت ایک شیورلے ڈیلیوری ٹرک ان کے پاس آ کر رکا۔ اس ٹرک کی باڈی پر ”موکیز ڈیری پروڈکٹس“ کا مخصوص لوگو چھپا ہوا تھا۔ مرلے نے اس ٹرک کے ڈرائیور سے کہا۔

”یہاں پر ملک پروڈیوسرز کی اسٹرائیک چل رہی ہے۔ ہم کسی بھی قسم کی ڈیری پروڈکٹس کو ادھر اُدھر نہیں جانے دیں گے، خصوصاً نیواورلینز کی طرف تو بالکل نہیں۔ کیا تمہارے ٹرک میں ایسا کچھ ہے؟“

”باس! کیا تم مجھے کوئی بچہ یا اُلو کا پٹھا سمجھتے ہو۔“ ڈرائیور نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”یہ موکیز ڈیری پروڈکٹس کا ٹرک ہے۔ کیا میں اس میں مگرمچھ کے ڈائپرز لے کر جا رہا ہوں گا......؟“

ڈرائیور کے اس بھونڈے مذاق پر مرلے کو غصہ تو بہت آیا مگر اس سے پہلے کہ وہ جواباً کوئی سخت بات کہتا، ٹرک کے عقبی حصے سے آواز بلند ہوئی۔ ”یہ لاک ہے...... یہ لاک ہے......“

رے فورڈ نے مرلے کو ایک طرف کرتے ہوئے ٹرک کے ڈرائیور سے کہا۔ ”کھولو اسے...... ہم تمہارے ٹرک کا سامان چیک کریں گے۔“

”اسے کوئی نہیں کھول سکتا باس۔“ ڈرائیور نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ”موکیز والوں نے اس کی چابی مجھے دی ہی نہیں۔“

”تم ہمیں بیوقوف سمجھتے ہو۔“ رے فورڈ نے کڑوے لہجے میں کہا۔ ”اگر تمہارے پاس اس کی چابی نہیں ہے تو تم کیا سمجھتے ہو، ہم اسے کھول نہیں سکتے......؟“ پھر اس نے اپنے ساتھی ہڑتالیوں کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔

”بوائز...... اس تالے کو توڑ ڈالو۔“

آئندہ چند سیکنڈ میں رے فورڈ کے حکم کی تعمیل کر دی گئی۔ اب اس ٹرک کا عقبی حصہ پوری طرح کھل چکا تھا۔ رے فورڈ نے دوسرے ہڑتالیوں کے ساتھ ٹرک کے اندر داخل ہوتے ہوئے مرلے سے کہا۔

”مرلے! تم ڈرائیور پر نظر رکھنا۔“

اس کے بعد سب کچھ آناً فاناً ہو گیا۔ وہ موکیز ڈیری کا ڈیلیوری ٹرک تھا۔ اس کے اندر دودھ کے ساتھ ہی کئی قسم کی ڈیری پروڈکٹس بھری ہوئی تھیں، وہ دیگر اشیا کے علاوہ دودھ سے بھرے ہوئے دس گیلن والے آٹھ کینز کو اٹھا کر بڑی بیدردی سے سڑک پر خالی کر رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسّی گیلن دودھ سڑک پر پھیل چکا تھا۔ جو لوگ گیلن کے حساب سے واقف نہیں ہیں، وہ ضائع ہونے والے اس دودھ کی مقدار کو تین سو دو لیٹرز سمجھ لیں۔

ٹرک کا ڈرائیور، سائڈ ویو مرر میں یہ ”تخریب کاری“ دیکھ رہا تھا۔ اس نے مرلے کی طرف دیکھتے ہوئے برہم لہجے میں کہا۔

”تم لوگوں نے یہ جو حرکت کی ہے، اس کے نتیجے سے تم واقف نہیں ہو۔ تمہارا تو پتا نہیں کیا ہوگا لیکن یہ تو پکا ہے کہ میری جاب چلی جائے گی۔“

”جاب کا چھوٹ جانا تمہارے لیے کہیں بہتر ہوگا، بہ نسبت اس کے کہ میں تمہیں ٹرک سے باہر نکال کر، دو چار ہڑتالیوں کو اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے تم پر چھوڑ دوں۔“ مرلے نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ”جاب تو تمہیں دوبارہ بھی مل جائے گی لیکن یہ لوگ تمہاری ہڈی پسلی جو ایک کریں گے، اس کی ٹریٹ منٹ پر تمہاری چار، چھ ماہ کی آمدنی لازمی چلی جائے گی۔“

ٹرک ڈرائیور نے ایک بار پھر سائڈ ویو مرر میں جھانکا تو حالات کی سنگینی اس کی سمجھ میں آ گئی۔ پھر جیسے ہی دودھ کے خالی کینز کو ہڑتالیوں نے ٹرک کے عقبی حصے میں پھینک کر دروازہ بند کیا، وہ ڈرا سہا ڈرائیور فوراً سے پیشتر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

آئندہ دو گھنٹے میں ان لوگوں نے مختلف گاڑیوں کی تلاشی کے نتیجے میں دس گیلن والے تین اور پانچ گیلن والے بارہ کینز کے علاوہ تین درجن ایک گیلن والی دودھ کی بوتلوں کو سڑک پر ”خالی“ کر دیا۔ دودھ کو جس بیدردی سے ضائع کیا جا رہا تھا، اس ظالمانہ عمل کے سامنے ملک ڈسٹری بیوٹرز

، ساڑھے پینتالیس لیٹرز (ہنڈریڈ ویٹ) دودھ پر
رف پچھتر سینٹ کی رعایت کا مطالبہ بہت بے ضرر اور حقیر
ر آتا تھا۔
اس دن کے اختتام پر جب مرلے کی شفٹ تبدیل
نے لگی تو رے فورڈ نے اس سے کہا۔
"ہم صبح سات بجے سے رات کے بارہ، ایک بجے
ک باری، باری یہاں پہرا دے کر اپنی اسٹرائیک کو
امیاب بنانے کی جو کوشش کر رہے ہیں، میرے خیال میں
ہ کافی نہیں ہے۔"
"تو پھر اس کے علاوہ اور کیا، کیا جائے؟" مرلے
نے سنجیدگی سے پوچھا۔
"ابھی تک ہم نے دودھ اور ڈیری پروڈکٹس کی
سپلائی کو روکنے کے لیے صرف ٹرک اور ڈیلیوری وین وغیرہ کو
ٹارگٹ کیا ہے اور ہم اس مقصد میں ایک حد تک کامیاب بھی
رہے ہیں۔ ہماری وجہ سے نیو اورلینز میں دودھ اور دودھ
سے تیار ہونے والی کوئی شے سپلائی نہیں ہو سکی۔" رے فورڈ
نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
"لیکن دودھ کی نقل و حمل کا سب سے بڑا ذریعہ ٹرین ہے۔
ہمیں ٹرینز کو بھی نشانہ بنانا ہوگا۔"
"اوہ......!" مرلے ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔
رے فورڈ کی بات اس کی سمجھ میں ٹھیک بیٹھ گئی تھی۔
اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ "کب......؟"
"اس مشن کے لیے کل شام سب سے زیادہ موزوں
رہے گی۔" رے فورڈ نے بتایا۔ "آج یہ ممکن نہیں ہو پائے
گا کیونکہ میں نے جو کچھ سوچا ہے، اس کا وقت گزر چکا۔"
"ٹھیک ہے، ہم اس پروجیکٹ کو کل کے لیے چھوڑ دیتے
ہیں۔" مرلے نے رسان بھرے لہجے میں کہا۔ "مجھے بتاؤ،
تمہارے ذہن میں کیا چل رہا ہے۔ میں سب جاننا چاہتا ہوں۔"
"ایلی نوائے سینٹرل ریلوے کمپنی کی ٹرین نمبر تھری ہمارا
شکار بنے گی۔" رے فورڈ نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔
"تین نمبر ٹرین روزانہ میمفس (ٹینیسی) سے نیو اورلینز (لوزیانا)
تک جاتی ہے اور یہ ٹرین ہر شام ساڑھے پانچ بجے امامیٹ سے ہو
کر گزرتی ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا......؟"
"سمجھ گیا۔" مرلے نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "ہمیں
کل ٹھیک پانچ بجے شام امامیٹ ریلوے اسٹیشن پہنچنا ہوگا۔"
"بالکل درست۔" رے فورڈ نے اثبات میں گردن
ہلاتے ہوئے کہا۔ "جے پی تمہارا دوست ہے۔ اس
پروگرام کے بارے میں اسے بھی بتا دینا۔"

"تم فکر نہیں کرو۔ میں جے پی کو اچھی طرح سمجھا دوں
گا۔" مرلے نے یقینی لہجے میں کہا۔ "اس آپریشن کے لیے
ہمیں درجن بھر افراد کی ضرورت ہوگی۔"
"میں اس کا بندوبست کر لوں گا۔" رے فورڈ نے
ٹھوس اور حتمی انداز میں کہا۔ "کل شام ہم بہت بڑا کام
کرنے جا رہے ہیں۔"
مرلے کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔
اس رات جب مرلے اپنے فارم ہاؤس واپس آیا تو
ڈائننگ ٹیبل پر ایک "بٹر ملک کیک" رکھا ہوا تھا۔ یہ کیک
اس کی مما کی خاص ریسیپی تھی۔ جب تک اس کی ماں زندہ
تھی، وہ اکثر یہ کیک بنایا کرتی تھی۔ مرلے کو یہ سمجھنے میں کوئی
دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ اس کی غیر موجودگی میں روتھ نے
یہ کیک بنایا ہوگا۔ گھر کی ایک ڈپلی کیٹ چابی مرلے نے
روتھ کو دے رکھی تھی تاکہ کسی ہنگامی صورت حال میں وہ اس
آبائی گھر میں پناہ لے سکے۔
اس کیک کے ساتھ ہی روتھ نے مرلے کے لیے ایک
پوسٹ کارڈ بھی چھوڑا تھا جس پر صرف ایک جملہ لکھا ہوا تھا۔
"مرلے! مجھے تمہارے ہی جیسے بڑے بھائی کی اشد
ضرورت تھی، نہ کہ وہ بھائی جو میرا پیدائشی حق بنتا ہے۔"
مرلے کافی دیر تک روتھ کے اس جملے کی معنی خیزی
میں کھویا رہا۔ "روتھ کی اشد ضرورت اور اس کا پیدائشی
حق!" اس نے خود کلامی کی "ان دونوں میں بھلا کیا فرق
ہے؟" اس نے خود سے سوال کیا۔ "ہر دو صورت میں، میں
اس کا بھائی تو رہوں گا ہی...... نہیں!" اس کے دماغ میں
اچانک ایک انوکھا خیال چمکا۔ "روتھ کو میری مدد کی ضرورت
ہے۔ ایسی مدد جو ایک بھائی ہونے کے ناتے میں آج تک
نہیں کر سکا۔"
اس خیال کے ساتھ ہی اس کے رگ و پے میں ایک
کرنٹ سا دوڑ گیا۔ وہ روتھ کے بارے میں سنجیدگی سے
سوچنے لگا۔
آئندہ روز ناشتے پر جے پی، مرلے کے ساتھ تھا۔
مرلے نے اسے کافی کے ساتھ روتھ کا بنایا ہوا بٹر ملک کیک
پیش کیا۔ جے پی اپنے ساتھ تازہ اخبار بھی لایا تھا۔
"ہماری اسٹرائیک اثر دکھا رہی ہے مرلے!" اس
نے اخبار مرلے کی جانب بڑھاتے ہوئے خوش خبری
سنائی۔ "نیو اورلینز کے سپلائی والے ہم سے اظہار یکجہتی
کر رہے ہیں۔ انہوں نے ڈسٹری بیوٹرز سے مال اٹھا کر
ریٹیلرز تک پہنچانے سے صاف انکار کر دیا ہے یعنی اگر

ڈسٹری بیوٹرز اور ہول سیلرز کے پاس کچھ ڈیری اسٹاک رکھا ہوا بھی ہے تو وہ ریٹیلرز تک پہنچ نہیں پائے گا۔ مطلب، نیواورلینز کے باسیوں کی ڈیری پروڈکٹس سے محرومی پکی ہے۔ ہم نے نیواورلینز کی طرف جانے والی سپلائی پر کڑی نگرانی بٹھا رکھی ہے۔ دو، چار روز میں ہم اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"دو، چار روز نہیں بلکہ آج ہی رات......" مرلے نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہم کل تک ڈسٹری بیوٹرز کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیں گے۔"

جے پی نے چونک کر سوالیہ نظر سے مرلے کی طرف دیکھا۔ جواب میں مرلے نے اسے رے فورڈ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتا دیا۔ پوری بات سننے کے بعد جے پی نے مسرت انگیز لہجے میں کہا۔

"زبردست...... یہ تو ہمیں پہلے ہی کر لینا چاہیے تھا۔"

ان کے بیچ شام والے مشن پر بات چیت کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ وا کر فارم ہاؤس کے سامنے ایک گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی۔ مرلے انجن کی اس مخصوص آواز کو بہ خوبی پہچانتا تھا۔ اس کی پیشانی پر ناگواریت کی سلوٹیں ابھر آئیں۔

"یہ تو کلیٹس کی گاڑی ہے۔" مرلے نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "یہ نامراد یہاں کیا لینے آیا ہے؟"

مرلے نے ناشتا ادھورا چھوڑا اور کچن سے نکل کر گھر کے داخلی دروازے پر پہنچ گیا اور یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کہ گاڑی تو کلیٹس ہی کی تھی مگر اس کے اندر سے روتھ برآمد ہوئی تھی اور وہ بھی انتہائی بُری حالت میں۔

روتھ کا چہرہ تازہ زخموں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس کا زیریں ہونٹ خاصا سوجا ہوا تھا اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ مرلے کا دل بھر آیا۔ اس نے سوالیہ نظر سے اپنی مضروب اور گھائل اکلوتی چھوٹی بہن کو دیکھا اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"کلیٹس......؟"

روتھ نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔ "کلیٹس نے اپنی فیکٹری میں بہت سارے لوگوں سے ادھار لے رکھا تھا اور واپسی کا نام نہیں لے رہا تھا۔ قرض خواہ اس کے آئے روز کے نت نئے بہانے سن سن کر تنگ آ گئے تو انہیں اپنی رقم کی وصولی ناممکن نظر آنے لگی۔ بس، پھر وہ لوگ آپس میں مل گئے اور انہوں نے اپنے دلوں کی بھڑاس نکالنے کے لیے کلیٹس کی جم کر ٹھکائی کی اور اس ہنگامے پر باس نے کلیٹس کو نوکری سے نکال دیا۔" وہ لمحے بھر کو رکی پھر اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

"جب وہ گھر آیا تو نشے میں ڈوبا ہوا تھا اور...... اور اس نے اپنی ذلّت کا بدلہ مجھ سے لیا جیسے قرض خواہوں نے نہیں بلکہ میں نے اس کی مرمت کی ہو اور...... اس کی جاب چھوٹنے کی بھی میں ہی ذمے دار ہوں۔"

مرلے نے روتی بلکتی روتھ کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ وہ اس کے شانے پر سر رکھ کر تا دیر آنسو بہاتی رہی۔ پھر مرلے اسے گھر کے اندر لے آیا اور غصے بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

"کلیٹس اس وقت کہاں ہے؟"

"وہ گھر ہی میں بے سدھ پڑا ہے۔" روتھ نے بتایا۔ "مجھے اچھی طرح زدوکوب کرنے کے بعد وہ نشے کی حالت میں فرش پر گر گیا تھا۔ میں نے کار کی چابیاں اٹھائیں اور یہاں چلی آئی۔ میرا خیال ہے، وہ ادھر ہی مدہوش سویا پڑا ہوگا۔"

"جے پی! تم روتھ کا خیال رکھنا......" مرلے نے اپنے دوست کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں زیادہ زحمت نہیں دوں گا۔ سمجھ لو، تھوڑی دیر میں واپس آ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" جے پی نے معتدل انداز میں کہا۔ "تم جب تک آ نہیں جاتے، میں اِدھر ہی روتھ کے پاس ہوں اور بے فکر ہو جاؤ، یہ میری پناہ میں محفوظ ہے اور ہاں......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر سنسنی خیز انداز میں اضافہ کر دیا۔

"مرلے! تم جہاں بھی اور جس بھی مقصد سے جا رہے ہو، اس کام کو ادھورا چھوڑ کر نہیں آنا۔"

مرلے نے اثبات میں گردن ہلائی اور گھر سے باہر نکل آیا۔ اس کا پک اَپ ٹرک جے پی کے ٹرک اور روتھ کی کوپے کار کے درمیان کھڑا تھا۔ وہ اپنے ٹرک پر سوار ہوا اور آندھی کی رفتار سے ڈرائیو کرتے ہوئے اس سیلن زدہ چھوٹے سے گھر کے سامنے پہنچ گیا جہاں روتھ، کلیٹس کے ساتھ عذاب ناک زندگی گزار رہی تھی۔

مرلے نے اپنے پک اَپ ٹرک کو سائڈ میں پارک کیا اور گھر کے داخلی دروازے پر زوردار دستک دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اطلاعی گھنٹی کا بٹن بھی دبا دیا مگر اندر سے کسی قسم کا ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ بالآخر اس نے کندھے کے طوفانی پش سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ تیسری ٹرائی پر گھر کا داخلی دروازہ اس کی بات "مان" گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ گھر کے اندر تھا۔

لیونگ روم کے فرش پر اعشاریہ تین دو کیلی بر کے ریوالور کو دیکھ کروہ چونک اٹھا۔ یہ وہی ریوالور تھا جو اس نے اس ڈرائیور سے لے کر اپنی جیب میں رکھ لی تھی جو بغیر ٹیکس کے سگریٹس لے کر کہیں جا رہا تھا۔ مرلے کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے گھر آکر وہ ریوالور ڈائننگ ٹیبل کے ایک کونے میں رکھ دیا تھا۔ مرلے کو یہ سمجھنے میں قطعی کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ روتھ جب گھر میں اس کے لیے بٹر ملک کیک رکھنے آئی تھی تو اس نے ٹیبل سے وہ ریوالور اٹھالیا ہوگا۔ اس نے کسی فوری خیال کے تحت ریوالور کو اٹھالیا اور لیونگ روم سے بیڈروم میں آگیا۔

بیڈروم کے فرش پر کلیٹس اپنے ہی خون میں لت پت پڑا تھا۔ کسی نے اس کے سینے میں دو گولیاں اتار دی تھیں۔ اس کی حالت تشویش ناک تھی لیکن ابھی اس کی موت واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ اکھڑی اکھڑی، اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ مرلے کو اپنے نزدیک پاکر اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے شکستہ مریل سے لہجے میں کہا۔

”میری...... مدد کرو...... پلیز......!“

”میں نے تم سے وعدہ کیا تھا نا......“ مرلے نے دانت کچکچاتے ہوئے بے رحمی سے کہا۔ ”کہ اگر پھر کبھی تم نے میری بہن پر ہاتھ اٹھایا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

اپنی بات کے اختتام پر مرلے نے کلیٹس کے سینے میں، عین دل کے مقام پر تیسری گولی اتار دی۔

کلیٹس کے لہولہان جسم نے ایک خوفناک جھٹکا کھایا پھر ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا پڑ گیا۔ مرلے نے اس ریوالور پر سے اپنے اور روتھ کے فنگر پرنٹس کو اچھی طرح صاف کیا اور اسے کلیٹس کی لاش کے پاس پھینک کر گھر سے باہر نکل آیا۔

واپسی کے سفر کے دوران میں وہ اپنی بہن کو مخاطب کرکے سوچ رہا تھا۔ ”روتھ! تم تو کافی بہادر نکلیں۔ خیر، میں نے تمہارے ادھورے کام کو مکمل کر دیا ہے۔ اب کوئی تم پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا۔“

کلیٹس کی موت نے مرلے کو پُرسکون کر دیا تھا۔ اس نے اپنے پک اپ ٹرک کو سائٹ کے راستے پر ڈال دیا۔

☆☆☆

ایلی نوائے سینٹرل ریلوے کمپنی کی ٹرین نمبر تین شام پانچ بج کر سینتیس منٹ پر ایلامیٹ کے پلیٹ فارم پر آکر رکی۔ اس ٹرین میں ”بی سی آر ایکس۔ سات سو دو“ کے نام سے ایک ٹینک بھی لگا ہوا تھا جس کے اندر تین ہزار نو سو پچاس گیلن دودھ بھرا ہوا تھا۔ اس ”ٹینک کار“ میں پائی جانے والی دودھ کی یہ بڑی مقدار مسی سپی ریاست کی ”بروک ہیون کریمری کمپنی“ سے نیواورلینز کی ”کلوورلینڈ ڈیری پروڈکٹس کمپنی“ تک پہنچائی جانے والی تھی۔

مرلے، رے فورڈ پانچ دیگر ہڑتالیوں کے ساتھ ٹرین کے انجن روم میں پہنچ گئے۔ وہاں پر ڈرائیور اور انجینئر دونوں موجود تھے۔

رے فورڈ نے انجینئر سے سخت لہجے میں کہا۔ ”دودھ سے بھری ہوئی اس ٹینک کار کو ٹرین سے الگ کر کے دوسرے ٹریک پر ڈال دو۔ ہم دودھ کی ایک بوند بھی ایلامیٹ سے نیواورلینز نہیں جانے دیں گے۔“

انجینئر کے چہرے پر ہچکچاہٹ نمودار ہوئی کیونکہ اس کے سامنے کھڑے تمام ہڑتالی مسلح اور غضب ناک دکھائی دے رہے تھے۔ اگر ان کا مطالبہ پورا کرنا قانون شکنی اور اپنے فرائض سے غفلت برتنے کے زمرے میں آتا تھا تو صاف انکار اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ بہرکیف، اس نے جان کو ہتھیلی پر رکھ کر مزاحمت کا فیصلہ کیا اور اپنا سیمی آٹو میٹک پسٹل نکال کر رے فورڈ پر تان لیا۔

قبل اس کے کہ کوئی ہڑتالی انجینئر کی اس جرأت پر کوئی ردِعمل ظاہر کرتا، مرلے نے ناقابلِ یقین پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی شاٹ گن کا بٹ انجینئر کے اس ہاتھ پر مارا جس میں اس نے پسٹل تھام رکھا تھا۔

یہ وار اتنا کاری، بروقت تھا کہ انجینئر کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹنے کی باقاعدہ آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل کر رے فورڈ کے قدموں میں جا گرا۔

رے فورڈ نے فوراً سے پیشتر اس پسٹل کو اٹھالیا اور مضروب انجینئر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خاصے سنگین لہجے میں کہا۔ ”تم ایک خوش قسمت انسان ہو...... بہت ہی نصیب والے...... جو اب تک زندہ نظر آرہے ہو ورنہ مرلے تو سیدھا کھوپڑی کے اندر گولی ڈالتا ہے۔“

رے فورڈ نے انجینئر کو ”متاثر“ کرنے کی غرض سے مرلے کی کچھ زیادہ ہی ”تعریف“ کر دی تھی۔ خوف زدہ انجینئر نے کسی پس و پیش کے بغیر رے فورڈ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے، دودھ سے بھری ہوئی ٹینک کار کو ٹرین نمبر تین سے الگ کر کے ایک سائڈ ٹریک پر کھڑا کر دیا۔

رے فورڈ نے لیسٹر اور دو دوسرے ہڑتالیوں سے کہا۔ ”اس ٹینک کے دونوں والوز کھول دو تاکہ سارا دودھ زمین پر بہہ جائے۔“

جب مذکورہ ٹینک کار میں موجود تین ہزار نو سو پچاس

گیلن دودھ کو بے دریغ بہا کر ریلوے کی زمین کو سیراب کیا جا رہا تھا اسی دوران میں فلیچر اور درجن بھر مسلح ہڑتالیوں نے سرچ آپریشن کر کے ایک بیگیج بوگی کے اندر سے دودھ کے دس گیلن والے بیس کینز اور کریم کے دس گیلن والے پندرہ کینز برآمد کر کے انہیں بڑی بیدردی سے ضائع کر دیا۔

ہڑتالیوں کے ایک جتھے نے بوگی نمبر ''آئی سی۔ فائیو سیون فائیو فور'' کی سیل کو توڑ ڈالا۔ ان کے خیال میں، اس بوگی کے اندر بھی دودھ یا دودھ سے تیار کردہ ڈیری پروڈکٹس ہو سکتی تھیں مگر وہ درحقیقت ڈاک کا ڈبا تھا۔ جب انہیں وہاں اپنے مطلب کی کوئی شے نہیں ملی تو انہوں نے متعلقہ اسٹاف سے درخواست کر کے اس بوگی پر نئی سیل لگوا دی تھی۔

رات گئے جب مرلے اپنے فارم ہاؤس پر پہنچا تو روتھ کی کوپے کار کے برابر جے پی کے ٹرک کو دیکھ کر اسے عجیب سا محسوس ہوا۔ وہ اپنے پک اپ ٹرک کو پارک کرنے کے بعد جب گھر کے اندر داخل ہوا تو جے پی کو ایک صوفے پر لیٹا پایا۔ مرلے پر نگاہ پڑتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''جے پی! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' مرلے نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔ ''تم امایٹ کے ریلوے اسٹیشن کیوں نہیں پہنچے تھے؟''

''روتھ بہت زیادہ خوف زدہ تھی۔ میں اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔'' جے پی نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ بار، بار پولیس کا ذکر کر رہی تھی۔ اسے ڈر لگ رہا تھا کہ پولیس کسی بھی وقت یہاں آسکتی ہے۔ میں نے پوچھا بھی کہ پولیس اس کے پیچھے کیوں آئے گی مگر اس نے بتایا نہیں۔ میں نے بھی اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے زیادہ اصرار نہیں کیا۔''

مرلے یہ خوبی جانتا تھا کہ روتھ کو کس وجہ سے پولیس کا دھڑکا لگا ہوا تھا لیکن اس نے اس حوالے سے جے پی سے کوئی بات نہیں کی اور اسے یہ بھی نہیں بتایا کہ اس نے کلیٹس کے ساتھ کیا، کیا تھا۔

''روتھ کہاں ہے؟'' مرلے نے معتدل انداز میں پوچھا۔

''وہ اپنے کمرے میں سو رہی ہے۔'' جے پی نے جواب دیا۔ ''میں نے اسے اطمینان دلایا تھا کہ جب تک تم واپس نہیں آؤ گے، میں اِدھر ہی موجود رہوں گا اور...... میرے ہوتے ہوئے کوئی اسے ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔''

آخری جملہ ادا کرتے ہوئے جے پی کی آنکھوں میں عزم، محبت، چاہت اور ذمّے داری کے درجنوں رنگ جھلملانے لگے تھے۔ مرلے کو یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ جے پی نے اپنی جس محبوبہ کا ذکر بڑی حسرت سے کیا تھا، وہ لڑکی روتھ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

جے پی کے جانے کے بعد مرلے نے روتھ کے کمرے میں جھانکا۔ وہ اپنے بستر پر مزے کی گہری نیند سو رہی تھی۔ یہ سوچ کر اس کا دل مطمئن ہو گیا کہ جے پی کے ہوتے ہوئے روتھ کی زندگی میں اب واقعتا کوئی دکھ نہیں آئے گا۔

☆☆☆

ڈیری فارمرز کے ارکان کی اسٹرائیک بالآخر کامیابی سے ہمکنار ہو گئی تھی۔ نیو اور لینز...... بلکہ پورے لوزیانا کی عوام کی طرف سے بلک ڈسٹری بیوٹرز پر بہت زیادہ دباؤ آ گیا تھا چنانچہ انہیں اپنے مطالبے سے دستبردار ہونا پڑا تھا۔ گویا دس دن کی کڑی محنت کے بعد مویشیوں کے باڑوں والے جیت گئے تھے۔

اخبارات والوں نے اس اسٹرائیک کو ''دس روزہ دورِ خوف و ہراس'' کا نام دیا تھا۔ ہر اخبار اس واقعے پر کچھ نہ کچھ لکھ رہا تھا۔ میڈیا کے اعداد و شمار کے مطابق، ان دس دنوں میں کل اسّی ہزار گیلن دودھ کو بیدردی سے بہا دیا گیا تھا۔ ٹرین، ٹرک، کار...... ہر اس وہیکل کو روک کر پریشان کیا گیا تھا جس کے ذریعے دودھ اور دیگر ڈیری پروڈکٹس کی نقل و حمل ممکن تھی۔ اسی ہنگامہ آرائی میں ایک شخص (ٹرین انجینئر) کے ہاتھ کی ہڈی کو بھی توڑ دیا گیا تھا۔ یو ایس میل کار کی سیل توڑنے کا معاملہ اس کے علاوہ تھا۔ الغرض...... سب کچھ تھا مگر کلیٹس ہینڈری کے قتل کا واقعہ کسی اخبار کی خبر نہیں بن سکا تھا۔

اسٹرائیک ختم ہونے کے اگلے روز کلیٹس کا ایک شرابی دوست جب اس سے ملنے گھر پہنچا تو اس نے کلیٹس کو مردہ پایا۔ کلیٹس کی لاش کی دریافت کے بعد پولیس حرکت میں آ گئی اور پوچھ تاچھ کے لیے ایک ڈپٹی شیرف مرلے کے گھر پہنچ گیا۔ وہ مقتول کی بیوہ روتھ سے چند سوالات کرنا چاہتا تھا۔ روتھ پچھلے دو دن سے مرلے کے ساتھ اپنے آبائی گھر ''واکر فارم ہاؤس'' میں رہ رہی تھی۔

''تمہارے شوہر کلیٹس ہینڈری کے سینے میں تین گولیاں اتار کر اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔'' ڈپٹی شیرف نے روتھ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''تم اس حوالے سے کیا جانتی ہو؟''

''تین گولیاں......!'' روتھ نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں......!''

''روتھ گزشتہ چار روز سے میرے ساتھ ہے۔''

مرلے نے فوراً صورتِ حال کو سنبھالنے کی غرض سے، غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''اور اس کی ایک خاص وجہ ہے آفیسر......!''

روتھ ڈپٹی شیرف کے استفسار کے جواب میں بے ساختہ کہنا چاہتی تھی کہ اس نے کلیٹس کے سینے پر تین نہیں، دو گولیاں چلائی تھیں مگر مرلے نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بات کو پلٹ دیا تھا۔

''اور وہ خاص وجہ کیا ہے؟'' ڈپٹی شیرف نے مرلے سے پوچھا۔

''آپ روتھ کے چہرے کو غور سے دیکھیں......'' مرلے نے روتھ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ڈپٹی شیرف نے بہ غور روتھ کے چہرے کا جائزہ لیا پھر افسوسناک انداز میں بولا۔ ''لگتا ہے، چند روز پہلے اس پر تشدد کیا گیا ہے۔ روتھ کو اس حالت میں کس نے پہنچایا ہے......؟''

''اس کے آنجہانی، جہنم مکانی شوہر کلیٹس پینڈری نے......'' مرلے نے زہرخند لہجے میں جواب دیا۔ ''کلیٹس کو جوئے اور شراب کی لت تھی۔ وہ جو کچھ بھی کماتا، اسے جوئے میں اُڑا اور شراب میں بہا دیتا تھا۔ اور گھر آ کر روتھ سے مار پیٹ کرنا بھی اس کے معمول میں شامل تھا۔ روتھ ایک عرصے تک اپنا دکھ مجھ سے چھپاتی رہی، پھر ایک روز میں اس کی زندگی کے عذاب سے واقف ہو گیا۔ پھر میں نے......'' وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا۔ اس کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔

''میں نے خفیہ طریقے سے کلیٹس کی جاسوسی کی تو مجھے پتا چلا کہ وہ بہت سے لوگوں کا مقروض ہے۔ وہ جس فیکٹری میں کام کرتا تھا وہاں بھی اس نے کئی بندوں سے ادھار لے رکھا تھا اور سب سے زیادہ خطرناک بات یہ کہ وہ ''ڈی ولاز'' کیسینو کا بھی قرض دار ہو چکا تھا۔ کیسینو کے وصولی کرنے والے لوگوں نے کئی بار اسے مارا پیٹا بھی تھا۔ آپ جانتے ہیں، وہ غنڈہ صفت لوگ کس قدر سفاک اور شقی القلب ہوتے ہیں۔ بندہ مارنا تو ان کے لیے کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔'' وہ ایک مرتبہ پھر رکا اس کے بعد ڈرامائی انداز میں کہا۔

''اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو آپ کلیٹس کی فیکٹری اور ڈی ولاز کیسینو جا کر اس معاملے کی تصدیق کر سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہو گیا۔'' ڈپٹی شیرف اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''آلۂ قتل اعشاریہ تین دو کیلی بر کا ریوالور پولیس کو کرائم سین سے مل چکا ہے مگر اس پر کسی کے فنگر پرنٹس نہیں پائے گئے۔''

اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''بہرحال ہماری تفتیش جاری ہے۔ ہمیں جیسے ہی قاتل کا کوئی سراغ ملا، آپ لوگوں کو ضرور آگاہ کریں گے۔''

ڈپٹی شیرف کے جانے کے بعد روتھ نے ٹٹولنے والی نظر سے مرلے کی طرف دیکھا اور معنی خیز انداز میں کہا۔ ''تین گولیاں......؟''

مرلے نے اپنے چہرے کے تاثرات کو قابو میں رکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''کلیٹس جتنے گھناؤنے کردار کا مالک تھا، اسے دو یا تین گولیاں کیا، فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کر کے لاتعداد گولیوں سے بھون ڈالنا چاہیے تھا۔''

اس کے بعد روتھ نے اپنے بھائی سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ مرلے نے نہ تو روتھ کو اس بات کا احساس ہونے دیا کہ وہ کلیٹس کے حوالے سے، اس کی کارروائی سے آگاہ ہو چکا ہے اور نہ ہی کبھی اس بات کا اقرار کیا کہ تیسری گولی اسی نے کلیٹس کے سینے میں اتاری تھی کیونکہ وہ روتھ کی چلائی ہوئی دو گولیوں سے جہنم واصل نہیں ہوا تھا۔ اس شیطان کی موت مرلے کے ہاتھوں ہی لکھی تھی۔ اسی بہانے اسے بڑا بھائی ہونے کا حق نبھانے کا موقع بھی مل گیا تھا۔

اس کے دو روز بعد پولیس نے مرلے کو اس کے فارم ہاؤس سے گرفتار کر لیا۔ کلیٹس کو قتل کرنے کے الزام میں نہیں، بلکہ ایلی نوائے سینٹرل ریلوے کمپنی کی ٹرین نمبر تین کے انجینئر کے ہاتھ کی ہڈی توڑنے کے جرم میں......

اس سلسلے میں پولیس نے ان تمام ہڑتالیوں کو بھی گرفتار کیا تھا جو اس اسٹرائیک میں حصے دار تھے مگر مرلے کے سوا باقی ملزموں اور مجرموں کو بھاری جرمانے اور تادیبی کارروائی کے بعد چھوڑ دیا گیا اور مرلے کے خلاف تعزیری کارروائی کرتے ہوئے، ٹرین کے انجینئر کا ہاتھ توڑنے کے جرم میں جرمانے کے علاوہ دو سال کی سزا بھی سنائی گئی۔

دو سال کے بعد جب وہ جیل سے رہا ہو کر اپنے فارم ہاؤس پہنچا تو اس کی آزادی کی خوشی میں ایک شاندار جشن منایا گیا۔ اس دوران میں روتھ نے جے پی سے شادی کر لی تھی اور اب ان کا تین ماہ کا ایک بچہ بھی تھا۔ گویا، واکر ڈیری فارم کو اپنا اگلا وارث مل گیا تھا۔

اس واقعے کے بعد مرلے نے کبھی اسٹرائیک کے بارے میں نہیں سوچا۔ ماضی کے اس تلخ تجربے کو دوہرا کر وہ اپنا حال اور مستقبل برباد نہیں کرنا چاہتا تھا۔

❖❖❖

احساس گزیدہ

عمران قریشی

بے بس اور لاچار لوگوں کے منصوبے بارش کے مانند ہوتے ہیں... پہلا منصوبہ پہلی بارش کی طرح زحمت... دوسری بار مفید... تیسری بار غنیمت اور چوتھی دفعہ زحمت بن جاتا ہے... معاشی طور پر بے حال شخص کے دگرگوں حالات کی روداد... وہ احساس گزیدہ تھا... اور زندگی کے جھمیلوں سے تھک چکا تھا... اس تھکن نے اس کی سوچوں کے گھوڑے دوڑادیے...

ضرورت کے رشتے میں بندھ کر خونی رشتے سے دوری کے اختیاری عمل کا نتیجہ......

کمرے کے اندر گھپ اندھیرا طاری تھا اور ٹین کی چھت پر بارش کے قطرے گولیوں کی صورت میں گر رہے تھے۔ لیکن اس شور کے باوجود بھی رقیہ کے خراٹوں میں کمی کے بجائے شدت آتی جارہی تھی۔ مبشر علی نے کتنی ہی دفعہ دوسرے کمرے میں سونے کے متعلق سوچا۔ لیکن اس کمرے میں ناصر علی اور کنول سوتے تھے اور وہ کمرا اتنا چھوٹا تھا کہ اس میں تیسری چارپائی سما بھی نہیں سکتی تھی اور پھر آج ان خراٹوں کا خاتمہ ہونے والا تھا۔ اس کی کمزور اور سالخوردہ کشتی میں بمشکل تمام دو افراد کی گنجائش تھی۔ لیکن

کھینچ تان کر چار افراد سفر کر رہے تھے۔ عقلمندی کا تقاضا یہ تھا کہ دو بیچ راستے میں سفر کو خیر باد کہنے کے بعد نیچے اتر جاتے۔ وہ اپنے دونوں بچوں سے بہت محبت کرتا تھا اور ان پر آنچ بھی آئے، برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ محبت تو وہ اپنی بیوی سے بھی کرتا تھا لیکن اس کی زندگی کے دن کم ہوتے جارہے تھے۔ اسے دل کا عارضہ لاحق تھا۔ مبشر علی اس کا علاج نہیں کروا سکتا تھا۔ اس لیے دواؤں پر انحصار کرنا پڑ رہا تھا اور دوائیں روز بروز مہنگی ہوتی جارہی تھیں۔ بڑھتے ہوئے اخراجات کو کم کرنے کے لیے افراد کو کم کرنا بے حد ضروری تھا۔ وہ اپنے وجود کو ختم کر کے اس کمی کو پورا کر سکتا تھا لیکن اس میں کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کافی سال پہلے جب اس نے انشورنس کمپنی کا رخ کیا تھا تو تجمل صاحب نے اس شرط پر اسے کام دیا تھا کہ وہ ایک ماہ کے دوران تین بیمہ پالیسیاں فروخت کر کے دکھائے۔ اگر اس نے شرط پوری کر دی تو پچیس سو ماہوار کی نوکری اسے دے دیں گے۔ تنخواہ بہت کم تھی لیکن پالیسی کی فروخت پر ملنے والا کمیشن پُرکشش تھا۔ اس لیے اس نے دن رات ایک کر کے دو پالیسیاں فروخت کر دیں۔ لیکن تیسری خریدنے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ تب مجبوراً تیسری پالیسی اس نے رقیہ کے نام خرید لی۔ اسے ان دنوں دل کا مرض لاحق نہیں تھا۔ ورنہ پالیسی اس کے نام مختص نہ ہو سکتی۔ پالیسی خریدنے سے قبل میڈیکل چیک اَپ کیا جاتا ہے اور دل کا مرض ہونے کی صورت میں پالیسی خریدنے والے کو رد کر دیا جاتا ہے۔ اسے انشورنس کمپنی میں ملازمت مل گئی اور تین چار ماہ کے دوران ہی اسے معلوم ہو گیا کہ پالیسی فروخت کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ لوگوں کے پاس گزر بسر کے لیے پیسے نہیں تھے۔ وہ پالیسیاں کیوں خریدتے۔ اس لیے مجبوراً اسے سیکنڈ ٹائم ایک بڑے ہوٹل میں ویٹر کا کام کرنا پڑا۔ یہاں بھی تنخواہ محدود تھی لیکن ٹپ اچھی خاصی مل جاتی تھی۔ تاہم ناصر علی اور کنول کی پیدائش کے بعد حالات ایک دفعہ پھر ناگفتہ بہ ہونے لگے۔ کمرے سے باہر بجلی بہت زور سے چمکی۔ ماحول وقتی طور پر روشن ہوا۔ رقیہ ساتھ والی چارپائی پر چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے خراٹوں میں وقتی طور پر کمی واقع ہوئی۔ پھر دوبارہ تسلسل برقرار ہو گیا۔ مبشر علی جھٹکے کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھا۔ چارپائی چرچرائی۔ بارش کی شدت میں اضافہ ہوا لیکن اس کے ارادوں پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ وہ آہستہ سے چارپائی سے نیچے اتر آیا۔ اس کے ہاتھوں میں تکیہ تھا۔ اخراجات کے بوجھ تلے دبی ہوئی کشتی میں سے ایک فرد کو کم ہونا ہی تھا۔ ورنہ وہ جلد ہی ڈوب جاتی۔ تاہم اس کے دماغ میں کشمکش و پیچ کی کیفیت نمایاں ہو رہی تھی۔ وہ رقیہ کے احسانوں تلے دبا ہوا تھا۔ اس کی زندگی رقیہ کی مرہونِ منت تھی۔ وہ جو کرنے جارہا تھا، اس میں اس کی مجبوری کا عمل دخل زیادہ تھا۔ ورنہ وہ ایسا کرنے کے متعلق سوچنے کو بھی گناہ سمجھتا تھا۔ وہ اندھیرے میں آگے بڑھنے لگا۔ تب پانی کا جگ دھماکے کے ساتھ زمین پر گرا۔ رات کو سونے سے قبل بجلی چلی گئی تھی۔ ان سب نے کھانا یہیں بیٹھ کر کھایا تھا اور عجلت کے عالم میں رقیہ نے جگ وہیں چھوڑ دیا تھا۔ مبشر علی کے پاؤں کی ٹھوکر سے وہ نیچے گر گیا۔ رقیہ کی نیند میں خلل پیدا ہوا۔ خراٹے یک دم رک گئے۔ اس نے ہڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن مبشر علی نے اسے دھکا دے کر واپس اپنی جگہ پر لٹا دیا اور تکیے کو اس کے چہرے پر رکھ کر دبانے لگا۔ چارپائی پر بھونچال کی کیفیت نمایاں ہوئی۔ پینتالیس سالہ رقیہ کے ناتواں جسم میں جیسے اچانک ہی طاقت کا طوفان بھر گیا۔ اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس کے دونوں ہاتھ آزاد تھے۔ اس نے مبشر علی کے منہ کو نوچ ڈالا۔ مبشر علی کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے چہرے پر کسی نے مرچیں ڈال دی ہوں۔ اس کے منہ سے بے اختیار سسکاری نکل گئی لیکن اس نے تکیے پر زور کم نہیں کیا۔ رقیہ جتنا بھی اس کے چہرے کو نوچتی۔ وہ اتنا ہی تکیے پر دباؤ بڑھا دیتا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اس کا چہرہ رقیہ کے ناخنوں کی بدولت لہولہان ہو گیا لیکن اس کے دم خم میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ بالآخر جب رقیہ ہمت ہار دینے والی تھی تب اس نے اپنی ٹانگ موڑ کر مبشر علی کی ناف کے نیچے دے ماری۔ اس کے منہ سے اوغ کی آواز نکلی اور وہ بے اختیار تکیہ چھوڑ کر چارپائی سے نیچے فرش پر گر گیا پھر اچانک ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور وہ زمین پر چاروں شانے چت پڑا تھا۔ تکیہ اس کے سینے پر دھرا ہوا تھا۔ چونکہ اس کے کمرے کا رخ مشرق کی جانب تھا۔ اس لیے سورج طلوع ہوتے ہی کمرا روشنی سے بھر جایا کرتا تھا۔ ورنہ ابھی صرف ساڑھے سات بجے تھے۔ کمرے سے باہر بولنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بچے شاید جاگ گئے تھے اور رقیہ ناشتا تیار کرنے میں مصروف تھی۔ وہ تکیے کو چارپائی پر رکھنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی کمر میں شدید ٹیس اٹھی اور وہ کمر پکڑ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ یہ تکلیف چند دنوں سے بڑھتی چلی جارہی تھی۔ اس لیے اس نے ویٹر والی نوکری پر اپنی جگہ ناصر علی کو لگا دیا تھا اور خود شام کو گھر آجایا

کرتا تھا۔ رقیہ نے بہت احتجاج کیا۔ کیونکہ ویٹر کی نوکری کی وجہ سے ناصر کی تعلیم کا حرج ہو سکتا تھا۔ وہ شام کو اپنے دوستوں کے پاس پڑھنے کے لیے جاتا تھا۔ ہوٹل کی نوکری کے بعد اس نے وہاں جانا ترک کر دیا تھا لیکن مبشر علی نے رقیہ کے احتجاج پر کان نہیں دھرے۔ اسے پڑھائی سے زیادہ ہوٹل سے آنے والی رقم کی فکر تھی۔ اسی رقم سے تو ان دونوں بہن بھائیوں کی فیس ادا ہوتی تھی۔ چارپائی پر بیٹھنے کے بعد اسے رات والا خواب یاد آیا۔ اسے شرمندگی محسوس ہوئی۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ رقیہ کے نام پر اچھی خاصی بڑی پالیسی موجود تھی اور یہ بھی حقیقت تھی کہ چند دن پہلے اسے ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے اسے فوراً آپریشن کروانے کی تلقین کی تھی لیکن رقم پاس نہ ہونے کی وجہ سے وہ آپریشن نہ کروا سکا اور نہ ہی اب اس کا آپریشن کروانے کا ارادہ تھا۔ چند دنوں کے شش و پنج کے بعد اس کے دماغ میں خودغرضانہ سوچوں نے ڈیرا ڈالنا شروع کر دیا۔ پچھلے ہفتے اسے تجمل صاحب نے بتایا تھا کہ اگر رقیہ مر گئی تو اسے یک دم دو کروڑ کی پالیسی مل جائے گی۔ مبشر علی کو یاد آیا کہ گزشتہ سال تجمل صاحب کی بیوی ایک حادثے میں ہلاک ہو گئی تھی۔ تب انہیں ڈھائی کروڑ کی پالیسی ملی تھی۔ بیوی کی موت سے قبل تجمل صاحب پرانی سی اسکوٹر پر آفس آیا کرتے تھے۔ اب ان کے پاس نئی اور چمکتی ہوئی موٹر سائیکل تھی۔ پالیسی ملنے سے قبل ان کے تمام بال سفید تھے اور رقم ملنے کے بعد انہوں نے ہیئر کلر لگا کر انہیں کالا کر لیا تھا۔ انشورنس کمپنی کے تمام ورکرز آپس میں سرگوشیاں کرتے تھے کہ تجمل صاحب جلد ہی آفس میں کام کرنے والی خوب صورت ترین ورکر شائستہ سے شادی کرنے والے ہیں۔ دونوں کی عمروں میں کم و بیش بیس بائیس سال کا فرق تو ضرور تھا لیکن جب سے تجمل صاحب کو پالیسی ملی تھی تب سے شائستہ اپنا زیادہ وقت ان کے کمرے میں گزارنے لگی تھی۔ یعنی اس کا جھکاؤ عمروں کے تضاد کے باوجود بھی تجمل صاحب کی جانب تھا۔ دولت ہر عیب پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ مبشر علی دوسری شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ تو صرف اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے سب کچھ کر رہا تھا۔ تاہم رقیہ بھی اسے بہت عزیز تھی۔ اس نے اپنے بچوں اور خصوصاً شوہر کے لیے بہت بڑی قربانی دی تھی۔ وہ مر کر بھی اس قربانی کا بدلہ نہیں چکا سکتا تھا۔ جب اس کے پاس ویٹر کی نوکری نہیں تھی تب گھر کے اخراجات پورے کرنے میں رقیہ اس کی مدد کرتی تھی۔ وہ گلی کے نکڑ پر بیٹھے سموسے والے کو کچے سموسے بنا کر دے دیا کرتی تھی اور اسے بدلے میں کچھ نہ کچھ معاوضہ مل ہی جایا کرتا تھا۔ مبشر علی پرانے وقتوں میں کھو گیا۔ اسے جوانی کے وہ دن یاد آ گئے جب ان کی شادی کو چند ماہ ہوئے تھے۔ انشورنس کی نوکری نہ ہونے کے برابر تھی اور جب اسے ویٹر کی نوکری ملی تو حالات بہتر ہو گئے لیکن ناصر علی اور کنول کی پیدائش کے بعد حالات دوبارہ خراب ہونے لگے اور کچھ عرصے کے بعد جب انہیں اسکول داخل کروانا پڑا۔ تب نوبت فاقوں پر آ گئی۔ وہ دونوں زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ اس لیے آمدنی کو بڑھانا ان کے اختیار میں نہیں تھا۔ مبشر علی پریشان رہنے لگا۔ اسے راتوں کو نیند نہیں آتی تھی۔ قرضے سر پر چڑھتے جا رہے تھے۔ اس نے مجبور ہو کر بجلی کٹوا دی۔ چولھا پہلے سے ہی لکڑیوں پر جل رہا تھا لیکن جب کچھ عرصے کے بعد پرچون والے نے قرضہ دینے سے انکار کر دیا تب مبشر علی کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ اسے اسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹروں نے آپریشن کروانے کے لیے کہا۔ گھر میں کھانے پینے کے لیے پیسے نہیں تھے آپریشن بھلا کیسے کرواتے۔ جب اس کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو اسے اسپتال داخل کر دیا گیا اور پھر یکلخت نہ جانے کیسے رقیہ نے رقم کا بندوبست کیا اور فوراً ہی اس کا آپریشن کروا دیا۔ آپریشن کی رقم لاکھ سے اوپر تھی۔ رقیہ کبھی بھی اتنی رقم کا بندوبست نہیں کر سکتی تھی لیکن اس نے نہ صرف آپریشن کا بندوبست کیا بلکہ کافی عرصے تک گھر کے اخراجات بھی پورے کیے۔ وہ صحت یاب ہو کر گھر آ گیا۔ کچھ ادویات ایسی تھیں جن کا استعمال اسے ایک سال تک کرنا تھا اور وہ بہت مہنگی تھیں۔ رقیہ وہ دوائیں بہ آسانی لے آیا کرتی تھی۔ مبشر علی کے دماغ میں کیڑے کلبلانے لگے۔ اتنی رقم آسانی سے حاصل کرنا ناممکن تھا۔ یقیناً رقیہ نے رقم حاصل کرنے کے لیے اپنے جسم کو بیچا تھا۔ اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے یقیناً یہی کیا تھا اور شاید اب بھی کر رہی تھی۔ مبشر علی کو اپنا خون کھولتا ہوا محسوس ہونے لگا اور اس نے بے اختیار ہو کر اسے مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ چیخی چلائی نہیں۔ پتھر کی بت بنی مار کھاتی رہی۔ کچھ ہی دیر میں مبشر علی دل کو تھام کر زمین پر بیٹھ گیا۔ تب رقیہ نے اسے سہارا دے کر چارپائی پر لٹا دیا اور افسردہ لہجے میں بتایا۔

”میں تمہیں بیماری کے دوران کچھ بھی نہیں بتانا چاہتی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ تمہیں دوبارہ اٹیک نہ ہو جائے۔ مجھے تمہاری زندگی بہت عزیز ہے۔ میں اسے بچانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔ میں

نے واقعی اپنا جسم بیچا ہے۔ اگر خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں اپنے آپ کو تمام زندگی معاف نہ کر پاتی۔ میں نے جو کچھ بھی کیا، تمہاری محبت میں مجبور ہو کر کیا۔ مجھے معاف کر دو۔ آئندہ نہیں کروں گی۔'' مبشر علی کا غصے سے کانپتا ہوا وجود دھیرے، دھیرے اعتدال پر آنے لگا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ اس سے اتنی محبت کرتی تھی کہ اس نے شوہر کی خاطر اپنی عصمت بیچ دینے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ اس کے چہرے پر اطمینان کی گہری چادر تنتی چلی گئی۔ لیکن حالات پر اس کے بعد بھی کچھ خاص فرق نہیں پڑا۔ بلکہ اور زیادہ خراب ہو گئے۔ جتنا عرصہ مبشر علی کام پر نہیں گیا، اتنے عرصے کے دوران وہ تمام رقم اخراجات کی نذر ہو گئی جو رقیہ نے جسم فروشی سے حاصل کی تھی اور پھر پہلی دفعہ نہایت ڈھٹائی کے ساتھ مبشر علی نے اسے جسم فروشی کے لیے کہا۔ رقیہ اس کے تیور دیکھ کر کسی حد تک اندازہ لگا چکی تھی، اسے معلوم تھا کہ وہ ایسا تقاضا ضرور کرے گا۔ لیکن اتنی جلدی کرے گا، اس کے متعلق اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ وہ غصے سے چیخی چلائی اس نے مبشر علی کو ملامت کیا کہ وہ بخوشی اپنا جسم بیچنے کے لیے تیار ہے اگر وہ اس کا دلال بننے کی حامی بھر لے۔ مبشر علی سُن ہو کر رہ گیا۔ وہ ایسا کبھی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی بیوی کا خریدار ڈھونڈنے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ اس لیے چارپائی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور اگلے دن ہی سے اس نے پالیسیوں کی تلاش میں سڑکوں پر پھرنا شروع کر دیا۔ شام کو وہ ہوٹل بھی جانے لگا لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہاں یہ احساس اسے جیتے جی مارنے لگا کہ وہ کون شخص تھا جس نے رقیہ کے جسم کا سودا کیا تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اس کے متعلق رقیہ سے پوچھتا۔ وہ شاید اسے بتاتی بھی نہیں۔ تاہم وہ جانتا تھا کہ وہ جو بھی ہے۔ ان کے قریب ہی کہیں رہائش پذیر ہے۔ وہ اسے تلاش کر سکتا تھا۔ اس لیے چپ ہو کر رہ گیا۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد جب اس کی ہمت...... جواب دینے لگی تو اس نے اپنی جگہ ناصر کو نوکری پر لگا دیا تھا۔ وہ اسے کبھی بھی اس کام کے لیے مجبور نہ کرتا اگر کمر میں درد بڑھ نہ گیا ہوتا۔ اس کی طرح رقیہ بھی اب بیماری کی وجہ سے کافی کمزور ہو چکی تھی۔ وہ پینتالیس سال کی عمر میں پچاس پچپن کی دکھائی دیتی تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جس طرح جوانی کے دنوں میں رقیہ نے اس کا ساتھ دیا تھا اسی طرح بڑھاپے میں مبشر علی بھی اس کا ساتھ دیتا۔ اسے اب وہی بیماری لاحق تھی جو جوانی میں مبشر علی کو لاحق تھی۔ وہ انہی خیالوں میں تھا کہ رقیہ کی آواز نے اسے حقیقت کی دنیا کا احساس دلایا۔ وہ اسے ناشتا تیار ہونے کی اطلاع دے رہی تھی۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ سردیوں کی دھوپ برآمدے کو خوشگوار حدت سے معمور کر رہی تھی۔ رقیہ برآمدے کے کونے میں پیڑھی ڈالے بیٹھی تھی۔ ٹاٹ کا پردہ لگا کر برآمدے کے مختصر حصے کو باورچی خانے کی صورت دی گئی تھی۔ صحن کے درمیان...... شہتوت کا درخت لگا ہوا تھا جس کے نیچے چار مرغیاں اور ان کے درمیان ایک مرغا دندناتا پھر رہا تھا۔ ان پانچوں کا وجود غنیمت تھا۔ انہیں روزانہ چار انڈے میسر آ جایا کرتے تھے۔ ورنہ وہ اس عیاشی کے متحمل نہیں تھے۔ چند دن پہلے مبشر علی نے انڈے قریبی دکان پر فروخت کرنے چاہے تھے تب ناصر اور کنول نے وہ ہنگامہ مچایا کہ مجبوراً اسے ارادے کو ملتوی کرنا پڑا۔ ان چاروں کی زندگیوں میں انڈے کی عیاشی کے سوا اور رکھا ہی کیا تھا۔ اس نے خاموشی کے ساتھ ناشتا کیا اور گھر سے باہر آ گیا۔ کچھ عرصہ پہلے تک وہ انشورنس کمپنی تک پیدل جایا کرتا تھا۔ لیکن ناصر کے ہوٹل میں نوکری کرنے کے بعد اس نے بس میں جانا شروع کر دیا۔ اس میں اب پیدل چلنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ کمر کا درد بہت تکلیف دیتا تھا۔ وہ پچاس سال کی عمر میں ساٹھ کا دکھائی دیتا تھا۔ اس لیے بس والے اس سے آدھا کرایہ لیتے تھے۔ بس کی سیٹ پر بیٹھنے کے بعد وہ رات والے خواب کے متعلق سوچنے لگا۔ اس نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ جس موضوع کے متعلق آدمی زیادہ سوچتا ہے وہی موضوع اسے خواب کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ مبشر علی کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ چند دنوں سے پالیسی حاصل کرنے کے متعلق سنجیدگی کے ساتھ غور کر رہا تھا۔ کسمپرسی کی زندگی گزارنا اب اس کے اختیار سے باہر ہونے لگا تھا۔ اس کی اور رقیہ کی زندگی گزر گئی تھی لیکن بچوں کی ابھی شروع ہوئی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان کی زندگیاں بھی ویسے ہی گزریں جیسی مبشر علی اور رقیہ کی گزری تھیں۔ رقیہ دل کی مریضہ تھی۔ آج نہیں تو کل اس نے مرنا ہی تھا۔ اگر پہلے مر جاتی تو مضائقہ ہی کیا تھا۔ تکیہ منہ پر رکھ کر مارنے والی بات قابلِ ہضم نہیں تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں فوراً واضح ہو جاتا کہ اس کی موت قدرتی نہیں بلکہ اسے ہلاک کیا گیا ہے۔ وہ اسے چھت سے نیچے بھی دھکیل سکتا تھا لیکن چھت پر جانے سے اسے ڈاکٹر نے سختی سے منع کر دیا تھا۔ گھر سے باہر وہ شاذ و نادر ہی جاتی تھی اور زہر کھلا کر وہ اسے مار نہیں سکتا تھا۔ ہاں میڈیکل چیک اپ کے لیے وہ مہینے کے آخر میں خیراتی اسپتال ضرور جاتی تھی۔ اسپتال کے

متعلق سوچتے ہی اسے وہ دن یاد آ گئے جب وہ علاج کے لیے داخل تھا۔ تب رقیہ نے اپنی عصمت بیچ کر اس کا علاج کروایا تھا۔ اسے اپنی سوچ پر ندامت محسوس ہونے لگی۔ وہ مشکلات کے ان دنوں میں اس کے لیے مسیحا ثابت ہوئی تھی۔ اس نے علاج کروا کر مبشر علی پر احسان بھی کیا تھا۔ اس احسان کو چکانے کا وقت آ گیا تھا۔ اب اسے بھی رقیہ کو مارنے کے بجائے اس کا علاج کروانا تھا۔ لیکن علاج کروانے کے لیے اس پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ بس نے اسے انشورنس کمپنی کے قریب ہی اتار دیا اور وہ سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر واقع تجمل صاحب کے کمرے میں آ گیا۔ وہاں کمپنی کا تمام اسٹاف موجود تھا۔ آفس کی میز کو ہٹا کر زمین پر قالین بچھا دیا گیا تھا اور سب لوگ تکیوں سے ٹیک لگائے چائے پینے میں مصروف تھے۔ ان کے درمیان.... رکھی ہوئی شیشے کی میز پر کیک اور پیسٹریاں رکھی ہوئی تھیں۔ کمپنی کے اسٹاف نے اسے بتایا کہ تجمل صاحب نے شائستہ سے شادی کر لی ہے اور وہ ساتھ والے کمرے میں نئی نویلی دلہن سے فون پر باتیں کر رہے ہیں۔ وہ کمرا اسٹنگ روم کے طور استعمال کیا جاتا تھا۔ جب کسی کلائنٹ سے تفصیلی بات چیت کرنا مقصود ہوتی تھی تب اس کمرے کو استعمال کیا جاتا تھا۔ مبشر علی، تجمل صاحب کو مبارک باد دینے کے لیے کمرے میں آ گیا۔ تجمل صاحب کرسی پر بیٹھے موبائل پر بات چیت کر رہے تھے۔ اسے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر بولے۔

''ہوسکتا ہے میں دوپہر کے کھانے پر نہ آسکوں۔ تم کھانا کھا لینا۔ میں تم سے کچھ دیر بعد بات کرتا ہوں۔ ابھی مبشر علی سے مبارک باد وصول کر لوں۔'' پھر موبائل بند کرتے ہوئے بولے۔ ''شائستہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ میں تمہیں بھی مشورہ دوں گا کہ دوسری شادی کر لو۔ عورت کے نصیب سے دن پھر جاتے ہیں۔ ابھی فون پر اس نے مجھے بتایا ہے کہ پانچ سو والے پرائز بانڈ پر پچاس ہزار کا انعام نکلا ہے۔ رقیہ تمہارے حق میں بہتر نہیں۔ اسے طلاق دے کر دوسری شادی کر لو۔''

مبشر علی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بیزار لہجے میں بولا۔ ''گھر میں کھانے کے لالے پڑے ہوئے ہیں اور آپ دوسری شادی کا مشورہ دے رہے ہیں۔ مجھے آپ کے مشورے پر حیرت محسوس ہو رہی ہے۔''

تجمل صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ ''تو پھر اسے مار دو، تم یک دم دو کروڑ کی پالیسی کے حق دار بن جاؤ گے۔

میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جلد از جلد تمہاری فائل کو اوپر بھجوانے کی کوشش کروں گا۔''

''کسی کو مار دینا اتنا آسان کام نہیں ورنہ اسے کب کا مار چکا ہوتا اور آپ جانتے ہیں کہ بیمہ پالیسی قتل پر نہیں ملتی۔''

تجمل صاحب سرگوشی بھرے لہجے میں ہمکلام ہوئے۔ ''مجھے معلوم ہے کہ قتل پر پالیسی نہیں ملتی لیکن حادثاتی موت پر مل جاتی ہے۔ مجھے تمہارے ساتھ ہمدردی ہے۔ اس لیے مشورہ دے رہا ہوں۔ اسے کسی معروف شاہراہ پر لے جا کر بس کے آگے دھکیل دو۔ تاہم کوشش کرنا کہ تمہیں وہاں دیکھنے والا کوئی نہ ہو۔ اپنے آپ کو ہجوم کے درمیان پوشیدہ رکھنا اور بعد ازاں اپنی موجودگی کو کہیں اور ظاہر کرنے کے لیے کوئی گواہ تلاش کر لینا۔''

مبشر علی کو اپنا دماغ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ تجمل صاحب کی بیوی کو بھی بس نے کچل دیا تھا اور جس دوران یہ حادثہ رونما ہوا تھا اس دوران تجمل صاحب ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کروا رہے تھے۔ تفتیشی ٹیم کو ان کی موجودگی کے متعلق ڈاکٹر صاحب کی گواہی کے ذریعے معلوم ہوا تھا۔ یقیناً انہوں نے ڈاکٹر کو بہت بڑی رقم رشوت میں دی ہوگی۔ لیکن مبشر علی کے لیے گواہی کون دیتا اور پھر وہ رقیہ کے احسان تلے دبا ہوا تھا۔ وہ اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔

تجمل صاحب اس کی دماغی کیفیت کا اندازہ لگاتے ہوئے بولے۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم دونوں کا ساتھ بہت پرانا ہے۔ لیکن میرا اور سلمٰی کا بھی تھا۔'' وہ سرد لہجے میں بولے۔ ''رشتے بنتے ہیں اور پھر ٹوٹ جاتے ہیں پھر دوبارہ بنتے ہیں۔ اس میں پریشان ہونے کی بات نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ رقیہ نے بیماری کے دنوں میں تمہارا بہت ساتھ دیا۔ ڈیڑھ لاکھ کی رقم کا بندوبست پندرہ دنوں کے دوران کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ لیکن اس نے نہ صرف رقم کا انتظام کیا بلکہ بے کاری کے ان دنوں میں گھر کے اخراجات بھی پورے کیے۔''

مبشر علی کو اپنا دماغ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ ڈیڑھ لاکھ کی رقم کے متعلق رقیہ کے علاوہ صرف اسے معلوم تھا۔ تجمل صاحب نے رقم کے متعلق بتا کر اس پردے کو فاش کر دیا تھا۔ جس کے متعلق بتانے سے رقیہ گریز کرتی تھی تو اس نے اپنا سودا تجمل صاحب سے کیا تھا۔ اسے اپنے دل و دماغ میں نفرت کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ تجمل صاحب سے اس

کی پہلے بھی نہیں بنتی تھی۔ اس انکشاف کے بعد نفرت کی شدت میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

تجمل صاحب بولے چلے جارہے تھے۔ ''اس نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ تمہارے احسانوں کا بدلہ چکایا ہے۔ تمام زندگی تم نے اسے اور بچوں کو اپنا خون پلا کر زندگی دی۔ تم گھر سے آفس سردی ہو یا پھر گرمی ہمیشہ پیدل آتے تھے۔ اب بھی جب اسے دل کا عارضہ لاحق ہوا تو تم نے نہ صرف اس کا علاج کروایا بلکہ دواؤں کا خرچ بھی برداشت کیا۔ احسان اتر چکا ہے۔ اب اسے بدلہ چکانا ہے اور اب قربانی کی باری اس کی ہے۔''

مبشر علی دانت پیستا ہوا اٹھ کر کمرے سے باہر آگیا۔ وہ مزید بات چیت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے دماغ میں طوفانی لہریں گردش کررہی تھیں اور اگر وہ زیادہ دیر کمرے میں بیٹھ کر ان کی باتیں سنتا رہتا تو انہیں قتل بھی کرسکتا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں چائے کا دور عروج پر تھا۔ وہ انہیں نظر انداز کر کے آفس کی عمارت سے باہر آگیا۔ اسے رقیہ پر بھی غصہ آرہا تھا۔ وہ اس کی غیر موجودگی میں تجمل صاحب کے پاس گئی تھی۔ نہ جانے ان دونوں نے رات کہاں بسر کی تھی۔ ان دنوں تجمل صاحب کی بیوی سلمٰی زندہ تھی۔ اس لیے اس کے ہوتے ہوئے تجمل صاحب من مانی نہیں کرسکتے تھے۔ یقیناً انہوں نے کسی ہوٹل کے کمرے کو استعمال کیا ہوگا۔ وہ بس اسٹینڈ پر آگیا۔ وہاں لوگوں کا ہجوم تھا اور بسوں کی بھرمار تھی۔ اگر کسی بھی بس کے سامنے رقیہ کو دھکیل دیا جاتا تو منٹوں میں اس کا کام تمام ہوسکتا تھا۔ وہ کافی دیر تک لوگوں کے ہجوم کے درمیان کھڑا ہو کر بسوں کا معائنہ کرتا رہا۔ وہاں سب اس کے جاننے والے تھے۔ اسے کسی ایسے بس اسٹینڈ کا انتخاب کرنا چاہیے تھا جہاں وہ اس سے پہلے بھی نہ گیا ہو۔ ایسے بس اسٹاپ پر اسے جاننے والا کوئی نہیں ہوتا اور وہ اپنا کام بہ خوبی کرنے کے بعد وہاں سے غائب ہو جاتا۔ اس صورت میں اسے اپنی موجودگی کہیں اور ظاہر کرنے کے لیے کچھ رقم خرچ کرنا تھی اور وہ ایسا کرسکتا تھا۔ دین محمد نائی سے وہ بال کٹواتا تھا۔ اس کے حالات بھی مبشر علی کی طرح تھے۔ ان دنوں اسے اپنے بڑے لڑکے کی شادی کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ مبشر علی اسے وہ رقم دے کر گواہی کے لیے آمادہ کرسکتا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ رقم لاتا کہاں سے۔ اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ پالیسی کی رقم ملنے میں اسے کچھ عرصہ لگ سکتا تھا۔ اس دوران دین محمد مشکل سے ہی صبر کرتا۔ تب اچانک ہی اسے خیال آیا کہ دین محمد کی دکان میں جو گھڑی لگی ہوئی تھی اس کا شیشہ ٹوٹ چکا تھا اور سوئیوں کو بہ آسانی ہاتھ کے ذریعے آگے پیچھے کیا جاسکتا تھا۔ بدھ کے دن اس کی دکان میں رش نہیں ہوتا تھا۔ وہ اسے کسی بہانے سے باہر بھیجنے کے بعد وقت کو تبدیل کرسکتا تھا۔ اب اسے صرف ایسے بس اسٹاپ کا انتخاب کرنا تھا جو دین محمد کی دکان سے زیادہ دور نہ ہو، تاکہ رقیہ کو بس کے نیچے دھکیلنے کے بعد وہ فوراً دین محمد کی دکان تک آجاتا۔ اسے بالوں کی کٹنگ کروائے...... کافی دن ہو چکے تھے۔ اس کی پلاننگ یہ تھی کہ وہ کٹنگ سے پہلے دین محمد کو دکان سے باہر بھجوا کر سوئیوں کو پیچھے کردیتا اور اس کے واپس آنے کے بعد متعدد بار اس سے وقت معلوم کرتا۔ اس طرح وہ وقت دین محمد کے دماغ میں حفظ ہوجاتا اور بعد میں جب وہ تفتیشی ٹیم کو اپنی موجودگی کے متعلق بتاتا تو دین محمد اس کے حق میں گواہی دے کر اس کی موجودگی کا اعتراف کرتا اور مبشر علی کی جان خلاصی ہوجاتی۔ اس صورت میں اسے رقم بھی خرچ نہ کرنا پڑتی اور وہ گواہ بھی تیار کرلیتا۔ لیکن تجمل صاحب سے بدلہ لینا بہت ضروری تھا۔ انہوں نے اس کی عزت کو پامال کر کے اس کے چہرے پر تھوک دیا تھا اور اس کا برملا اعتراف کر کے اس کا مذاق بھی اڑایا تھا۔ وہ اس کے لیے انہیں معاف نہیں کرسکتا تھا۔ تمام دن دفتروں کے چکر لگاتے ہوتے ہوئے گزر گیا لیکن کسی نے بھی پالیسی نہیں خریدی۔ شام کو آفس بند ہونے سے پہلے وہ عمارت کے پاس پہنچ گیا لیکن اندر نہیں گیا۔ عمارت کے نیچے پارکنگ تھی۔ وہ پارکنگ کا چکر لگا کر تجمل صاحب کے کمرے میں آگیا۔ اس نے تمام دن کی تفصیلات سے انہیں آگاہ کرنے کے بعد گھر جانے کی اجازت طلب کی۔ تب تجمل صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔

''کب تک پالیسیوں کے پیچھے بھاگتے رہو گے۔ اب پالیسی کو کیش کروانے پر دھیان دو۔ اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔ اگر نیت تھوڑی سی خراب ہو۔''

مبشر علی ست لہجے میں بولا۔ ''میں بہت تھک گیا ہوں۔ اب مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ مزید کام کرسکوں۔ ناصر ہوٹل میں ویٹر لگ گیا ہے۔ شاید اگلے مہینے سے میں پالیسی فروخت کرنا چھوڑ دوں۔ لیکن ابھی تو مجھے گھر جانے کی سوچ پریشان کیے دے رہی ہے۔ پیدل چلتے چلتے میرے پاؤں شل ہوگئے ہیں اور کمر میں شدید درد ہورہا ہے۔ قریبی بس اسٹاپ تک نہ جانے کیسے جاؤں گا؟''

تجمل صاحب، ہمدردی بھرے لہجے میں بولے۔ ''اگر

کچھ دیر انتظار کر سکتے ہو تو میں کام نمٹا کر آفس بند کرتا ہوں۔ تمہیں موٹر سائیکل پر گھر چھوڑ دوں گا۔''

مبشر علی نے اثبات میں سر ہلایا اور قریبی صوفے پر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

شام کو سات بجے جب وہ گھر پہنچا۔ تب ناصر علی ہوٹل کی طرف جا چکا تھا اور کنول ابھی اکیڈمی سے واپس نہیں آئی تھی۔ اس لیے رقیہ گھر میں اکیلی تھی۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مبشر علی کو تجمل صاحب کی باتیں یاد آنے لگیں۔ ڈیڑھ لاکھ کی رقم میں سے کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ سب کچھ آپریشن کی نذر ہو گیا تھا۔ یقیناً تجمل صاحب نے رات گزارنے کے بعد تمام رقم کسی بیگ میں ڈال کر رقیہ کے حوالے کی ہوگی۔ کیونکہ بینک میں رقیہ کا کوئی اکاؤنٹ نہیں تھا۔ اتنی بڑی رقم کو اس نے کیسے سنبھالا ہوگا۔ یہ علیحدہ بات تھی کہ تمام رقم آپریشن کے دوران ہی ختم ہو گئی تھی۔ لیکن آپریشن سے قبل اس نے رقم کو گھر میں ہی رکھا ہوگا اور وہاں رکھنے کے لیے کوئی محفوظ جگہ نہیں تھی۔ رقیہ نے اس سے کھانے کے متعلق دریافت کیا تو اس نے انکار کر دیا اور اسے اپنے پاس چارپائی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ جب وہ بیٹھ گئی تو مبشر علی نے تنقیدی نگاہوں سے اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔ اس کے خوب صورت جسم کو بیماری نے کھوکھلا کر کے رکھ دیا تھا۔ عمر اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن چہرے پر جھریاں نمودار ہونے لگی تھیں۔ آنکھوں کے نیچے حلقے تھے اور ہونٹ خشک تھے۔

رقیہ نے تیکھی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تم نے اس گھرانے کے لیے بہت قربانیاں دی ہیں اور میں تمہیں خوشی کا کوئی بھی پل نہیں دے سکا۔ مجھے اس کا افسوس تمام زندگی رہے گا جو بیماری مجھے لاحق تھی، اب تم اس میں مبتلا ہو۔ تم نے اپنا آپ بیچ کر میرا علاج کروایا اور میں تمہاری بیماری کا علاج کروانے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا۔''

رقیہ نے بے اختیار ہو کر اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تم نے حتی المقدور میرا علاج کروایا۔ تمہارے بس میں اتنا ہی تھا۔ اس سے زیادہ تم کیا کر سکتے تھے۔ اب بھی مجھے یقین ہے کہ تم تمام دن دفتروں اور بازاروں میں دربدر پھرتے رہے ہو گے اور تم نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا۔ تاہم اب تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ناصر علی نے مجھے بتایا ہے کہ جلد اسے گاڑیوں کے شوروم میں نوکری مل جائے گی۔ تنخواہ معقول ہے لیکن ٹائمنگ بہت زیادہ ہے اس لیے اسے پڑھائی کو خیرباد کہنا ہوگا۔''

مبشر علی غصیلے لہجے میں بولا۔ ''نوکری سے زیادہ پڑھائی ضروری ہے۔ میں نے دونوں بچوں کے مستقبل کے لیے بہت کچھ سوچ رکھا ہے۔ اللہ بہتری کرے گا۔ بس کچھ دنوں کی بات ہے پھر ہمارے بھی دن پھر جائیں گے۔''

رقیہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تو پھر تم کھانا کھا لو۔ میں نے انڈوں والا سالن بنایا ہے۔ کنول بھی آنے والی ہوگی۔ ہم مل کر کھائیں گے۔''

مبشر علی نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کر منہ ہاتھ دھونے لگا۔ اس دوران کنول اکیڈمی سے واپس آگئی ان تینوں نے خاموشی سے کھانا کھایا اور تمام دن کی تھکن اتارنے کے لیے مبشر علی بستر کی طرف آگیا۔ ناصر بارہ بجے سے پہلے واپس نہیں آتا تھا۔ وہ کھانا ہوٹل میں ہی کھاتا تھا۔ اس لیے گھر آنے کے فوراً بعد سونے کے لیے لیٹ جاتا تھا۔ اسے صبح آٹھ بجے کالج جانا ہوتا تھا لیکن نیند مبشر علی کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ سوچوں نے اس کے دماغ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ تاہم اب وہ پریشان نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ دو کروڑ کی پالیسی ملنے کے بعد تمام مسائل سلجھ جائیں گے۔ پھر ناصر کو ہوٹل میں رات دیر تک کام نہیں کرنا پڑے گا اور وہ اپنی پڑھائی کی جانب بھی توجہ دے سکے گا۔ رقم ملنے کے فوراً بعد وہ کنول کی شادی کر دے گا۔ دو تین رشتے اس کی نگاہوں میں تھے۔ مفلسی اور تنگ دستی کی وجہ سے وہ بات کو آگے بڑھا نہیں پا رہا تھا۔ بارہ بجے کے قریب ناصر ہوٹل سے واپس آگیا۔ وہ گھر میں داخل ہونے کے بعد سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ رقیہ نے ہمیشہ کی طرح اس سے کھانے کے متعلق پوچھا۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ وہ ہوٹل سے کھانا کھا کر آتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی ممتا کی ماری روزانہ اس سے پوچھنے کے لیے کمرے میں جاتی تھی اور جب وہ اسے تفصیل کے ساتھ بتاتا تھا کہ اس نے کھانے میں کیا کیا کھایا تھا تب مطمئن ہو کر واپس کمرے میں آجاتی تھی۔ اس رات بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ جب ناصر سے پوچھنے کے بعد واپس کمرے میں آئی تو مبشر علی مسکراتے ہوئے بولا۔

''ہو گئی تمہاری تسلی، وہ ہمیشہ تمہیں بتاتا ہے کہ کھانا اسے ہوٹل والوں کی جانب سے ملتا ہے لیکن تم روزانہ اس سے پوچھنے کے لیے جاتی ہو۔''

رقیہ جھکے ہوئے لہجے میں چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ مجھے ناصر اور کنول کی فکر کھائے جارہی ہے۔ نہ جانے میرے بعد ان دونوں کا کیا ہوگا۔ وہ ابھی ناسمجھ ہیں۔ اپنا اچھا بُرا انہیں جان سکتے اور میری زندگی کے دن کم ہوتے چلے جارہے ہیں۔"

مبشر علی محبت بھرے لہجے میں بولا۔ "تمہاری زندگی کے دن بھلا کم کیوں ہونے لگے۔ تمہارا علاج ہورہا ہے نا اور میں جلد تمہارا آپریشن بھی کروانے کی کوشش کروں گا۔ تم بالکل بھی فکر نہ کرو۔ ناصر اور کنول کی شادی تم اپنے ہاتھوں سے کروگی۔"

رقیہ بستر پر لیٹتے ہوئے بولی۔ "کنول کے لیے کل بھی ایک رشتہ آیا تھا۔ میں نے ٹال دیا۔ خالی ہاتھ اسے کیسے بیاہ دوں۔ سوچتی ہوں کوئی چھوٹی موٹی نوکری کرلوں۔ محلے کے اسکول میں آیا کی نوکری مل رہی ہے لیکن تنخواہ بہت کم ہے۔ دو ہزار روپے ماہوار۔ اس میں ہوتا ہی کیا ہے۔ میں نے تین ہزار کی بات کی ہے اگر پرنسپل مان گئیں تو پہلی تاریخ سے کام پر جانا شروع کردوں گی۔"

مبشر علی انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "اب اس کی ضرورت نہیں۔ بس کچھ دن صبر کرلو۔ اس کے بعد جو کچھ بھی ہوگا، تمہارے سامنے ہوگا۔"

رقیہ نے بیزاری کے ساتھ کروٹ لی اور آنکھیں موند لیں۔ وہ جانتی تھی کہ ان کے حالات کبھی بھی بدلنے والے نہیں تھے۔ مبشر علی صرف اسے تسلی دے رہا تھا۔ تاہم وہ نوکری پر جانے کا تہیہ کرچکی تھی۔ اب ان سب کو مل کر ہی کچھ کرنا تھا۔ کنول کے کالج میں تین مہینے کی چھٹیاں ہونے والی تھیں اور اسکول کی پرنسپل نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے بھی ٹیچر رکھ لیں گی۔ ٹیچر کی تنخواہ چھ ہزار روپے ماہوار تھی۔ اس طرح مہینے کا نو ہزار ان کے گھر آجاتا۔ وہ اس رقم سے بہت کچھ کرسکتی تھی۔ لیکن اسے کنول کی شادی کی فکر کھائے جارہی تھی۔ اس لیے اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ نو ہزار کی رقم گھر کے اخراجات کی نذر نہیں کرے گی بلکہ اس سے کنول کے جہیز کا سامان خرید کرلائے گی۔ ہرچند کے رقم بہت کم تھی لیکن نہ ہونے سے بہرحال بہتر تھی۔

☆☆☆

صبح انشورنس آفس جانے سے پہلے مبشر علی دین محمد کی دکان کی طرف چلا آیا۔ اس نے گھڑی کا معائنہ کیا۔ شیشہ اب بھی ٹوٹا ہوا تھا اور دکان پر گاہکوں کا رش تھا۔ اس کی دکان سے کچھ دور ایک بس اسٹاپ تھا۔ وہاں سے اسے واپس آنے میں آدھا گھنٹا لگ سکتا تھا لیکن اگر وہ رکشے پر آتا تو پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگتے۔ احتیاطاً اس نے رکشے کی رقم علیحدہ کرکے رکھ لی اور پھر بس میں بیٹھ کر آفس کی جانب چل دیا۔ جلد ہی بس میں سفر کا جھنجٹ ختم ہونے والا تھا۔ وقت بہت تیزی کے ساتھ گزر رہا تھا اور سفر بھی گزر گیا۔ جب وہ بس اسٹاپ پر اترا تو اس کا دل بہت تیز دھڑک رہا تھا اور دماغ پر خوف طاری تھا۔ لیکن یہ خوف چند دنوں میں ختم ہونے والا تھا پھر حالات اعتدال پر آجاتے۔ وہ سڑک پار کرکے انشورنس آفس کی دومنزلہ عمارت کی طرف آگیا۔ صبح کے ساڑھے آٹھ بجنے والے تھے۔ وہ آج وقت سے کچھ پہلے آفس آگیا تھا۔ عموماً کام کرنے والا اسٹاف نو بجے سے پہلے نہیں آتا تھا۔ لیکن جب اس نے آفس میں قدم رکھا تو وہاں تمام اسٹاف کو موجود پایا۔ ان کے چہروں پر حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات تھے۔ وجہ معلوم کرنے کی مبشر علی کو ضرورت نہیں تھی۔ ان کے درمیان.... کرسی پر انسپکٹر بیٹھا تھا۔ مبشر علی کو دیکھتے ہی اس نے پوچھا۔
"کل تم تجمل صاحب کے ساتھ گھر کی طرف گئے تھے؟"

مبشر علی نے اثبات میں سر ہلایا۔

انسپکٹر نے دوبارہ پوچھا۔ "تم کون سے اسٹاپ پر اترے تھے، دیکھو جھوٹ نہ بولنا میں تحقیقات کروا رہا ہوں۔"

مبشر علی نے بتایا۔ "میں امداد چوک پر اتر گیا تھا جبکہ تجمل صاحب نے کچھ آگے ریگل چوک پر اترنا تھا۔ لیکن آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں؟ تجمل صاحب تو ٹھیک ہیں نا، ان کی طبیعت ناساز تھی۔"

انسپکٹر نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ "لیکن اسٹاف والوں کا کہنا ہے کہ انہیں کوئی بھی بیماری لاحق نہیں تھی۔"

مبشر علی نے دوبارہ اثبات میں سر ہلایا۔ "وہ ٹھیک تھے لیکن بلڈ پریشر اچانک ہائی ہوجانے کی وجہ سے انہیں چکر آرہے تھے۔"

"تو تم ان کے ساتھ ریگل چوک پر نہیں گئے؟"

مبشر علی نے انکار میں سر ہلایا۔

انسپکٹر بولا۔ "عینی شاہد کے مطابق انہیں لوگوں کے ہجوم کے درمیان.... سے کسی نے بس کے آگے دھکا دیا اور جس نے دھکا دیا اس نے اپنے چہرے کو ماسک لگا کر چھپا رکھا تھا۔ تجمل صاحب کو قتل کیا گیا ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ کچھ عرصہ قبل تجمل صاحب کی بیوی کے ساتھ بھی کچھ ایسا

ہی حادثہ رونما ہوا تھا۔اس حادثے میں ان کی بھی موت واقع ہوئی تھی اور حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ حادثہ بھی ریگل چوک پر رونما ہوا تھا۔''

مبشر علی نے دماغ پر زور دیا تو اسے یاد آیا کہ واقعی تجمل صاحب کی بیوی کی موت ریگل چوک پر ہوئی تھی۔ انہوں نے اسے بتایا تھا کہ ریگل چوک پر بسیں بہت تیز رفتاری کے ساتھ گزر رہی تھیں اور ان بسوں میں سے ایک نے ان کی بیوی کو کچل کر رکھ دیا تھا۔

انسپکٹر دوبارہ بولا۔ ''ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تجمل صاحب روزانہ اپنی موٹر سائیکل پر گھر جاتے تھے لیکن کل ان کی موٹر سائیکل میں سے کسی نے ہوا نکال دی اور چونکہ ہوا دونوں ٹائروں میں سے نکالی گئی تھی اس لیے وہ اسے کھینچ کر قریبی دکان تک نہیں لے جاسکے اور مجبوراً انہیں بس کا سفر کرنا پڑا۔ اس انکشاف نے ہمیں چونکا دیا اور ہم نے اسے اتفاقی حادثے کے بجائے قتل کے نظریے سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اس لیے ہماری اجازت کے بغیر تم میں سے کوئی بھی شہر سے باہر جانے کی کوشش نہ کرے۔ ہم وقتاً فوقتاً تم سب کو پوچھ گچھ کے لیے پولیس اسٹیشن بلائیں گے۔'' انسپکٹر اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ پھر دوبارہ اسٹاف سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''دو تین ایسے واقعات اور بھی ہو چکے ہیں جن کا مقصد پالیسی کا حصول تھا اور اس میں انشورنس کا محکمہ ملوث ہے۔ اس لیے تم سب مجھ سے تعاون کرنا۔ میں بھی کوشش کروں گا کہ تم سب کو زیادہ تنگ نہ کروں۔'' وہ کمرے سے باہر نکل گیا اور مبشر علی سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسٹاف کے لوگوں نے انسپکٹر کے جانے کے بعد اس پر سوالات کی بارش کر دی۔ وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

''مجھے کچھ معلوم نہیں۔ تجمل صاحب کو جب میں نے امدد چوک پر الوداع کہا تھا تب ان کی طبیعت ناساز تھی۔ ریگل چوک پر ان کے ساتھ کیا ہوا؟ مجھے کچھ معلوم نہیں۔''

ورکرز چپ ہو گئے اور مبشر علی کچھ دیر آفس میں بیٹھے رہنے کے بعد عمارت سے باہر آ گیا۔ اس کا دماغ سوچوں کے گھیرے میں تھا۔ بس کے آگے دھکیل کر ہلاک کرنے والا طریقہ عام ہو گیا تھا۔ اسے اب کچھ اور سوچنا تھا۔ اس نے کام کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ حالانکہ آج کا دن اس کے لیے بہت اہم تھا۔ وہ دو کروڑ کی پالیسی خریدنا چاہتا تھا لیکن تجمل صاحب کی موت نے ورکرز کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور انسپکٹر کی آمد نے انہیں کام کرنے سے انکاری کر دیا تھا۔ بہرحال

ویٹو پاور

ویٹو کا کسی قانون اور اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تصور صرف ہمیں یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں پانچ عالمی بدمعاش ہیں اور ان پانچ میں سے اگر کوئی ایک بھی کسی معاملے میں انکار کر دے تو سلامتی کونسل کچھ نہیں کرے گی۔ کیونکہ ان پانچ بدمعاشوں میں سے کسی ایک کو ناراض کر دینا عالمی امن کو خطرے میں ڈال سکتا ہے۔

مغرب کی مسیحی اقوام کے پاس بھی ویٹو کی یہ طاقت موجود ہے اور وہ صیہونیت کی سرپرست بھی ہیں۔ چینی تہذیب کے پاس بھی یہ طاقت ہے اور روس کے پاس بھی۔

اس بندوبست میں صرف مسلم دنیا کو ویٹو سے محروم رکھا گیا ہے۔ پیغام واضح ہے۔

اور وہ یہ کہ اقوام متحدہ اصل میں کوئی عالمی ادارہ نہیں۔ یہ جنگ عظیم اول کے فاتحین کا کلب ہے اور انٹرنیشنل لا اس کلب کے مفادات کی قانونی شرح ہے۔ باقی سب کہانیاں ہیں۔

آصف محمود کے خیالات

پری

''ہاں، تو بیٹا! میں کہہ رہی تھی کہ کوہ قاف میں ایک پری تھی۔ ایک دن وہ اڑتے ہوئے سمندر پر سے گزر رہی تھی کہ......!''

پوتے نے دادی کی کہانی میں یکایک قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔ ''دادی ماں...... دادی ماں...... کیا پریاں واقعی اڑتی ہیں؟''

''ہاں، بیٹا! اللہ میاں نے ان کو پر دیے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ کبوتروں اور چڑیوں کی طرح اڑتی پھرتی ہیں۔''

''لیکن ہمارے پڑوس والی آنٹی تو نہیں اڑتیں!'' بچے نے اٹھلا کر شکوہ کیا۔

''بیٹے...... وہ ہم تم جیسی ہیں...... وہ پری نہیں ہیں!''

''لیکن بابا تو شام کو انہیں گلے لگا کر کہہ رہے تھے کہ تم میری پیاری پری ہو!''

''چپ ہو جا!'' دادی نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ ''یہ اپنی ماما سے نہ کہہ دینا...... وہ میرے بیٹے کی زندگی اجیرن کر دے گی۔''

کھاریاں سے شبنم شفیق کا انتخاب

پالیسی اگلے دن بھی خریدی جا سکتی تھی۔ وہ بس پکڑ کر گھر آ گیا۔ رقیہ نے اس سے واپس آنے کی وجہ دریافت کی تو اس نے تجمل صاحب کی موت کے متعلق اسے بتا دیا۔ وہ ششدر ہو کر رہ گئی۔

مبشر علی بولا۔ ''بسوں والے بھی تو حد کرتے ہیں۔ سڑکوں پر بسوں کو اڑائے چلے جاتے ہیں اور شہر میں رش کا یہ عالم ہے کہ پیدل چلنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔'' رقیہ نے وہی سوال پوچھا جو کچھ دیر پہلے انسپکٹر نے پوچھا تھا۔

''غالباً تجمل صاحب کی بیوی بھی بس کے نیچے آ کر ہلاک ہوئی تھی؟''

مبشر علی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں واقعی، میں تو بھول ہی گیا لیکن اس کی ہلاکت کا سبب دو کروڑ کی پالیسی تھی۔ تجمل صاحب نے کوئی پالیسی نہیں خریدی تھی۔ انہیں صرف اپنے اعمالوں کی سزا ملی ہے۔'' وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا پھر رقیہ کے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ''مجھے ورکرز نے بتایا ہے کہ وہ بہت عیاش انسان تھے۔ کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے میں انہیں عار محسوس نہیں ہوتی تھی۔''

رقیہ کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ مبشر علی کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ چارپائی پر بیٹھنے کے بعد وہ سوچنے لگا۔ اگر اسے پہلے معلوم ہو جاتا کہ رقیہ نے تجمل صاحب کے سے اپنا سودا کیا تھا تو شاید وہ یہ سب کچھ بہت پہلے کر چکا ہوتا جو اب کر رہا تھا۔ لیکن اب اسے کوئی اور راستہ تلاش کرنا تھا۔ بس والا طریقہ عام ہو گیا تھا اور ہلاکت ایسی ہونی چاہیے تھی جس پر خودکشی کا گمان ہو ورنہ پالیسی نہ ملتی۔ وہ کافی دیر تک ہلاکت کے طریقے کے متعلق سوچتا رہا لیکن سبب تلاش نہ کر سکا۔ تب اس نے دماغ کو آزاد چھوڑ دیا۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا۔ جب اسے کسی کام میں ناکامی ہوتی تھی تب وہ اسے حواسوں پر طاری نہیں کرتا تھا بلکہ دماغ کو کسی اور جانب مشغول کر دیتا تھا۔ اس دفعہ بھی اس نے یہی کیا اور رقیہ کے متعلق سوچنے لگا۔ وہ اپنے گھرانے کے لیے ہمیشہ سے سنجیدہ رہی تھی۔ اس کی زندگی یا پھر سوچیں اپنے بچوں اور شوہر کے لیے محدود تھیں۔ شاید اسی وجہ سے عام میاں بیوی کی طرح ان دونوں میں لڑائی جھگڑا کم ہی ہوتا تھا۔ وہ اتنی سنجیدہ اور مخلص عورت تھی کہ اس نے کبھی بھی مبشر علی کی کسی بات سے انکار نہیں کیا تھا۔ وہ بھی رقیہ سے بہت محبت کرتا تھا اور جو کچھ اس نے مبشر علی کے لیے کیا تھا اس کے بعد اس کے دل میں اس کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی تھی۔ اس نے دل میں تہیہ کر لیا کہ وہ پالیسی حاصل کرنے کے لیے رقیہ کو ہلاک نہیں کرے گا۔ اس کی زندگی رقیہ کی مرہونِ منت تھی۔ وہ اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا اور اسے اس کا احسان بھی اتارنا تھا۔ اس لیے ارادہ بدلنے کے بعد وہ کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆

صبح اس کی آنکھ تاخیر سے کھلی۔ ناصر اور کنول ناشتا کر کے کالجوں کی طرف جا چکے تھے اور رقیہ ناشتا تیار کیے اس کی منتظر تھی۔ اس نے خاموشی کے ساتھ ناشتا کیا پھر کپڑے تبدیل کرنے کے بعد رقیہ کو بتایا۔

''میں نوکری چھوڑنے والا ہوں۔ مہنگائی اتنی زیادہ ہو گئی ہے کہ کوئی بھی مجھ سے پالیسی نہیں خریدتا۔ لوگوں کے گھروں کا خرچہ کھینچ تان کر پورا ہو جائے یہی بڑی بات ہے۔ میری بات کو غور سے سننا۔ میں باہر جانے والا ہوں۔ تمہیں کچھ دنوں کے دوران اچھی خاصی رقم مل جائے گی۔ جس سے تمہاری گزر بسر آسانی سے ہو جائے گی۔ تاہم جو بھی رقم ملے اسے احتیاط کے ساتھ خرچ کرنا۔ ناصر سے ہوٹل کی نوکری چھڑوا دینا۔ اسے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کا شوق ہے اسے داخلہ دلوا دینا۔ گلی کے نکڑ پر جو شفیق صاحب ہیں نا، انہوں نے مجھ سے کئی دفعہ کنول کے متعلق بات چیت کی ہے۔ میں نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا۔ تم ان کی بیوی سے بات کر لینا۔ ان کا لڑکا گورنمنٹ ملازم ہے۔ گھر ذاتی ہے۔ کنول وہاں خوش رہے گی اور ہاں جتنی رقم تمہیں ملے، اس میں سے ایک چھوٹا سا مکان اور مین سڑک کے پاس والی دو دکانیں آ جائیں گی۔ ان دکانوں کا کرایہ بیس سے پچیس ہزار ماہوار ہے۔ اس طرح تمہیں کوئی بھی کام کیے بغیر پچاس ہزار کی رقم مل جائے گی۔ میرے خیال میں تم تینوں کا گزارا باآسانی ہو جائے گا......''

رقیہ بات کو درمیان سے کاٹتے ہوئے بولی۔ ''لیکن ناصر اور کنول کو تمہاری ضرورت ہے، جو تم سوچ رہے ہو، میں وہ سوچ چکی ہوں۔ خدا کے واسطے ایسا مت کرنا۔ ہمارے دونوں بچے دربدر ہو جائیں گے۔ کھینچ تان کر گزارا ہوتا آ رہا ہے۔ ہمیں کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑتا، پھر کیا ضرورت ہے اس تردد کی؟''

مبشر علی نے اداس لہجے میں بتایا۔ ''تمام زندگی اپنے بچوں کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ اب موقع ملا ہے تو اسے گنواؤں گا نہیں۔ اپنی زندگی تو گزر گئی ہے لیکن ان دونوں

کی زندگیوں کی شروعات ہے اور میں چاہتا ہوں کہ انہیں کسی بھی چیز کی کمی نہ ہو، مجھے یقین ہے کہ رقم ملنے کے بعد سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ بس میری باتوں کو اپنے پلے باندھ کر رکھنا اور ان پر عمل کرنا۔" وہ اٹھ کر تیز قدموں سے چلتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔ جب وہ دین محمد کی دکان کے سامنے سے گزرا تو وہ باہر کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر مبشر علی کو سلام کیا اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "بال نہیں کٹواؤ گے، اب تو رش بھی نہیں ہے۔"

مبشر علی نے جواب دیا۔ "اس کی ضرورت نہیں رہی۔ تاہم تم دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کا شیشہ ضرور لگوا لینا۔ کوئی بھی وقت کو اپنی مرضی سے آگے پیچھے کرسکتا ہے۔"

دین محمد نے نہ سمجھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا لیکن مبشر علی کوئی بھی بات کیے بغیر آگے چل دیا۔ سڑکوں پر رش تھا۔ بسوں کی بھرمار تھی۔ وہ آفس جانے والی بس میں سوار ہوگیا۔ آج اس کا دماغ سوچوں کے گھیرے میں نہیں تھا۔ حتمی فیصلے پر پہنچنے کے بعد اس نے سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ اب اس کے چہرے پر سنجیدگی کے تاثرات تھے۔ بس سے اتر کر وہ سیڑھیاں چڑھ کر آفس میں آگیا۔ کمرے میں تجمل صاحب کی جگہ ان کا بھائی محمد حسین بیٹھا تھا۔ مبشر علی نے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے دو کروڑ کی پالیسی لینے کے ارادے کا اظہار کیا تو وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ مبشر علی اس کی حیرت کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ کمپنی کے ڈاکٹر کو بلا لو۔ میں ہر لحاظ سے صحت مند ہوں۔ اگلے ماہ پریمیم کی رقم ادا کردوں گا۔ تم کاغذات بنالو۔"

محمد حسین مسکراتے ہوئے بولا۔ "یعنی تم مرنے کی تیاری کرچکے ہو۔ لیکن یہ یاد رکھنا کہ موت طبعی یا پھر حادثاتی ہونی چاہیے۔ قتل کی موت پر پالیسی نہیں ملے گی اور اگلے ماہ پریمیم ادا کردینا۔ میں کاغذات مکمل کروالوں گا۔"

اس کے بعد دفتری کارروائیاں ہوتی رہیں۔ دو بجے وہ فارغ ہوکر گھر واپس آگیا۔ ناصر اور کنول کالج سے آچکے تھے۔ ان چاروں نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد مبشر علی نے پالیسی کے متعلق ناصر کو بتایا اور مین سڑک پر بنی ہوئی دکانوں کی خرید و فروخت کی بات چیت کرنے کے لیے کہا۔

ناصر نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ "ان دکانوں کی قیمتی ایک کروڑ تو ضرور ہوگی، ہم رقم کہاں سے لائیں گے؟"

مبشر علی نے بتایا۔ "دو کروڑ کی پالیسی میں نے اس لیے خریدی ہے تاکہ دکانیں لے سکوں اور باقی کے بچ جانے والے ایک کروڑ میں سے چھوٹا سا مکان آجائے گا۔ میں کل سے مکان تلاش کروں گا۔ ناصر کو کچھ بھی سمجھ نہیں آئی۔ تاہم اسے اندازہ ہوگیا کہ حالات کے اتار چڑھاؤ نے اس کے باپ کا دماغ خراب کردیا تھا۔ اس لیے زیادہ توجہ دیے بغیر کھانا کھانے کے بعد سونے کے لیے لیٹ گیا۔ اسے پانچ بجے سے پہلے ہوٹل جانا ہوتا تھا۔ لیکن مبشر علی کے پاس وقت بہت کم تھا۔ اسے پچاس ساٹھ لاکھ میں دو یا تین کمروں کا مکان تلاش کرنا تھا۔ پریمیم کی رقم اس کے پاس موجود تھی۔ وہ نوکری سے استعفیٰ دے کر آیا تھا اور اسے جمع شدہ کچھ رقم مل گئی تھی۔ وہ گھر سے نکل کر پراپرٹی ڈیلر کی طرف آگیا۔ وہ اس کے محلے میں رہتا تھا اور مبشر علی سے اس کی اچھی خاصی جان پہچان تھی۔ اس نے جب اس سے مکان کے متعلق پوچھا تو وہ حیران رہ گیا۔ اسے مبشر علی کے حالات کے متعلق اچھی طرح معلوم تھا۔ مبشر علی نے بتایا کہ آبائی مکان بکنے کی وجہ سے اسے حصے میں اچھی خاصی رقم ملی ہے تب پراپرٹی والا مطمئن ہوگیا اور اس نے چند مکانوں کی تصاویر اور حدود اربع کے متعلق اسے بتایا۔ اس میں دو مکان ایسے تھے جن کی قیمت مناسب تھی اور بنے ہوئے بھی اچھے تھے۔ اس نے پراپرٹی ڈیلر کو مالک مکان سے بات چیت کرنے کے لیے کہا اور وہاں سے اٹھ کر اس نے مزید پراپرٹی ڈیلروں سے ملاقات کی اسے چند مزید مکان پسند آئے لیکن ان میں کچھ خامیاں تھی۔ کسی میں گیس کی مناسب سہولت نہیں تھی اور کسی میں پانی کی مشکلات تھیں۔ اس لیے تھک ہار کر وہ واپس آگیا۔ ناصر ہوٹل جاچکا تھا اور کنول اکیڈمی کے لیے نکل رہی تھی۔ رقیہ کپڑے دھو رہی تھی۔ مبشر علی نے اسے مکانوں کی تفصیل سے آگاہ کیا تو وہ رو دینے والے لہجے میں بولی۔

"تم یہ سب کیوں کررہے ہو؟ تمہارے بچوں کو تمہاری ضرورت ہے نا کہ اس رقم کی جو انہیں پالیسی کی صورت میں ملنے والی ہے۔ تم اپنے علاوہ ان پر بھی ظلم کررہے ہو۔ دنیا تو خراب ہے ہی آخرت بھی برباد ہوکر رہ جائے گی۔"

مبشر علی افسردہ لہجے میں بولا۔ "ان کی آئندہ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ہی تو میں یہ سب کررہا ہوں۔ ہمارے محلے میں دو مکان مناسب ہیں۔ تم ناصر کو بتادینا۔ دونوں کی قیمتیں پچاس لاکھ ہیں۔"

رقیہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ معاملہ اس کی

برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی باپ اپنے بچوں کے لیے اس حد تک بھی کر سکتا تھا۔ اپنی زندگی کو ختم کر دینا کوئی معمولی بات نہیں تھی لیکن اس کا شوہر خودکشی کرنے والا تھا۔ اس لیے ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "خدا کے لیے ایسا مت کرو، تمہاری موت کے بعد ملنے والی رقم سے وہ اپنی خوشیاں خرید نہیں سکیں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ تمام زندگی تمہیں یاد کرنے کے بعد آخرکار پاگل ہو جائیں گے اور پالیسی سے ملنے والی تمام رقم مٹی میں مل جائے گی۔ وہ تمہارے ساتھ خوش ہیں۔ ان کی خوشیوں کو چھیننے کی کوشش نہ کرو۔"

مبشر علی نے جواب دیا۔ "میں خوشیوں سے ان کی جھولی بھرنے کے لیے یہ سب کر رہا ہوں۔ تم مجھے منع نہ کرو۔ ابھی مجھے بہت کام کرنے ہیں۔ مکان کا بندوبست کرنے کے بعد دکانوں کی بات چیت بھی کرنی ہے۔ ایک کروڑ کی دکانیں اور پچاس لاکھ کے مکان کے سوا بھی تمہارے پاس پچاس لاکھ کی رقم بچ جائے گی۔ جس سے نہ صرف تمہارا علاج ہو جائے گا بلکہ کنول کی شادی کے لیے اچھی خاصی رقم بچ جائے گی۔ اب سب کچھ تمہیں ہی کرنا ہے اس لیے اس معاملے میں میرا ساتھ دو۔"

رقیہ چپ ہو گئی۔ تاہم اس نے دل میں تہیہ کر لیا کہ وہ صبح مبشر علی کے جانے کے بعد ناصر اور کنول کو سب کچھ بتا دے گی۔ مبشر علی کو اس کے ارادے سے باز اس کے بچے ہی رکھ سکتے تھے۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد جب مبشر علی سونے کے لیے لیٹا تو اس کے دماغ میں بہت سی باتیں گردش کر رہی تھیں۔ انشورنس کی رقم اتنی جلدی نہیں مل سکتی تھی۔ اس دوران مکان اور دکانیں فروخت بھی ہو سکتی تھیں۔ انشورنس کا چیک آنے میں پانچ سے چھ مہینے لگ جاتے تھے۔ اس لیے آج کی دوڑ دھوپ فضول ثابت ہوئی تھی اور سب سے اہم بات اسے قربانی دینے کے لیے کوئی مناسب طریقہ کار سوچنا تھا۔ درحقیقت مر تو وہ تب ہی گیا تھا جب اسے معلوم ہوا تھا کہ رقیہ نے اپنا جسم تجمل صاحب کے ہاتھوں فروخت کیا تھا۔ اس انکشاف کے بعد اس کے دل میں جینے کی معمولی سی امنگ بھی باقی نہیں بچی تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنے بچوں کی خوشی کے لیے اپنی زندگی کو ختم کرنے والا تھا۔ اسے رقیہ سے کوئی گلہ شکوہ نہیں تھا۔ وہ تو اس کا احسان اتارنے کے لیے یہ سب کر رہا تھا۔ وہ اکثر پالیسی فروخت کرنے ٹرین کے ذریعے قریبی شہروں کی طرف جایا کرتا تھا اور کم و بیش ایک دو ماہ کے دوران ایک یا دو حادثے مسافروں کے ٹرین سے نیچے گرنے کی صورت میں رونما ہوتے تھے۔ اگر اسے یہ حادثہ پیش آ جاتا تو اس کے بیوی بچوں کو دو کروڑ کی پالیسی مل جاتی۔ تاہم وہ مطمئن نہیں تھا۔ تجمل صاحب کی نسبت محمد حسین بہت کائیاں اور شکی مزاج انسان تھا۔ وہ اتنی آسانی سے بات کو ہضم نہیں کر سکتا تھا۔ اسے کوئی اور طریقہ سوچنا تھا۔ لیکن اتنی پریشانیوں اور دماغی تناؤ کے باوجود بھی اسے جلد ہی نیند آ گئی اور وہ خواب میں اپنے آپ کو پالیسی کی رقم لیتے ہوئے دیکھنے لگا۔ انشورنس آفس میں محمد حسین کے کمرے کے باہر اس کی لاش بینچ پر رکھی ہوئی تھی۔ اسے سفید کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ رقیہ اور کنول اس کی لاش کے گرد بیٹھے بین کر رہے تھے اور وہ حیرت انگیز طور پر محمد حسین کے سامنے بیٹھا ہوا پالیسی کے کاغذات پر دستخط کر رہا تھا۔ پھر رقیہ اور کنول کے رونے کی آواز قریب آنے لگی اور کسی نے جھنجھوڑ کر اسے نیند سے بیدار کر دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اسے اپنے الٹے ہاتھ میں شدید تکلیف کا احساس ہوا کمر بھی دوہری ہو گئی۔ سانس سینے میں رکنے لگا۔ ناصر اس کی چارپائی کے قریب کھڑا تھا اور کنول ماں کی چارپائی کے کنارے بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی۔ مبشر علی چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے قدم ڈگمگائے۔ ناصر نے روتے ہوئے بتایا کہ ماں نہ جانے رات کے کس پہر ان سب کو چھوڑ کر موت کی وادیوں میں گم ہو چکی ہے۔ اس کا جسم سردی کی وجہ سے اکڑ گیا ہے۔ مبشر علی کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ اس نے سر کو جھٹک کر حواس بحال کیے۔ وہ رقیہ کا احسان نہیں اتار سکا تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر اس پر سبقت لے گئی تھی اور اس کی ناگہانی موت میں کافی حد تک مبشر علی کا ہاتھ تھا۔ اسے رقیہ کو اپنے ارادوں سے آگاہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ دل کی مریضہ تھی۔ ان تلخ باتوں کو برداشت نہیں کر سکی تھی اور اس کا مناسب علاج بھی نہیں ہو رہا تھا۔ اس لیے شاید رات کے کسی پہر ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور اس نے دو کروڑ کی پالیسی شوہر اور بچوں کے نام کر دی تھی۔ مبشر علی لڑکھڑا کر چارپائی کے پاس زمین پر گر گیا۔ اس کا سانس رکنے لگا۔ دونوں بچوں نے اسے سنبھالنے کی ناکام کوشش کی۔ لیکن اچانک ہی اس نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس کے منہ سے خون نکل کر نیچے زمین پر گرنے لگا اور جسم بے جان ہو گیا۔ ماں باپ کی اچانک موت کے بعد ناصر اور کنول چار کروڑ کی پالیسی کے مالک بن گئے لیکن رقم کو استعمال کرنے کے لیے اب وہ دونوں دنیا میں تنہا تھے۔ ماں باپ کا سایہ ان کے سروں سے چھین لیا گیا تھا۔

❖❖❖

پیچک

عبدالرب بھٹی

حقیقت بڑی سفاک ہوتی ہے... خصوصاً ایک عام آدمی کے لیے اپنے معالج کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ ناقابلِ تردید حقیقت ہوتی ہے... انسان ذہین ہو تو پھر وہ اپنی ذہانت سے ایسے کام لیتا ہے کہ .... فرار کی کوئی گنجائش نہیں رہتی... ایک ایسے ہی ڈاکٹر کی کارکردگی جس نے نہایت باریک بینی... تجربے اور ذہانت سے اپنے مریض کے مرض کی تشخیص کر کے بروقت علاج تجویز کر دیا تھا...

اس بدباطن کا ماجرا جسے ظاہر کی خوبصورتی عزیز تھی......

سردیوں کی ٹھٹھرتی شام تھی۔ یخ بستہ ہواؤں کے تھپیڑوں نے سڑکوں اور بازاروں کو ویران کر رکھا تھا۔ ایک پُرانی طرز کی رہائشی عمارت، جس کی چھتیں اُونچی اور کمرے کشادہ تھیں۔

یہ اسی عمارت کے ایک کمرے کا منظر ہے۔ یہ نشست گاہ ہے۔ اس کی کھڑکی بند تھی اور بھاری پردے لٹکے ہوئے تھے۔ آتش دان میں بجلی کا ہیٹر جل رہا تھا۔ کمرے کی فضا گرم تھی۔ بالکل کسی آغوشِ مادر کی طرح نرم اور پُرسکون۔

کمرے میں ایک عجیب قسم کی نامعلوم سی اسراریت

کا گمان محسوس ہوتا تھا۔ جیسے کچھ ہونے والا ہو یا ہو چکا ہو......

نشست گاہ میں دو افراد تھے۔ ایک نوجوان اور دوسرا معمر شخص۔ نوجوان کاؤچ پر آنکھیں موندے دراز پڑا تھا۔ نجانے وہ سو رہا تھا یا پھر بے ہوش تھا۔

اس کے سامنے آرام کرسی پر وہ معمر شخص براجمان تھا، جس کی یک ٹک سی نظریں اسی دراز نوجوان پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بیک وقت دو مختلف کیفیات کا شکار تھا۔ غم اور غصہ۔

معمر شخص کا نام کلیم تھا۔ سرجن کلیم الدین...... اور کاؤچ پر دراز نوجوان فہیم، جوان کا بھانجا تھا۔ سگا بھانجا۔

سرجن کلیم کو غصہ اپنے اس بھانجے فہیم پر اور غم اپنے بڑے بھائی تمیز الدین کی موت کا تھا جسے آج ہی وہ اپنے ہاتھوں سے دفنا کر آرہا تھا۔ اسے اپنے مرحوم بھائی کی بہت سی باتیں یاد آرہی تھیں۔ خوش گوار اور کبھی آنکھوں کو پرنم کر دینے والی باتیں۔

مرحوم تمیز الدین اپنے بھانجے فہیم سے بہت محبت کرتے تھے۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ فہیم ان کی جوانی کی نقل تھا۔ ویسا ہی دراز قد، دہرا بدن، کھلتا ہوا گندمی رنگ۔ کشادہ پیشانی اور اس پر جھولنے والی بالوں کی لٹیں۔ وہ بھی فہیم کی طرح اپنی جوانی میں خوب صورت اور خوش لباس تھے لیکن کام چور اور آوارہ نہیں تھے۔ انہوں نے خوب محنت کی، شادی بھی کی اور ایک کامیاب زندگی گزاری لیکن گزشتہ شب ان کی موت طبعی نہیں تھی، جس کا سرجن کلیم کو بہت دکھ ہوا تھا۔

ہوسکتا ہے مرحوم تمیز الدین کی اپنے آوارہ اور نکمے بھانجے سے محبت کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہو کہ وہ خود لاولد تھے۔ انہیں ایک بیٹے کی بڑی تمنا تھی لیکن بیوی کی حد سے بڑھی ہوئی چاہت اولاد کی خواہش پر غالب آگئی اور یوں وہ فہیم کو ہی اولاد کی طرح چاہنے لگے۔

یہاں خود فہیم اُن کی محبت سے ناجائز فائدہ اُٹھانے میں کبھی نہیں چوکتا تھا۔ وہ ان کی محبت کی قیمت پیسوں کی صورت، وصول کرتا تھا۔ مختلف بہانوں سے چھوٹی موٹی رقم اینٹھتے رہنا گویا اس کا محبوب مشغلہ بن چکا تھا، جبکہ مرحوم جیب خرچ کے نام پر اسے ہر ماہ ایک بے حد معقول رقم بھی دیتے تھے۔ حتیٰ کہ بیوی کے انتقال کے بعد انہوں نے برملا اعلان کر دیا تھا کہ فہیم ان کی دولت اور جائداد کا بڑا وارث ہوگا اور توقع ظاہر کی تھی کہ دوسرے لوگ ان کی خواہش کا احترام کریں گے۔

اس سلسلے میں انہوں نے باقاعدہ وصیت نامہ بھی مرتب کیا تھا جس کے اندراجات کا سب ہی کو علم تھا لیکن سرجن کلیم الدین نے محسوس کیا تھا کہ گزشتہ کئی ماہ سے وہ فہیم کی طرف سے غیر مطمئن اور مایوس نظر آنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ وہ دبی دبی زبان سے فہیم کے حق میں لکھے ہوئے وصیت نامے کو تبدیل کرنے کی باتیں بھی کرنے لگے تھے۔

پھر ایک روز تین ہفتے قبل تمیز الدین نے ملاقات ہونے پر بڑے دل گرفتہ لہجے میں اپنے بھائی سرجن کلیم الدین سے کہا۔

”کلیم! اب اس بات کی تصدیق ہوگئی ہے کہ فہیم کو جوئے کی لت پڑگئی ہے۔“

اس پر کلیم الدین نے پوچھا تھا۔ ”بھائی جان! کیا فہیم آپ سے لمبی رقمیں اینٹھنے لگا ہے؟“

جواب میں تمیز الدین نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ”بات پیسوں کی نہیں ہے کلیم! جوئے کی لت ایسی لعنت ہے جو کبھی نہیں چھوٹتی۔ آدمی شراب چھوڑ دیتا ہے، بدکاری چھوٹ جاتی ہے، لیکن تباہ و برباد ہونے کے باوجود جوئے کی لت نہیں چھوٹتی، یہ قبر تک ساتھ جاتی ہے۔ اس کا نشہ سب سے بڑھ کر ہوتا ہے اور ہر جواری کی قسمت میں تباہی و بربادی لکھ دی جاتی ہے، جو اٹل ہوتی ہے۔ اب مجبوراً مجھے سوچنا پڑ رہا ہے کہ اپنا وصیت پھاڑ دوں۔ میں یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ اس قدر محنت و مشقت سے میں نے زندگی بھر میں جو کمایا ہے وہ جوئے کی میز پر تاش کے پتوں کی نذر ہوجائے۔“

مرحوم تمیز الدین کی طرح، سرجن کلیم الدین بھی اگرچہ نوجوان فہیم کے ماموں ہی تھے، لیکن باوجود کوشش کے وہ فہیم کو کبھی پسند کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے تھے بہن کے رشتے کی وجہ سے وہ اسے برداشت کر لیتے تھے۔

اگرچہ کئی بار انہوں نے اپنے بھانجے پر ترس کھانے کی بھی کوشش چاہی لیکن اپنے دل کو اس پر بھی آمادہ نہ کر سکے۔ فہیم اس قابل تھا بھی نہیں کہ اس پر ترس کھایا جائے، پھر اپنے مرحوم بھائی سے آخری ملاقات کے بعد تو فہیم کے لیے نفرت کے جذبات بھی پرورش پانے لگے تھے۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ انہیں اپنے مرحوم بھائی تمیز الدین سے بے حد محبت تھی اور فہیم نے ان کے بھائی کو بڑا دُکھ پہنچایا تھا۔

ان دونوں بھائیوں کی ایک ہی بہن تھی، عارفہ۔ فہیم اسی

کی اکلوتی اولاد تھا۔ ماں اور ماموں کے لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا تھا۔ وہ حد سے زیادہ آوارہ مزاج ہو گیا تھا۔

ان کی بہن عارفہ خود دار تھی، اپنی پسند سے خاندان سے باہر کالج کے لیکچرر سے شادی کر لی تھی، زندگی بھر بے چاری تنگ دستی کا شکار رہی، لیکن کبھی بھائیوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا مگر اسی بہن کا بیٹا فہیم آوارہ ہونے کے ساتھ بے غیرت بھی تھا۔ ہر وقت دونوں ماموؤں کے در پر کھڑا رہتا تھا اور ابھی حال ہی میں کلیم الدین کو یہ اطلاع ملی تھی کہ فہیم کو جوئے کی لت بھی پڑ گئی ہے۔

یہ خبر اُن کے مرحوم بھائی تمیز الدین نے سنائی تھی جنہیں وہ آج صبح ہی اپنے ہاتھوں سے دفن کر کے آئے تھے۔

دفعتاً کاؤچ پر دراز نوجوان فہیم کے بدن میں حرکت پیدا ہوئی تو کلیم الدین اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔

فہیم نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کلیم الدین پر نظریں جمادیں، بولا۔ ”کیا ہوا تھا ماموں جان؟“

”تھکن اور گرمی کے باعث تم پر غشی طاری ہو گئی تھی فہیم میاں!“

”تھکن اور گرمی؟“

کلیم الدین نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ”پنڈی سے لاہور تک مسلسل ڈرائیونگ نے تمہیں بری تھکا دیا تھا۔ اس تھکان میں بڑے ماموں کی موت کے صدمے کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ پھر یہاں آنے کے فوراً بعد تم نے کانی پی لی اُوپر سے یہ کمرا بھی خوب گرم تھا۔ معاف کرنا فہیم بیٹے! بوڑھوں کو سردی کچھ زیادہ ہی لگتی ہے۔ اس لیے جب تک کمرا خوب گرم نہ ہو، میں بے آرامی محسوس کرتا ہوں، تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟“

”سر بہت بھاری ہے، ہلنے جلنے کی بھی ہمت نہیں پڑ رہی، میں کتنی دیر بے ہوش رہا ہوں ماموں جان؟“

”یہی کوئی بیس پچیس منٹ، میں نے ویسے فوری طور پر تمہیں انجکشن لگا دیا تھا۔ چند گھنٹوں بعد تم ٹھیک ٹھاک ہو جاؤ گے۔“

”خوش قسمتی سے آپ ڈاکٹر ہیں۔ اسی لیے مجھے فوراً ٹریٹمنٹ مل گیا لیکن میرا خیال ہے کہ ماموں کی ناگہانی موت کا صدمہ ہی میری بے ہوشی کا باعث تھا۔ آپ کو تو پتا ہے کہ مجھے ان سے کتنی محبت ہے اور خود وہ بھی مجھ سے کس قدر محبت کرتے تھے۔“

”تمہاری محبت کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ

سکتا۔ ہاں! البتہ مرحوم کی محبت کے بارے میں تم غلط فہمی کا شکار ہو، فہیم!'' کلیم الدین نے خشک لہجے میں کہا۔

فہیم کی کشادہ پیشانی پر اچانک ننھے ننھے قطرے پھوٹنے لگے۔ ''میں سمجھا نہیں ماموں جان! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' اس نے کاؤچ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو برخوردار! کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ مرحوم تمہارے حق میں اپنا وصیت نامہ تبدیل کر کے تمہیں اپنی جائیداد سے بالکل محروم کر دینا چاہتے تھے۔'' کلیم الدین نے رک کر فہیم کو غور سے دیکھا جو بے دھیانی میں آستین سے پیشانی پر پھوٹنے والا پسینا خشک کر رہا تھا۔

''م م...... میری سمجھ میں نہیں آ رہا آپ کیا کہہ رہے ہیں ماموں جان! اول تو یہ ممکن ہی نہیں، انہیں مجھ سے اور اپنی مرحومہ بہن سے بہت محبت تھی اور اگر واقعی ان کا ایسا کوئی ارادہ تھا، جس کا کوئی امکان نہیں ہے تو مجھے اس کا قطعی کوئی علم نہیں۔''

''تمہارے حساب سے ان کی موت بروقت ہوئی، ذرا سی تاخیر تمہیں بہت بڑی دولت اور جائیداد سے محروم کر دیتی اور تم زندگی بھر بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاتے۔'' کلیم الدین نے بے رحمی سے کہا اور انہیں فہیم کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرا کر معدوم ہوتی نظر آئی۔

''بھائی جان سے تمہاری آخری ملاقات کب ہوئی تھی فہیم؟''

''کوئی نو روز قبل، یہ اچھا ہی ہوا کہ میں دو روز سے شہر میں موجود نہیں تھا۔''

''اپنی بات کی وضاحت کرو۔''

''میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ......''

''اخبار میں......؟'' کلیم الدین نے بھویں اُچکائیں۔ ''تم اور اخبار؟ تمہیں تو موبائل فون اور انٹرنیٹ سے ہی......''

''ماموں جان! پوری بات تو سن لو۔'' فہیم بیزاری سے بولا۔ ''کچھ دنوں سے میں نے ہر روز جاب کی تلاش کے سلسلے میں تازہ اخبار نیٹ پر پڑھنے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا، ضرورت ہے کہ علاوہ درمیانی صفحات میں بھی کبھی کبھی اچھی جاب کے باکس اشتہار چھپتے ہیں اس لیے میں پورا ہی اخبار دیکھ لیا کرتا تھا، وہیں ایک خبر پر میں چونکا تھا۔''

''خبر کیا تھی؟'' کلیم الدین نے دوبارہ بھویں اُچکائیں۔ یوں جیسے وہ اسے کسی کسوٹی تلے جانچنا چاہ رہے ہوں۔''

''یہی کہ میں نے ماموں کی موت کی خبر اخبار میں پڑھی تھی جس میں لکھا تھا کہ گزشتہ شب کوئی چور ان کی کوٹھی میں گھس آیا تھا اور بہ ظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ وہ تجوری کھول کر مال سمیٹ رہا تھا کہ ماموں نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا، ان کے درمیان سخت جدوجہد ہوئی، جس کے نتیجے میں چور نے ماموں کو گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا۔ انہیں آخر چور سے مزاحمت کرنے کی کیا ضرورت تھی، اگر وہ کچھ لے جا رہا تھا تو لے جانے دیتے، اس طرح ان کی زندگی تو بچ جاتی۔''

''وقوعے کی جگہ کا جائزہ لینے کے بعد پولیس نے یہی نظریہ قائم کیا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ واقعی ایسا ہی ہوا ہو۔'' کلیم الدین اس کی طرف گھورتے ہوئے سنجیدگی سے بولے۔

ان کی بھانپتی ہوئی نظریں بدستور فہیم کے چہرے جمی ہوئی تھیں۔

فہیم نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ بولا۔ ''اسی لیے میں نے کہا تھا کہ شہر سے میری غیر موجودگی میرے حق میں بہتر ہی ثابت ہوئی، حالانکہ ماموں کے جنازے میں شرکت نہ کرنے کا مجھے بے حد دکھ اور ملال ہے۔''

''تمہاری غیر موجودگی کا اس واردات سے کیا تعلق؟''

''ظاہر ہے پولیس نے آپ کا بیان بھی لیا ہوگا۔'' فہیم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اور...... آپ نے انہیں وصیت نامے کے بارے میں بھی بتایا ہوگا کہ تمیز الدین ماموں مجھے اپنی وصیت سے خارج کرنا چاہتے تھے، لیکن آپ کے بقول ان کی بروقت موت نے مجھے ان کی دولت اور جائیداد سے محروم ہونے سے بچا لیا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اب پولیس مجھ پر بھی شک کرے گی کہ ان کی بروقت موت کا کہیں میں ذمے دار تو نہیں، خوش قسمتی سے میں کل رات پنڈی میں تھا اور اس کا ایک گواہ بھی موجود ہے۔''

''ہاں، پولیس اس زاویے سے سوچ سکتی ہے اور غالباً انسپکٹر ضیغم خان نے یہی سوچ کر مجھ سے تمہارا پتا دریافت کیا تھا۔'' کلیم الدین نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''لیکن...... اس سے کیا ہوتا ہے، ان کا وقت تو آ ہی گیا تھا، چور کی موجودگی تو بہانہ بن گئی۔'' وہ آخر میں عجیب اسرار بھرے سے لہجے میں بولے۔ اس پر فہیم ذرا چونک کر مستفسر ہوا۔ ''کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں ماموں جان؟''

''اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے تمہیں بھی کچھ نہیں

بتایا تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے بڑی رازداری سے کام لیا تھا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ گزشتہ کئی ماہ سے مرحوم بالکل ریٹائرڈ لائف گزار رہے تھے۔ گھنٹے آدھے گھنٹے کے لیے دفتر چلے جاتے تھے اور باقی وقت آرام کرتے تھے۔ دراصل دو ماہ قبل ان پر دل کا دورہ پڑا تھا اور میں ہی ان کا علاج کر رہا تھا۔ انہیں اسپتال میں جانے اور مریضوں کی طرح زندگی بسر کرنے سے شدید نفرت تھی۔ انہوں نے تو مجھے بھی منع کر دیا تھا کہ میں اس کا ذکر کسی سے بھی نہ کروں۔ پھر کوئی دو ہفتے قبل ان پر دوسرا دورہ پڑا۔ اس وقت میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ اگر فوری طور پر انہوں نے آپریشن نہیں کرایا تو تیسرا دورہ جان لیوا ثابت ہوگا۔ افسوس انہوں نے میری تنبیہ پر کوئی توجہ نہیں دی۔ لگے کہنے...... کہ وقت سے پہلے موت نہیں آسکتی اور آجائے تو کوئی اسے ٹال نہیں سکتا۔ میرا خیال ہے بلکہ مجھے پورا یقین ہے کہ کل رات انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ان پر تیسرا دورہ پڑنے والا ہے۔"

"آپ...... آپ کو اس بات کا یقین کیوں ہے ماموں جان؟"

"اس لیے کہ کل رات دو بجے میرے فون کی بیل گنگنائی تھی ایک تواتر کے ساتھ...... مجھے نیند سے بیدار ہونے میں کچھ تاخیر ہو گئی اور جب میں نے فون اُٹھایا تو دوسری طرف سے لائن منقطع ہو چکی تھی اور مرحوم کی موت بھی کل رات لگ بھگ اسی وقت واقع ہوئی تھی۔ اس بات سے مجھے یقین ہوا کہ کل رات بھائی جان مجھے ہی فون کر رہے تھے اور چور یہ سمجھا کہ کھٹکے سے ان کی آنکھ کھل گئی ہے اور وہ پولیس کو فون کر رہے ہیں۔ اس غلط فہمی نے چور کو قاتل بنا دیا۔ اس نے مرحوم کو زبردستی فون پر بات کرنے سے روکنا چاہا، تب ہی ان کے درمیان ہاتھا پائی ہوئی ہوگی، جس کی وجہ سے بھائی جان کے کپڑے بھی پھٹ گئے اور اسی مزاحمت کے دوران مرحوم کا گلا چور کی گرفت میں آگیا۔ اگر وہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتا تب بھی وہ تیسرے دورے سے جانبر نہیں ہو سکتے تھے۔"

فہیم کا چہرہ دُھلے ہوئے کپڑے کی طرح سپید پڑ گیا تھا۔ تاہم خود کلامیہ انداز میں بڑبڑایا۔ "بڑا ہی بدقسمت چور تھا۔"

"بالکل۔" کلیم الدین نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "پھر اسے ملا کیا؟ بھائی جان گھر میں چند ہزار روپوں سے زیادہ رقم نہیں رکھتے تھے۔ ان چند ہزار روپوں کی خاطر وہ قاتل بن گیا۔ اگر وہ صرف چوری کا مرتکب ہوتا تو پکڑے جانے پر اسے محض چند سال کی سزا ہوتی لیکن اب اسے سزائے موت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ وہ چند ہزار روپے اس کے لیے پھانسی کا پھندا بن گئے۔"

"بشرطیکہ چور پکڑا جائے۔" فہیم کی آواز نیچی تھی۔

"وہ ضرور پکڑا جائے گا، زیادہ سے زیادہ مزید چوبیس گھنٹے آزاد رہ سکتا ہے لیکن فہیم تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"آپ اس قدر وثوق کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ پولیس چوبیس گھنٹے کے اندر اندر چور کو گرفتار کر لے گی؟"

"اس کی بھی ایک وجہ ہے لیکن مجھے تمہاری حالت ٹھیک نظر نہیں آرہی، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تمہیں بخار ہو، ٹھہرو میں ابھی تمہارا معائنہ کرتا ہوں۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں ماموں جان!" فہیم نے گریبان کے اندر ہاتھ ڈال کر سینہ کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ "آپ یہ بتائیں کہ چور آخر کس طرح پکڑا جائے گا؟"

"تمہارا بے ہوش ہو جانا اور پھر اب بخار جیسی کیفیت، مجھے آثار کچھ اچھے نظر نہیں آرہے۔"

"ماموں جان! میں بالکل ٹھیک ہوں۔" فہیم نے گریبان کے بٹن کھول کر سینے کو مسلتے ہوئے کہا۔ "میں چور کے بارے میں پوچھ رہا تھا کہ آخر اس کا پکڑا جانا کیوں یقینی ہے؟"

"یہ راز کی بات ہے فہیم میاں! لیکن تمہیں بتانے میں کوئی حرج نہیں۔ دراصل چند روز قبل مرحوم بھائی جان کو چیچک نکل آئی تھی۔"

"چیچک۔"

کلیم الدین نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ "انہوں نے بچپن میں کبھی کوئی حفاظتی ٹیکا نہیں لگوایا تھا اور اب تو ہمارے ملک سے چیچک کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اس لیے بچوں کو بھی چیچک سے بچاؤ کے ٹیکے نہیں لگائے جاتے لیکن بھائی جان کے جسم میں اس کے جراثیم موجود تھے اور اس عمر میں جب دل کے دوروں کی وجہ سے ان کے بدن کا دفاعی نظام کمزور پڑا تو وہ جراثیم غالب آگئے۔ میں نے ان سے بہت کہا کہ وہ فوراً وبائی امراض کے اسپتال میں داخل ہو جائیں کیونکہ یہ مسئلہ بے حد نازک ہے اور ان کی ذات تک محدود نہیں ہے۔ ہنگامی بنیادوں پر اس محلے کے ہر فرد کو چیچک سے بچاؤ کے ٹیکے لگنے چاہئیں جہاں ان کی رہائش ہے، اس کے علاوہ ان کے دفتر اور ان کے کارخانے کے سارے عملے کو بھی ٹیکے لگنے ضروری ہیں تاکہ اس وبائی مرض کے پھیلنے کا

ہر امکان ختم ہو جائے لیکن وہ نہ مانے۔

انہوں نے مجھے بتایا کہ چیچک کے وہ خارش نما دانے اسی روز نمودار ہوئے تھے اور انہوں نے فوراً ہی مجھے بُلا کر معائنہ کروالیا ہے اور اب وہ کسی کو بھی اپنے قریب نہیں آنے دیں گے، کسی گھریلو ملازم کو بھی نہیں، وہ خود کو اپنی خواب گاہ میں قید کر لیں گے تاکہ کسی دوسرے کو یہ منحوس بیماری نہ لگنے پائے یہاں تک کہ میرے علاج سے وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو جائیں۔ انہیں اس کی بھی پروا نہیں تھی کہ چیچک کے علاج کے لیے وبائی امراض کے اسپتالوں میں جو مخصوص قسم کے آلے اور مشینیں ہوتی ہیں، ان کی عدم موجودگی سے میرا علاج انہیں صحت یاب تو ضرور کر دے گا لیکن چیچک کے داغ ان کے چہرے کو بدصورت اور بھیانک بنا دیں گے۔

بھائی جان علاج کے معاملے میں بے حد ضدی اور غیر ذمے دار تھے۔ انہوں نے مجھے رازداری کی قسم دی تھی لیکن اس چور کی بدقسمتی کہ وہ ان سے لپٹ گیا اور انہیں گلا گھونٹ کر ہلاک کرنے کی وجہ سے اس کے ہاتھ بھائی جان کے حلق سے ضرور لگے ہوں گے اور اس طرح چیچک کے جراثیم یقینی طور پر چور کے جسم میں منتقل ہو گئے ہوں گے۔ اب چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر اس پر چیچک کا حملہ ہو گا اور جب وہ کسی ڈاکٹر سے علاج کے لیے رجوع کرے گا تو ان دانوں کو دیکھتے ہی ڈاکٹر سمجھ جائے گا کہ وہ چیچک کے دانے ہیں۔ یوں وہ قانون کے مطابق فوراً ہی اسے وبائی امراض کے اسپتال میں داخل ہونے کا مشورہ دے گا اور خود اس کا علاج نہیں کرے گا، اور جب چیچک کا کوئی مریض کسی اسپتال میں داخل ہو گا تو اسپتال کی انتظامیہ فوراً پولیس کو اس کی اطلاع دے گی کیونکہ پولیس نے وبائی امراض کے تمام اسپتالوں کو خبردار کر دیا ہے کہ جونہی ایسا کوئی مریض کسی اسپتال میں داخل کیا جائے انہیں فوراً اس کی اطلاع دی جائے۔ اب سمجھے تم...... چور کی گرفتاری یقینی امر ہے۔ اب مجھے تم اپنا معائنہ کرنے دو......"

فہیم پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس کی نظریں اپنے سینے پر جمی ہوئی تھیں اور دہشت سے اس کا چہرہ ایسا سپید پڑ گیا تھا جیسے کسی نے اس کے بدن سے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا ہو۔

"ارے...... فہیم! یہ تمہیں کیا ہوا۔" کہتے ہوئے کلیم الدین اپنی نشست سے اُٹھ کر تیزی سے اپنے بھانجے کے قریب آئے اور جھک کر فہیم کا سینہ دیکھنے لگے جو رگڑنے کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا اور اس سرخی میں باریک باریک دانے اُبھرے ہوئے نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے۔

"ارے یہ کیا! یہ کیسے دانے ہیں......؟ یہ گرمی کے دانے تو نہیں ہو سکتے، آج کل سردی کا موسم ہے۔ میں ابھی دیکھتا ہوں۔ میرا میڈیکل باکس کہاں گیا...... لعل دین!" انہوں نے زور سے اپنے ملازم کو آواز دی۔

"ذرا میرا میڈیکل باکس تو لانا لعل دین!"

"مم...... ماموں جان!" فہیم کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

کلیم الدین نے پلٹ کر اپنے بھانجے کی طرف دیکھا۔ وہ پسینے میں شرابور ہو رہا تھا اور دہشت زدہ نظروں سے اپنے ماموں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تمہاری حالت تو بہت خراب نظر آتی ہے فہیم!" انہوں نے کلائی پکڑ کر نبض ٹٹولی۔ "تمہارا بدن برف کی طرح ٹھنڈا پڑا ہے اور نبض کی رفتار بھی ہلکی ہے۔ بلڈ پریشر بہت کم ہو گیا ہے۔ ٹھہرو میں ابھی تمہارا معائنہ کر کے دوا دیتا ہوں۔"

"کوئی فائدہ نہیں ماموں جان! کوئی فائدہ نہیں۔" فہیم کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے گرنے لگے پھر وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

"ارے ارے...... اس قدر گھبرانے کی کیا بات ہے، فہیم میاں! ہمت سے کام لو، انسان تو بیمار ہوتا ہی ہے، میں بھی ہوتا ہوں، سب ہوتے ہیں۔" پھر منہ پھیرا۔

"لعل دین! کدھر مر گیا۔ جلدی میرا باکس لے کر آ......"

"مم...... مجھے بچالو ماموں جان!" فہیم نے بالآخر روتے ہوئے جیسے فریاد کر ڈالی۔ "میرا چہرہ بدصورت ہو جائے گا۔ میں زندہ نہیں رہوں گا ماموں جان!" روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

"تمہارا چہرہ کیوں بدصورت ہوگا، کیا وجہ ہے، آخر۔ تم تو بلاوجہ اس قدر پریشان ہو گئے، فہیم برخوردار! لو لعل دین میرا باکس لے آیا۔ میں ابھی دیکھتا ہوں، آخر تمہاری یہ حالت کیوں ہوئی ہے۔"

"مجھے...... مجھے چیچک...... چیچک ہو گئی ہے۔ ماموں جان! اللہ کے لیے مجھے بچالو ماموں جان!"

"چیچک! لیکن کیسے؟ تم بھائی جان سے آخری بار دس روز قبل ملے تھے، اس وقت تو......"

"یہ دیکھیں...... دیکھیں۔" فہیم نے جواب میں اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا۔ "میں...... میں، ماموں کو مارنا

نہیں چاہتا تھا لیکن...... کل رات پتا نہیں کیا ہوا...... میں بہت پریشان تھا، ماموں نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ مجھے وصیت سے خارج کر رہے ہیں۔ مجھ پر شیطان سوار ہوگیا، میں ہی وہ چور تھا، وہ بدقسمت چور، کاش! میں کل رات وہاں جاتا ہی نہیں، کاش! ماموں جان کو قتل نہ کرتا۔"

"تم نے تجوری کا تالا توڑا تھا تاکہ پولیس دھوکا کھا جائے؟"

فہیم نے فوراً سر کو اثباتی جنبش دی۔ "میں سدا کا بدقسمت ہوں، چند گھنٹے انتظار کر لیتا تو کیا ہو جاتا۔" وہ بُری طرح کاؤچ سے سر ٹکرانے لگا۔

کلیم الدین دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ وہ نفرت بھری نظروں سے اپنے بھانجے کو دیکھ رہے تھے۔ فہیم نے آنسوؤں سے تر چہرہ اُٹھا کر ان کی جانب دیکھا۔ "مجھ پر رحم کریں ماموں جان! مجھے بدصورت ہونے سے بچا لیں۔"

"رحم؟ تم نے بھی تو اپنے بوڑھے ماموں پر بڑا رحم کیا تھا نا۔" کہتے ہوئے انہوں نے آخر میں بہ آواز بلند پکارا۔ "انسپکٹر......!"

تب ہی بھاری بھرکم جھولتے پردوں کے پیچھے سے باوردی پولیس والے باہر نکل آئے۔ ان میں سے ایک انسپکٹر ضیغم خان...... تھا اور دوسرا اس کا ماتحت۔

"آپ نے مجرم کا اعترافِ جرم سُن لیا انسپکٹر! اب اسے میری نظروں سے دور لے جائیں۔"

انسپکٹر کا اشارہ پا کر ماتحت نے فہیم کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں جو پھٹی پھٹی نظروں سے پولیس والوں کو دیکھ رہا تھا۔ "اسے دوسرے کمرے میں لے جاؤ۔"

کلیم الدین خود کو اچانک ہی بہت بوڑھا محسوس کرنے لگے۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے سر اُٹھا کر اپنے ملازم کی طرف دیکھا جوان کا میڈیکل بیگ ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔

"تم نے سُن لیا، فہیم نے کیا کہا تھا؟" ملازم نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ان باتوں کو اچھی طرح یاد رکھنا۔ عدالت کے سامنے تمہیں بھی بیان دینا ہوگا۔ اب تم جاؤ اور چائے بنا لاؤ۔"

ملازم کے جانے کے بعد چند لمحے نشست گاہ میں گہرا سکوت طاری رہا۔ انسپکٹر اپنے سامنے بیٹھے ہوئے مشہور سرجن کلیم الدین کو بڑے احترام سے دیکھ رہا تھا۔

"آپ نے کمال کر دیا کلیم الدین صاحب! یہ احمق کتنی آسانی سے آپ کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گیا۔"

"ایک عام آدمی کے لیے ڈاکٹر کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ ناقابلِ تردید حقیقت ہوتی ہے۔ اس کی جگہ اگر کوئی بہت ہی تجربہ کار مجرم ہوتا وہ بھی پھنس جاتا یہ تو پھر اناڑی تھا، بچہ تھا۔"

"کیا واقعی آپ کے مرحوم بھائی دل کی بیماری میں مبتلا تھے؟"

جواب میں کلیم الدین نے انکار میں سر ہلایا۔ "گزشتہ دو تین ماہ سے انہیں ہائی بلڈ پریشر کی شکایت ہوگئی تھی، میری ہدایت پر انہوں نے تمام ذمے داریاں اپنے قابلِ اعتماد ملازمین کے سپرد کر دی تھیں اور خود زیادہ سے زیادہ آرام کرنے لگے تھے۔ بس یہ حقیقت تھی ان کے دل کے دوروں کی جسے وہ بے وقوف سچ سمجھ بیٹھا۔"

"ہاں، اسے اپنی جلد بازی پر بڑا افسوس ہو رہا تھا لیکن یہ اس کے سینے پر اچانک ہی دانے کہاں سے نمودار ہو گئے؟"

"مجھے اس پر پہلے ہی شک تھا کہ اس نے بھائی جان کو وصیت نامہ تبدیل کرنے سے روکنے کے لیے انہیں قتل کیا ہے اور اس واردات کو چوری کی واردات کا رنگ دیا ہے۔ جیسے ہی یہ میرے پاس آیا میں نے آپ کو فون کر کے بُلا لیا اور اسے چائے پلا دی۔ جس میں بے ہوش کرنے والی دوا ملی ہوئی تھی۔ چائے پی کر یہ بے ہوش ہوگیا۔ آپ لوگوں کو پردے کے پیچھے چھپا کر میں نے اس کے سینے پر وہ دوا مل دی، جس کی وجہ سے کچھ دیر بعد خارش ہونے لگتی ہے اور سرخ سرخ دانے جلد پر اُبھر آتے ہیں۔ جب اسے ہوش آیا تو اسے دل کے دوروں اور چیچک والی کہانی سنا دی۔ جب اسے اپنے سینے پر وہ دانے نظر آئے اور ان میں خارش ہوئی تو یہ سمجھا کہ اسے مرحوم سے چیچک کی وبا لگ گئی ہے اس لیے یہ دہشت زدہ ہوگیا، اس نے فوراً ہی اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔ خوب صورت تھا نا۔ ہر خوب صورت مرد اور عورت کو اپنی زندگی سے زیادہ اپنی خوب صورتی عزیز ہوتی ہے۔ چیچک کی دہشت نے اس کا ذہن ماؤف کر دیا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کر لی۔ کیوں انسپکٹر! چار افراد کے سامنے اعترافِ جرم اسے پھانسی تک پہنچا دے گا نا۔"

انسپکٹر نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "پھانسی نہیں تو عمر قید ضرور ہو جائے گی۔"

❖❖❖

سچ کی تلاش

روبینہ رشید

بظاہر کسی کہانی میں ظاہری طور پر کوئی امتیازی خدوخال نہیں پائے جاتے... مگر جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے... اس کے باطن میں پوشیدہ بہت سے عناصر منکشف ہوتے چلے جاتے ہیں... ایک چھوٹے سے علاقے میں رہنے والے ہنرمندوں کی کاوشوں کا احوال... رفتہ رفتہ ان کے اخبار و رسائل کی اشاعت اور اشتہارات میں نمایاں کمی آتی جارہی تھی... وہ پریشان اور اُداس تھے۔ مستقبل کو درخشاں اور تاباں رکھنے کی خواہش نے انہیں تفتیش و کھوج کے راستے پر ڈال دیا... مسلسل نقصان نے ان کی ہمت شکنی نہیں کی تھی...

ہم مزاج فنکار دوست بھائیوں کی خوشگوار انداز میں کی جانے والی سراغرسانی......

صبح کے سات بجنے والے تھے۔

مگر اس کے باوجود چاروں جانب اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہر طرف پھیلی گہری دھند نے اس تاریکی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ سردی الگ مزاج پوچھ رہی تھی۔ رات ہونے والی شدید برف باری نے اس چھوٹے سے قصبے کو ایک بڑے سردخانے میں تبدیل کر دیا تھا۔ ہاروے بیلر اس سردی میں اپنے اوورکوٹ میں کپکپاتا ہوا خالی سڑک پر ہر ممکن تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ قدرے بھاری جسامت اور درمیانی قدوقامت کا مالک تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی۔ اس وقت اس کے دائیں ہاتھ میں ایک بنڈل...... تھا جس پر پلاسٹک کا کور لپٹا ہوا تھا۔ اس نے اسے احتیاط سے اٹھا رکھا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں اس کی چھتری تھی جو اس وقت بند تھی اور جس کی نوک سے وہ چھڑی کا کام لے رہا تھا۔ اس کے جسم پر سویٹر، کوٹ اور اوورکوٹ سب ہی کچھ موجود تھا، سر پر گرم ٹوپی تھی۔ اس کے باوجود وہ ٹھٹھر رہا تھا۔ اس وقت اس کی خواہش جلد از جلد تھامس کے دفتر پہنچنا تھی۔ تھامس قصبے کے واحد بڑے اصطبل کا مالک تھا اور وہاں سے ہر موسم میں اور ہر وقت بگھی دستیاب ہوجاتی تھی۔ اسے آج کے دن کے لیے کرائے پر بگھی درکار تھی جس کے بعد اسے قصبے سے باہر جانا تھا۔ آج کا دن اس کے لیے بہت اہم تھا، اسے کئی افراد سے ملنا تھا اور پرنٹنگ مشین میں بھی تھوڑا کام کرانا تھا، اس سب کے بعد ہی وہ آرام سے اپنے گھر گرم بستر میں گھس کر اپنی پسندیدہ کافی کا لطف لے سکتا تھا۔

تھامس کے اصطبل پہنچ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ اس سے ایک روز پہلے ہی بگھی کی بات کر چکا تھا۔

''تھامس سب تیار ہے؟'' اس نے مصافحے کے بعد پوچھا۔

''جی مسٹر بیلر...... آپ کی بگھی بالکل تیار ہے، آپ نے شام چار بجے اسے واپس پہنچانا ہے۔''

''ہاں، ہاں معلوم ہے یار......'' وہ جیب سے نوٹ نکال کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اگر آپ کہتے تو میں جیمز کو بلا لیتا، وہ آج فارغ ہی تھا۔'' تھامس نے نوٹ جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ تھامس کے پاس دو اسسٹنٹ تھے جو کوچبان کے طور پر بھی کام کرتے تھے مگر بیلر قصبے کے دیگر مردوں کی طرح ہمیشہ بگھی خود ہی چلاتا تھا۔ کوچبان عموماً خواتین سواریوں کے لیے ہی بلائے جاتے تھے۔

''تم جانتے ہو کہ میں بگھی خود چلانا پسند کرتا ہوں۔'' بیلر نے جواب دیا اور بگھی کی جانب بڑھ گیا۔

''کنجوس مکھی چوس......'' تھامس بڑبڑایا۔

''کچھ کہا تم نے؟'' بیلر نے مڑ کر پوچھا۔

''نہیں، نہیں، کچھ بھی نہیں۔'' وہ گڑبڑا کر مسکرایا اور اصطبل میں گھس گیا۔ بگھی میں بیٹھ کر بیلر کو کچھ آرام محسوس ہوا۔ اس نے باگوں کو تھاما، گھوڑا تربیت یافتہ تھا۔ اشارہ ملتے ہی چل پڑا تھا۔

اس قصبے میں زیادہ تر لوگ بگھیوں کے روایتی سفر کو پسند کرتے تھے۔ نوجوان البتہ سائیکلوں پر نظر آتے۔ اس وقت تو یوں بھی پورا علاقہ ویران پڑا ہوا تھا۔ اتنی سردی میں لوگ اتنی جلد بمشکل ہی بستروں سے نکلنے پر تیار ہوتے تھے۔ اس کے پیشے کے تقاضوں نے اسے مجبور نہ کیا ہوتا تو وہ بھی اس وقت بستر میں ہی ہوتا۔ بگھی ابھی قصبے سے باہر نکلی بھی نہیں تھی کہ اچانک وہ بگھی کے سامنے آ گیا۔ اس نے سر پر گندم کی کاغذی بوری چڑھا رکھی تھی جس میں آنکھوں، ناک اور ہونٹوں کے لیے پھوہڑ پن سے سوراخ کیے گئے تھے جبکہ اس کے پورے جسم پر سفید ڈھیلا ڈھالا سا لبادہ تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے بڑی سی چادر کو اپنے گرد باندھ لیا ہو۔ اس نے تیزی سے بگھی کو روک لیا۔

''رک جاؤ بیلر۔'' وہ بیلر کو بگھی چلانے کی کوشش کرتا دیکھ کر غرایا۔ ''اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو......'' اس نے ہاتھ میں پکڑا ریوالور اس پر تان لیا۔ ریوالور دیکھ کر بیلر کانپ کر رہ گیا۔ اس نے باگوں پر سے ہاتھ ہٹا لیا تھا۔

بگھی کے پوری طرح رکنے سے قبل ہی وہ اچھل کر بگھی کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔

''چلو...... یہ یاد رکھنا کہ یہ پستول چلتا ہے تو گولی نکلتی ہے جو سامنے والے کی جان لے لیتی ہے۔'' اس کا لہجہ نہایت سرد تھا۔ بیلر کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

''ک...... کون ہو تم......؟ م...... مجھ سے کیا چاہیے؟'' وہ بگھی چلاتے ہوئے بمشکل بولا۔

''سب کچھ......'' اس نے اسی انداز میں کہا۔ ''کون ہوں، یہ جاننا تمہارے لیے ضروری نہیں ہے۔'' وہ جنوبی علاقوں میں رہنے والے افراد کے مخصوص لہجے میں بات کر رہا تھا۔

''ک...... کہاں جانا ہے؟'' بیلر نے پوچھا۔

''قصبے سے باہر۔'' وہ بولا۔

''کیا تم مجھے مارنا چاہتے ہو؟ میں نے کیا کیا ہے؟''

''سوال نہیں...... چپ چاپ بگھی چلاؤ۔'' وہ اس کی گردن پر ریوالور کا دباؤ ڈالتے ہوئے غرایا۔ بیلر کے پاس خاموشی سے اس کے احکامات پر عمل درآمد کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔

''رک جاؤ......'' قصبے سے تھوڑا باہر آنے کے بعد وہ بولا۔ ''روکو بگھی۔''

بیلر نے حکم پر فوری عمل کیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں

آرہا تھا بس اسے وہ سب بہت خطرناک لگ رہا تھا۔

"اپنا بٹوا نکالو۔" وہ بگھی رکتے ہی غرایا۔

"یہ...... یہ لو۔" بیلر نے کوٹ کی جیب سے بٹوا نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔

"وہاں سیٹ پر رکھو احمق۔" وہ بولا۔ "اور اب نیچے اتر جاؤ فوراً۔"

"یہ...... یہاں...... اِس سردی میں......؟" وہ گھبرا کر بولا۔

"دوسری صورت میں زمین کے نیچے مردہ حالت میں جانا پسند کرو گے؟" اس نے بڑی متانت سے پوچھا۔

"نن، نہیں......" بیلر نے کہا اور بگھی سے اُتر گیا۔ اس نے اپنا بنڈل اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر اس نے بنڈل پر ہاتھ رکھ دیا۔

"چھوڑ دو اسے۔" وہ غرایا۔

"اس میں کچھ نہیں ہے...... اخبار ہیں......"

"جو بھی ہے...... ہو پیچھے۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو پانچ منٹ تک اپنی جگہ سے حرکت بھی مت کرنا۔" وہ بولا اور بگھی کو تیز رفتاری سے دوڑاتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔

بیلر بے بسی اور خوف سے اُسے جاتا ہوا دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

کال بیل کی تیز آواز پر نک اسپنسر چونک کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے چہرے پر بیزاری کے آثار نمایاں تھے۔ آج ہی صبح اس نے اپنی زندگی کے لیے کچھ اصول بنائے تھے جس میں سے ایک دوپہر میں گھنٹے بھر کا قیلولہ بھی شامل تھا۔ (اس نے ایک روز قبل ہی کہیں پڑھا تھا کہ قیلولہ ذہنی صلاحیتوں میں اضافے کا باعث بنتا ہے) فیصلہ تو اس نے کرلیا تھا مگر یوں لگ رہا تھا کہ آج ہی ساری دنیا اس کے اس فیصلے کو سبوتاژ کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئی ہے۔ قیلولہ کے ابتدائی تیس منٹوں میں تین مرتبہ کال بیل بج چکی تھی۔ ایرک (نک کے بڑے بھائی) کی غیر موجودگی کی وجہ سے لامحالہ دروازہ اسے ہی کھولنا تھا۔ دھوبی، عمارت کے کیئر ٹیکر اور پڑوسیوں کی چابی رکھنے کے "اہم کاموں" سے نمٹنے کے بعد اس کی آنکھ لگی ہی تھی کہ بیل ایک بار پھر بج اٹھی۔ وہ دو لمحے بستر پر بیٹھ کر بُرے بُرے منہ بناتا رہا مگر جب بیل بجتی ہی چلی گئی تو وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر باہر نکلا۔ باہر نکلتے ہی اس کا سارا غصہ ہوا میں تحلیل ہو گیا، چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ دروازے پر ایک خوب صورت لڑکی کھڑی تھی۔

"جی میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟"

"فی الحال تو اپنا یہ پیکٹ لے کر اس کاغذ پر دستخط کریں اور دروازہ جلدی کھولا کریں۔" وہ سخت لہجے میں بولی۔

اس کے جانے کے بعد نک پیکٹ ہاتھ میں تھامے لاؤنج میں آیا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ چند لمحے اس بے وقت آنے والے پیکٹ کو گھورتا رہا پھر اسے کھول لیا۔ اندر اسمتھ بلڈنگ کی جانب سے آنے والا رسالہ تھا۔ اس نے جلدی سے رسالے کو کھولا۔ فہرست چیک کی اس میں اس کی کہانی موجود تھی مگر ہمیشہ کی طرح مسٹر اسمتھ نے اس کا رکھا ہوا عنوان بدل ڈالا تھا۔ غصے سے اس کی ناک پھولنے لگی تھی کہ رسالے میں موجود کہانی کا چیک اس کی انگلیوں سے ٹکرایا۔ چیک نے دنیا اور اس کے لوگوں پر اس کے اعتماد کو بحال کیا۔ کافی کے کپ کی طلب بڑھتی جارہی تھی اس لیے وہ کچن کی جانب بڑھ گیا۔

وہ اس رسالے کا اسٹار رائٹر تھا جہاں وہ اپنے اور ایرک کے کیسز کی کہانیاں لکھا کرتا تھا۔

ایرک اور نک دونوں بھائی تھے مگر دونوں میں بہت فرق تھا۔ ایرک نہایت سنجیدہ اور بقول نک اکثر رنجیدہ رہنے کا عادی تھا جبکہ نک کو زندگی میں ہنسنے بولنے اور مزے کرنے کا شوق تھا۔ ایرک کو لکھنے پڑھنے سے بالکل دلچسپی نہیں تھی مگر ایک چیز ان دونوں میں یکساں تھی۔ وہ دونوں بہت اچھے پرائیویٹ سراغ رساں یا ڈیٹیکٹیو تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی اسپنسر ڈیٹیکٹیو ایجنسی کافی مشہور تھی۔ آج کل کوئی کیس نہ ہونے کی وجہ سے راوی چین لکھ رہا تھا۔

اس کا ارادہ کافی پی کر دوبارہ سونے کی کوشش کرنا تھا مگر اس بار بستر پر لیٹنے سے قبل ہی کال بیل بج گئی تھی۔ اس نے افسوس سے سر ہلایا اور دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ باہر ایرک موجود تھا۔

"آرام ہو رہا تھا؟" اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"کوشش کر رہا تھا مگر تقدیر کو شاید یہ منظور نہیں۔" نک نے جواب دیا۔

"آرام کا وقت ختم...... اپنا بیگ تیار کرلو، ہم لٹل ٹن کی طرف جارہے ہیں۔"

"یعنی کوئی نیا کیس؟"

"ہاں، کرنل رابرٹ نے بلایا تھا مجھے، لٹل ٹن میں

ایک ری پبلکن ایڈیٹر کے ساتھ لوٹ مار ہوئی ہے جس میں چور اس کے اخبارات بھی چرا لے گئے ہیں۔ اب ری پبلکن اس کا ملبا ڈیموکریٹس پر ڈال رہے ہیں۔ کرنل رابرٹ چاہتے ہیں کہ اس چپقلش کے ہنگامہ بننے سے قبل ہم وہاں جا کر اس سب کی تفتیش کریں۔'' وہ بولا۔

''ٹھیک ہے بگ برادر...... فیس کی بات کر لی آپ نے؟'' اس معاملے میں ایرک کافی کمزور واقع ہوا تھا۔ نک کے سوال کے جواب میں ایرک نے اسے ملامتی نظروں سے گھورا۔

''اتنے مادیت پرست کیوں ہوتے جا رہے ہو تم؟ سب کچھ تو ہے ہمارے پاس...... موم، ڈیڈ یہ گھر اور وہ بڑا گھر چھوڑ گئے ہیں جس کا کرایہ ہم دونوں کے لیے کافی سے زیادہ ہے۔ تم کیسز کی کہانیاں لکھ کر بھی پیسا کماتے ہو...... پھر بھی پیسے کی اتنی فکر......''

''دیکھو ایرک...... پیسا ایک ضروری ترین چیز ہے اور......'' نک نے کہنا شروع کیا مگر ایرک نے اس کی تقریر کو شروع ہونے سے پہلے ہی روک دیا۔

''وقت بالکل نہیں ہے نک، ٹرین ایک سے ڈیڑھ گھنٹے میں روانہ ہو جائے گی۔ اگر یہ ٹرین نکل گئی تو پھر کل تک انتظار کرنا ہوگا۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی الماری کی جانب بڑھا۔

''او کے بگ برادر......'' نک نے جواب دیا۔ دلی طور پر وہ اس خبر سے خوش تھا۔ گزشتہ دو تین ہفتوں سے ان کے پاس کوئی کیس نہیں تھا اور وہ اب بوریت محسوس کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

ملٹن پہنچنے میں انہیں تین گھنٹے لگے تھے۔ ایرک کے لیے یہ گھنٹے گزارنا مشکل تھے کیونکہ اسے ٹرین کا سفر پسند نہیں تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ ٹرین سے الرجک تھا۔

''اس بار تمہاری حالت اتنی خراب ہے۔'' نک نے پلیٹ فارم پر پیر رکھتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے کہتے ہیں کہ مشق انسان کو ماہر بناتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ہمیں اگلے ایک ماہ میں ٹرین کے کئی سفر کرنا چاہئیں تا کہ تمہارے جسم کو اس کی عادت پڑ سکے۔'' اپنی بات مکمل کرتے ہوئے اس نے کن انکھیوں سے ایرک کو دیکھا۔ اسے شرطیں لگانے کی عادت نہیں تھی مگر وہ اپنی کل جمع پونجی (کل ملا کر 625 ڈالرز) کو داؤ پر لگا سکتا تھا کہ وہ اُس کا جواب خاموشی سے نظرانداز کرتا یا پھر بُری طرح گھورنے کے سوا کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' ایرک نے کہا اور اپنا بیگ سنبھال کر آگے بڑھتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے جواب پر نک کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''شکر ہے کہ میں شرطیں نہیں لگاتا۔'' اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔ نک، ایرک کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا مگر آج کے دور میں کون کب بدل جائے، کچھ کہا نہیں جا سکتا...... یوں بھی اس کے ہیرو شرلاک ہومز کی ناول میں موت کی خبر کے بعد سے ہی وہ خاصا اُداس سا رہنے لگا تھا اور اکثر اپنی طرف سے اس کی موت کی تفتیش بھی کرتا رہتا تھا۔ اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی ان کی نظر اس شخص پر پڑی، وہ لباس سے معزز نظر آ رہا تھا مگر اس وقت ایک عجیب سی حالت میں تھا۔ اس کا ایک جوتا برف کی دلدل میں دھنس کر گم ہو گیا تھا۔ اب وہ ایک پیر پر کھڑا اپنے جوتے کی تلاش میں تھا۔ ان پر نظر پڑتے ہی وہ جھینپ سا گیا۔

''عجیب گڑبڑ ہے۔'' وہ بولا۔ اس کا لہجہ جنوبی علاقے جیسا تھا۔

''آپ کو مدد کی ضرورت ہے؟'' ایرک نے پوچھا۔

''ویسے تو میں اپنی مدد آپ کا قائل ہوں مگر اس وقت ایک ٹانگ پر، یہ کچھ مشکل نظر آ رہا ہے۔ یہ میرے بہترین موزے ہیں میں انہیں خراب کرنا نہیں چاہتا...... بس اس لیے......'' وہ بے بسی سے مسکرایا۔

''یعنی مدد درکار ہے؟'' نک نے تصدیق چاہی۔ اسے وہ کچھ ڈرامے باز سا لگا تھا۔

''جی بالکل۔'' اس بار وہ سیدھے طریقے سے بولا۔

نک نے اس کے جواب پر ایرک کی جانب دیکھا اور کندھے اچکائے۔

''آپ نے مدد کی آفر کی تھی اور آپ کا لباس بھی اس کے لیے مناسب ہے۔'' وہ بولا۔

''ہمیشہ کی طرح ایرک جینز شرٹ سویٹر اور اوورکوٹ میں تھا جبکہ نک نے اوورکوٹ کے نیچے اپنا بہترین تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔

''ٹھیک ہے، تم اسے گرنے سے بچائے رکھنا۔'' ایرک بالآخر بولا۔

''یہ میں کرلوں گا۔'' نک نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔ اس نے اس اجنبی کے قریب کھڑے ہو کر اپنا کندھا اسے پیش کیا جسے اس نے شکریے کے ساتھ قبول کیا اور اپنا ہاتھ اس کی گردن میں ڈال کر آرام سے کھڑا

ہو گیا۔

''آپ دونوں بہت اچھے ہیں۔'' وہ بولا۔

اس دوران میں ایرک برف کی دلدل کو دونوں ہاتھوں سے ہٹاتے ہوئے کافی گہرائی میں اُترتے اس کے جوتے کو تلاش کر رہا تھا۔

''آپ دونوں بھائی ہیں نا؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''جی بالکل۔'' نک بھی مسکرایا۔ وہ اور ایرک دیکھنے میں کافی مختلف تھے مگر دونوں ہی لمبے اور متناسب جسامت کے مالک تھے۔ سب سے بڑھ کر ان دونوں کے سرخی مائل بال ان کے ایک خاندان سے تعلق کا اعلان کرتے تھے۔

''یہاں کسی کام سے آئے ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''کس سے کام ہے، اگر بتانا پسند کریں۔'' اس نے ملتجیانہ انداز میں پوچھا۔

نک چند لمحے چپ رہا۔ وہ اس دوران یہ فیصلہ کر رہا تھا کہ اس شخص کو مزید تفصیلات بتانا مناسب ہے یا نہیں......

''ہم...... ہم یہاں ہاروے بیلر سے ملنے آئے ہیں۔'' ایرک نے بالآخر زمین کے منہ سے اس اجنبی کا جوتا چھین لیا تھا۔ ''ہاروے بیلر ری پبلکن لعل ٹن کے نام سے اخبار نکالتے ہیں۔'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے اپنا جملہ مکمل کیا۔ اس کے ہاتھ میں اب اس کا برف سے بھرا جوتا تھا۔ خود اس کی پینٹ، ہاتھ، آستین سب گیلے ہو رہے تھے۔

''یہ لیجیے آپ کا جوتا۔''

''اوہ...... دی لعل ٹن ری پبلکن۔'' اس نے جوتا اچک کر ایرک کے ہاتھ سے لیا اور اسے خوب جھٹک کر پہن لیا۔ ''بہت شکریہ۔'' اب وہ نک کے سہارے کے بغیر کھڑا تھا۔

''اصل میں آپ سے اخبار کے دفتر کا پتا پوچھنا چاہتا تھا مگر یہاں یہ سب چل رہا تھا۔'' ایرک مسکرایا۔

''اچھا...... ویسے اگر آپ پوچھتے تو میں ہرگز نہیں بتاتا اور سچ یہ ہے کہ میں اب بھی نہیں بتاؤں گا۔ میں آپ سے آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔'' اس نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

''سچ پوچھیے تو میں آپ کو نہیں بتانا چاہتا۔'' ایرک نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ ناراض ہوئے یا بگڑے بغیر بولا۔ ''میں آپ کا ذکر پُراسرار اجنبیوں کے طور پر کروں گا جو اچھی طبیعت کے مالک ہونے کے باوجود بے ہودہ لوگوں کے ساتھ کاروبار کرتے ہیں۔''

اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ اس بار وہ انتہائی احتیاط سے چل رہا تھا۔

''بے ہودہ......'' ایرک ناک سکیڑ کر بڑبڑایا۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں سب سے پہلے کسی ہوٹل میں کمرا لینا چاہیے تاکہ آپ گیلے ہونے کی وجہ سے بیمار ہونے سے بچ سکیں۔'' نک نے کہا۔

''ہاں...... وہاں سے ری پبلکن کا پتا بھی مل جائے گا۔'' ایرک نے سر ہلایا۔ اس کی بڑی بڑی مونچھیں اب بھی پھڑک رہی تھیں جس کا مطلب یہ تھا کہ اجنبی کی شان میں بے آواز تعریفیں جاری تھیں۔

ہوٹل سے دوبارہ تیار ہو کر باہر نکلنے میں انہیں آدھا گھنٹا لگ گیا تھا۔ لعل ٹن سے اخبار کا ایڈریس مل گیا اور دس منٹ کے اندر اندر وہاں پہنچ بھی گئے تھے۔ دی ری پبلکن کا دفتر ایک پرانی دو منزلہ عمارت میں تھا جہاں کمپوزنگ اور دفتری سیٹ اَپ کے ساتھ ساتھ نیچے ایک چھوٹی پرنٹنگ مشین بھی موجود تھی۔

وہاں اس وقت تین افراد موجود تھے ان میں سے ایک قدرے بھاری جسامت اور درمیانی قدوقامت کا مالک شخص تھا جس کی عمر پچپن ساٹھ کے درمیان لگ رہی تھی۔ اس کے علاوہ ایک نوجوان لڑکا ایک کمپیوٹر پر کام کر رہا تھا اور ایک میز پر اکیس بائیس برس کی نوجوان لڑکی بھی موجود تھی۔

''جی میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟'' بوڑھے شخص نے ہمیں اندر آتے دیکھ کر پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ ہم یہاں آپ کی مدد کرنے آئے ہیں۔'' نک بولا۔ ''کیا آپ مسٹر بیلر ہیں؟''

''جی ہاں، میں بیلر ہوں، ہاروے بیلر...... آپ شاید اسپنسر ڈیٹکٹیو کمپنی سے آئے ہیں؟''

''جی بالکل میں نک اسپنسر ہوں اور یہ میرے بڑے بھائی ایرک اسپنسر ہیں۔''

''تشریف لایئے...... بیٹھیے۔'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ دونوں اُس کے ذہن میں موجود سراغ رسانوں کے حلیے پر پورے نہیں اترے تھے۔

''تو آپ کس طرح کام شروع کرنا پسند کریں گے؟'' جب ہم تینوں وہیں موجود ایک گول میز کے گرد بیٹھ

چکے تو اس نے پوچھا۔

''میں آپ سے تمام تفصیلات سننا چاہوں گا۔ مجھے واقعے کا علم ہے لیکن جو جزئیات میرے خیال میں ضروری ہوں، وہ میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، مجھے کہاں سے شروع کرنا چاہیے۔'' وہ ٹھوڑی کو سہلاتے ہوئے گویا بلند آواز میں سوچ رہا تھا۔

''جب آپ بگھی لے کر نکلے مسٹر بیلر...... وہاں سے۔'' نوجوان لڑکا اچانک بولا۔ ''وہ ٹین ایجر تھا اور اس کی آواز اب بدل رہی تھی۔

''اوہ نہیں، وہ تو بہت لمبی بات ہو جائے گی لارنس......''

''مگر آپ ہی تو کہتے ہیں کہ ایک مکمل اسٹوری ہی لوگوں کی توجہ حاصل کر سکتی ہے۔'' اس بار نوجوان لڑکی نے کہا۔

''درست مگر ان کی توجہ پہلے سے موجود ہے لوسی...... انہیں معلومات درکار ہیں۔ ٹھوس معلومات۔'' وہ بولا۔

اس دوران میں دونوں سراغ رساں بھائی خاموشی سے ان کی باتیں سنتے رہے۔

''دی لٹل ٹن ری پبلکن گزشتہ 22 سالوں سے کام کر رہا ہے۔'' بالآخر بیلر نے گفتگو کا آغاز کیا۔

اس جملے کے ساتھ ہی نک کھنکھارا۔ اسے خطرہ تھا کہ کہیں بیلر اپنی پیدائش سے واقعات کا آغاز نہ کر دے۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں اصل واقعے سے گفتگو کا آغاز کرنا چاہیے۔''

''میں آپ کو کچھ بیک گراؤنڈ بتانا چاہتا ہوں تاکہ آپ یہاں کی صورتِ حال سمجھ سکیں۔'' بیلر نے ہلکی سی ناراضی سے کہا۔ ''اگر آپ اسے غیر ضروری سمجھتے ہیں تو......''

''نہیں آپ بات جاری رکھیں۔'' ایرک، نک کو اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''شکریہ...... تو اس وقت یہاں سب بہترین تھا۔ دی ری پبلکن یہاں کا واحد اخبار تھا۔ کمیونٹی نے اسے بہت تیزی سے قبول کیا۔ ہمارے پاس پانچ سو سالانہ خریدار تھے۔ دو سو افراد ہماری میلنگ لسٹ میں تھے جنہیں پرچہ روانہ کیا جاتا تھا اور قرب و جوار سے کافی اشتہارات بھی مل جاتے تھے۔ سب ٹھیک تھا کہ پھر وہ ہو گیا......'' اس کی آواز قدرے دھیمی پڑ گئی۔

''یہاں مقابلہ شروع ہو گیا۔''

''یعنی دی لٹل ٹن ڈیموکریٹس؟'' نک نے پوچھا۔ اسے اس اخبار کا نام ہوٹل سے معلوم ہوا تھا۔

''جی ہاں۔''

''یہ کب شروع ہوا تھا؟'' ایرک نے پوچھا۔

''ایک سال پہلے...... اس کا ایڈیٹر نہ جانے کہاں سے آیا۔ اس نے سامنے سڑک پر ایک جگہ کرائے پر لی اور اخبار نکالنا شروع کر دیا۔ ہمارا ایڈیشن ہر بدھ کو آتا ہے۔ اس نے جمعرات کو اپنا اخبار نکالنا شروع کر دیا۔ یوں وہ آدھا اخبار تو ہماری خبریں چُرا کر بھر لیتا ہے...... اس کے آنے کے بعد ہماری سبسکرپشن گرنا شروع ہو گئی۔ اشتہارات پر بھی فرق پڑنا شروع ہو گیا۔ پھر بات یہیں تک محدود نہیں رہی۔ حالات مزید خراب ہو گئے۔ ایک اخبار اور نکلنا شروع ہو گیا۔

''دی لٹل ٹن پروگریسو؟'' نک نے پھر اپنی معلومات کا اظہار کیا مگر اس بار یہ تُکا تھا۔

''نہیں...... اس کا نام دی لٹل پاپولسٹ ہے۔''

''وہ کب شروع ہوا؟'' ایرک نے اس سوال جواب کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''چھ ماہ پہلے۔'' بیلر نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہ اور بُرا ہوا کیونکہ اسے یہاں کی مقامی اور مقبول شخصیت نے نکالا ہے۔ وہ یہاں کی پوسٹ مسٹریس ہے۔ اس کے بعد سے خریداری اور اشتہارات دونوں بہت کم ہو گئے ہیں۔ ہمیں قصبے سے کچھ اشتہار مل جاتے ہیں مگر قصبے کے باہر کے تمام اشتہارات بند ہو گئے ہیں۔ ہمارا اشتہارات کا صفحہ اب خالی ہوتا ہے اور مجھے اس پر شاعری، لطیفے یا فضول کہانی؛ افسانے لگانے پڑتے ہیں۔''

اُس کے اِس تبصرے پر ایرک نے نک کو غور سے دیکھا جسے اس نے نظرانداز کر دیا اور فیصلہ کیا کہ وہ بیلر کو اپنی کہانیوں کے بارے میں علم نہیں ہونے دے گا۔

''پھر؟'' ایرک نے لقمہ دیا۔

''ایک ہفتے پہلے میں بہت پریشان تھا۔ اخبار کی خریداری اور اشتہارات گرتے جا رہے ہیں اور اگر یہ سلسلہ یوں ہی رہتا ہے تو مجھے اس کام کو بند کرنا پڑے گا...... یہ سوچتے ہوئے مجھے ایک نیا آئیڈیا آیا۔ یہاں سے 13 کلو میٹر کے فاصلے پر فورٹ لوگن ہے جہاں ہزاروں سپاہی موجود ہیں، خبریں تو وہ بھی پڑھتے ہیں۔ وہاں موجود کرنل

...ر سن ری پبلکن کے وفادار رہے ہیں۔ اگر میں انہیں بتا ...ں کہ ڈیموکریٹک گورنر کی غلطیاں اور اس کے غلط فیصلوں ...ہم رپورٹ شائع کرتے ہیں تو کیا وہ منع کر سکتے ہیں؟" وہ ...تے کہتے ایک دم رکا، اُس کے چہرے پر کشمکش کے آثار نظر ...ئے پھر اس نے پوچھا۔

"آپ دونوں ڈیموکریٹس تو نہیں ہیں نا؟"

"نہیں۔" ایرک نے جواب دیا۔

"واہ پھر تو آپ ری پبلکن ہی ہوئے نا؟" وہ ...کرایا۔

"ہم ایک ری پبلکن خاندان سے تعلق ضرور رکھتے ...ں مگر ہم دونوں اس حوالے سے غیر جانبدار ہیں۔ کوئی ...اسی وابستگی نہیں ہے۔" نک نے کہا۔ "تو آپ بتا رہے ...تھے کہ آپ نے فورٹ لوگن جانے کا فیصلہ کیا۔"

"جی ہاں...... میں منہ اندھیرے اٹھا۔ دفتر آ کر نئے ...ڈیشن کی کاپیوں کا بنڈل جو کہ تیار ہی تھا، اٹھایا۔ تھامس ...سے بگھی لی اور روانہ ہو گیا۔ اس کے بعد جو ہوا وہ آپ کو ...علوم ہے۔"

"آپ اخبارات لے کر کتنے بجے نکلے تھے؟" ...یرک نے پوچھا۔

"سات میں پندرہ منٹ کم پر۔"

"یعنی ہر بدھ کو آپ اسی وقت اخبار کا بنڈل لے کر ...اتے ہیں؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔

"جی ہمیشہ......" اس کے ان الفاظ پر لوسی اور لارنس کے چہروں پر کچھ تناؤ سا آ گیا تھا جو کچھ الگ کہانی سنا رہا ...تھا۔

"اور یہ سب یعنی بنڈل وغیرہ کون تیار کرتا ہے؟"

"لوسی اور لارنس......"

"ایک منٹ......" ایرک نے اس کا جملہ کاٹ کر ...پوچھا۔ "کیا یہ دونوں روزانہ اتنی صبح یہاں موجود ہوتے ...یں؟"

"نہیں، صرف بدھ کے دن ایسا ہوتا ہے۔" اس بار ...جواب لوسی نے دیا تھا۔

"بدھ کو میں اور میرا بھائی بہت جلد آ جاتے ہیں۔ ...رنٹنگ کے کاموں سے نمٹ کر بنڈل بنا دیے جاتے ہیں ...چونکہ ایڈیٹنگ کا تمام کام مکمل ہو چکا ہوتا ہے اس لیے مسٹر ...یلر کو اتنی صبح آنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"یعنی عموماً وہ بدھ کو نیند پوری کر کے آتے ہیں؟" ...یرک نے پوچھا۔

"ہاں...... ہاں۔" بیلر نے لوسی کو جواب دینے کا موقع دیے بغیر کہا۔ "میں اپنے اسٹاف پر اعتماد کرتا ہوں اور یہ اچھا کام کرتے ہیں۔" وہ ان دونوں کی جانب دیکھ کر سرپرستانہ انداز میں مسکرایا۔ لارنس نے جوابی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی جانب دیکھا مگر لوسی نے اس تعریف پر کوئی تاثر ظاہر نہیں کیا۔

"راستے میں کسی نے آپ کو دیکھا؟"

"شاید ایک یا دو افراد نے دیکھا ہو مگر اصل بات یہ ہے کہ کون کون مجھے دیکھ سکتا تھا۔" بیلر نے کہا۔ "جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ڈیموکریٹس کا دفتر سامنے ہی ہے اور میں ایبی جانسن کے مکان کے پاس سے بھی گزرا، یہ وہی پوسٹ مسٹریس ہے جو پاپولسٹ نکال رہی ہے۔ وہ دونوں یا ان کے ملازم مجھے وہاں سے اخبارات کے بنڈل کے ساتھ گزرتے دیکھ سکتے تھے۔"

"ہم......" ایرک کے اس ہم کا مطلب اس کا مطمئن نہ ہونا تھا مگر یہ صرف نک ہی سمجھ سکتا تھا۔

"اُس وقت موسم کیسا تھا؟" ایرک نے ایک لمحے کے وقفے کے بعد پوچھا۔

"بہت سردی تھی مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"تو آپ قصبے سے آدھا میل آگے گئے؟"

"جی ہاں، وہیں یہ واقعہ ہوا...... اور جب میں نے اس کا مخصوص جنوبی لہجہ سنا، اس کا لبادہ دیکھا میں سمجھ گیا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ یہی میں نے کرنل کو بتایا تھا جس کے بعد انہوں نے تم لوگوں کو بھیجا ہے۔ وہ یقیناً کیو کلکس قبیلے کے لوگ تھے جو میرے پیچھے لگ گئے ہیں۔"

"کیا؟" ایرک ایک لمحے کے لیے ساکت سا ہو گیا۔ "کیو کلکس...... یہ تو مجھے پہلے نہیں بتایا گیا تھا۔"

"یہی اصل بات ہے اگر تم اُن کے بارے میں جانتے ہو تو اس کا لبادہ اور ایک ری پبلکن کو لوٹنا دونوں ہی بتا رہے ہیں کہ وہ کیو کلکس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"خیر، اگر آپ خود بھی تھوڑی تحقیق کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ پچیس سال پہلے.... اس علاقے سے جا چکے ہیں۔ اب وہ اس قسم کے لبادوں میں بھی نہیں پھرتے۔" نک بولا۔

"آپ کو کسی نے بچ بھیجے تھے؟" ایرک نے اچانک پوچھا۔

"کیا کہا آپ نے؟" بیلر نے چونک کر پوچھا۔

"نارنجی رنگ کے چھوٹے بیج...... کوکلکس قبیلے کے لوگ کسی کو دھمکانے یا نقصان پہنچانے سے قبل اسے یہ بیج ضرور بھیجتے ہیں۔"

"نہیں تو...... ویسے میں نے یہ بات پہلے نہیں سنی...... یہ نارنجی بیج ہی کیوں؟"

ایرک اور نک نے اس سوال پر ایک دوسرے کی جانب دیکھا، یہ ایک اچھا سوال تھا مگر ان دونوں کو اس کا جواب معلوم نہیں تھا۔

"وجہ تو معلوم نہیں...... اب جو لوگ چادر لپیٹ کر پھرتے ہوں، ان کے بارے میں کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔" نک نے کندھے اچکائے۔

"صحیح کہہ رہے ہیں، کیا آپ کا ان لوگوں سے پالا پڑ چکا ہے، میرا مطلب ہے کہ آپ کے پاس اتنی معلومات ہیں؟"

اس سوال پر نک اور ایرک نے دوبارہ ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ وہ دونوں اتنا تو سمجھ ہی گئے تھے کہ بیلر کو یہ بتانا کہ ان کی یہ شاندار معلومات ایرک کے ہیرو شرلاک ہومز کے ایک ناول 'دی فائیو اورنج پائپس' سے ماخوذ ہے، تھوڑا مشکل کام تھا اور اس سے بھی مشکل اس کا ہم دونوں پر اعتماد کرنا تھا۔

"نہیں ہمارا تو ان سے پالا نہیں پڑا البتہ کچھ سال قبل انگلینڈ میں ایک دوست کا ان سے کچھ مسئلہ ہوا تھا۔ وہ اب تک اپنی اس روایت پر عمل کرتے ہیں۔" ایرک نے نہایت اعتماد سے بتایا۔

"میں جانتا تھا...... میں جانتا تھا کہ یہ وہی ہیں۔" بیلر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "لوگ کہتے ہیں کہ وہ ختم ہو گئے ہیں۔ تم نے بھی ابھی یہی کہا تھا نا؟" وہ نک کی جانب مڑا۔

"ہمیں کسی نتیجے تک پہنچنے کے لیے سوالات کرنا پڑتے ہیں۔" ایرک دوبارہ بولا۔ "ہمیں اس بحث میں پڑنے کے بجائے اصل معاملے پر آنا چاہیے...... اس شخص نے آپ کو روکا اس کے بعد کیا ہوا؟"

"بالکل، بالکل...... یہ بات بھی درست ہے۔" وہ ٹھنڈا پڑتے ہوئے بولا۔ "اس نے مجھے قصبے سے باہر چلنے کو کہا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ مجھے قتل کر دے گا مگر میں کیا کرتا اس کے ہاتھ میں گن تھی، اس کی بات ماننا مجبوری تھی۔"

"وہ کیسی گن تھی؟" ایرک نے پوچھا۔ "کچھ خاص جو آپ کو یاد ہو؟"

"نہیں...... وہ بہت چالاک تھا، اس نے گن کو اپنی آستین میں تقریباً چھپا رکھا تھا۔"

اس کے اس جواب پر ایرک اور نک دونوں نے اسے گھورا جس کے جواب میں بیلر بگڑ گیا تھا۔

"وہ کوئی چھڑی یا انگلی نہیں تھی۔" وہ غرایا۔ "میں کوئی احمق نہیں ہوں، وہ ایک گن ہی تھی۔ اس نے قریب آنے سے پہلے اسے تان رکھا تھا۔"

"ہمیں یقین ہے۔" ایرک نے فوراً کہا۔ "اس شخص کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں۔ لمبا تھا؟ موٹا تھا؟ میرا مطلب ہے اس کا کچھ حلیہ وغیرہ؟"

"معلوم نہیں۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "اصل میں اس نے مجھے چونکا دیا تھا اور پھر اس کے بگھی میں بیٹھ جانے کے بعد مڑ کر دیکھنے کی میری ہمت نہیں ہوئی، ویسے وہ ایک عام جسامت والا تھوڑا سا لمبا شخص تھا اور اس کا لہجہ جنوبی علاقے کے لوگوں کے مانند تھا۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔"

"او کے۔" ایرک نے کہا۔ "تو وہ آپ کو قصبے سے باہر لے جا رہا تھا اور آپ کو ڈر تھا کہ وہ آپ کو مار ڈالے گا اس کے بعد......؟"

"اس کے بعد اس نے مجھے رکنے کو کہا۔ میں سمجھا کہ وقت آ گیا ہے مگر گولی مارنے کے بجائے اس نے مجھے بگھی سے اترنے کو کہا۔ میرے نیچے اترتے ہی وہ خود آگے آ گیا اور اس نے باگیں تھام لیں اس کے بعد مجھ سے کہا۔ 'پانچ منٹ تک اپنی جگہ سے ہلنا مت ورنہ نتائج کے تم خود ذمے دار ہو گے اگر تم ...... لعل ٹن میں اپنی ری پبلکن جھوٹی خبروں کو پھیلاتے رہنا چاہتے ہو تو میری بات یاد رکھنا اور پھر وہ بگھی دوڑاتا ہوا واپس چلا گیا۔"

"قصبے کی طرف......؟" ایرک نے پوچھا۔

"ہاں رخ تو اسی طرف تھا پھر پتا نہیں وہ کہاں گیا، بگھی اس نے سڑک کے پاس کہیں چھوڑ دی تھی۔ گھوڑا تربیت یافتہ تھا وہ سیدھا اصطبل پہنچا اور اس کے بعد تھامس میری تلاش میں نکلا۔ میں پیدل چل پڑا تھا مگر کچھ ہی آگے پہنچا ہوں گا جب تھامس وہاں پہنچا۔ اتنی دیر میں وہ غائب ہو چکا تھا۔"

"اور اخبارات کا بنڈل؟ وہ ملا؟"

"نہیں۔" بیلر نے نفی میں سر ہلایا۔

"دلچسپ۔" ایرک بڑبڑایا۔ "کتنی کاپیاں ہوں گی۔

اخبار گی؟‘‘
’’تقریباً سو۔‘‘ بیلر اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ شاید وہ اخبارات کی چوری کے دلچسپ ہونے کے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔
’’سو کا پیاں غائب ہیں...... اس سارے واقعے کا کوئی گواہ نہیں ہے۔‘‘
’’نہیں۔‘‘
’’اس وجہ سے لوگوں کو شک کرنے کا موقع مل سکتا ہے نک تم نے پبلسٹی اسسٹنٹ کے بارے میں سنا ہے نا؟‘‘ ایرک نے بالوں کو ماتھے سے ہٹاتے ہوئے پوچھا۔
نک نے اس سوال پر پہلے بیلر کی طرف دیکھا جس کی نظریں ایرک پر جمی تھیں پھر بولا۔ ’’میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔‘‘
’’یہاں بھی کافی لوگوں نے اسی خیال کا اظہار کیا تھا جس کے بعد میں نے کرنل رابرٹ کو خط لکھا تھا۔‘‘ بیلر نے متانت سے کہا۔ ’’میں نے کافی عرصہ ان کی خبریں لگائی ہیں۔ وہ ایک اچھے انسان ہیں اور پکے ری پبلکن بھی...... انہوں نے کہا تھا کہ وہ اپنے دو بہترین سراغ رسانوں کو یہاں بھیج رہے ہیں جو نہ صرف یہ کیس حل کر دیں گے بلکہ مجھ پر انگلی اٹھانے والے بھی شرمندہ ہو جائیں گے۔‘‘
ایرک نے منہ کھولا اور پھر بند کر لیا۔ اسے کرنل رابرٹ کے سراغ رساں ہونے والے جملے پر سخت اعتراض تھا مگر پھر اس نے فی الحال اس موضوع پر کچھ نہ کہنے کا فیصلہ کیا۔
’’دیکھیں فی الحال ہم کوئی وعدہ نہیں کر رہے...... ہم اس معاملے کی تفتیش شروع کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں تھامس سے ابتدا کرنی چاہیے۔‘‘ آخری جملہ اس نے نک سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔
’’کیا؟‘ بیلر کی آنکھیں حیرت سے کھل سی گئیں۔ لوسی اور لارنس نے بھی چونک کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ ’’تھامس سے کیوں؟‘‘ بالآخر بیلر نے پوچھ ہی لیا۔
’’کیونکہ وہ ہی جانتا تھا کہ تم اس سے بگھی لے کر قصبے سے باہر جا رہے ہو اور تمہارے پاس اخبارات بھی موجود ہیں...... یہ تھامس ری پبلکن ہے یا وہ دوسری طرف کا آدمی ہے؟‘‘ نک نے پوچھا۔
’’اوہ...... وہ...... ری پبلکن ہے، وفادار ری پبلکن اور ہمارا خریدار بھی...... میں تمہیں اس کا پتا دیتا ہوں مگر تمہیں اس سے زیادہ توجہ جیولس ایکس کی طرف دینی چاہیے۔‘‘
’’وہ...... لفل ٹن ڈیموکریٹک والا......‘‘ نک نے اندازہ لگایا۔
’’بالکل وہی......‘‘ وہ بولا۔
’’تفتیش کے دائرے میں سب ہی آئیں گے۔‘‘ ایرک نے جواب دیا اور کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں میں وہ دونوں بیلر کے دفتر کے باہر تھے۔ باہر سردی اسی طرح مزاج پوچھے لے رہی تھی۔
’’وہ دیکھو سامنے......‘‘ ایرک نے چلتے ہوئے کہا۔
’’کہاں؟‘‘ نک نے پوچھا اور اسی وقت اس کی نظر سڑک کے دوسری جانب ایک دفتر کے دروازے پر کھڑے نوجوان پر پڑی۔ وہ لارنس سے کچھ بڑا ہو گا اور اس کی نگاہیں ان دونوں پر ہی جمی ہوئی تھیں۔
’’اس نوجوان کو......‘‘ نک نے دوبارہ پوچھا۔
’’وہ بھی مگر اس سے زیادہ دلچسپ اور عجیب اُس کے دفتر کا بورڈ ہے۔‘‘ ایرک کے کہنے پر نک نے بھی اس جانب دیکھا۔ اس بورڈ پر موٹے حروف میں کچھ تحریر تھا۔
’’لفل ٹن ڈیموکریٹ نیوز آفس۔ اسٹیشنری ویٹم ام پینڈ دویرو۔‘‘
’’یہ...... ویٹم پینڈ ویرو کیا ہو سکتا ہے؟‘‘ ایرک بڑبڑایا۔
’’یہ لاطینی الفاظ لگ رہے ہیں...... ٹھہریے میں کسی سے پوچھتا ہوں۔‘‘ نک نے برابر سے گزرتے شخص کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ واپس پلٹ آیا تھا۔
’’اسے نہیں معلوم...... پتا نہیں مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ یہ ٹوائلٹ پیپر کا اشتہار ہے۔‘‘ اس نے ایرک کی جانب دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا۔
’’یہ کیا بکواس ہے؟‘‘ اس نے اسے گھورا۔
’’اس جناتی زبان کا یہی مطلب ہے بھائی صاحب۔‘‘ نک نے جواب دیا۔
’’اوکے۔‘‘ ایرک کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ اتنی دیر میں وہ لڑکا دفتر میں واپس جا چکا تھا۔
’’وہ اندر گیا مگر لگ رہا ہے کہ وہاں سے بھی باہر جھانک رہا ہو گا، بیلر اس بارے میں تو بالکل درست ہے کہ یہ لوگ اس پر نظر رکھتے ہیں۔‘‘ نک نے کہا۔
’’ہم......‘‘ ایرک نے جواب میں صرف اتنا ہی کہا۔
’’اگر یہ کیوکلکس والے واپس آ گئے ہیں تو یہ معاملہ

خطرناک ہوسکتا ہے۔'' نک پھر بولا۔

''ہمم ......''

''یہ اورنج بیجوں والی بات حقیقت ہے ایرک......؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ دیر خاموش رہو پلیز میں کچھ سوچ رہا ہوں۔'' بالآخر اسے جواب مل گیا۔

چند منٹوں بعد وہ تھامس کے دفتر کے باہر تھے۔ وہاں صفائی تو موجود تھی مگر اس کے باوجود ایک عجیب سی بُو نے ان کا استقبال کیا۔ تھامس انہیں باہر ہی مل گیا تھا۔ ایرک نے تعارف اور مقصد بیان کرنے میں ایک لمحہ لیا تھا۔

''آپ کو معلوم تھا کہ وہ اُس روز بگھی کیوں لے رہا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''بالکل، اس نے خود پوری تفصیل بتائی تھی۔ اسے نئے اشتہارات اور خریداری کا یقین تھا جس کے بعد میں بھی سوچ رہا تھا اب مجھے اپنے اشتہارات کے پیسے دینا پڑیں گے۔'' وہ بولا اس کی آواز میں ایک عجیب سا کھردراپن تھا۔

''یعنی ابھی آپ اس کو پے منٹ نہیں کرتے؟'' ایرک نے پوچھا۔

''ہاں...... پیسے کی شکل میں نہیں کرتا مگر اس کے بدلے میں مسٹر بیلر میری بگھی استعمال کرتے رہتے ہیں۔'' وہ بولا۔ ''ویسے بھی آج کل اس اخبار میں سوائے چند مقامی یعنی قصبے کے اشتہاروں کے کوئی اشتہار موجود نہیں ہوتا۔''

''مسٹر بیلر کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟'' ایرک نے پوچھا۔

''میں کسی کے معاملات میں دخل نہیں دیتا، مجھے کیا کوئی کچھ بھی کرے...... وہ بس تھوڑا اجھکی ہے۔ دوپہر میں کام پر پہنچتا ہے اور پھر رات گئے تک ایگل کافی اور مشروبات سیلون میں بیٹھا رہتا ہے۔''

''اور مسٹر جیولیس ریکس کیسے آدمی ہیں؟''

''دیکھیں ان کے معمولات میرا مسئلہ نہیں ہیں۔ ویسے وہ بھی دن چڑھے گھر سے نکلتے ہیں اور رات گئے مشروبات کے دوسرے سیلون فنگی اینڈ ڈرم میں پائے جاتے ہیں۔'' وہ کندھے جھٹک کر بولا۔

''کیا آپ نے کسی سے مسٹر بیلر کی آمد اور جس طرف وہ گئے تھے، اس بارے میں کچھ بات کی تھی؟'' ایرک کے سوال پر تھامس نے اسے غصے سے گھورا۔

''اگر آپ اُس صبح کی بات کررہے ہیں تو اُس صبح صرف میرا بیٹا یہاں تھا اور مجھے اس کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ مسٹر بیلر خود ہی خاصی بلند آواز میں باتیں کررہے تھے۔''

''وہ بھی تیار ہوتے ہی نکل کھڑے ہوئے تھے؟''

''جی ہاں۔''

''وہ کس سمت گئے تھے؟''

''بڑی سڑک سے فورٹ لوگن کی طرف۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے کی مدد سے بتایا۔ اس کی بات سُن کر ایرک نے سر ہلایا اور آنکھیں بند کرکے گویا مراقبے میں چلا گیا۔ چند لمحے گزرنے کے بعد تھامس نے نک کی جانب استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔ جیسے جاننا چاہ رہا ہو کہ کیا یہ اس کا نارمل انداز ہے جس کے جواب میں نک نے کندھے اچکائے۔ چند لمحوں بعد ایرک بالآخر دوبارہ زمین پر آگیا تھا۔

''کیا آپ نے یہاں کبھی کیوکلکس قبیلے کے افراد میں سے کسی کو دیکھا ہے؟''

''نہیں۔'' تھامس نے کہا۔ ''اگر ایسا ہوتا تو لوگ انہیں کبھی نہیں چھوڑتے۔''

''کون سے لوگ؟ ڈیموکریٹس پڑھنے والے یا ری پبلکن پڑھنے والے۔'' ایرک نے دلچسپی سے پوچھا۔

''سب، ڈیموکریٹکس نیوز، ری پبلکن نیوز اور پاپولسٹ پڑھنے والے بھی بلکہ وہ بھی جو کچھ بھی نہیں پڑھ سکتے...... نفرت کبھی کبھی لوگوں کو بہت تیزی سے متحد کردیتی ہے۔''

''بیلر اس نفرت کے خلاف ہے؟''

''نہیں اس سے زیادہ مخالفت تو وہ آزاد تجارت، عورتوں کے حقوق وغیرہ کی کرتا ہے اور سب سے زیادہ ڈیموکریٹس کی۔'' تھامس ہنسا۔ ''اور اس سے بھی زیادہ اگر پوچھو تو جیولس ریکس کی۔''

''تم ان دونوں میں سے کس کو زیادہ پسند کرتے ہو؟'' ایرک نے اچانک پوچھا۔ اس کے سوال پر تھامس اور نک دونوں نے اسے حیرت سے گھورا۔ ''یہ آخری سوال ہے۔''

''بیلر اچھا آدمی ہے لیکن وہ ماضی میں رہ گیا ہے۔'' تھامس بالآخر بولا۔ ''ویسے میں سیاست کے معاملے میں نہیں پڑتا۔''

''اوکے۔'' ایرک بولا۔ تھامس کے چہرے سے نظر آرہا تھا کہ اب وہ ایک سوال بھی برداشت نہیں کرے گا۔

کچھ دیر میں وہ دونوں فیملی اینڈ ڈرم پہنچ گئے۔ چھوٹا سا ریسٹورنٹ تقریباً بھرا ہوا تھا۔ ان کے اندر داخل ہوتے ہی ایک لمحے کو ہال میں خاموشی ہوگئی۔

''دیکھا...... میں نے کہا تھا ناکہ وہ دونوں آخرکار مجھے ڈھونڈتے ہوئے ضرور آئیں گے۔'' ایک قدرے بلند آواز نے اُن کا استقبال کیا۔

کارنر پر موجود ایک میز کے ساتھ موجود کرسی پر وہی شخص موجود تھا جس کا جوتا، ایرک نے زمین کے منہ سے چھینا تھا۔

''مسٹر ریکس......'' نک اس کے قریب پہنچ کر جھکتے ہوئے بولا۔ ''ہم آپ کے پسندیدہ موزوں کی خیریت پوچھنے آئے ہیں۔''

''ہاہا......'' وہ زور سے ہنسا۔ ''یہ واقعی میرے پسندیدہ ہیں۔'' اس کی میز پر دو اور افراد موجود تھے، اس بار اس کا مخاطب وہ تھے۔ ''پلیز تم لوگ میرے مہمانوں کو جگہ دے دو، ہم بعد میں بات کرتے ہیں۔'' اس کے ان الفاظ کے ساتھ وہ دونوں وہاں سے اٹھ گئے۔ ''تشریف رکھیے۔'' اس بار وہ نک اور ایرک سے بولا۔

''بہت شکریہ۔'' نک مسکرایا۔

''میں نہیں چاہتا کہ مجھ پر بداخلاقی کا الزام لگے۔'' وہ بولا۔ ''بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں کسی بھی معاملے میں خود پر کوئی الزام لگتا نہیں دیکھنا چاہتا۔''

''ہم یہاں الزام لگانے آئے بھی نہیں ہیرر۔'' اس بار ایرک بولا۔ ''ہم صرف معلومات کے خواہاں ہیں۔''

ریکس مسکرایا اور اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ نک ایک لمحے کو چوکنا ہوگیا۔ اس نے اپنے کوٹ کے اندر موجود ریوالور نکالنے کے بارے میں سوچا مگر پھر اس خیال کو جھٹک دیا۔ ریکس نے کوٹ کی جیب سے نوٹ بک اور پنسل نکالی اور مسکرایا۔

''میں بھی...... مجھے بھی معلومات چاہئیں آخر یہ میرا پیشہ ہے تو کیوں نا ہم ''باری باری سوال'' کا کھیل کھیلیں؟''

''ٹھیک ہے۔'' ایرک بھی جواب میں مسکرایا۔ ''مگر پہلی باری میری ہوگی۔''

''اوکے۔''

''یہ بتائیے کہ گزشتہ بدھ کی صبح جب ہاروے بیلر قصبے سے باہر گیا تھا، آپ اس وقت کہاں تھے؟''

''اپنے گھر پر...... بستر میں...... گہری نیند سو رہا

تھا...... میری بیوی اور ملازم اس کی گواہی دے سکتے ہیں۔"

وہ بولا۔ "اب میری باری...... آپ دونوں کے نام کیا ہیں؟ آپ کس کے لیے کام کر رہے ہیں؟ آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں؟ اور کیا آپ لوگ ایک خبطی شخص کی باتوں میں آ کر لعل ٹن کے لوگوں سے تفتیش کرنے کو درست سمجھتے ہیں؟"

"یہ تو سوال کے بجائے سوالوں کی ٹرین ہو گئی...... آپ ایک سوال پوچھ سکتے ہیں اور اس سب میں سے جو جواب بنتا ہے وہ یہ ہے کہ میں ایرک ہوں اور یہ میرا چھوٹا بھائی نک ہے۔ اب میرا سوال۔ جب بیلر اپنے دفتر سے نکلا تب کیا آپ کے دفتر میں کوئی موجود تھا؟"

"جی ہاں...... میرا اسسٹنٹ رابرٹ نیل وہاں موجود تھا۔ وہ اخبار کے معاملات دیکھتا ہے۔ پریس میں پرچا بھیجنا اور صبح اسے پہنچانا اس کی ذمے داری ہے۔ میں گیارہ کے بعد دفتر پہنچتا ہوں...... اب آپ بتائیں کہ آپ کس کے لیے کام کر رہے ہیں اور یہاں کیسے آئے ہیں۔ یہ دونوں سوال ایک دوسرے سے متعلق ہیں اس لیے امید ہے کہ تمہیں ان پر اعتراض نہیں ہوگا۔" وہ بولا۔

"اعتراض نہیں ہے۔" نک نے ایرک کے کچھ کہہ پانے سے پہلے کہا۔ "ہم دونوں مل کر مشہور اسپنسر ڈی ٹیکٹیو ایجنسی چلاتے ہیں۔"

"ہم......" وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

"اب آپ بتائیں کہ کیا آپ نے یہاں کیو ٹلکس قبیلے کے کسی شخص کو دیکھا ہے؟"

"جنرل ناتھن نے ان سب کو 1869ء میں یہاں سے نکال دیا تھا۔" ریکس بولا۔ اس سوال کو سنتے ہی اس کے چہرے پر غصہ ابھر آیا تھا۔

"کیونکہ اب وہ قبیلہ ختم ہو چکا ہے۔" اس کی آواز اور چہرے پر غصہ تھا اور یہ وہ تاثر تھا جو وہاں موجود ہر شخص کے انداز میں نظر آ رہا تھا۔

"اب میں آپ کے سوال کا جواب...... دیتا ہوں مسٹر ریکس......" نک بولا۔ "ہم یہاں کسی سے تفتیش کرنے نہیں آئے۔ ہم حقائق کو جاننے کی کوشش کر رہے ہیں اور سچ تک پہنچ کر رک جائیں گے۔ اس میں تھوڑی مشکل ہو سکتی ہے مگر ہماری کوشش، ارادہ اور مقصد صرف سچ کی تلاش ہے۔"

ریکس پہلے نک کی جانب متوجہ نہیں تھا مگر "سچ کی تلاش" کے الفاظ پر وہ مسکرایا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بہتر ہو گئے۔ "تم الفاظ کا بہت اچھا استعمال کرتے ہو۔ ضروری۔ ہے کہ ان پر عمل بھی کیا جائے۔ تمہیں معلوم ہے کہ 'ویٹم ام پینڈ ووِیرو' کا مطلب کیا ہے؟"

"نہیں۔" نک نے کہا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ یہ آپ کے اخبار کا 'موٹو' ہے۔"

"ہاں، یہ رومن شاعر جیوِنل کا کہا ہوا مصرعہ ہے جس کا مطلب "سچ کے لیے زندگی کو وقف کر دو" ہے اور میں اس کا قائل ہوں...... یہ جو جھوٹ کا جالا بُنا گیا ہے نا، میں تمہیں اس میں نظر نہیں آؤں گا۔"

نک نے جواب میں سر ہلایا۔ ہال میں موجود لوگ اب ان دونوں سے کچھ مطمئن نظر آ رہے تھے مگر ایرک شاید ریکس سے زیادہ متفق نہیں تھا اور یہ اُس کے چہرے سے عیاں تھا۔

"ایسا ہی ہوگا۔" وہ بالآخر بولا۔ "میرے پاس تمہارے لیے ایک اور سوال موجود ہے۔"

"سوری مگر میرے سوال ختم ہو گئے ہیں۔" ریکس نے نوٹ بک بند کرتے ہوئے کہا۔

"مسٹر ریکس مجھے یقین ہے کہ آپ سچ کی خاطر ایک سوال کا کریڈٹ دے دیں گے...... آپ جب چاہیں اس کے بدلے کا سوال پوچھ لیجیے گا۔" نک نے کہا۔

ریکس چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا مگر وہاں تمسخر نہ پا کر اس نے سر ہلایا۔ یہ گویا رضامندی کا اعلان تھا۔

"مسٹر ریکس! آپ کے پاس کون سا پسٹل موجود ہے؟" ایرک نے پوچھا۔

"آپ دیکھ سکتے ہیں کہ میرے پاس پسٹل نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "ہاں مگر سیلف ڈیفنس کے لیے میرے پاس ایک کولٹ ڈریگن ریوالور موجود ہے جو میں دفتر میں رکھتا ہوں۔ یہ میرے والد کا ہے اور انہی سے مجھے ملا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہر شخص کو اپنے دفاع کا خیال رکھنا چاہیے۔"

"بالکل درست کہا آپ نے......" نک نے کہا۔

ایرک کچھ کہنا چاہ رہا تھا پھر اس نے منہ بند کر لیا۔

"اب آپ لوگ مجھے اجازت دیں، اتنے سوالوں نے مجھے تھکا دیا ہے۔" ریکس نے کہا۔

"بالکل مسٹر ریکس...... آپ سے دوبارہ مل کر اچھا لگا۔" نک نے جواب دیا اور وہ دونوں باہر نکل آئے۔

"ایک بات طے ہے کہ یہ لوگ ہم سے خوش نہیں ہیں۔" نک نے چلتے ہوئے کہا۔ "اور آپ اسے ہر بات پر بھڑکا رہے تھے۔"

''بعض لوگوں سے سچ نکلوانے کے لیے انہیں بھڑکانا پڑتا ہے۔'' ایرک نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''لعل ٹن میں اب تک ہمیں کوئی نارمل انسان نہیں ملا جو سیاست کے چکر سے دور ہو...... مجھے تو لگتا ہے کہ ان دونوں اخبارات اور ان کے مالکان نے یہاں کے لوگوں کو سیاست کا زدمبی بنا دیا ہے۔''

''بات تو سچ ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ تیسرے اخبار کا چکر کیا ہے۔''

''ہاں، وہیں جا رہے ہیں۔'' ایرک نے کہا اور سامنے موجود قصائی کی دکان میں داخل ہو گیا۔

''ارے...... ارے یہ وہ نہیں ہے بھائی۔'' نک نے بے اختیار کہا جس پر ایرک نے مڑ کر اسے گھورا۔ ایرک کے اندر جانے کے بعد نک نے مڑ کر ریستوران کی جانب دیکھا وہاں وہ شخص کھڑا تھا جو اُن کے بیٹھنے سے قبل ریکس کی میز پر موجود تھا...... نک نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا...... وہ لوگ ان کی نگرانی کی کوشش کر رہے تھے۔

''اس سڑک کے اختتام پر پوسٹ آفس ہے جو کہ پوسٹ مسٹریس کا گھر بھی ہے۔'' ایرک نے دکان سے نکل کر کہا اور تیزی سے آگے بڑھا۔

''بھاگ کیوں رہے ہیں بھائی۔'' نک نے اس کے قدم سے قدم ملاتے ہوئے پوچھا۔

''قصائی کے مطابق وہ وقت پر دفتر بند کر دیتی ہے اور پھر کسی کی نہیں سنتی۔'' ایرک نے جواب دیا۔ ''اور دفتر بند ہونے میں چند منٹ ہی رہ گئے ہیں۔ ہم اس سے ملنے کے لیے کل تک کا انتظار نہیں کر سکتے۔''

پوسٹ مسٹریس کا گھر سڑک پر آگے جا کر سب سے آخر میں تھا۔ اس کے اردگرد اس وقت نہایت خاموشی تھی۔ اس گھر سے قریبی عمارتیں دو چرچ تھے جو آمنے سامنے بنے ہوئے تھے اور اس کے بعد ایک قبرستان تھا۔

پوسٹ مسٹریس کا گھر خاصی بہتر حالت میں تھا۔ سردی اور برف کے باوجود گھر کی صفائی پر پورا دھیان نظر آ رہا تھا۔ دروازے پر بڑے حروف میں ''پوسٹ آفس'' لکھا ہوا تھا۔ دروازے کے سامنے ایک اینٹ موجود تھی جس میں ایک چھوٹا لفافہ پھنسا ہوا تھا۔ نک اسے غور سے دیکھ رہا تھا جبکہ ایرک کی نظر ''کلوزڈ'' کی تختی پر جمی ہوئی تھی۔

''دروازے پر دستک دو۔'' ایرک نے نک سے کہا۔

نک نے کچھ سوچتے ہوئے دستک دی۔

''پانچ بج چکے ہیں۔'' اندر سے ایک سخت قدرے بھاری مگر نسوانی آواز بلند ہوئی۔

''ہم معذرت خواہ ہیں مگر ہم آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں میڈم۔'' نک بولا۔

''پوسٹ آفس صبح آٹھ بجے کھلے گا اب یہ صرف گھر ہے۔'' وہ سختی سے بولی۔ اندر سے اس کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی مگر اس کا رخ دروازے کی جانب نہیں تھا۔

''میں معافی چاہتا ہوں۔'' نک نے پھر کہا۔ ''مجھے صرف چند منٹ درکار ہیں۔''

''یہ میرا کھانا بنانے کا وقت ہے...... کل ملاقات ہو گی۔''

''میڈم ہم یہاں پوسٹ مسٹریس سے ملنے نہیں آئے۔ ہمیں لعل ٹن پاپولسٹ کی پبلشر سے ملنا ہے۔'' نک بالآخر بولا۔ ایرک اسے تنقیدی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے اپنے تعریفی کلمات واپس لینے کے بارے میں سوچ رہا ہو۔

قدموں کی چاپ ایک لمحے کو رکی اور پھر قریب آتی محسوس ہوئی۔

''آپ کو کیا کام ہے خبر، اشتہار یا کوئی شکایت؟'' اس نے پوچھا۔

''خبر......'' نک نے جواب دیا۔

''کس طرح کی خبر؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہاروے بیلر کے ساتھ کیا ہوا؟'' نک بولا۔ دوسری جانب ''اونہوں'' کی تیز آواز سنائی دی۔ ''بیلر نے دوسرا غرسانوں کو تفتیش کے لیے بلایا ہے۔'' نک مزید بولا۔

''ارے واقعی؟ تمہیں کیسے معلوم؟'' آواز اب دروازے کے قریب تھی۔

''ہم وہی ہیں۔'' نک نے گویا اقبالِ جرم کیا۔

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ ان کے سامنے ساٹھ پینسٹھ برس کی ایک قدرے فربہ خاتون موجود تھی۔ اس کے چہرے پر سختی تھی مگر آنکھوں میں نرم تاثر موجود تھا۔

''آپ دونوں کو مجھ سے کیا کام ہے؟'' اس بار اس نے نرمی سے پوچھا۔

''ہمیں صرف چند سوال کرنے ہیں۔'' نک تیزی سے بولا۔ ''اور ہم آپ کے صرف چند منٹ لیں گے جس

کے بعد آپ کھانا تیار کر سکتی ہیں۔"

"اوہ...... یہ تو تم دونوں ہو ایرک اور نک...... ہے نا......" وہ ان دونوں کے سرخ بالوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "مجھے یقین نہیں آرہا۔"

"جی بالکل یہ ہم ہیں۔ سرخ بالوں والے سراغرساں......" نک مسکرایا۔

"اندر آجاؤ، باہر بہت سردی ہے۔" وہ انہیں راستہ دیتے ہوئے بولی۔ "مگر کیچڑ ساتھ مت لانا۔ ڈور میٹ موجود ہے۔"

"بالکل، بالکل۔" نک نے کہا۔ "یہاں شاید کوئی تاخیری میل موجود ہے۔" اس نے اینٹ کے نیچے سے لفافہ نکال کر اس کی جانب بڑھایا جسے اس نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے اس سے لے کر اپنے ایپرن کی جیب میں ڈال لیا۔

"یہ لوگ کبھی وقت کے پابند نہیں ہو سکتے۔" وہ بڑبڑائی۔ "اگر میں سختی نہ کروں تو یہاں رات کے بارہ بجے بھی خط آتے رہیں۔ خیر آپ لوگ اندر آئیں۔"

"آپ ہمیں کیسے جانتی ہیں؟" نک نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"یہاں بہت رسالے آتے جاتے ہیں جس میں سے کچھ گر کر کھل بھی جاتے ہیں، رسالے یوں بھی اکثر کھلے ہی ہوتے ہیں۔"

"اوہ تو آپ نے ہماری کہانیاں پڑھی ہیں؟" نک نے مسرت سے کہا۔

"جی ہاں...... لفافے الگ کرنا اور روانہ کرتے رہنا خاصا بورنگ کام ہے۔ اس میں تھوڑی بہت دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔"

اندر سے وہ بالکل ایک گھر تھا صرف مختلف میزوں پر لفافے، پیکٹس اخبار اور رسالے ترتیب سے رکھے نظر آرہے تھے۔

"میں جانتی ہوں کہ آپ لوگ کیا سوچ رہے ہیں۔ اصل میں لعل ٹن کا پوسٹ آفس ایک سال پہلے جل گیا تھا جس کے بعد ہی میں نے خود کو یہ عہدہ دیا ہے۔ جو آدمی پہلے یہ کام کر رہا تھا وہ ہماری ڈاک اور منی آرڈرز کے بارے میں نہایت بے پروا تھا اور وہی بے پروائی اس نے کیروسین کے لیمپ کے ساتھ بھی برتی جس کی وجہ سے آگ لگ گئی تھی۔ اب سب قابو میں ہے ٹھیک آٹھ بجے پوسٹ آفس کھل جاتا ہے اور کسی کا کوئی پیکٹ ادھر اُدھر نہیں

ہوتا۔" وہ بیٹھتے ہوئے مسکرائی۔

"مجھے حیرت ہے کہ اس سب مصروفیت کے بعد آپ کے پاس اخبار نکالنے کا وقت نکل آتا ہے مسز جونسن...... مجھے آپ کا یہی نام بتایا گیا ہے۔" ایرک نے پہلی بار منہ کھولا۔

"تم مجھے ایگنس کہہ سکتے ہو۔" وہ مسکرائی۔ "میں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں، یہ اخبار وغیرہ کا مجھے کوئی خاص شوق نہیں ہے، میں نے پاپولسٹ صرف ری پبلکن اور ڈیموکریٹک سے چڑنے کی وجہ سے نکالا ہے، ان دونوں نے مل کر ہمارے چھوٹے سے قصبے میں نفرتیں پھیلا رکھی ہیں اور لوگوں کو تقسیم اور ایک دوسرے سے دور کرنے کا کام کر رہے ہیں۔ میرے اخبار میں کہانیاں، کھانے کی ترکیبیں، گارڈنگ ٹپس...... قسم کی چیزیں ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود مجھے بیلر اور ریکس سے زیادہ اشتہار مل جاتے ہیں۔" وہ قہقہہ لگا کر بولی۔

"تمہارا کیا خیال ہے ایرک...... بیلر کے ساتھ کچھ ہوا ہے یا وہ کہانیاں بنا رہا ہے؟"

ایرک چند لمحے سوچتا رہا۔ اسے سوالات کی عادت تھی مگر جواب دینا تھوڑا مشکل تھا۔ "میں یہی جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔" وہ بالآخر بولا۔

"مگر فی الحال ہم مسٹر بیلر پر یقین کر رہے ہیں۔" نک نے اضافہ کیا۔

"کیا آپ مسٹر بیلر کی بات پر یقین نہیں رکھتیں؟" ایرک نے پوچھا۔ "یقیناً اس کی کوئی وجہ ہوگی۔"

"نہیں ایسا تو نہیں ہے۔" وہ بولی۔ "سچ بھی ہو سکتا ہے، بہت سے لوگ اس سے بہت زیادہ چڑتے بھی ہیں۔"

"ڈیموکریٹس یا پھر کیوکلکس قبیلے والے؟"

"یہ...... یہی ساری باتیں شکوک پیدا کرتی ہیں...... یہاں کیوکلکس کا کوئی بندہ موجود نہیں ہے۔"

"مگر آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہیں...... یہ بہرحال ایک خفیہ قبیلہ ہے۔"

"کتنا خفیہ...... میں نے ساری عمر میں ان کی موجودگی کے بارے میں نہیں سنا، میں یہاں کی پوسٹ مسٹریس ہوں اور میں نے بھی کچھ نہیں دیکھا...... میں بتا رہی ہوں کہ یہ صرف بکواس ہے۔"

"یعنی ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی نے بیلر کو پریشان کرنے کے لیے یہ سوانگ بھرا ہو؟"

"یہ ہو سکتا ہے مگر میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی

کہ کسی کو دن میں اتنا سوانگ بھر کر اسے پریشان کرنے کی کیا ضرورت ہے جبکہ وہ بہت رات گئے گھر لوٹتا رہا ہے اور اُس وقت اُس کی حالت بھی بہت خراب ہوتی ہے، تو اگر کسی کو کچھ کرنا ہی ہوتو اس وقت کیوں نہیں کیا گیا۔'' ایگنس کے سوال میں دم تھا۔

''ٹھیک ہے۔ کیا یہاں کوئی ایسا ہے جو بیلر سے مخاصمت رکھتا ہو؟''

''ہاں بہت ہیں، اگر تم لوگ ان سب سے بات کرنے لگے تو ہفتے لگ جائیں گے۔ اب یہ معاملہ صرف سیاست کا نہیں ہے، ان دونوں نے ہر معاملے کو جھگڑا بنادیا ہے، اگر صرف ایک پارک بھی بنانا ہو تو ان میں سے ایک اعتراض لے کر ضرور کھڑا ہو جائے گا...... یہ جھگڑا ہر چیز میں بڑھتا جا رہا ہے اور اسی لیے میں یہ کام کر رہی ہوں، جب ان کے اخبار بند ہو جائیں گے تو کچھ سکون ہوگا۔''

''آپ کی بات بالکل درست ہے۔'' نک بولا۔

''میں آپ سے صرف دو سوال اور کرنا چاہتا ہوں۔'' ایرک بولا۔ ''پہلا سوال یہ ہے کہ پوسٹ ماسٹر یا مسٹریس کو وفاقی حکومت کی طرف سے مقرر کیا جاتا ہے جو کہ یہاں ڈیموکریٹس کی چل رہی ہے تو پھر پاپولسٹ کی پبلشر کو کیسے اس کام کے لیے مقرر کیا گیا؟''

''اچھا سوال ہے۔'' وہ مسکرائی۔ ''میرے مرحوم شوہر کاؤنٹی ڈیموکریٹک پارٹی کے چیئرمین تھے۔ میں بھی ڈیموکریٹک تھی مگر اب میں پاپولسٹ ہو گئی ہوں یوں بھی یہاں پہلے ہی ایک ڈیموکریٹک اخبار نکل رہا ہے اور سچ بات یہ ہے......'' اس کی آواز سرگوشی میں بدل گئی۔ ''جیولیس ریکس ایک احمق گدھا ہے۔''

''یس...... میرا بھی یہی خیال ہے۔'' نک نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

''آخری سوال یہ ہے کہ بیلر اُس دن یہاں سے گزرا تھا کیا آپ نے اس کو دیکھا تھا اور واپسی میں اس بگھی کو جس میں وہ نہیں تھا؟'' ایرک نے پوچھا۔

''نہیں، ویسے بھی میں اس طرف دھیان نہیں دیتی مگر بدھ اور جمعرات خاص طور پر بہت مصروف دن ہوتے ہیں۔ بدھ کو لارنس کے بچے آتے ہیں جوری پبلکن کے لیے موجود خطوط وغیرہ لے جاتے ہیں اور کچھ بنڈل اخبار جو قصبے سے باہر موجود سبسکرائبرز کو بھیجے جاتے ہیں یعنی سالانہ خریداری والوں کو وہ دیے جاتے ہیں۔ جمعرات کو بوبی بیل ڈیموکریٹک کا یہی کام کرتا ہے، مجھے پھر وہ پیکٹ بھیجنے ہوتے ہیں۔''

''بہت شکریہ...... ایرک نے اس کے جواب پر سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے آپ کا بہت وقت لیا۔''

''کوئی بات نہیں مگر تم لوگوں کو قصبے سے جانے سے پہلے ایک بار یہاں آنا ہوگا۔'' وہ بولی۔ ''مجھے پاپولسٹ کے لیے تمہارا انٹرویو چاہیے اور آج کا قرض بھی اتارنا ہے۔''

''قرض......؟'' ایرک نے اس کی جانب دیکھا۔

''ہاں ابھی کھانا تیار نہیں مگر کل میرا خاص سوپ تیار ہوگا۔'' وہ مسکرائی۔

''بہت شکریہ ایگنس......'' ایرک مسکرایا۔ لعل ٹن میں آمد کے بعد پہلی بار کوئی اچھا جملہ سننے کو ملا تھا۔

باہر اندھیرا پھیل چکا تھا، وہ دونوں احتیاط سے قدم جماتے ہوئے چل رہے تھے۔ اچانک پیچھے سے آنے والی آواز نے انہیں چونکا دیا۔

''نک...... ایرک رکو......'' یہ ایگنس کی آواز تھی۔ وہ ہاتھ میں لیمپ لیے اپنے پورچ میں کھڑی تھی۔ وہ دونوں تیزی سے واپس مڑے۔

''کیا ہوا......؟'' ایرک نے پوچھا۔ ''کیا آپ کو کچھ اور یاد آ گیا ہے؟''

''نہیں، میرے پاس تمہارے لیے کچھ ہے...... ایک ڈیلیوری...... ویسے تو میں پوسٹ آفس کے اوقات کے بعد اس کا کوئی کام نہیں کرتی مگر تم لوگوں کے لیے میں نے خاص رعایت کی ہے۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑا لفافہ نک کی طرف بڑھایا۔

لفافے پر پلاسٹک چڑھا ہوا تھا۔ نک نے پلاسٹک اتار کر لفافے کو دیکھا اس پر سیاہ حروف میں ایرک اور نک سراغرساں لکھا ہوا تھا۔ لفافہ بہت ہلکا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس میں موتی نما کوئی چیز ہو۔

''شکر ہے کہ میں نے اسے ابھی دیکھ لیا اور تم لوگ مجھ سے ملنے آ گئے۔ ورنہ میں اس کا کیا کرتی۔'' ایگنس نے کہا۔ ''شاید یہ نامعلوم میل کے تھیلوں میں دفن ہو جاتا۔''

''یہ کہاں سے آیا ہے؟'' ایرک نے پوچھا۔

''یہ تم خود دیکھ لو...... یہ پورچ میں موجود تھا جب تم لوگ آئے تھے۔''

''وہی جو میں نے اینٹ کے نیچے سے نکال کر آپ کو دیا تھا۔'' نک نے پوچھا۔

''ہاں، ہاں وہی تو ہے۔'' اس کی نگاہیں بھی لفافے پر جمی تھیں جسے نک کھولنے ہی والا تھا جب ایرک نے اس کا

ہاتھ پکڑ لیا۔

"نک، ہم لیڈی کا بہت وقت لے چکے ہیں اور یہاں خاصی سردی بھی ہو رہی ہے۔ ہم اسے ہوٹل میں جا کر دیکھ لیں گے۔"

"نہیں مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" ایگنس نے کہا۔

ایرک نے نک کے ہاتھ سے لفافہ لے کر تہ کر کے جیب میں رکھ لیا اور پھر ایگنس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"بہت شکریہ...... مگر یہاں بہت ٹھنڈ ہے آپ اندر جائیں ہم کل آپ سے ملنے ضرور آئیں گے۔" اس نے سر جھکا کر کہا اور آگے بڑھ گیا۔

"اچھا۔" ایگنس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی صحافیانہ رگ پھڑک چکی تھی مگر اس کے پاس اب کچھ کہنے کو بچا نہیں تھا۔ "گڈ نائٹ کل ملتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ گھر کی جانب مڑ گئی۔ نک ایک لمحہ اسے جاتے دیکھتا رہا پھر بڑے بڑے قدم اٹھاتا ایرک کے قریب جا پہنچا جو کچھ آگے نکل گیا تھا۔ وہ مونچھوں تلے مسکرا رہا تھا۔

"نک بعض اوقات تم جذبات میں بہہ جاتے ہو۔" اس نے نرمی سے کہا۔ "تم اور میں دونوں جانتے ہیں کہ اس لفافے میں کیا ہے، ہے یا نہیں؟"

"یس۔" نک بولا۔

"لہٰذا تیز قدم اٹھاؤ اور ایسا بُرا شرمسار چہرہ بنانے کی ضرورت نہیں۔" وہ بولا۔

"یہ ٹھیک ہے۔" نک نے دانت نکال کر پوچھا۔

"ٹھیک تو بالکل نہیں مگر پہلے سے بہتر ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"جہاں تک میں سمجھ رہا ہوں کسی نے ہمیں دھمکانے کی کوشش کی ہے اور وہ ایسا شخص ہے جسے ہم جانتے ہیں اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ اس دھمکی کا واضح مطلب یہ ہے کہ اُسے ہم سے ڈر ہے...... اور یہ آپ پھر مسکرا رہے ہیں...... کیوں؟" نک نے پوچھا۔

"میں مسکرا رہا ہوں؟" ایرک نے معصومیت سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" نک نے کہا۔

"ہم جب اس گھر میں داخل ہوئے تو ہمیں اس کیس کا سر پیر سمجھ نہیں آ رہا تھا اور اب ہمارے پاس بہترین کلیو موجود ہے، کیا اس کے بعد مجھے مسکرانا نہیں چاہیے؟"

"بہترین کلیو؟ یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"سوچنے اور سمجھنے کے بعد...... تم بھی یہ کرو...... سمجھ جاؤ گے۔" ایرک نے متانت سے کہا۔

ہوٹل پہنچنے کے بعد ایرک نے وہ لفافہ کھولا۔ ان کے اندازوں کے عین مطابق لفافے میں پانچ پیلے بیج موجود تھے۔

"یعنی کیو کلکس موجود ہے؟" نک نے پوچھا۔

"یعنی تم عقل سے کام نہیں لے رہے...... سوچو اس صورتِ حال میں شرلاک ہومز دی گریٹ کیا کرتا......" ایرک نے کہا۔ "ہم اس دوران کھانا کھا لیتے ہیں۔" کھانے کے بعد وہ آرام سے بستر پر گر گیا۔

"اب ہمیں ان بیجوں پر بات کرنی چاہیے۔" نک نے پوچھا۔ "اگر ایسا ہے تو ہم یہاں محفوظ نہیں ہیں۔"

"اس وقت مجھے صرف نیند آ رہی ہے...... تھک بھی بہت گیا ہوں۔" ایرک بولا۔

"کمال ہے...... حالات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔" نک بگڑ کر بولا۔

"میں سوچ چکا ہوں۔" ایرک نے منہ پر تکیہ رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ نک چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر اس نے بڑھ کر دروازے کو لاک کیا۔ کمرے میں موجود صوفے کو گھسیٹ کر دروازے سے لگایا۔ کچھ دیر اس پر بیٹھ کر غور کرتا رہا، بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ نیند سے مزید جنگ اس کے بس کی بات نہیں ہے جس کے بعد وہ گرتے پڑتے بستر پر پہنچا اور نیند کی وادی میں گم ہو گیا۔

خواب میں کیو کلکس کے تلوار برداروں اور لہراتے ریوالوروں سے جنگ کے دوران اسے کئی بار ایرک کی آواز سنائی دی بالآخر کسی نے اسے زوردار طریقے سے جھنجوڑ ڈالا۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔ ایرک اس کے سامنے تھا اس کے ہاتھ میں کوئی اخبار نما چیز تھی۔ اس نے پھر آنکھیں بند کرنا چاہیں۔

"اٹھ جاؤ نک...... اب سونا نہیں ہے۔" ایرک بولا۔

"میں سویا نہیں ہوں، میں جاگ رہا ہوں۔" وہ دوبارہ نیند میں ڈوبتے ہوئے بولا۔

"فوراً کھڑے ہو جاؤ۔" اس بار ایرک نے جھٹکا دیتے ہوئے کہا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "بہت دیر سے نیند آئی تھی۔" وہ بولا۔

"یہ دیکھو...... اس اخبار کو دیکھو......" اس کے ہاتھ میں موجود اخبار کے پورے صفحے پر چھوٹے چھوٹے اشتہارات تھے۔

''یہ...... یہ کیا ہے؟''
''اشتہار ہیں اور یہی ہمارے سوال کا جواب ہیں۔'' وہ مسکرایا۔
''مطلب......؟'' نک نے اسے گھورا۔
''مطلب یہ کہ ہمیں پورے آٹھ بجے کہیں پہنچنا ہے، فوراً تیار ہو جاؤ۔'' وہ بولا۔
ہوٹل سے باہر نکلنے سے قبل ایرک لابی میں موجود لعل ٹن ری پبلکن کا تازہ شمارہ اٹھانا نہیں بھولا تھا جو وہاں ہر میز پر موجود تھا۔
جب وہ دونوں پوسٹ آفس پہنچے تو آٹھ بج چکے تھے۔ فرنٹ ڈور پر کلوز کی جگہ اوپن کا نشان موجود تھا۔
ایگنس لفافوں، ڈبوں اور پیکٹوں کو ان کی جگہ پر رکھ رہی تھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر وہ مسکرائی۔
''خوش آمدید دوستو......... تم لوگ میرے آج کے پہلے کسٹمر ہو...... ایسا تو نہیں کہ تم لوگ انٹرویو دینے کے خیال سے آئے ہو؟''
''گفتگو کے خیال سے۔'' ایرک بھی مسکرایا اور اشارے سے اجازت طلب کرتے ہوئے گھر میں داخل ہو گیا۔ نک اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے ایرک کے ساتھ سٹنگ روم نما جگہ میں داخل ہوا۔
''مجھے تو پتا نہیں تھا اس لیے سوپ تیار نہیں ہے۔'' ایگنس بولی۔ ''ہاں شام تک مل سکتا ہے۔''
''اس کے لیے انتظار کیا جا سکتا ہے۔'' ایرک مسکرایا۔ ''فی الحال کیا ہم یہاں کچھ دیر بیٹھ سکتے ہیں؟''
''بالکل بیٹھ سکتے ہیں۔ آرام سے بیٹھیے مگر مسز تھامسن کی نئی سلائی مشین کا خیال رکھنا ہوگا جو کل ہی منٹگمری سے آئی ہے۔''
''بالکل میڈم۔'' وہ بولا اور وہ دونوں مشین کے ڈبے کے دونوں اطراف میں سیٹی پر بیٹھ گئے۔
''ہم یہاں کیوں آئے ہیں، وہ بھی اتنی صبح صبح......'' نک نے سرگوشی میں پوچھا۔
''صبر کرو صبر......'' ایرک بولا۔ ''ایگنس مین نے آپ کا اخبار دیکھا، اس میں کافی اشتہار تھے...... بیلر بھی کہہ رہا تھا کہ پہلے اس کے پاس بہت اشتہار تھے، کیا یہ تعداد ایک چھوٹے سے قصبے کے اخباروں کے لیے زیادہ نہیں ہے؟''
''نہیں، کیونکہ مختلف قصبوں اور شہروں کے لوگ دوسرے علاقوں کے اخبارات خریدتے ہیں۔ میں اپنا بتا سکتی ہوں، میرے پاس ابھی ایک سو پچاس خریدار ہیں جو دوسرے قصبوں میں موجود ہیں۔ ان علاقوں کے اشتہار بھی مل جاتے ہیں جو دراصل کلاسیفائڈ ہوتے ہیں اور یہ سب لوگ وہی نہیں ہوتے ان میں اس علاقے کے بزنس، حکومتی ادارے، لائبریریز سب شامل ہوتے ہیں۔''
''اوکے۔'' ایرک نے سر ہلایا۔ اس سے قبل کہ وہ ایگنس سے صحافت کے کاروبار کے بارے میں اسٹیپ بائی اسٹیپ بلیو پرنٹ حاصل کرتا پوسٹ آفس کا دروازہ کھلا اور بیلر کے دونوں نوجوان اسسٹنٹ لوسی اور لارنس اندر داخل ہوئے۔ دونوں کے کاندھے پر کینوس کے بیگ تھے جن میں اخبارات کے رول موجود تھے۔ ایرک اور نک جس سیٹی پر بیٹھے تھے وہاں سے وہ صاف نظر آ رہے تھے مگر انہیں وہ دونوں نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ دونوں سیدھے ایگنس کی جانب بڑھے۔
''گڈ مارننگ مسز جونسن۔'' لوسی نے کہا۔
''مارننگ میم۔'' لارنس بھی بولا۔ انہوں نے تھیلوں سے اخبارات کے رولز نکالنے شروع کیے۔ ہر اخبار پر براؤن رنگ کا پیپر چڑھا ہوا تھا اور اس پر لینے والے کا پتا وغیرہ لکھا ہوا تھا۔ جب انہوں نے آخری پیپر میز پر رکھ دیا تب ایرک اپنی جگہ سے اٹھا۔
''شاید یہ آج کی آخری ڈیلیوری ہے...... ہے نا؟'' اس نے پوچھا۔
لارنس اور لوسی اس کی آواز پر پلٹے اور اسے سامنے دیکھ کر ساکت سے رہ گئے۔
''اوہ ڈرا دیا آپ نے......'' لوسی نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
''سوری، میرا یہ مقصد نہیں تھا۔'' ایرک نے کہا اور میز کے قریب کھڑا ہو گیا۔
''یہ ری پبلکن کے شہر سے باہر کے خریداروں کے اخبار ہیں؟'' اس نے پوچھا۔
''جی بالکل۔'' لوسی بولی۔ ''ہم نے قصبے میں ہر جگہ اخبار پہنچا دیا ہے۔ بس یہ آخری ڈیلیوری رہ گئی تھی۔''
''اب ہم گھر جا کر ناشتا کریں گے۔'' لارنس نے کہا۔
''اور گھر تو قریب ہے تمہارے والد ان دونوں میں سے ایک چرچ کے منتظم ہیں نا۔'' ایرک نے پوچھا۔
''جی بالکل۔'' لارنس بولا۔ لوسی چند لمحے خاموش کھڑی رہی پھر وہ ایرک کی طرف بڑھی۔

''سر آپ کی تفتیش کہاں تک پہنچی؟'' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ''کچھ معلوم ہوا؟''

''ہاں کافی حد تک۔'' وہ جواباً مسکرایا اور میز پر موجود اخبارات کے رولز میں سے ایک اٹھایا اور اسے نک کی جانب اچھال دیا جسے اس نے بہ آسانی کیچ کرلیا تھا۔

''ارے۔'' لوسی اور لارنس ایک ساتھ چیخ پڑے تھے۔

''نک اسے کھولو اور مجھے بتاؤ کہ اندرونی صفحات میں کیا ہے؟'' ایرک نے کہا۔

''اوکے۔'' نک نے جواب دیا۔ اخبار پر موجود براؤن کور پر کسی جون اسمتھ کا نام تھا اور پتے میں فلاڈیلفیا لاء اسکول لکھا تھا۔

''آپ لوگ یہ نہیں کر سکتے۔'' لوسی بولی۔ ''یہ ڈاک کے ساتھ چھیڑ چھاڑ ہے جو جرم ہے۔''

''یہ ابھی ڈاک میں گئے ہی نہیں ہیں۔'' ایرک بولا۔

''آپ ان سے کہیں۔'' لوسی اب ایگنس کی جانب مڑی۔ ''انہیں یہ اخبار واپس کرنا ہوگا۔''

''میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔'' ایگنس نے معصومیت سے سر ہلایا۔ ''یہ لوگ بھی تو تمہاری طرح بیلر کے لیے کام کررہے ہیں نا؟''

''وہ آپ کچھ نہیں کرسکتیں۔'' لوسی نے دانت پیسے اور نک کی جانب لپکی۔

نک نے اُسے اپنی جانب آتا دیکھ کر اخبار کا رول فوری طور پر کھولا اور اس کی جانب پیٹھ کر کے آگے بڑھنے لگا۔ ''آج کی مرکزی خبر جہاز کے ٹوٹنے کی ہے۔ کریبل کریک کے کان کنوں پر اداریہ لکھا گیا ہے...... موسم کی خبریں ہیں......''

وہ یہیں تک پہنچا تھا کہ لوسی نے جھپٹا مار کر اس سے اخبار چھیننا چاہا جس کے نتیجے میں اخبار کا کچھ حصہ نک کے ہاتھوں میں رہ گیا جبکہ باقی حصہ پھٹ کر لوسی کے ہاتھ میں آگیا۔ مگر جو حصہ نک کے ہاتھ میں بچا تھا، وہ سب کچھ واضح کرنے کے لیے کافی تھا۔

''یہ جو میرے ہاتھ میں ٹکڑے ہیں ان میں صرف اشتہار ہیں۔'' نک بولا۔ ''ایک اسٹو پالش کا ہے، یہ دوسرا بوسٹن کے انسٹی ٹیوٹ کا ہے اور تیسرا......''

''بس بس کافی ہے اب وہاں رکھی وہ کاپی اٹھاؤ جو ہم نے ہوٹل سے لی تھی۔'' ایرک بولا۔

نک نے ہاتھ میں موجود ٹکڑوں کو کوٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے اخبار کی کاپی کو اٹھایا۔

''اب یہ تو تم مجھے پڑھنے دو گی نا؟'' وہ لوسی کی طرف دیکھ کر بولا۔ اور اخبار کھول کر اپنے قد سے اونچا کر کے ایرک کو سنانے لگا۔ ''اس میں بھی جہاز ٹوٹنے، موسم اور کان کنوں کی خبریں ہیں مگر اس کے ساتھ نظمیں، لطیفے اور علی بابا چالیس چور کی داستان ہے، اس میں پورے صفحے کی جگہ صرف چار اشتہار ہیں۔''

''وہ بھی صرف مقامی...... ہے نا؟'' ایرک نے پوچھا۔

''بالکل۔'' نک نے سر ہلایا۔ اس دوران لوسی نک اور ایرک کو خونخوار نظروں سے گھورتی رہی۔

''دیکھا لوسی......'' لارنس بڑبڑایا۔ ''میں تمہیں کہہ رہا تھا کہ اس دفعہ یہ مت کرو۔''

''چپ رہو لارنس۔'' اس کی بہن نے اسے گھورا۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ یہ سب کیا ہے؟'' ایگنس نے پوچھا۔

''دراصل لعل ٹن ری پبلکن دو الگ انداز میں چھپ رہا ہے۔'' نک بولا۔ ''ایک جو یہاں قصبے میں ہوتا ہے اور دوسرا وہ جو یہاں سے ڈاک میں بھیجا جاتا ہے۔ دوسرے والے میں وہ سارے اشتہار ہوتے ہیں جو بیلر کے خیال میں اب اسے نہیں مل رہے۔'' نک نے کہا۔

''بیلر کا سارا کاروبار اس کے یہ دو اسسٹنٹ ہی چلا رہے ہیں۔ چھاپنا، پہنچانا، ڈاک میں بھیجنا...... شاید اسی حوالے سے انہیں بلکہ اگر کہوں کہ لوسی کو یہ آئیڈیا آیا ہوگا کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں۔ انہوں نے بیلر کو یہ ماننے پر تیار کیا کہ قصبے کے باہر سے ملنے والے سیکڑوں اشتہار بند ہوگئے ہیں اور اس کے پیسے خود رکھنا شروع کر دیے۔ ظاہر ہے کہ جو اشتہار دیتے ہیں، وہ انہیں پرنٹ کی شکل میں دیکھنا بھی چاہتے ہوں گے لہٰذا انہیں الگ سے سو دو سو کاپیاں چھاپنا پڑتی ہوں گی۔ پچھلے ہفتے جب بیلر خود پہنچ گیا اور ان کاپیوں کو لے کر فورٹ لوگن جانے لگا تو ان کا بھانڈا پھوٹنے کا خطرہ پیدا ہوگیا۔ جیسے ہی وہ اخبار کے اندر نظر ڈالتا، کھیل ختم ہوجاتا۔ اسی لیے ان کی کوشش تھی کہ وہ اخبار کھول کر نہ دیکھ سکے۔''

''اوہ تو کیا لارنس نے...... لارنس نے کیو کلکس قبیلے والا گیٹ آپ بنایا تھا......؟'' ایگنس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''نہیں...... ان کا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہوگا۔ مسئلہ

صرف یہ تھا کہ ان کے پاس وقت بہت کم تھا۔ دس یا پندرہ منٹ میں انہیں بیلر تک پہنچ کر اسے روکنا تھا اور وہ انہیں پہچان نہ پائے، یہ بھی کرنا تھا تو واحد راستہ یہی تھا کہ آٹے کے تھیلے یا تکیے میں آنکھوں کے سوراخ بنا کر پہن لیا جائے اس سے چہرہ وغیرہ تو چھپ گئے تھے، بیلر ان کے کپڑوں سے ان کو شناخت کرسکتا تھا اس لیے انہوں نے خود کو لبے لبادے میں چھپا لیا جو کہ شاید کوئی چادر ہو۔'' ایرک، نک کے چپ ہوتے ہی بولا۔

لوسی اس سب کے دوران چپ کھڑی رہی۔

''کیوں لارنس......؟'' نک اس کی جانب مڑا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' وہ منمنایا۔

''اوہ...... کیا اس نے تمہیں نہیں بتایا تھا؟'' ایرک بولا۔ اس کی اس بات پر لوسی نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔

''یعنی وہ کوئی اور تھا...... لارنس نہیں تھا؟'' ایگنس نے پوچھا۔

''نہیں مگر وہ ان کا پارٹنر تھا۔ سچ پوچھو تو مجھے ابھی کچھ دیر پہلے تک اس کا علم نہیں تھا مگر اب مجھے خیال آیا ہے کہ ''کیو کلکس'' قبیلے کا وہ جوان اپنی گن کو کیوں اس قدر چھپا رہا تھا کیونکہ اس کے چہرے اور کپڑوں کی طرح گن سے بھی اس کے پہچان لیے جانے کا خطرہ تھا۔ وہ ایک بڑا پرانا کولٹ ڈریگن ریوالور تھا جو کہ جولیس ریکس کے والد نے اپنے بیٹے کو دیا تھا اور وہ اسے اپنے دفتر میں رکھتا ہے، ہے نا؟'' ایرک کی نگاہیں لوسی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ''تم ریکس کے اسسٹنٹ کے ساتھ مل کر یہ کام کررہی تھیں بلکہ تم دونوں مل کر یہ سب کررہے تھے۔ یہاں تم اور وہاں لعل ٹن ڈیموکریٹ میں وہ ڈبل اخبار بنا رہے تھے تب ہی اس کے اشتہارات بھی نہ ہونے کے برابر رہ گئے ہیں۔ وہ بیل تھا جس نے راستے میں بیلر کو روکا اور اس نے اخبارات کا وہ بنڈل لوسی اور لارنس کو واپس لاکر دیا جنہوں نے اگلی صبح شہر جاکر اسے ڈاک میں ڈال دیا تب ہی وہ اخبار واپس بھی نہیں مل سکے۔''

لوسی اب بے بسی سے ایرک کو دیکھ رہی تھی جبکہ لارنس رونے والی شکل بنا چکا تھا۔

''آپ خوش نصیب...... ہو کہ آپ کے پاس کوئی اسسٹنٹ نہیں ہے۔'' ایرک نے ایگنس سے کہا جو منہ کھولے یہ سب سن رہی تھی۔

''اور نک تمہیں یہ سب کب معلوم ہوا؟'' ایگنس نے پوچھا۔

''میں ایرک ہوں ایگنس......'' اس نے پہلے اس کی تصحیح کرنا ضروری سمجھا پھر بولا۔ ''وہ خط جو تم نے کل ہمیں دیا تھا اس نے سب کچھ کھول دیا تھا۔ اس میں پانچ بیج موجود تھے جو کہ کہا جاتا ہے کہ کیوکلکس قبیلے کی جانب سے دھمکی کے طور پر بھیجے جاتے ہیں وہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ میں نے یہ بات بیلر کے دفتر میں کہی تھی جہاں لوسی اور لارنس بھی موجود تھے۔ اس معاملے میں ریکس پر بھی شک کیا جاسکتا تھا مگر وہ بیجوں والی روایت سے واقف نہیں تھا یہ تو صرف ایک بار شرلاک ہومز کے ناول میں استعمال ہوئی تھی۔'' ایرک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ناول میں؟ یعنی وہ سب سچ نہیں تھا۔'' لوسی بڑبڑائی۔

''نہیں...... ایک خیال تھا بس......'' نک بولا۔

''تم لوگوں کے والدین چرچ کے منتظمین ہیں، انہیں تم لوگوں کی اس حرکت سے کتنا دھچکا لگے گا...... یہ سب کیوں کیا تم لوگوں نے؟'' ایگنس نے لوسی سے پوچھا۔

''کیونکہ یہ دونوں اخبار بکواس ہیں۔'' لارنس بولا۔

''اور کسی حد تک آپ کا بھی......'' اس بار لوسی بولی۔

''صرف سیاست، جھوٹ، نفرت، لڑائیاں، مخالفت...... ہم اس طرح ایک نئے اور بہتر اخبار نکالنے کے لیے پیسے جمع کررہے تھے۔ ایک ایسا اخبار جو درحقیقت سچ لکھے۔''

''جی ہاں۔'' لارنس نے سر ہلایا۔ ''لعل ٹن کمیونسٹ۔''

وہ تینوں اُن دونوں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

نک اور ایرک اسی شام واپس روانہ ہوگئے تھے مگر انہیں لعل ٹن کی تمام خبریں ملتی رہی تھیں۔ وہ قصبہ اب بھی اسی طرح تھا اور کمیونسٹ نیوز پیپر کے بغیر چل رہا تھا۔ لعل ٹن ری پبلکن اور لعل ٹن ڈیموکریٹس کام کررہے تھے مگر اب ان کے پاس اسسٹنٹ نہیں تھے جنہیں اسی شام نوکری سے نکال دیا گیا تھا مگر ان پر کوئی جرم عائد نہیں کیا گیا تھا۔ دونوں مالکان جانتے تھے کہ ان کے قارئین کی بڑی تعداد چرچ کے منتظمین کے زیرِاثر ہے اس لیے ان کے بچوں کی غلطی کو معاف کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس صورت میں ان کے نقصان کی قسط دار بھرپائی بھی طے کردی گئی تھی۔ نک اور ایرک کو اس کیس میں کوئی فیس نہیں ملی تھی۔ لعل ٹن کے تینوں اخبار موسم کی رپورٹ کے نیچے ان کا مفت اشتہار چھاپتے تھے جو اُن کی طرف سے ان کا لائف ٹائم انعام تھا۔

❖❖❖

لمحوں کو خوش گوار اور لبوں کو مسکراہٹ سے ہمکنار کر دینے والی فنکاری کے داؤ پیچ

سلسلہ ہائے عیدی

یعقوب بھٹی

زندگی میں بہت سارے دن ایسے آتے ہیں... جو خوشی اور مسرت کے دن ہوتے ہیں... مگر کچھ خاص دن ایسے ہوتے ہیں جن کے آنے کی خوشی اور سرشاری سب پر بھاری ہوتی ہے... جی ہاں... وہ ہوتے ہیں رمضان المبارک اور اس کے بعد عید کا روایتی اور اسلامی تہوار... آپ کے جانے مانے کردار بھی انہی ایام سے گزر رہے ہیں... یہ اور بات کہ احساس مسرت اور عیدی کی تیاری کے انتظامات کا بوجھ ان دونوں کے ناتواں کندھوں پر تھا...

حشر انبالوی اپنی مخصوص کرسی پر اُکڑوں بیٹھے تھے۔ ٹانگوں کے دباؤ سے توند دونوں اطراف سے اس طرح نظر آرہی تھی جیسے غبارے پر درمیان سے دباؤ ڈال دیا گیا ہو...... اس پوزیشن میں عموماً ان کے سامنے امتحانی گتے میں پھنسا کاغذ اور ہاتھ میں قلم ہوتا تھا اور نگاہیں دفتر کی چھت سے لٹکتے مکڑی کے جالوں پر ہوتی تھیں اور عالمانِ بالا سے کچھ خاص ان کے دماغانِ ارفع و اعلیٰ پر لینڈ فرما ہو رہا ہوتا تھا مگر اس وقت صورتِ حال مختلف تھی۔ انہوں نے آج روزہ رکھا تھا اور سارے جہاں کی یتیمی چہرے پر سجائے

مسلسل ٹھنڈی آہیں بھر رہے تھے۔ میں ان آہوں کے اغراض و مقاصد سے بخوبی واقف تھا مگر جب یہ سلسلہ دراز ہونے لگا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ اب مزید فرار ممکن نہیں ہے۔ بالآخر میں نے پوچھ ہی لیا۔

''حشر صاحب! لگتا ہے کوئی یاد آ رہا ہے؟''

حشر صاحب کے آسن میں تو فرق نہیں آیا مگر چہرے کی یتیمی آواز میں منتقل ہو گئی۔ ''میاں! تمہاری دل و معدے میں اتر جانے والی چشمِ بے دید کو داد دینے کو جی چاہ رہا ہے۔ والدہ مرحومہ کی زندگی میں روزے کی فضیلت اور بڑھ جاتی تھی۔ ٹھیک یہی وقت ہوتا تھا جب افطاری کی تیاری شروع ہو جاتی تھی اور گھر پکوانوں کی مہک سے بھر جاتا تھا۔'' انہوں نے ایک اور زوردار آہ بھری۔ ''آج یہ وقت آ گیا ہے کہ محض لسّی کے ایک عدد بانس جیسے دبلے گلاس اور رات کی باسی روٹی سے سحری کی ہے اور افطاری کے لیے غالباً کسی مسجد کی صف پکڑنی ہوگی یا پھر کسی مخیر کے افطار دستر خوان پر کچے پکے چاول چبانے ہوں گے۔''

ان جذباتی مکالموں کا مقصد میرے جیب کی طرف جانے والا راستہ ہموار کرنا تھا...... جہاں بار کونسل کی طرف سے موصول ہونے والا ایک مختنی سا لفافہ موجود تھا۔ ہر سال کی طرح اس دفعہ بھی مستحق وکلا میں، میرا نام نمایاں تر رہا تھا۔ حشر صاحب نے اس لفافے کے لیے متعدد چکر بار کونسل کے لگائے تھے مگر یہ لفافہ زیرِ دستخطی مسٹر گل نواز ایڈووکیٹ کے ہی جاری ہو سکتا تھا یعنی بقلم خود......

حشر صاحب جانتے تھے کہ یہ لفافہ سیدھا گل کی عید شاپنگ فنڈ کی نذر ہونے والا تھا۔ اسی سبب لڑنے، جھگڑنے کے بجائے انہوں نے دوسرا ہتھکنڈا آزمایا تھا۔ میں نے مکمل بے نیازی سے کہا۔

''آپ افطاری سے پہلے اپنا رخ مبارک سیدھا میمن مسجد کی طرف کر لیجیے گا۔ جامِ شیریں ملا دودھ، خوش رنگ کھجوریں اور انواع و اقسام کے کھانے آپ کے منتظر ہوں گے...... ویسے صبح آپ کی زوردار ڈکار کے سبب آفس کی فضا مکدر رہی تھی۔ یہ نہاری کی اوور ڈوز کے سبب تو نہیں تھا؟''

حشر صاحب نے بڑی شد و مد سے نفی میں سر ہلایا۔ ''تمہاری حسِ شامہ کو زبردست دھوکا ہوا ہے۔'' پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ ''مگر اتنا زبردست دھوکا ممکن تو نہیں ہے...... غالباً پچھلے سال انہی دنوں میں بار کونسل والے لفافے سے حصہ بقدرِ جثہ جو آیا تھا اسی سے نہاری کھائی تھی۔

عین ممکن ہے اسس کا کوئی بچ جانے والا حصہ وجود کی تاریکیوں سے اُبھر کر معدے میں آ گرا ہو، تمہاری بات درست ہو سکتی ہے۔''

میں نے لفافے والی جیب پر دوسرا ہاتھ بھی دھر دیا۔ ''کوہان اور توند میں فرق ہوتا ہے حشر صاحب! اور ویسے بھی آپ کا سلسلہ نسب اگر ڈارون کے نظریے کو مان بھی لیں تو کہیں بھی جا کر اونٹ جیسے مقدس جانور سے نہیں ملتا اور پچھلے سال تو کیا اس سے پچھلے سال بھی اس لفافے سے آپ کے حصے میں کچھ نہیں آیا تھا۔ ندیدی نگاہوں کے زاویے کسی اور طرف موڑ دیں۔ یہ لفافہ آپ کی ہونے والی اکلوتی بہو کی امانت ہے۔''

داؤ خالی جاتے ہی حشر صاحب بھڑک اٹھے۔ ''میاں! میرے خون، پسینے سے تم اور تمہاری لاڈلی گلچھرے اڑاؤ اور میں مسجدوں میں افطاری کروں۔ مجھے یہ کسی صورت منظور نہیں ہے۔ نکالو جیب سے لفافہ اور یہاں رکھ دو۔''

میں نے اطمینان سے ٹانگیں میز پر رکھیں۔ ''اس لفافے میں آپ کا خون پسینہ کہاں سے آ گیا اور اپنی زبان درست فرمائیں...... منگیتر یا محبوبہ کے لیے لاڈلی کا لفظ قطعی غیر مناسب ہے۔''

حشر صاحب اَن سنی کرتے ہوئے دہاڑے۔ ''مت بھولو...... تمہاری وکالت میرے سبب چل رہی ہے ورنہ اس دفتر میں اُلّو بول رہے ہوتے۔''

میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''تو آپ کی موجودگی میں کون سی بلبلیں اور فاختائیں بول رہی ہیں۔ دن میں آپ اور رات میں اُلّو ہی بولتے ہیں۔''

حشر صاحب نے غصے سے تھرتھراتے ہوئے دھوتی کے اوپر پتلون چڑھانے کی کوشش کی تو دونوں ٹانگیں ایک ہی طرف ڈال بیٹھے۔ میں نے ہنسی کو بمشکل کنٹرول کیا۔ طیش اور بے بسی اُن کے چہرے پر گڈمڈ ہو گئی۔ ایک ٹانگ نکالتے ہوئے انہوں نے اعلان کیا۔

''میاں! ابھی اور اسی وقت میرے بقایاجات ادا کرو! تمہاری نوکری اور تمہاری تشریف پر لات مار کر ہم جا رہے ہیں۔'' انہوں نے درست پتلون چڑھائی اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

اس سے زیادہ غصہ حشر صاحب کے لیے مناسب نہیں تھا۔ تشریف پر لات کی تو خیر تھی مگر میرے پاس واجبات ادا کرنے کی سکت نہیں تھی جو نجانے حشر صاحب کتنے نکال

بیٹھتے۔ مجبوراً مجھے پسپائی اختیار کرنا پڑی۔

لفافے میں سے سکہ رائج الوقت پانچ ہزار روپے ان کی عمرو عیار کی زنبیل جیسی جیب میں منتقل ہوئے تو وہ سب کچھ بھول گئے اور چہرے کی بشاشت بھی لوٹ آئی۔ مجھے نماز کی تلقین کرتے ہوئے وہ ظہر کی نماز پڑھنے کے لیے دفتر سے نکل گئے۔

ان کے جاتے ہی میں نڈھال سا اس لفافے کو تکنے لگا جس میں باقی ماندہ بیس ہزار روپے گل کے منہ میں زیرے سے بھی کم تھے۔ ماہِ رمضان کے آغاز کے ساتھ ہی کچہری کی رونقیں بھی برائے نام رہ گئی تھیں۔ اس صورتِ حال میں کسی کلائنٹ کی آمد کی امید بھی کم ہی تھی۔ سوچتے سوچتے مجھے خیال آیا کہ کیوں نا ان کلائنٹس سے ریکوری کی جائے جو مختلف کیسوں میں باقی ماندہ فیس دبائے بیٹھے تھے۔ اس خیال نے مجھے پُرجوش کر دیا۔ حشر صاحب کی آمد سے پہلے میں نے چند نام شارٹ بھی کر لیے۔

حشر صاحب آئے تو اس تجویز نے انہیں اور بھی پُرجوش کر دیا وہ بولے۔ ''میاں! کلائنٹس کے ساتھ ساتھ ہمارا ایک اور بھی نادہندہ ہے...... آغاز اسی سے کرتے ہیں۔''

میں نے بے ساختہ پوچھا۔ ''کون سا؟''

انہوں نے شفاف سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''روانی میں منہ سے ''ہمارا'' نکل گیا ہے۔ ورنہ وہ صرف میرا ہی نادہندہ ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تو وہ خبر ہے جو روزنامہ ''کالا وسیاہ'' کی شہ سرخی ٹھہرے گی...... کون ہے وہ ذاتِ شریف؟''

حشر صاحب مسکرائے ''تاج تونسوی...... کالا وسیاہ کا مالک! قطعوں کی بقایاجات کی مد میں اس کی طرف بیس ہزار سے اوپر ہی نکلتے ہیں۔''

میں نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ ''اسے نچوڑیں گے بھی تو کچھ نکلنے والا نہیں ہے۔''

حشر صاحب پُریقین رہے۔ ''نئی حکومت نے اشتہارات سے خوب نوازا ہے...... آج تمہیں تونسوی کو بھی نچوڑ کر دکھاتے ہیں۔''

میں نے ان کے الفاظ پر غور کیا۔ ''بھی سے کیا مراد ہے؟ اس سے پہلے کسے نچوڑ چکے ہیں؟''

ہنسی روکنے کی کوشش میں ان کی توند تھرتھرانے لگی تو مجھے بھی ان کی بات کی سمجھ میں آ گئی۔ میں نے غصے سے کہا۔ ''بائیک میں پیٹرول آپ ڈلوائیں گے...... میں ایک پیسہ نہیں دوں گا۔''

حشر صاحب کا موڈ خوشگوار رہا۔ ''اس کا انتظام ہو جائے گا۔ تم بھاگ کر آقائے بجلی کو میرا سلام بولو اور پانچ سو پکڑ لاؤ۔''

میں نے انہیں گھورا۔ ''وہ میرا سر پھاڑ دے گا۔''

پانچ ہزار وصولی بالجبر کے سبب حشر صاحب کی طبیعت کی جولانیاں عروج پر تھیں۔ بڑے تحمل سے بولے۔ ''آقائے بجلی المعروف بے دم اختر صاحب کا ٹی اسٹال پھیل کر کینٹین بن چکا ہے اور روزہ خوروں کی آماجگاہ بھی۔ اسے کہنا کہ اس حوالے سے روزنامہ کالا وسیاہ میں صبح شہ سرخی لگنے والی ہے۔ اسے رکوانے کے لیے اس کے استادِ محترم جا رہے ہیں۔''

میں نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا۔ ''بس، بس...... آپ کا روزہ مکروہ ہو جائے گا...... میں سمجھ گیا ہوں۔''

حشر صاحب نے پتلون اتاری اور دھوتی سمیٹ کر پرانے آسن میں بیٹھتے ہوئے بولے۔ ''جلدی سے آجاؤ، میں اتنے میں قطعہ مکمل کر لوں۔ اس کے بھی دام کھرے کرتے آئیں گے۔''

میں، آقائے بجلی کے آستانے پر پہنچا تو دنگ رہ گیا۔ وسیع جگہ قناتوں سے گھری ہوئی تھی۔ اندر درجن بھر سے زائد میزیں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ اکثر میزوں پر بریانی چل رہی تھی اور آقائے بجلی کے دو بھتیجے اور ایک بیٹا بڑی مستعدی سے آرڈر سرو کرنے میں مصروف تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی باچھیں پھیل گئیں اور پان سے رنگے دانت نمایاں ہو گئے۔ اس نے جلدی سے کاؤنٹر کے نیچے سے حساب، کتاب والا رجسٹر نکالا اور اسے کھولتے ہوئے بولا۔

''میاں! لگتا ہے آج کوئی موٹا مرغا پھنسا ہے۔''

حشر صاحب کی شاگردی اختیار کرنے کے بعد وہ، مجھے، انہی کے انداز میں مخاطب کرنے لگا تھا۔

میں نے بغور اسے دیکھا۔ ''نہیں، کوئی خاص موٹا نہیں ہے۔''

اس نے دھیان نہیں دیا۔ اس کی نظریں رجسٹر پر تھیں۔ وہ جس خوش فہمی کا شکار ہوا تھا، اسی میں ڈوبے ہوئے گویا ہوا۔

''آپ کے ذمے پانچ ہزار، چھ سو اور چالیس روپے ہوئے ہیں...... شکر ہے آپ خود ہی دینے آ گئے۔ بجلی کے بل کی بھی آخری تاریخ تھی۔''

میں نے رجسٹر بند کرتے ہوئے کہا۔ ''آقائے بجلی!

یہ جان کر تم پر بجلی ہی گر جائے گی کہ یہ تمہاری نوزائدہ کینٹین کل شہ سرخیوں میں ہوگی۔"

بجلی نے بھویں اچکائیں۔ "کیوں میاں! یہ نواب زادہ کینٹین کیا کسی کی دیوار پھلانگ گیا ہے۔" ساتھ ہی اس نے اپنی زبردست حسِ مزاح کی دانت نکالتے ہوئے گویا مجھ سے داد چاہی۔

نواب زادہ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بھی میں نے سنجیدگی برقرار رکھی۔ "اس سے بھی مزید بڑھ کر سمجھو، روزہ خوروں کی جنت کے عنوان سے روزنامہ کالا و سیاہ کل کے روزنامے میں تمہاری نوٹوں سے سرخ کینٹین پر سیاہی ملنے والا ہے۔"

بجلی نے تنک کر کہا۔ "مجھے ذرا بھی پروا نہیں ہے۔ ضلعی حکومت نے لاری اڈے کے ساتھ ساتھ کچہری کینٹینوں کو بھی رمضان ایکٹ سے مشتبہ (مستثنیٰ) قرار دیا ہے۔ یہاں بھی مختلف کیسوں کے سلسلے میں دور دراز سے لوگ آتے ہیں اور وہ روزہ نہیں رکھ سکتے۔"

میں نے بریانی اُڑاتے لوگوں پر طائرانہ نظر ڈالی۔ "اخبار والے جب کیمروں کے ساتھ آ کر ان روزہ خوروں کے شناختی کارڈ دیکھیں گے تو نوے فیصد مقامی نکلیں گے۔ اس کے بعد ضلعی حکومت مشتبہ قرار دینے کے باوجود تمہیں بمع بریانی کے پتیلے سمیت ٹرالی میں ڈالے تھانے کی سمت رواں دواں ہوگی اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ تم پتیلے کے نیچے ہو۔"

بجلی کے دانت فوراً چھپ گئے اور چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ اگلے لمحے وہ قدرے سنبھالا لے کر پوچھ بیٹھا۔ "یہ وہی شاہ کالا اخبار نہیں جس میں استاد محترم قطعہ لکھتے ہیں۔"

میں نے فوراً اثبات میں سر ہلایا تو اس کے چہرے پر رونق لوٹنے لگی۔ وہ کاؤنٹر کے عقب سے نکلتے ہوئے بولا۔ "تو پھر استاد محترم سے بات کرتا ہوں۔ وہ خبر کو دبوا دیں گے۔"

میں نے جلدی سے کہا۔ "تم سے زیادہ فکر تمہارے استاد کو ہی ہے۔ ہم خبر دبوانے کے لیے ہی جا رہے ہیں مگر بائیک میں پیٹرول نہیں ہے۔"

بجلی کا چہرہ باقاعدہ دمک اٹھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر جنریٹر کے عقب سے ایک ڈیڑھ لیٹر پیٹرول کی بوتل برآمد کر کے میری طرف بڑھائی۔ "استاد محترم کی خدمت میں حقیر سا نذرانہ۔"

میں نے بوتل تھامتے ہوئے کہا۔ "اور بائیک کا آئل بھی تو پرانا ہو چکا ہے۔ بدلے بغیر اسٹارٹ نہیں ہوگی۔"

بجلی، میرا مطلب جان گیا۔ مردہ ہاتھوں سے اس نے دراز سے ایک پرانا سا پانچ سو کا نوٹ نکالا تو میں نے کہا۔ "خدا کا خوف کرو یار آئل کا ڈبا ساڑھے سات سو کا ہو گیا ہے۔"

بادلِ ناخواستہ اس نے تین سو اور دیے اور میں بوتل سنبھالے واپس آ گیا۔

آفس میں حشر صاحب بالکل اس مرغی کے مانند پھولے بیٹھے تھے جو ابھی ابھی تخلیق کے عمل سے فارغ ہوئی ہو۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ قطعہ مکمل ہو چکا ہے۔ میں نے کہا۔ "سلسلہ ہائے وصولی عیدی پر نکلنے سے پہلے دماغانِ اعلیٰ میں جو وارد ہو چکا ہے...... نکال پھینکیں! میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

"میاں! پہلے ذرا شاگرد رشید کی بابرکت کمائی ادھر ارسال فرما دیں۔ ہم اپنے ہاتھوں سے تمہارے نابنجار بائیک میں پیٹرول ڈلوائیں گے۔"

بوتل میں پہلے ہی ٹینکی میں انڈیل چکا تھا۔ میں نے کہا۔ "کیوں اپنا روزہ مکروہ کرنے پر تلے ہیں۔ یہ مکروہ فعل میرے ہاتھوں ہی مناسب رہے گا۔"

انہوں نے میرا چہرہ پڑھا اور اپنے شاگرد رشید کی کمائی سے دستبردار ہوتے ہوئے قطعے کی طرف آئے۔

اوپر والے اکثر تو وزیر ہو گئے
جو رہ گئے وہ مشیر ہو گئے
باقی بچے سفید پوش اور غریب
اول لیر و لیر، آخر فقیر ہو گئے

قطعہ حالاتِ حاضرہ کا عکاس تھا۔ میں نے بے اختیار داد دی تو حشر صاحب مزید پھول گئے۔ کرسی کے عقب سے نکلتے ہوئے وہ بولے۔ "اچھا ہے تو ابھی چل کر اس کے دام کھرے کرتے ہیں۔"

بائیک پر میں تقریباً ٹینکی پر سوار رہا تھا۔ میرے اور حشر صاحب کے درمیان ان کی توند پڑی ہوئی تھی۔

روزنامہ کالا و سیاہ کا دفتر ایک پلازا کی چوتھی منزل پر تھا۔ لفٹ نجانے کب سے خراب تھی۔ اس کی خرابی سے حشر صاحب واقف تھے۔ اسی سبب انہوں نے پہلے ہی رخ سیڑھیوں کی طرف کر لیا تھا۔ نیم تاریک اور پان کی پیکوں سے آلودہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے حشر صاحب بُری طرح سے ہانپنے لگے تھے۔ تیسری سے چوتھی منزل تک مجھے توند سمیت انہیں سہارا دینا پڑا تھا۔

دفتر ایک ہال پر مشتمل تھا۔ جہاں چند اسکرینوں پر مختلف لائیو نیوز چینل آرہے تھے۔ ان کے سامنے بیٹھے دو آپریٹران خبروں سے مزید خبریں کشید کرکے الفاظ کے الٹ پھیر کے ساتھ کل کے روزنامے کی کچی کاپی بنانے میں مصروف تھے۔ کالا و سیاہ، نمائندوں کے بجائے انہی سے چل رہا تھا۔ شام میں البتہ مقامی صحافی چائے کے ایک کپ کی قیمت پر جھوٹی، سچی مقامی خبریں بھیج آجاتے تھے۔

ہال کے ایک کونے میں لوہے کے فریم اور شیشے سے بنا ایک پرانا کیبن تھا جس میں تاج تونسوی بیٹھتے تھے۔ اخبار کے مالک وایڈیٹر وہی تھے۔ امتدادِ زمانہ سے کیبن کے شیشے اس قدر دھندلے ہو چکے تھے کہ اندر بیٹھے تونسوی صاحب نگاہوں سے اوجھل تھے۔

دروازہ کھول کر ہم اندر داخل ہوئے۔ شیشے کے ٹاپ والی نئی میز کے عقب میں شاپر چڑھی نئی ریوالونگ چیئر پر تونسوی صاحب اس شان سے براجمان تھے کہ ان کا استخوانی ہاتھ ایک پینتیس سالہ دوشیزہ کے ہاتھ میں تھا اور وہ ہاتھ پر جھکی بڑے انہماک سے کچھ دیکھ رہی تھی۔ تونسوی صاحب کے چھدرے بال اور مونچھیں بھی رنگی ہوئی تھیں اور بانس جیسے جسم پر ڈھنگ کا لباس نظر آرہا تھا اور چہرہ ہزار دولٹ کے بلب کے مانند چمک رہا تھا۔ اس دخل درنامعقولات پر تونسوی صاحب کے چہرے پر برہمی نمودار ہوئی مگر ہمیں دیکھتے ہی پیشانی پر نمودار ہونے والی سلوٹیں اس طرح غائب ہو گئیں جیسے ہمارے حکمرانوں کی آئی ایم ایف کے وفد کے استقبال کے وقت ہوتی ہیں۔ میک اَپ اور جدید تراش کے لباس نے عمر کی گاڑی کو واپس دھکیلنے کی جان توڑ کوشش میں مصروف دوشیزہ کا رنگ بھی یقیناً میک اَپ کی تہ کے عقب میں اُڑ گیا تھا۔ حشر صاحب نے بلند آواز میں سلام کیا اور بولے۔ ”یہ کیا چل رہا ہے تونسوی؟ لگتا ہے چوتھی شادی کی لکیر ڈھونڈی جارہی ہے۔“ انہوں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ دونوں میں باہمی بے تکلفی تھی۔

دوشیزہ نے شرما جانے کی اداکاری کی...... تونسوی صاحب...... کھسیانی ہنسی کے ساتھ بولے۔ ”نہیں یار! دولت کی لکیر ڈھونڈی جارہی ہے۔ کم بخت ہاتھ آہی نہیں رہی۔ یہ نئی سیکریٹری مہرو خان ہے۔ انہیں دست شناسی کا دعویٰ تھا۔ میں نے کہا۔ ”ڈھونڈ دو لکیر!“ ساتھ ہی انہوں نے مہرو کو اشارہ کیا۔ وہ ہمیں سلام کرتی ہوئی تیزی کے ساتھ آفس سے نکل گئی۔

تونسوی صاحب گرگِ باراں دیدہ تھے۔ ہماری آمد کا مقصد بھانپ چکے تھے مگر بدِمقابل بھی حشر انبالوی تھے جو تونسوی صاحب کو نچوڑنے کے پکے ارادے سے آئے تھے اور اسی لہر میں وہ بے دھیانی کے عالم میں تونسوی صاحب کے عین سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اگلے ہی لمحے ان کے منہ سے تیز سسکاری نکلی اور وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ چہرے پر خجالت آمیز طیش نمودار ہوا۔ ان کا ہاتھ تیزی سے کمر سے نیچے گیا مگر پھر شرمندگی کے سبب واپس لوٹ آیا۔ دراصل اس قدیمی کرسی کے لکڑی کے تختوں کے درمیان خلا تھے۔ لچک کے سبب بے دھیانی کا مظاہرہ کرنے والوں کو یہ کرسی بڑے زور سے کاٹتی تھی۔

تونسوی صاحب کی مونچھیں پھڑ پھڑا اٹھیں۔ تونسوی صاحب کی کوشش ہوتی تھی کہ ناپسندیدہ مہمانوں کو اسی کرسی پر بٹھایا جائے۔ حشر صاحب واقفِ حال تھے اور اکثر دونوں مل کر شکار کرتے تھے اور لطف اندوز ہوتے تھے مگر آج اپنے ہی دام میں صیاد آگیا تھا۔

تونسوی صاحب دلی مسرت چھپاتے ہوئے بولے۔ ”احتیاط سے بھئی، تمہیں تو اس شکنجے کا پتا ہی ہے۔“

حشر صاحب دوسری کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں صورتِ حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ تونسوی صاحب میری طرف متوجہ ہوئے۔

”دوگل میاں! تم کیوں کھڑے ہو...... آؤ بیٹھو۔“ ان کے انداز میں شرارت تھی۔

میں نے کہا۔ ”شکریہ! میں یہیں ٹھیک ہوں۔“

وہ ہنسے اور تیسری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہاں بیٹھ جاؤ۔“

میں احتیاط سے دیکھ بھال کر اس کرسی پر بیٹھ گیا۔ حشر صاحب مسلسل پہلو بدل رہے تھے۔ ان کی تکلیف دبے چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ اسی کیفیت میں وہ سیدھا اصل مدعے کی طرف آئے۔

”تونسوی! میں آج اپنا حساب صاف کیے بغیر یہاں سے ہلنے والا نہیں ہوں۔“

تونسوی صاحب نے اطمینان سے ریوالونگ چیئر سے پشت لگائی۔ ”تمہیں ہلنے کو کہہ بھی کون رہا ہے۔ روزنامے کے حالات تمہارے سامنے ہیں، پرنٹنگ اور کاغذ کے اخراجات......

حشر صاحب نے آگ بگولا ہو کر طنزیہ انداز میں بات کاٹی۔ ”حالات تو دیکھ ہی رہا ہوں۔ اس سے پہلے کہ اشتہارات کا سارا فنڈ تم اپنی عیاشیوں پر لگادو، نکالو میرے

بقایاجات جو پچاس ہزار سے اوپر ہی بنتے ہیں۔''
تونسوی صاحب کو جیسے بچھو نے ڈنک مارا۔ ''کون سی عیاشیاں...... تم قسطوں پر لیے فرنیچر کو عیاشی میں شمار کر رہے ہو؟'' انہوں نے باقاعدہ آنکھیں نکالیں۔
میں نے کھنکھار کر مداخلت کی۔ ''حشر صاحب کا اشارہ غالباً نئی سیکریٹری کی تقرری کی طرف تھا۔''
حشر صاحب بھی اسی طرف پلٹے۔ ''اس کی تنخواہ کہاں سے دو گے؟ ہاتھ کی لکیروں سے شروع ہونے والا کھیل تمہیں منکر نکیر تک لے جائے گا۔''
تونسوی صاحب کو مجبوراً پچھلے قدم پر جانا پڑا۔ ''مہرو، کام سیکھنے کی غرض سے آئی ہے۔ تنخواہ والا کوئی سلسلہ نہیں ہے۔''
حشر صاحب کے لہجے میں طنز اور بڑھ گیا۔ ''کام یعنی صحافت...... تم صحافت سکھاؤ گے اور بدلے میں پامسٹری سیکھو گے یعنی حساب برابر۔''
میں نے دوبارہ مداخلت کی۔ ''ویسے تونسوی صاحب! آپ کے دہن مبارک سے ''مہرو'' کتنا اچھا ہے۔ سنتے ہی کانوں میں نقرئی گھنٹیاں سی بجنے لگتی ہیں۔ آپ کے منہ میں تو ملائی سی گھل جاتی ہوگی۔''
حشر صاحب حلق پھاڑ کر ہنسے۔ ''بچے! دائی سے پیٹ نہیں چھپتا۔ صاف نظر آرہا ہے تم ایک نیا گل کھلانے جا رہے ہو۔''
تونسوی صاحب نے خفگی آمیز بے بسی سے ہمیں دیکھا پھر ہارے ہوئے جواری کے مانند پوچھا۔
''روزہ۔ تم دونوں کا ہی ہوگا؟''
ہمارا جواب اثبات میں سنتے ہی بولے۔ ''معاف کرنا، تمہاری باتوں سے دل اتھل پتھل ہو گیا ہے۔ شربت دل بہار ضروری ہو گیا ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے میز کے نیچے سے ایک پلاسٹک کی بوتل نکالی جس میں سرخ سا محلول تھا۔ یقیناً یہی شربتِ دل بہار تھا۔ حشر صاحب نے معنی خیز انداز میں کہا۔
''یہ شربت یقیناً مہرو نے اپنے نازک ہاتھوں سے بنایا ہوگا۔''
تونسوی صاحب نے زچ ہو کر کہا۔ ''اس بے چاری کی جان چھوڑ بھی دو۔'' ساتھ ہی انہوں نے بوتل براہِ راست منہ سے لگالی۔ انہیں ڈھب پر آتا دیکھ کر حشر صاحب نے مجھے بھی آنکھ سے اشارہ کیا اور خود بھی خاموشی اختیار کر لی۔

میں دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا کہ تونسوی صاحب اتنی آسانی سے قابو میں کیسے آگئے۔ آج لگتا تھا حشر صاحب کی قسمت کا ستارہ زمین کے محور میں اتر آیا تھا مگر میری غلط فہمی جلد ہی دور ہو گئی۔ تونسوی صاحب چکنے گھڑے تھے۔ دو گھونٹ لے کر انہوں نے احتیاط سے بوتل کو ڈھکن لگایا اور اسے میز کے نیچے رکھتے ہوئے بولے۔
''دیکھو ابا لوبی! تم بقایاجات والا قصہ دماغ سے نکال دو تو اگلے ہفتے تمہیں پانچ ہزار کی ادائیگی ممکن ہو سکتی ہے، وہ بھی اشتہارات کی متوقع آمدنی سے ہی ممکن ہو سکے گی۔ میں کوئی وعدہ نہیں کر رہا۔''
حشر صاحب لحظہ بھر کے لیے تو ششدر رہ گئے مگر پھر فوراً ہی سنبھلے۔ ''پانچ ہزار شربتِ مہرو'' کے لیے رکھ لو۔ ہم جا رہے ہیں۔''
تونسوی صاحب نے مصنوعی افسردگی سے کہا۔ ''کیا کہہ سکتا ہوں۔ تم حالات کو سمجھ ہی نہیں رہے۔''
حشر صاحب کی طرح میں نے بھی کرسی چھوڑ دی۔ حشر صاحب بولے۔
''حالات دیکھتے ہوئے تو میں نے شربت مہرو کے لیے پانچ ہزار چھوڑے ہیں۔ اس غریق ہوش شربت کے خواص کے بارے میں کچھ جاننا چاہو گے؟'' رمزیہ انداز نے تونسوی صاحب کو چونکایا مگر سر سے بلا ٹلتی دیکھ کر زبردستی کی بشاشت کے ساتھ بولے۔
''کچھ پوشیدہ خواص ہیں تو بتاتے جاؤ۔''
حشر صاحب کے لہجے میں انگارے سلگ رہے تھے مگر وہ ٹھنڈے ٹھار انداز میں بولے۔ ''میرے چندا! آج گھر واپسی پر جوان بیٹے گھسیٹیں گے...... منکوحہ جو غالباً اس اخبار کی اصل مالک بھی ہے باقی ماندہ بال نوچے گی...... بیٹیاں گیٹ سے باہر پھینکیں گی تو غم غلط کرنے کے لیے یہی شربت تمہارے کام آئے گا۔''
تونسوی صاحب کے چہرے پر گھبراہٹ آمیز طیش ابھرا۔ ''سٹھیا گئے ہو کیا؟ کیا بکواس کیے جا رہے ہو؟''
حشر صاحب اطمینان سے بولے۔ ''تمہارے کرتوتوں کی خبر ملتے ہی اہلِ خانہ ممکن ہے اس سے زیادہ برا سلوک کریں۔ نوشاد کالونی 2-6 میں ہی ہے نا تمہارا گھر...... پچھلے سال جہاں روزہ افطار کروایا تھا تم نے؟''
تونسوی صاحب کے چہرے پر پسینہ نمودار ہوا۔ مجھے لگا کہ ان کے بادشاہ پر اکا آگرا ہے۔ ان کی بیٹھی ہوئی آواز ابھری۔ ''تم سے اس گھٹیا بلیک میلنگ کی امید نہیں تھی۔''

حشر صاحب نے ہتھیلی آگے پھیلائی۔ ''ساڈا حق ایتھے رکھ!''

تونسوی صاحب نے دوبارہ شربتِ دل بہار کے دو گھونٹ لیے۔ ''بیٹھو! کچھ کرتا ہوں تمہارا۔'' آواز ڈوبی ہوئی سی تھی۔

حشر صاحب بے دھیانی میں دوبارہ اسی کرسی پر بیٹھنے لگے مگر میری ٹانگ بروقت حرکت میں آئی...... کرسی کیبن کی دیوار سے جا لگی۔ حشر صاحب پشت کے بل گرے۔ اس سے پہلے کہ طوفان کا رخ میری طرف ہوتا، میں نے جلدی سے انہیں سہارا دے کر کھڑا کرنے کی کوشش کی۔

''معافی چاہتا ہوں حشر صاحب! اس دفعہ شاید آپ ''چکی'' برداشت نہ کر پاتے۔''

تونسوی صاحب منہ کھول کر ہنس رہے تھے۔ حشر صاحب نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ میں نے معصوم سی صورت بنائی۔ میرا فعل بے شک خلافِ تہذیب اور بدتمیزی کے زمرے میں آتا تھا مگر حشر صاحب نے میری نیت پر غور کیا اور طوفان کا رخ تونسوی صاحب کی طرف ہو گیا۔

کھڑے کھڑے مذاکرات کا ایک راؤنڈ ہوا۔ تونسوی صاحب فوری دس ہزار دینے پر رضامند تھے اور حشر صاحب پچاس سے کم پر راضی نہیں تھے۔ آخر کار میری ثالثی میں پچیس ہزار پر سودا ہو گیا۔

تونسوی صاحب نے کپکپاتے ہاتھوں سے چیک سائن کیا۔ اس دوران ان کی نظر حشر صاحب کے کوٹ کی اوپری جیب میں رکھے کاغذ پر پڑی۔ انہوں نے چیک پکڑاتے ہوئے کہا۔

''آج دا قطعہ...... ایتھے رکھ!''

حشر صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس کا سودا نقد ہو گا۔'' ساتھ ہی انہوں نے پہلا مصرعہ پڑھ دیا۔

تونسوی صاحب کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی مگر وہ مردہ سے لہجے میں بولے۔ ''آج تک کا حساب صاف ہے...... یہ قطعہ آج ہی کے حساب میں شمار ہو گا۔''

حشر صاحب نے قطعی انداز میں کہا۔ ''تمہاری مرضی ہے۔'' ایک دفعہ پھر مختصر سے مذاکرات ہوئے اور قطعہ کے بدلے مزید پندرہ سو حشر صاحب کی جیب میں منتقل ہو گئے۔

ہم سیڑھیاں اتر رہے تھے تو ہر قدم پر حشر صاحب ''ہائے'' کرتے تھے۔ ساتھ ہی انہوں نے کمر پر بھی ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ ہائے کا سبب ''چکی'' بھی ہو سکتی تھی اور چکی

کوہ پیمائی کا جدید انداز!

دو روٹی کا سوال ہے بابا!

سے بچانے کی وجہ بھی...... خیر حشر صاحب کو نیچے خیریت سے لانے کی کوشش میں، میں ہانپ گیا۔

بائیک پر بیٹھتے ہوئے حشر صاحب نے حاتم طائی کی روح کو شرمندہ کرتے ہوئے پندرہ سو میری جیب میں ٹھونستے ہوئے کہا۔

''ہمارے خون، پسینے کی کمائی حاضر ہے۔'' ساتھ ہی انہوں نے ٹھنڈا سانس لیا۔

میں نے بدک کر کہا۔ ''خون، پسینے کی آپ رکھ لیں...... پچیس ہزار بظاہر مالِ حرام ہے مگر اسے نکلوانے میں میرا بھی خون، پسینہ شامل ہے۔ وہ میری جیب میں ڈال دیں۔''

''میاں! خواب وہ دیکھو...... جو آنکھوں میں بھی سمائے......'' ان کا ہاتھ میری جیب کی طرف بڑھا۔ ''نہیں چاہیے تو واپس لے لیتے ہیں۔''

میں نے جیب پر ہاتھ رکھا اور وقتی پسپائی اختیار کی۔ حشر صاحب نے کراہتے ہوئے کہا۔

''ریکوری مشن کل تک ملتوی سمجھو! اور آفس کی راہ لو......!''

بائیک چلاتے ہوئے میرا موبائل مسلسل وائبریٹ ہو رہا تھا۔ یقیناً یہ کال گل کی طرف سے تھی۔ ٹریفک کے شدید دباؤ کے سبب میں نے کال لینے کا فیصلہ مؤخر کر دیا۔

بلڈنگ کے نیچے میں نے بائیک روکی تو حشر صاحب کمر پر ہاتھ رکھے آفس کی طرف روانہ ہوئے۔ میں نے فوراً موبائل نکالا۔ گل کی تین مسڈ کالز لگ چکی تھیں۔ میں نے جوابی کال کی تو اس کی ناراضگی بھری آواز ابھری۔

''کہاں تھے؟''

میں نے اسے مختصراً ریکوری مہم اور تونسوی صاحب کے آفس کا احوال سنایا تو وہ ہنس دی۔ اس کا موڈ خوشگوار ہونے میں دیر نہیں لگی پھر بولی۔

''اچھا ہے مزید ریکوری کر لو! کل میں نے اپنی دوستوں کو افطار، ڈنر پر انوائٹ کیا ہے۔ تمہاری جیب خاصی ہلکی ہو جائے گی۔''

مجھے لگا جیسے میرے کان سنسنا اٹھے ہیں۔ حلق خشک ہو گیا۔ میری جانب سے خاموشی محسوس کرتے ہی گل نے کہا۔

''کیا ہوا کیا انہیں منع کر دوں؟ اس کا لہجہ دوبارہ سے بدلنے لگا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

''کیوں، میں نے کب کہا...... تمہاری دوست سر آنکھوں پر......''

اس کے لہجے کی بشاشت لوٹ آئی۔ ''خبردار! آنکھیں قابو میں رکھنا۔ میری دوست محض تمہاری تصویریں دیکھ کر ہی تمہیں فلرٹ قرار دے چکی ہیں۔''

''تمہیں تو دیکھنے کی اجازت ہے نا؟''

میرے لہجے کے سبب گل کا رنگ یقیناً سرخ ہو گیا ہوگا۔ اس نے شرگیں لہجے میں کہا۔

''ہاں، مگر زیادہ نہیں۔''

میں نے زوردار قسم کی ٹھنڈی سانس لی تو گل نے مزید کہا۔

''گاڑی بھی بک کرا دینا...... میرے ساتھ چار مزید لڑکیاں ہیں۔''

میں نے ڈوبتے دل کو بمشکل سنبھالتے ہوئے مصنوعی بشاشت سے کہا۔ ''شریعت میں تو شاید چار کی اجازت ہے۔''

''میں تمہارا سر توڑ دوں گی...... اور کپڑے ذرا ڈھنگ کے پہن کر آنا......'' اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے وہیں کھڑے، کھڑے معروف ہوٹل کا افطار ڈنر نیٹ پر سرچ کیا تو میرا سر گھومنے لگا...... علاوہ ٹیکسز پر ہیڈ پینتیس سو...... قدم گھسیٹتے ہوئے میں نے سیڑھیوں کا رخ کیا تو میرے دماغ میں ایک منصوبہ پروان چڑھنے لگا۔

میں آفس میں داخل ہوا تو حشر صاحب کھڑکی کھولے کھڑے تھے۔ میں نے کہا۔

''آپ بھول گئے ہیں کہ روزہ محض بھوکے مرنے کا نام نہیں ہے۔ آنکھوں کا بھی روزہ ہوتا ہے۔''

انہوں نے کھڑکی بند کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے دماغانِ خر میں کچھ مثبت تو آ نہیں سکتا ...... ہم سورج کی پوزیشن سے مغرب کے باقی ماندہ وقت کا اندازہ لگا رہے تھے۔''

یقیناً بحث طول پکڑ جاتی مگر اسی وقت بجلی آفس میں داخل ہوا...... اس نے ہمیں آتا دیکھا تھا اور اب اپنے پیٹرول اور آٹھ سو کے بدلے ہماری کارکردگی جاننے کا خواہش مند تھا۔ اسے دیکھتے ہی حشر صاحب نے چہکتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔

''آؤ، شاگردِ من وتن و پیٹرولیم...... بصدقہ پاپوش مبارک حاتی وزیرون!''

کچھ سمجھ نہ آنے کے باوجود اتنے القابات سے

نوازے جانے پر بجلی پھول گیا اور دانت نکالتے ہوئے بولا۔ ''شا...... کالا والوں کو میری کٹنگ سے کیا تکلیف ہوگئی تھی استادِ محترم! ان کا کانٹا نکال آئے آپ؟''

''تم جس راہ کے مسافر ہو...... اب تمہاری راہ کا ہر کانٹا تمہارے استاد نے ہی نکالنا ہے...... تمہاری شاعری کی دھوم کالا وسیاہ تک جا پہنچی ہے۔'' حشر صاحب نے بے پر کی مزید چھوڑی...... اس کا ایڈیٹر بھی شاعر ہے۔ پیشہ ورانہ چشمک کے سبب اور تو کچھ نہیں کر پایا...... تمہارے کٹنگ کے درپے تھا۔ وہ پوری رپورٹ ہم بقلم خود اپنے ہاتھوں سے پھاڑ کر آئے ہیں اور آئندہ کے لیے اسے تائب ہونے پر بھی مجبور کر دیا ہے۔''

بجلی نے فرطِ عقیدت سے بڑھ کر حشر صاحب کے ہاتھ چومے...... آپ نے احسان کا ایک اور کوہِ فغاں (گراں) شاگرد کے کندھوں پر لاد دیا ہے۔''

حشر صاحب نے اسے ٹوکا۔ ''اپنی زبان پر دھیان دو! شاگردِ المناک! کوہِ آہ و فغاں کندھوں پر نہیں سر پر لادا جاتا ہے اور تم استاد کی کمر اور کندھے دبا کر اس کا وزن بھی کم کر سکتے ہو۔''

معذرت کر کے بجلی فوراً ہی اس خدمت کے لیے کمر بستہ ہوگیا۔ حشر صاحب کرسی پر براجمان ہو گئے اور میں میز کے عقب میں جا بیٹھا۔ بجلی کے ہاتھ حشر صاحب کے کندھوں پر ماہرانہ انداز میں چلنے لگے تو حشر صاحب نے آنکھیں موندتے ہوئے کہا۔

''پورا رمضان گزرنے کو ہے...... کچھ نیا نہیں سنایا تم نے......''

بجلی کے چہرے پر شرگیں مسکراہٹ نمودار ہوئی......

''حضور رات ہی کچھ شیر (شعر) اترے ہیں...... آپ کی نذر کرتا ہوں۔''

حشر صاحب کے ساتھ میں نے بھی...... ''ارشاد...... ارشاد......'' کا نعرہ لگایا تو بجلی گویا ہوا۔

چائے کا رنگ سانولا سا ہے

میں گرہ لگانے سے خود کو روک نہیں پایا۔

دودھ میں پاؤڈر زیادہ ملایا ہے

شاگردِ المناک اور استادِ غضب ناک نے مجھے گھور کر دیکھا اور حشر صاحب گرجے......

''میاں! اپنی اوقات دیکھو! جس کے شعر پر تم نے گرہ لگانے کی جرأت کی ہے...... اس کے قد و قامت سے واقف ہو......؟ فیض و فراز آج حیات ہوتے تو اپنی مسندیں اس عظیم شاعر کے لیے خالی کر کے شاعری سے توبہ فرماتے اور صحرا نوردی اختیار کر لیتے۔ اس گستاخی کی معافی مانگو!'' یہ کہتے ہوئے ان کی توند کی تھرتھراہٹ نمایاں تھی۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ حقیقی جذبات کو کتنی مشکل سے مقید کیے بیٹھے تھے۔ میرے معافی مانگنے پر بجلی کا موڈ قدرے بحال ہوا تو اس نے شعر مکمل کیا۔

چائے کا رنگ سانولا ہے

ضرور اس نے کیتلی میں جھانکا ہے

میری اور حشر صاحب کی واہ...... واہ...... اور مکرر...... مکرر نے بجلی کے چہرے پر رنگ بکھیر دیے۔ حشر صاحب فرطِ جذبات سے گویا ہوئے۔

''آج تم نے رخِ مبارک اچھے سے دھویا ہوتا تو ہم یقیناً روزے کے باوجود تمہارا منہ چوم لیتے۔''

میں نے کہا۔ ''کولر میں پانی موجود ہے...... رخِ مبارک دھلایا جا سکتا ہے۔''

''نہیں یہ فرض ہم روزہ افطاری کے فوراً بعد انجام دیں گے......'' ساتھ ہی انہوں نے مجھے کن انکھیوں سے اشارہ کیا تو میں نے فوراً کہا۔

''تو پھر ٹھیک ہے آج کی افطاری کی سعادت آقائے بجلی...... حاذق شعراء کے حصے میں آئی۔''

اس کے بعد ایک شاندار افطاری کے صدقے میں ہمیں ایک شاہکار غزل...... سننا پڑی اور اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے پڑے۔

بجلی افطاری کے انتظامات کے لیے رخصت ہوا تو ہم بہت دیر تک ہنستے رہے۔

☆☆☆

اگلے دن ہم حکیم اشرف فولاد کے مطب جا پہنچے...... دروغ برگردن علاقہ مکیں...... حکیم صاحب خاندانی باورچی تھے مگر باہر شاندار بورڈ پر حکیم ابن حکیم اشرف فولاد لکھا تھا اور آگے نامعلوم ڈگریوں کے نام تھے۔

ایک مریض با عمر ساٹھ سال...... بہ شوق عقدِ ثانی...... حکیم صاحب کے نسخہ خاص کی بدولت گھوڑی پر سوار ہونے سے پہلے چار کندھوں پر سوار ہوگیا تھا۔ لواحقین نے حکیم صاحب کے خلاف ایف آئی آر درج کروا دی تھی۔ حال ہی میں، میں نے ان کی ضمانت کروائی تھی جس کے بعد وہ طے شدہ فیس کا نصف سے زائد دبائے بیٹھے تھے۔

مطب میں اس وقت ویرانی تھی۔ صرف ایک تنومند مریض حکیم صاحب کے قریب رکھے اسٹول پر بیٹھا تھا اور

اس کے مرض کا بیان سنتے ہوئے حکیم صاحب، اپنی سرخ مہندی سے رنگی داڑھی میں انگلیاں پھیر رہے تھے۔ ہم، انہیں یقیناً ورلڈ بینک کے نمائندوں کی صورت نظر آئے تھے جو قرض کی قسط کا تقاضا کرنے آئے تھے۔ واضح طور پر ان کا رنگ اُڑ گیا۔

حکیم صاحب کا ہاتھ چونکہ مریض کی جیب کی طرف جا رہا تھا۔ اسی لیے ہم سلام کرکے ایک طرف کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ حکیم صاحب نے مریض کی کیفیت سنی اور پھر فرمایا۔

فکر نہ کرو! ہم مرض کو گاجر کے مانند وجود کی زمین سے نکالتے ہیں اور ایسے، ایسے کتر دیتے ہیں۔'' انہوں نے ہاتھ سے چھری چلائی۔

حشر صاحب دھیرے سے بڑبڑائے۔ ''انداز تو باورچی والا ہی ہے۔''

مریض منمنایا...... ''حکیم صاحب! میں بچ تو جاؤں گا نا؟''

حکیم صاحب نے فرمایا۔ ''تھا تو مشکل مگر تم حکیم ابن حکیم اشرف فولاد کے پاس آگئے ہو...... تمہارا بچ جانا اتنا ہی یقینی ہے جیسے پھیکا حلوہ دیگ میں بچ جاتا ہے۔''

اس دفعہ مجھے بھی ان کے باورچی ہونے کی سند جاری کرنا پڑی۔

تھوڑی دیر میں مریض دواؤں کا پلندا لے کر رخصت ہوا۔ حکیم صاحب نے فیس اور دواؤں کی رقم مکمل آڑ میں اس طرح وصول کی کہ کوشش کے باوجود ہمیں رقم کا اندازہ نہ ہوسکا۔

مریض کے بعد حکیم صاحب روکھے انداز میں ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ ''گل صاحب! کیسے آنا ہوا...... خیریت تو ہے نا......؟''

میں نے کہا۔ ''آپ کی ضمانت خطرے میں ہے...... اسی لیے حاضر ہوا ہوں۔''

حکیم صاحب پر مطلق اثر نہیں ہوا...... بولے۔ ''مرحوم کے لواحقین سے میرا راضی نامہ ہوچکا ہے تو پھر خطرہ کیسا؟ پیشی پر وہ میرے حق میں بیان دے دیں گے...... ہم گاجر اور آلوؤں کے مانند یکجا ہوچکے ہیں۔''

میرے لیے یہ اطلاع نئی اور کسی صدمے سے کم نہیں تھی۔ میں نے فوراً پینترا بدلا...... ''یہ تو خوشی کی خبر ہے مگر آپ کے علم میں لے آؤں کہ مجریہ ایکٹ انسدادِ عطائیت 1988ء اس طرح کے کسی کیس کے ساتھ لگا ہو تو قابلِ راضی نامہ نہیں ہوتا۔''

حکیم صاحب اُچھلے۔ ''عطائیت...... ہم خاندانی حکیم ہیں...... حکیم ابن حکیم...... یہ بات بوٹی، بوٹی جانتی ہے۔''

''بے شک...... بے شک مگر جج صاحب یہ بات نہیں جانتے...... آپ کی ڈگریوں کی تصدیق ہوگی اور ابن حکیم کے دعوے کی تصدیق کے لیے شجرہ نسب کھنگالا جائے گا۔''

اس دفعہ حکیم صاحب کچھ ڈھیلے پڑے تو میں نے مزید کہا۔

''کچھ قانونی موشگافیاں ہیں...... جن کی مدد سے اس مسئلے کو ٹالا جاسکتا ہے اور آپ باعزت بری ہوسکتے ہیں۔ لیکن......'' میرے ادھورے فقرے نے حکیم صاحب کو بے چین کردیا۔

''لیکن کیا گل صاحب!''

میں نے کہا۔ ''یہ تو دفتر تشریف لائیں گے تو اس بارے میں بات ہوگی...... آپ فکر نہ کریں آپ کو تو ہم اس کیس سے ایسے نکال لیں گے جیسے باورچی دیگ میں سے اپنے حصے کا قورمہ نکال لاتا ہے۔''

مثال حکیم صاحب کو پسند آئی۔ چہرے کی رونق بحال ہوئی اور دوبارہ سے داڑھی میں انگلیاں چلاتے ہوئے بولے۔

''یہ بات ہے تو میں کل ہی حاضر ہوتا ہوں......''

اس دوران میں حشر صاحب جو خاموشی سے مکالمہ سن رہے تھے، بولے۔ ''ضرور تشریف لائیں مگر آپ کی ضمانت کو جو خطرہ......'' انہوں نے فقرہ ادھورا چھوڑا تو حکیم صاحب نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔

''آپ کے ضمانتی مچلکے چونکہ جعلی تھے۔ رجسٹرار آفس میں ان کی پڑتال شروع ہوچکی ہے اور ہماری فیس کے معاملے میں بھی آپ نے بے پروائی برتی ہوئی ہے۔''

حکیم صاحب کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ ''اس سلسلے کو رکوائیں گل صاحب! ہم...... میں فیس والا مسئلہ حل کرتا ہوں......''

حشر صاحب نے دوبارہ دخل دیا۔ ''اور رجسٹرار آفس کو کیسے سنبھالیں؟''

اس سے پہلے کہ حکیم صاحب کو ہارٹ اٹیک ہوجاتا، میں نے کہا۔ ''کچھ دے دلا کر اسے بھی سنبھال لیتے ہیں۔''

تھوڑی دیر بعد ایک اچھی خاصی رقم میری جیب میں منتقل ہوچکی تھی اور میں بڑی آسودگی محسوس کر رہا تھا۔ حکیم صاحب نے مردہ سی آواز میں پوچھا۔

"میں اب بے فکر ہو جاؤں نا گُل صاحب؟"
مجھ سے پہلے حشر صاحب گویا ہوئے۔ "بالکل...... بالکل...... آپ ایسے آرام کریں جیسے باسی سالن کوڑے کی باسکٹ میں......"
حکیم صاحب کی بھویں تنیں تو میں نے گھور کر حشر صاحب کو دیکھا۔ حشر صاحب بوکھلا گئے۔
"شاید مثال غلط ہوگئی ہے...... ہمیں چلنا چاہیے۔"
ہم مطب سے نکلے تو میں نے حشر صاحب سے کہا۔
"آئیں آپ کو شاپنگ کروادوں......"
حشر صاحب کے قدم وہیں جم گئے۔ "میاں! لگتا ہے مجھے کانوں کا علاج کروانے کے لیے واپس ابن حکیم کے پاس جانا پڑے گا...... میں یہ کیا سن رہا ہوں؟"
میں ہنسا...... وہ مرغی کے مانند آپ کی کھال اتار دے گا اور گاجر، مولی کی طرح چھیل دے گا...... آپ نے بالکل درست سنا ہے۔" حشر صاحب نے اچنبھے سے مجھے دیکھا۔ میں نے ان کے کندھے پر بازو پھیلایا۔
"آپ میرے اکلوتے بزرگ ہیں...... گُل نے آج اپنی دوستو کے ساتھ، ساتھ ہمیں بھی افطار ڈنر پر بلایا ہے...... اس پرانے کوٹ کے ساتھ جاتے آپ اچھے لگیں گے؟"
حشر صاحب کے نقوش گداز ہوگئے۔ "میاں! اس جذباتی داؤ کے بعد ابن حکیم سے ہونے والی وصولی تمہیں معاف کی جاتی ہے۔"
میں نے زبردستی پانچ ہزار ان کی جیب میں ڈالے۔
"نہ شرمندہ کریں حشر صاحب!"
حشر صاحب نے بے یقینی سے پانچ ہزار کے نوٹوں کو دیکھا اور انہیں شادیِ مرگ ہوتے ہوتے بچا۔
مہنگے باربر کی دکان سے ہم دونوں تیار ہو کر نکلے تو پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ میں بھی ڈھنگ کے لباس میں تھا اور حشر صاحب تو کرتے پاجامے میں بالکل کوئی نواب لگ رہے تھے۔
افطاری شاندار لان میں تھی۔ گُل کی دوستوں کی ستائشی نظریں بار بار میری طرف اٹھ رہی تھیں۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے گُل نے زور سے میرے بازو پر چٹکی لی۔
"اتنا تیار ہو کر آنے کی کیا ضرورت تھی؟ آج شادی تو تھی نہیں تمہاری......"
میں نے کہا۔ "ارادہ بنتے کتنی دیر لگتی ہے...... تمہارا نہ سہی...... تمہاری کسی دوست کا تو بن سکتا ہے۔"
"یہ منہ دھو رکھو......"
"اور کتنا دھوؤں؟"
گُل کی توجہ اچانک حشر صاحب کی طرف ہوئی۔ "انہیں لانے کی کیا ضرورت تھی...... ایک بزرگ کی موجودگی میں کھل کر ہنسی مذاق بھی نہیں ہو سکتا......"
"انہیں لانے کی تو سب سے زیادہ ضرورت تھی۔"
"کیا مطلب......؟"
"ہم...... میرا مطلب ہے کہ ہمارے اکلوتے بزرگ ہیں۔ ان کے بغیر یہ بابرکت افطاری پھیکی سی رہ جاتی۔"
گُل چپ سی ہوگئی تو میں نے کہا۔
"کھانے کے بعد تم لوگ آئس برگ" پہنچو! میں، حشر صاحب کو ڈراپ کر کے آتا ہوں...... ہنسی مذاق وہاں ہو جائے گا۔"
گُل خوش ہوگئی۔ "یہ ٹھیک ہے۔"
میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "اور میں نے منہ بھی تو میٹھا کرنا ہے۔"
وہ سرخ ہوئی...... "فی الحال آئسکریم سے کرلینا۔"
اس کے ساتھ ہی وہ لہراتی ہوئی دوستوں کی طرف چلی گئی۔
افطاری کے بعد پُرتکلف ہونے سے لطف اندوز ہو چکے تو حشر صاحب واش روم کی طرف چلے گئے۔ میں اسی موقع کی تلاش میں تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔
"تو پھر آؤ لڑکیو! آئس برگ پر ملتے ہیں چھوٹی سی بریک کے بعد۔"
گُل سمیت اس کی دوستوں نے تالیاں بجا کر اس اعلان کا خیر مقدم کیا اور باہر کی طرف چل دیں۔ میں نے کاؤنٹر پر بیٹھے اسسٹنٹ منیجر کی طرف رخ کیا اور اس کی خلیقانہ سی مسکراہٹ کے جواب میں کہا۔
"بل...... انکل ادا کریں گے...... میں مہمانوں کو چھوڑنے جا رہا ہوں......"
وہ حشر صاحب کو ہمارے ساتھ دیکھ چکا تھا...... مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "ویلکم سر!"
گُل وغیرہ کو گاڑی میں بٹھانے کے بعد میں نے بھی پارکنگ سے بائیک نکال لی۔ میں جانتا تھا کہ حشر صاحب اپنی جمع پونجی ہمیشہ اندرونی جیب میں سینے کے ساتھ لگا کر رکھتے تھے۔
اس کے بعد حشر صاحب نے میرا جو حشر کیا، اس کے بارے میں جاننے کے لیے اگلی عید کا انتظار کریں۔"

❖❖❖

قسط نمبر 22

دہر

حسام بٹ
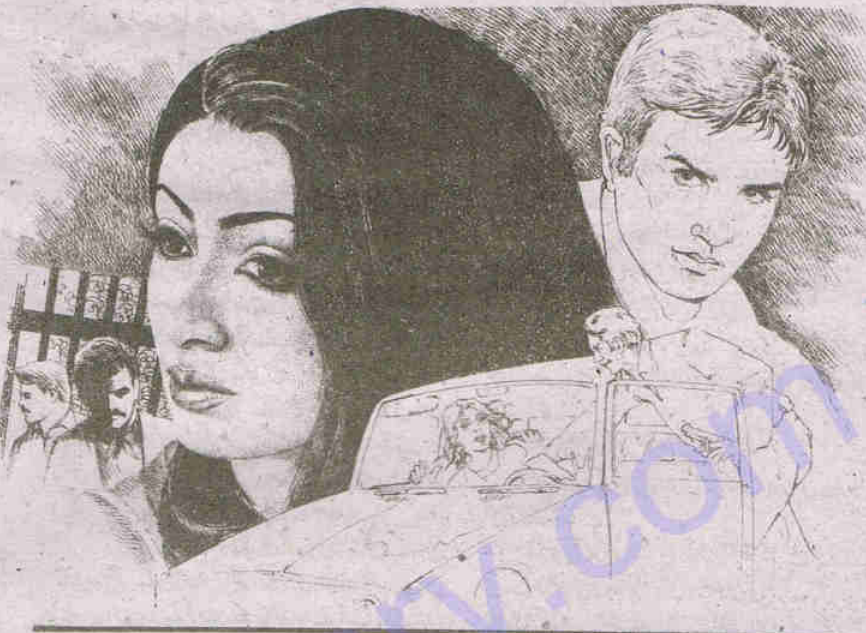
کامیابی اسی کو ملتی ہے جو ثابت قدم اور مستقل مزاجی سے اپنی منزل کی جانب گامزن رہتا ہے۔ وقت کی ایک بے رحم، سفاک کروٹ نے اس کے جیون میں بھی زہر گھول دیا تھا۔ ناکردہ جرم کی پاداش میں اس کا لڑکپن اور جوانی قید و بند کی صعوبتوں کی نذر ہوگئیں۔ زمانہ اسیری نے ایک طرف اس کے دل و دماغ پر صدمات کے ان مٹ نقوش چھوڑے تو دوسری جانب اس نے علم و ہنر کا بحر بے کنار اپنے وجود میں سمیٹ لیا۔ اس نے آزاد عملی میدان میں قدم رکھا تو نت نئے دشمنوں سے اس کا سابقہ پڑا۔ جلد ہی اس پر منکشف ہوا کہ خالق نے اسے زمینی خداؤں کی سرکوبی کے لیے تخلیق کیا ہے۔ مقصد حیات واضح ہوا تو اس نے خود کو منشائے قدرت کے سامنے سرنگوں کردیا۔ اس کار زار فنا و بقا کی آبلہ پا جدوجہد میں ایک دل نشیں مہ جبیں اس کی رفیق سفر ٹھہری۔ اپنے اطراف میں پھیلی شوریدہ لہروں کو برداشت کرتے ہوئے اس کا سفر جاری تھا جہاں یہودیوں کا سازشی ذہن دنیا پر حکمرانی کا اپنا خواب شرمندۂ تعبیر کرنا چاہتا تھا۔

چند لمحوں میں زندگی بدل دینے والے عیار ذہنوں کی ہوش ربا حیلہ سازیاں

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

جاسم کا تعلق ایک متوسط طبقے سے تھا۔ لڑکپن میں قدم رکھنا قیامتِ صغریٰ کا پیغام ثابت ہوا۔ اس کے والد قاسم باری نے مقامی غنڈوں کے خلاف پولیس کی مدد کی تو یہ چھوٹی سی فیملی طوفان کی زد میں آگئی۔ ایک رات اسی گینگ کے چند لوگوں نے گھر میں گھس کر جاسم کی والدہ اور والد پر قاتلانہ حملہ کر دیا جس میں ماں ہلاک ہوگئی اور شدید زخمی باپ کو پرائیویٹ اسپتال پہنچا دیا گیا۔ قاسم کا علاج شروع کرنے کے لیے پانچ لاکھ کی ضرورت تھی۔ جاسم نے مدد کے لیے اپنے اکلوتے ماموں جلیل کی طرف دیکھا۔ جلیل نے اس شرط پر رقم کا انتظام کر دیا کہ جاسم کو ایک ناکردہ جرم کی پاداش میں کچھ عرصے کے لیے جیل جانا پڑے گا۔ جاسم کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے ماموں کی بات مان لی۔ اپنے باپ کی زندگی بچانے کے لیے وہ تیرہ سال کی عمر میں آٹھ سال کے لیے جیل چلا گیا۔ قید و بند کی اس زندگی میں دو افراد نے اہم کردار ادا کیا۔ ان میں سے ایک چھٹا ہوا بدمعاش مراد علی تھا جسے سب دادا کہتے تھے۔ دوسرا کارل مارکس کا پیروکار ایک صحافی انور بیگ تھا جو کامریڈ کہلاتا تھا۔ دادا اور کامریڈ ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن دونوں ہی کی جاسم پر گہری نگاہ تھی۔ وہ جاسم کی بپتا سے واقف تھے اس لیے وہ اپنے اپنے نظریات کے مطابق اس کی ذہنی اور جسمانی تربیت میں لگ گئے۔ کامریڈ نے جاسم کی زبان کو تلوار اور دادا نے اس کے ہاتھ پاؤں کو موت کی للکار بنا دیا۔ دادا نے اپنے بندوں کے ذریعے پتا لگا لیا تھا کہ جاسم کے والدین کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے پیچھے راجو نامی ایک گینگسٹر کا ہاتھ ہے اور یہ بھی کہ جلیل ماموں نے جاسم کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ اس نے پانچ لاکھ اپنی جیب میں ڈالے اور قاسم باری کو مرنے کے لیے چھوڑ کر کہیں غائب ہوگیا تھا۔ دادا اتنا طاقتور بدمعاش تھا کہ وہ جیل میں بیٹھ کر بھی باہر کے معاملات کو چلاتا رہتا تھا۔ جلیل تو منظر سے ہٹ چکا تھا لیکن راجو تک پہنچنے کے لیے دادا نے جاسم کی مدد کی۔ اسے اپنے معتمدِ خاص کامل کے ساتھ چند گھنٹے کے لیے جیل سے باہر بھیجا۔ جاسم نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راجو کو زندگی بھر کے لیے وہیل چیئر کا محتاج بنا دیا۔ دادا کا جیل سے باہر جانا لگا رہتا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی میں شرکت کرنے گیا تو اس کے ایک دیرینہ دشمن شعیب چاچا نے اسے اور اس کی بیٹی و بیوی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دادا کی موت نے جاسم کو حد درجہ افسردہ کر دیا۔ بہرحال وہ اپنی سزا پوری کرنے کے بعد جیل سے باہر آیا تو دنیا بدل چکی تھی۔ اب وہ ایک تربیت یافتہ کڑیل جوان تھا اور اسے ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا تھا اور اسی آغاز پر ایک مہ جبیں سے اس کا تعارف ہوگیا۔ ناجیہ ایک پروڈکشن ہاؤس میں ایسوسی ایٹ پروڈیوسر تھی۔ وہ جاسم کی فائٹنگ اسکلز سے حد درجہ متاثر ہوئی اور اس نے جاسم کو رنگ و نور کی دنیا سے روشناس کرا دیا۔ جاسم کو پتا چلا کہ شعیب چاچا معاشرے میں ایک کامیاب ایکسپورٹر کی حیثیت سے عزت کی زندگی گزار رہا ہے لیکن درپردہ وہ ڈرگز، ناجائز اسلحہ، انسانی اعضا کی فروخت اور نوعمر لڑکیوں کے اغوا جیسے مذموم کاموں میں ملوث ہے۔ اس مکروہ کاروبار میں بعض بااثر افراد اس کے ساتھ ہیں اور اسے بین الاقوامی کارٹلز کا تعاون بھی حاصل ہے۔ دونوں دوستوں نے مضبوط منصوبہ بندی سے شعیب چاچا کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔ دوسری سمت جاسم کا شوبز کا کام بھی جاری تھا اور اسے چند روز کے بعد ایک سیریل کی شوٹ کے لیے استنبول جانا تھا اس سے پہلے اس نے راجو کو بھی حسرت ناک موت سے ہمکنار کیا تھا۔ یہ سنسنی خیز ہنگامے چل رہے تھے کہ کسی ڈیوڈ نامی شخص نے بڑے پُراسرار انداز میں جاسم سے رابطہ کیا اور اسے اپنے کسی ریئلیٹی ٹی وی میں، بھاری معاوضے پر شرکت کی دعوت دی۔ یہ وہی وقت تھا جب جاسم اپنے یونٹ کے ساتھ استنبول جانے والا تھا۔ ڈیوڈ کا رویہ اتنا پُراسرار اور خطرناک تھا کہ فوری طور پر یہی سمجھ میں آیا کہ کوئی مخالف پروڈیوسر ڈیوڈ بن کر جاسم کو اپنے ٹریک سے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن جلد ہی جاسم کو اندازہ ہوگیا کہ ڈیوڈ ایک انتہائی طاقتور اور بااختیار شخص ہے۔ ڈیوڈ نے ناجیہ کو اغوا کر کے جاسم کو اپنے ریئلیٹی ٹی وی میں کام کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ دونوں کی ملاقات استنبول میں طے ہوگئی۔ جاسم کا پروڈیوسر تمام حالات سے بہ خوبی آگاہ تھا۔ اس نے اپنے سیریل میں جاسم کا رول ایک دوسرے کردار حیم کو دیا اور جاسم کو یونٹ کے ساتھ استنبول روانہ کر دیا۔ پروڈیوسر سرمد صدیقی ناجیہ کے باپ غفار داؤد کا دوست تھا اس لیے صدیقی کی نظر میں اپنے سیریل سے زیادہ ناجیہ کی زندگی اور اس کی محفوظ واپسی کی اہمیت تھی۔ ڈیوڈ نے جاسم کو ہدایت کی تھی کہ جب وہ استنبول میں ریئلیٹی ٹی وی کے کنٹریکٹ پر دستخط کردے گا تو اس کی دوست نما محبوبہ کو رہا کر دیا جائے گا۔ ڈیوڈ کا وہ ریئلیٹی ٹی وی ایک میگا پروجیکٹ تھا جس کی تمام تر شوٹنگ پُراسرار سرزمینِ مصر میں ہونے والی تھی۔ ڈیوڈ کی ہدایت کے مطابق، جاسم کو استنبول پہنچ کر اس کے خاص آدمی بن عرفات سے ملاقات کرنا تھی۔ جاسم استنبول کے ایک معروف مقام گلاٹا برج کے نیچے بنے ہوئے زینان نامی ایک یونانی ریسٹورنٹ میں پہنچ گیا جہاں بن عرفات ماسٹر شیف کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ بن عرفات نے جاسم کے خون سے مذکورہ کنٹریکٹ پر دستخط کرا لیے اور وعدے کے مطابق، اسے ناجیہ کی رہائی کی خوش خبری سنا دی۔ جاسم نے فون پر ناجیہ سے بات کر کے اس امر کی تسلی کر لی کہ وہ بہ حفاظت اپنے گھر پہنچ چکی ہے۔ اب وہ محفوظ سائڈ پر تھا لہٰذا اس نے ڈیوڈ کے پروجیکٹ میں کام کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ڈیوڈ نے بن عرفات کے توسط سے جاسم کو انتا غفیل کر کے ایک کروز شپ پر پہنچا دیا۔ جب جاسم کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک بڑے

بحری جہاز پر پایا۔ بعدازاں ڈیوڈ نے ایک مرتبہ پھر جاسم سے پُراسرار انداز میں سیلولر رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ وہ کروز شپ استنبول سے مصر کی بندرگاہ، پورٹ سعید تک جائے گا۔ پھر اس کے آدمی جاسم کو پورٹ سعید سے بہ ذریعہ جیپ قاہرہ پہنچادیں گے جہاں پر اس ری ایلیٹی ٹی وی کی افتتاحی تقریب کا انعقاد کیا جائے گا۔ ڈیوڈ نے ری ایلیٹی ٹی وی کی شوٹنگ سے پہلے ہی جاسم کے ساتھ شکار اور شکاری کا جو کھیل شروع کر دیا تھا، جاسم اسے انجوائے کرنے کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر پوری طرح تیار تھا۔ ڈیوڈ کی ہوشیاری کے سبب جاسم اس کا کھیل سمجھنے سے قاصر تھا۔ ڈیوڈ نے ہرٹیم کو بریف کر دیا تھا۔ مصر کے حرم سے انہیں ایک صندوق حاصل کرنا تھا۔ جاسم کی مددایک جن زادی کر رہی تھی۔ کچھ ممبران زندگی کی بازی ہار چکے تھے اور باقی ہارنے والے تھے۔ جاسم کا رخ استنبول کی جانب تھا۔ دورانِ سفر انکشاف ہوتا ہے کہ ان کا جہاز ہائی جیک کرلیا گیا ہے۔ جاسم اس صورتِ حال سے نمٹنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ اس نے اپنی خفیہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ہائی جیکرز کو زیر کرتے ہوئے صورتِ حال کو اپنے قابو میں کرلیا تھا۔ ہائی جیکرز کا ٹارگٹ استنبول کے جسٹس طلال حسنی تھے۔ جن سے وہ اپنی مرضی کا فیصلہ لینا چاہتے تھے۔ استنبول میں جاسم کا جسٹس حسنی سے بہت گہرا تعلق بن گیا تھا۔ جاسم ان کے بیٹے کو بھی بازیاب کرا چکا تھا اور اپنے دشمنوں کو بھی ایسا سبق دیا تھا کہ وہ زندگی بھر یاد رکھتے۔ سلور کوئن کی ہدایت پر ڈیوڈ کو اب جاسم کے خلاف حتمی کارروائی کرنی تھی کیونکہ جاسم ان لوگوں کے خلاف بہت کچھ کر چکا تھا۔ ڈیوڈ اور حواری اب جاسم کا تعاقب کرتے ہوئے جسٹس حسنی کے ولا تک پہنچ چکے تھے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

سبطِ ابلیس دجال کی داسی سلور کوئین کی تین رکنی مرکزی کابینہ کا ہنگامی اجلاس جاری تھا۔ آج یکم اکتوبر دو ہزار تیئس عیسوی کی تاریخ میں وہ لوگ دوسری بار اس قدیم کاسل میں جمع ہوئے تھے۔ پہلی مرتبہ صبح آٹھ بجے اور اس دفعہ دس بجے۔ سلور کوئین اپنی مخصوص شاہانہ نشست پر براجمان تھی اور وہ تینوں اپنی ایکسپائری ڈیٹ کے قریب پہنچے ہوئے کھاپڑ یہودی اکابرین باادب، باملاحظہ گردنیں جھکائے اس کے سامنے بیٹھے تھے۔ دو گھنٹے پہلے بھی وہ سب یہیں موجود تھے، جب سلور کوئین کو جیمس ٹاؤن (سینٹ ہیلینا) والے سنسنی خیز واقعے سے آگاہ کیا گیا تھا۔ سلور کوئین نے انہیں معلوماتی شواہد پیش کرنے کے لیے دو گھنٹے کی مہلت دی تھی۔ اس دوران میں سلور کوئین نے اپنے اوپر والوں کو بھی اس سانحے سے نہ صرف آگاہ کر دیا تھا بلکہ اس کے حوالے سے ضروری ہدایات بھی حاصل کرلی تھیں۔ اس نے اپنے ذہن میں آئندہ کے لیے لائحۂ عمل تیار کرلیا تھا اور یہ میٹنگ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

سلور کوئین کے اندر کا احوال کسی خوف ناک آتش فشاں جیسا تھا لیکن اپنے نائبین کے سامنے اس نے خود کو بڑی مہارت سے سنبھال رکھا تھا۔ جب لیڈرہل فورٹ کے اندر واقع ڈیوڈ کے محفوظ خفیہ ٹھکانے میں ہونے والے ہنگامے کی سیکیورٹی کیمراز ریکارڈنگ دکھانے کے بعد اس بارے میں دیگر معلومات سلور کوئین کو فراہم کر دی گئیں تو اس نے گمبھیر انداز میں کہا۔

”اس بندے کا قد کاٹھ اور جسامت بہ عین، جاسم ایسی ہے۔ تم لوگوں نے پچھلے دو گھنٹے میں جو بھاگ دوڑ کی ہے، اس کی روشنی میں وہ جاسم نہیں ہے۔ مجھے یہی بتایا گیا ہے نا......؟“

”یس میم!“ مسٹر جیکب نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔ ”جاسم کے فنگر پرنٹس، آئی ریٹینا اور دیگر اہم چیزوں کا ریکارڈ ہے ہمارے پاس۔ اس شخص نے ڈیوڈ کے ٹھکانے پر کئی مقامات کو چھوا ہے خصوصاً ونسیٹ کی گن اور الفریڈ کے خنجر کو باقاعدہ استعمال بھی کیا ہے مگر ہر جگہ اس کے فنگر پرنٹس جاسم کے فنگر پرنٹس سے میچ نہیں کرتے۔ یہ کہا جاتا ہے......“

”ہم فرض کر سکتے ہیں کہ اگر وہ جاسم ہی تھا تو اس نے کسی خاص تیکنیک کا سہارا لے کر اپنے فنگر پرنٹس اور آئی ریٹینا کو کسی بھی مرحلے پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔“ جیکب کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی سلور کوئین بول اٹھی۔ ”مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ اس قلعے کے اندر پہنچا کیسے؟ یہ نہایت ہی اہم سوال ہے۔ اگر اس نے اپنی شناخت چھپانے کے لیے چہرے پر کوئی ماسک بھی لگا رکھا تھا تو قلعے کے بیرونی حصے میں نصب سیکیورٹی کیمراز کی آنکھ سے وہ کیسے بچ گیا اور ڈیوڈ کے ان محافظوں کو وہ دکھائی کیوں نہیں دیا جو دونوں راستوں کی کڑی نگرانی پر مامور ہیں؟“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں میم!“ جیکب نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”لیڈرہل فورٹ تک رسائی کے بظاہر دو ہی راستے ہیں۔ ایک پہاڑی والی تنگی سڑک اور دوسرا راستہ ہے، جیکب زلیڈر...... جیکب کی

سیڑھی ہو یا لہراتی، بل کھاتی پہاڑی سڑک، ڈیوڈ تک رسائی حاصل کرنے والے اس شخص نے ان میں سے کسی بھی راستے کا استعمال نہیں کیا۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا راستہ ''تھارپس شاپ'' والا بھی ہے۔ اس خفیہ راستے سے صرف ڈیوڈ ہی کو آنے جانے کی سہولت حاصل تھی مگر وہاں موجود ہمارے وفادار لوگوں کا کہنا ہے کہ ڈیوڈ یا کوئی اور شخص ادھر سے نہیں گزرا......''

''مسٹر جیکب!'' سلور کوئین نے ایک مرتبہ پھر قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ واقعہ آج صبح چھ سے سات بجے کے درمیان کا ہے اور اس وقت تھارپس شاپ بند ہوتا ہے۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ وہ بندہ کسی بھی راستے سے ڈیوڈ تک پہنچ گیا تھا تو پھر بھی ایک اہم سوال کا جواب ڈھونڈنا ہوگا اور وہ یہ کہ...... جب ڈیوڈ کے ٹھکانے کے اندرونی سیکیورٹی کیمراز نے اس کی حرکات وسکنات کو ریکارڈ کیا ہے تو پھر وہ کسی بیرونی کیمرے کی آنکھ کو دکھائی کیوں نہیں دیا۔ ڈیوڈ اور اینجیل کی باتوں سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ڈیوڈ کے دونوں محافظ ونسینٹ اور الفریڈ بھی اسے دیکھ نہیں پائے تھے جبکہ اندرونی لفٹ کے آس پاس بھی وہ نظر آیا ہے۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ اس بندے نے تھارپس شاپ والا راستہ اختیار نہیں کیا ہوگا۔ یہ کوئی اور ہی معاملہ ہے......''

''تھارپس شاپ۔'' دراصل جیمس ٹاؤن کا ایک نہایت ہی مہنگا شاپنگ مال ہے جہاں پر زیادہ تر انگلینڈ اور ساؤتھ افریقا سے امپورٹ کی ہوئی اعلیٰ درجے کی اشیا فروخت ہوتی ہیں۔ اسی تھارپس شاپ کے اندرونی حصے سے ایک راستہ ڈیوڈ کے خفیہ ٹھکانے کے زیریں حصے تک جاتا تھا جہاں سے لفٹ کے ذریعے ڈیوڈ اوپر قلعے کے بالائی حصے تک رسائی حاصل کرتا تھا۔ تھارپس شاپ کے عملے میں زیادہ تر انہی کے لوگ تھے جو مذکورہ خفیہ راستے کی کڑی نگرانی کرتے تھے۔ یہ راستہ صرف ڈیوڈ کے استعمال میں تھا اور وہ بھی مہینے میں ایک آدھ بار ہی اپنے ٹھکانے سے باہر نکلتا تھا۔ پچھلے تین سال سے ڈیوڈ نے اس قلعے کو اپنی دجالی سرگرمیوں کا مرکز بنا رکھا تھا۔

''میں آپ سے مکمل اتفاق کرتا ہوں میم!'' جیکب نے کہا۔ ''واقعی، یہ بہت ہی پُراسرار معاملہ ہے اور وہ بندہ آپ کو اچھی طرح جانتا ہے...... آپ نے سیکیورٹی کیمراز اور حساس مائیک کی ریکارڈنگ دیکھ لی ہے۔ جب وہ بندہ ڈیوڈ سے بات کر رہا تھا تو اس نے آپ کے لیے میڈم سیم تن اور میم سیمیں بدن کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ ڈیوڈ اس کی بات سمجھ نہیں پایا تو اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا...... میں سلور کوئین کی بات کر رہا ہوں......''

''وہ مجھے جانتا ہے، یہ کافی نہیں ہے مسٹر جیکب!'' سلور کوئین نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''ضروری یہ ہے کہ میں بھی اسے جاننا چاہتی ہوں۔ اس نے آج ہمارے اندر گھس کر ڈیوڈ کے ساتھ جو بہیمانہ برتاؤ کیا ہے، وہ کسی خوفناک چیلنج سے کم نہیں۔ اس نے ہماری رٹ پر کاری ضرب لگائی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ڈیوڈ کوئی پُراسرار آنکھ نہیں بلکہ بھس بھرا ہوا کوئی گڈا تھا جس کی وہ ایسی تیسی کر کے چلتا بنا۔ اس ڈیوڈ نے تو ہمیں پہلے والے ڈیوڈ سے بھی زیادہ مایوس کیا ہے۔ آخر وہ اس اجنبی نوجوان کے سامنے اتنا نکما ثابت کیوں ہوا...... کیا اس کی تربیت میں کوئی کمی باقی رہ گئی تھی؟''

''ایسی بات نہیں ہے میم......!'' مسٹر اولیور نے سلور کوئین کے سوال کے جواب میں نہایت ہی احترام بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ ڈیوڈ پچھلے تین سال سے جیمس ٹاؤن والے ٹھکانے پر بالکل ٹھیک کام کر رہا تھا حالانکہ اس دوران میں وبائی مرض نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہمیں بھی نت نئے مسائل کا سامنا رہتا تھا مگر ڈیوڈ نے ہر سچویشن کو اچھے سے ہینڈل کیا ہے۔ باقی جہاں تک آج صبح والے واقعے کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ڈیوڈ کی ایک کمزوری کا کیا دھرا ہے۔''

''کیسی کمزوری؟'' سلور کوئین نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''ڈیوڈ، عورت کو ہینڈل کرنے والے معاملے میں کافی نالائق ثابت ہوا ہے میم!'' مسٹر اولیور وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ اپنی اس کمزوری کو دور کرنے کے لیے مخصوص قسم کی ادویات کا استعمال کرتا ہے جو جسمانی کارکردگی کو تو کسی حد تک بڑھا دیتی ہیں مگر ذہن اور اعصاب پر ان کا منفی اثر ہوتا ہے۔ آپ نے ریکارڈنگ میں دیکھا ہے، جب وہ نامعلوم بندہ ڈیوڈ کے ٹھکانے میں گھسا تو ڈیوڈ اینجیل کے ساتھ کس نوعیت کا وقت گزار رہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں اسی وجہ سے وہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کو خاطر خواہ کام میں نہیں لا سکا اور......'' وہ لمحے بھر کو رکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اور ابھی اس بندے کی پُراسراریت کا ذکر ہو رہا ہے تو میں نے تین سال پہلے بھی آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ یہ ناممکن نہیں کہ کوئی جن یا کوئی اور نادیدہ مخلوق جاسم

کی مدد کر رہی ہو...... اس پر آپ نے فرمایا تھا کہ ہمارے علاوہ بھی کئی نادیدہ اور پُراسرار قوتیں منقش صندلیں باکس کو حاصل کرنا چاہتی ہیں کیونکہ سب کو اپنے مسیحا کی آمد کا انتظار ہے اور وہ لوگ ہمارے مسیحا کو اپنے مسیحاؤں کا دشمن اور ابلیس کا جانشیں سمجھتے ہیں......"

"تو؟" مسٹر اولیور کی وضاحت طول پکڑنے لگی تو سلور کوئین نے اسے ٹوک دیا۔

"میم! میں دراصل یہ عرض کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ مقدس صندلیں باکس ہماری پہنچ سے دور جاچکا ہے۔" اولیور نے معتدل انداز میں کہا۔ "عین ممکن ہے کہ وہ باکس جاسم کے ہاتھ لگ گیا ہو اور وہ اسی کے طلسماتی اثرات سے یہ سب کارنامے انجام دے رہا ہو۔ ڈیوڈ تک پہنچنے کے صرف تین راستے ہیں۔ دو ظاہرہ اور تیسرا خفیہ تھارپس شاپ والا اور اس نے ان میں سے کوئی بھی راستہ اختیار نہیں کیا اور حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ ونسیعٹ اور الفریڈ کی نگاہ میں بھی آئے بغیر سیدھا اندر جا پہنچا تھا۔ یہ سب معاملات ایک ہی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ جاسم نے کوئی ایسی نادیدہ قوت حاصل کرلی ہے جو ہمارے خلاف اس کی بھرپور مدد کررہی ہے۔"

"مسٹر اولیور! آپ کی بات میں وزن تو ہے لیکن آپ کا فوکس جاسم پر ہے۔" سلور کوئین نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جب تک یہ ثابت نہیں ہوجاتا کہ آج صبح والے واقعے میں جاسم ہی ملوث ہے اس وقت تک حتمی طور پر کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ جاسم کا پچھلے تین سال سے کوئی اتا پتا نہیں ہے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ وہ مرکھپ چکا ہو گا۔ میں امکان کی بات کررہی ہوں۔ ویسے ہونے کو تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ خیر......" لمحے بھر کو رک کر اس نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہمیں اس امکان کو بھی یکسر نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ ان تمام پُراسرار واقعات کے پیچھے اس پاکستانی نوجوان ہی کا ہاتھ ہو جسے آٹھ سال پہلے ہم نے انٹارکٹیکا کے چٹیل، سنسان اور ویران برف زار میں پھنکوایا تھا اور وہ ہم سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کہیں غائب ہوگیا تھا۔ ہم نے اسے ہر جگہ تلاش کیا مگر وہ کہیں نہیں ملا۔ اس کے دور میں بھی ایسے پُراسرار واقعات رونما ہوتے رہتے تھے۔"

سلور کوئین کے خاموش ہوجانے پر کوئی کچھ نہیں بولا۔ کیونکہ ان کی میم کی طرف سے کوئی سوال نہیں آیا تھا۔ چند لمحے کے بعد سلور کوئین نے نارمن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مسٹر نارمن! آپ کن سوچوں میں گم ہیں۔ اس حالیہ واقعے کے بارے میں آپ کی ریسرچ کیا کہتی ہے؟"

"میم! میرا دھیان اپنی ٹیم کی اس ریسرچ کی طرف جارہا ہے جو تین سال پہلے ہم نے جاسم اور ناجیہ کے حوالے سے کی تھی۔" نارمن نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ ریسرچ درحقیقت مسٹر جیکب کی ٹیم کی ریسرچ کا پارٹ تو تھی۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں کچھ کہنا چاہوں گا جس سے جاسم اور ناجیہ کی موجودہ لوکیشن پر روشنی پڑے گی۔"

"نیک کام میں تاخیر کیسی!" سلور کوئین ترنت بولی۔

"ہم اس وقت اسی مقصد سے یہاں جمع ہیں کہ صبح ڈیوڈ کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا ہے، اس کی تشریح ہوسکے۔ اگر آپ کی ریسرچ ہمیں جاسم یا ناجیہ کے نزدیک لے جاتی ہے تو یہ کامیابی کی طرف ہمارا ایک بڑا قدم ہوگا۔ پلیز...... آپ اپنا بیان جاری رکھیں۔"

"آپ کو یاد ہوگا کہ تین سال پہلے جاسم سے ناراض لیلیٰ حسینی اور کامل سے برگشتہ راشد فیضی نے اپنے دلوں کی بھڑاس نکالنے کے لیے ہمارا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا اور جاسم اور اس کے خیرخواہوں کی تلاش کے سلسلے میں وہ دونوں مسٹر جیکب کی استنبول والی ٹیم کا حصہ بن گئے تھے۔"

"ہاں...... میں اس واقعے کو بھولی نہیں ہوں۔" سلور کوئین نے سپاٹ آواز میں کہا۔ "راشد فیضی اور لیلیٰ حسینی نے جاسم کی ایک ائرہوسٹس دوست نشا صباحی کو اغوا بھی کرلیا تھا مگر بدقسمتی سے وہ دونوں اذیت ناک موت مرے تھے۔ استنبول پولیس کمشنر کے بندوں نے نشا صباحی کو ریسکیو کرلیا تھا۔" وہ لمحے بھر کو تھمی پھر خودکلامی کے انداز میں بڑبڑائی۔

"پتا نہیں، اس کم بخت جاسم کو ہر جگہ اپنے چاہنے اور جان لٹانے والے لوگ کیسے مل جاتے ہیں اور انہی میں طلال حسنی اور قاموس ترک جیسے بااثر افراد بھی شامل ہیں۔"

نارمن نے اپنی میم کی بڑبڑاہٹ پر کوئی تبصرہ کرنے کی حماقت نما غلطی نہیں کی اور اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے معتدل انداز میں بولا۔

"جب لیلیٰ حسینی، نشا صباحی کو زیر کرنے کے بعد اس سے جاسم کا پتا ٹھکانا اگلوانے کی کوشش کررہی تھی تو ایک موقع پر نشا نے جلے کٹے انداز میں لیلیٰ کو بتایا تھا کہ جاسم اور ناجیہ نے شادی کرلی ہے اور وہ ہنی مون منانے "ٹٹ بٹ آئی لینڈ" پر گئے ہوئے ہیں۔ لیلیٰ حسینی ٹٹ بٹ کا نام سن کر بری

طرح اُلجھ گئی تھی لیکن اس کی زندگی نے وفا نہیں کی اس لیے وہ نشا سے ٹٹ بٹ کے بارے میں کچھ اور نہیں پوچھ سکی تھی۔ بعدازاں مسٹر جیکب کی ٹیم نے ٹٹ بٹ، آئی لینڈ کے حوالے سے کام کیا تو انہیں یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ نشا نے لیلیٰ کو محض بے وقوف بنانے کے لیے وہ بات مذاق میں کہی تھی۔ اس نام کا کوئی جزیرہ دنیا میں موجود نہیں تھا لیکن میری کراچی والی ٹیم نے اس نام سے ملتا جلتا ایک جزیرہ ڈھونڈ نکالا تھا جس کا نام......!'' اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر سنسنی خیز لہجے میں اپنی بات مکمل کردی۔

''اس جزیرے کا نام ہے بھٹ آئی لینڈ!''

''آپ نے یہ بات ہمیں تو نہیں بتائی......؟'' جیکب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔'' نارمن نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''مسٹر نارمن! ودھ ڈیو ریسپیکٹ...... ہم سب میم کے لیے کام کرتے ہیں۔'' جیکب نے خفگی بھرے انداز میں کہا۔ ''اور یہ ایک ٹیم ورک ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی الگ رہ کر انفرادی طور پر کچھ بھی نہیں ہے۔''

''ہم ایک ہیں اور ہمیشہ ایک ہی رہیں گے۔'' نارمن نے متحمل لہجے میں جواب دیا۔ ''تم سب مل کر گریٹر اسرائیل کے قیام کے لیے رات دن کام کررہے ہیں۔ ہمارا مشن ایک اور منزل بھی ایک ہے جسے ہم حاصل کرکے ہی رہیں گے۔ مسٹر جیکب! آپ کو کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔''

''غلط فہمی ہو یا خوش فہمی، اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔'' جیکب نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

''آپ لوگ آپس میں اُلجھنا بند کریں۔'' سلور کوئین نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''یہ جاسم کے حوالے سے ہماری آخری میٹنگ ہے۔ جاسم کی فائل ہماری ٹیبل سے کسی اور کی ٹیبل پر جاچکی ہے۔ اوپر والوں نے مجھ سے کہا ہے کہ جیمس ٹاؤن والے افسوس ناک واقعے کی تفتیش مکمل کرکے رپورٹ آگے بڑھا دی جائے۔ اس کے بعد ہمارا کام ختم...... جاسم جانے اور اوپر والے جانیں......''

''جاسم کا کیس اب کس کے سپرد کیا گیا ہے میم؟'' جیکب نے شائستہ لہجے میں استفسار کی جرأت کرڈالی۔

''مجھے معلوم ہے مگر بتانے کی اجازت نہیں۔'' سلور کوئین نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔

''میم......!'' جیکب کی دیکھا دیکھی اولیور نے بھی ہمت کرکے پوچھ لیا۔ ''ہم نے آپ کو اس کاسل میں صرف ایک ملازم بنجامن کے ساتھ ہی دیکھا ہے۔ وہ آپ کا باورچی، گارڈ، ڈرائیور اور ہر قسم کا خدمت گار ہے۔ آپ اس پر بہت بھروسا کرتی ہیں۔ ہم تینوں آپ کے نائبین ہیں اور آپ کے بلاوے پر ہی یہاں آتے ہیں لیکن آج ہم نے کاسل کے داخلی گیٹ پر دو مسلح افراد کو دیکھا ہے۔ اس بندوبست کی کوئی خاص وجہ ہے؟''

''مسٹر اولیور! اچھا ہوا، آپ نے ان سیکیورٹی گارڈز کے بارے میں پوچھ لیا۔'' سلور کوئین نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ''ویسے میں خود بھی آپ لوگوں کو اس تبدیلی کے بارے میں ابھی بتانے ہی والی تھی۔ خیر......'' لمحاتی توقف کے بعد وہ اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''وہ مسلح افراد میری سیکیورٹی کے لیے یہاں بھیجے گئے ہیں۔ اوپر والوں کا خیال ہے کہ میری جان کو خطرہ ہے۔ جس شخص نے جیمس ٹاؤن میں ڈیوڈ کی مٹی پلید کی ہے، وہ سینٹ ہیلینا سے سیدھا یہاں آئے گا اور اس کا اگلا نشانہ میں ہوں گی۔ آج سہ پہر میں سینٹ ہیلینا کی ائرلائن ''ائر لنک'' کی ایک فلائٹ جیمس ٹاؤن ائرپورٹ سے جوہانسبرگ (جنوبی افریقا) جائے گی۔ اغلب امکان اس بات کا ہے کہ وہ بندہ مذکورہ فلائٹ کے ذریعے جیمس ٹاؤن سے پہلے جوہانسبرگ جائے گا۔ اس کے بعد وہاں سے کوئی فلائٹ پکڑ کر یہاں پہنچے گا۔ میری حفاظت کے خیال سے ہائی کمان نے ان سیکیورٹی گارڈز کو اس کاسل میں تعینات کیا ہے حالانکہ مجھے اپنی حفاظت کے لیے کسی اور کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود کو محفوظ رکھنا اچھے سے جانتی ہوں مگر ہائی کمان کے سامنے کوئی سوال نہیں اٹھایا جاسکتا۔''

''میم! آپ نے ائرلنک کی جس فلائٹ کا ذکر کیا ہے، میں اس کے بارے میں جانتا ہوں۔'' مسٹر جیکب نے معتدل انداز میں کہا۔ ''سینٹ ہیلینا ائرلائن کا وہ جہاز ہفتے میں صرف ایک بار جیمس ٹاؤن سے جوہانسبرگ اور جوہانسبرگ سے واپس جیمس ٹاؤن کا ٹرپ لگاتا ہے اور آپ کی اطلاع کے لیے بتادوں کہ آج وہ فلائٹ جیمس ٹاؤن کے ائرپورٹ سے ٹیک آف نہیں کرسکے گی۔ باہر کی دنیا سے سینٹ ہیلینا تک آمدورفت کے دو ہی ذرائع ہیں۔ نمبر ایک، بائی ائر۔ نمبر دو، بائی سی۔ خشکی کا کوئی راستہ اس طرف جاتا ہے اور نہ ہی وہاں سے آتا ہے۔ میں نے اپنے ذرائع استعمال کرکے جیمس ٹاؤن میں واقع پولیس ہیڈ کوارٹرز

''کولمن ہاؤس'' کو ہائی الرٹ کر دیا ہے۔ پولیس چیف مسٹر پیٹرسن نے مجھے یقین دلایا ہے کہ جب تک ہمارا مطلوبہ بندہ گرفت میں نہیں آ جاتا، چڑیا کا ایک بچہ بھی جیمس ٹاؤن سے باہر نہیں نکل سکتا۔ آپ فکر نہیں کریں۔ جیمس ٹاؤن کی پولیس آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے ہی اس شیطان کو ڈھونڈ نکالے گی۔ چھ سو تیس افراد کی آبادی والے اس، پہاڑی گھاٹی پر واقع ننھے منے شہر میں اس اجنبی وارداتیے کو تلاش کرنا مشکل نہیں ہوگا۔''

''یہ سب میں بھی جانتی ہوں۔'' سلور کوئین نے اپنے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ سجاتے ہوئے توانا لہجے میں کہا۔ ''آپ لوگوں کو میرے بارے میں کسی بھی چھوٹی یا بڑی تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے رک کر نارمن کی طرف دیکھا اور ان استفساریہ الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''مسٹر نارمن! آپ کسی بھٹ آئی لینڈ کے بارے میں بتا رہے تھے؟''

''یس میم!'' نارمن نے نپے تلے الفاظ میں بولنا شروع کیا۔ ''یہ جزیرہ پاکستان کے شہر کراچی سے تعلق رکھتا ہے یعنی اس کا شمار کراچی کے نزدیکی جزائر میں ہوتا ہے اور یہ کراچی کے ساحل کیماڑی سے محض بیس منٹ کے سمندری سفر پر واقع ہے۔ چار مربع کلومیٹرز رقبے والے اس جزیرے پر پچیس ہزار کے قریب لوگ آباد ہیں جو ماہی گیری کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ ''ٹٹ بٹ آئی لینڈ'' سے ملتے جلتے نام ''بھٹ آئی لینڈ'' کا تحقیقاتی دورہ کرنے کے بعد ہمیں پتا چلا کہ تین سو سال سے آباد اس جزیرے پر جاسم اور ناجیہ کے رہائش اختیار کرنے کے امکانات صفر کے برابر ہیں کیونکہ وہاں رہنے والے لوگ غربت اور کسمپرسی کی لکیر سے بہت نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہاں پینے کا پانی ہے نہ گیس اور بجلی بھی کبھی کبھار ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اسکول، کالج اور اسی کی طرح کی دیگر سہولیات بھی ناپید ہیں۔ اسپتال کے نام پر ایک ڈسپنسری تو موجود ہے مگر اس ڈسپنسری کا میڈیکل اسٹاف اکثر غائب رہتا ہے اور اگر خوش قسمتی سے عملے کا کوئی شخص وہاں موجود ہوتا بھی ہے تو سمجھ لیں، مذکورہ ڈسپنسری پر ہر مرض کا علاج پیناڈول ہی سے کیا جاتا ہے۔''

یہاں تک پہنچنے کے بعد نارمن کو بہت زور کا ٹھسکا لگا اور وہ غوطے دار انداز میں کھانستا چلا گیا۔ اس نے جوش خطابت میں اپنے کہنہ سال اور سیلن زدہ ضعیف پھیپھڑوں کو کچھ زیادہ ہی استعمال کر ڈالا تھا۔ اپنی اوقات سے باہر آنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ جاسم دشمنی میں نارمن نے وطن عزیز کے ایک جزیرے کا جس بھونڈے انداز میں نقشہ کھینچا تھا، اس سے بھی بدتر حالت والے متعدد جزائر اس دنیا میں پائے جاتے ہیں مگر وہی بات کہ اپنے گریبان میں کوئی نہیں جھانکتا۔

اوپر تلے کئی گہری سانسیں لینے کے بعد وہ بولنے کے قابل ہوا تو اس کی آواز سے یہی محسوس ہوتا تھا کہ ابھی اسے کسی اسپتال کے وینٹی لیٹر سے اٹھا کر لایا گیا ہے۔

''جاسم اور ناجیہ تو بھٹ آئی لینڈ پر کہیں نہیں ملے لیکن اس ریسرچ کا ایک فائدہ ضرور ہوا اور یہ فائدہ ایک آئیڈیا کی شکل میں تھا......'' نارمن نے اپنی رہی سہی توانائی کو اکٹھا کرنے کے بعد دوبارہ بولنا شروع کیا۔ ''یہ آئیڈیا جاسم اور ناجیہ کی کرنٹ لوکیشن پر روشنی ڈال سکتا ہے۔ میم......!'' وہ سلور کوئین کو مخاطب کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بتانے لگا۔ ''تین سال پہلے آپ نے دنیا کے بارہ ایسے ممالک کا ذکر کیا تھا جن میں سے گیارہ ممالک جزیرے کی شکل میں اور ایک خشکی پر واقع ہے۔ آپ نے ہمیں بتایا تھا کہ خطرناک وبائی مرض ان بارہ ممالک میں داخل نہیں ہو سکے گا اور ہم نے دیکھ لیا کہ مذکورہ بارہ ممالک میں کورونا کا ایک بھی کیس رجسٹر نہیں ہوا اور...... اور انہی بارہ ممالک میں ایک جزیرہ نما ملک ''سینٹ ہیلینا'' بھی ہے۔ بحراوقیانوس میں واقع اس جنت نظیر جزیرہ ملک کے بارے میں جاسم نے بھی کہیں سے سن لیا ہوگا اور ہم اس امکان کو نظرانداز تو نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی دولت اور دیگر ذرائع استعمال کر کے ناجیہ کے ساتھ اس جزیرے پر آ بسا ہو۔ اگر جیمس ٹاؤن والے واقعے میں جاسم کسی بھی حوالے سے ملوث ہے تو پھر میرا یہ آئیڈیا صد فیصد درست ثابت ہوگا۔''

اس کی سانس بری طرح الجھ چکی تھی اور سینہ دھونکنی کے مانند پھول پچک رہا تھا۔ اس کے تنفس کو معتدل ہونے میں لگ بھگ دو منٹ لگ گئے۔ جب وہ کچھ کہنے سننے کے قابل ہوا تو سلور کوئین نے توصیفی نظر سے اسے دیکھتے ہوئے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔

''ویل ڈن مسٹر نارمن! آپ بہت دور کی کوڑی لائے ہیں۔'' پھر اس نے جیکب کی طرف رخ موڑ کر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''مسٹر جیکب! سردست ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ڈیوڈ کا حشر نشر کرنے والا وہ بندہ جاسم ہی ہے۔ اس نے بھیس بدل رکھا ہے اور کوئی پُراسرار ذریعہ بھی استعمال کر رہا ہے۔

ں حالات میں آپ مجھے بتائیں، کولمن ہاؤس ہمارے
لوبہ بندے کو اپنی گرفت میں لانے کے لیے کس قسم کے
رامات کررہا ہے۔ آپ کی تو پولیس چیف پیٹرسن سے
یسلی بات بھی ہوگی ہے؟''

''یس میم!'' جیکب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں
اب دیا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ...... بے حد معذرت کے
اتھ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ مجھے مسٹر نارمن کی اس تھیوری
ے بالکل اتفاق نہیں ہے کہ آج صبح ڈیوڈ کے ساتھ پیش
نے والے افسوس ناک واقعے کا ذمے دار جاسم ہے کیونکہ
یں اس بندے کے فنگر پرنٹس جہاں جہاں بھی ملے ہیں،
جاسم کے فنگر پرنٹس سے بالکل میچ نہیں کرتے۔ علاوہ
یں اس کے آئی ریٹینا کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ تھارپس
اپ سے لیڈرہل فورٹ تک جانے والے خفیہ راستے میں
بجا کلوز سرکٹ ٹی وی کیمراز نصب ہیں۔ ان کی
یکارڈنگ میں بھی اس بندے کا نام و نشان دکھائی نہیں
تا۔ ایسا ہی حال اس قلعے تک جانے والے دوسرے دو
ستوں کا بھی ہے۔ میں تو یہی کہتا ہوں کہ یہ بندہ کسی بھی
ت پر جاسم نہیں ہوسکتا۔''

''ٹھیک ہے مسٹر جیکب!'' سلور کوئین نے قطع کلامی
رتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''مسٹر نارمن کی طرح
پ کو بھی اپنی رائے رکھنے کا حق حاصل ہے۔ فی الحال
پ مجھے جیمس ٹاؤن پولیس کے لائحہ عمل کے بارے میں
ائیں۔''

''اوکے میم......!'' جیکب نے رسانیت بھرے
داز میں کہا۔ ''جیسا کہ آپ جانتی ہیں، جیمس ٹاؤن کی
بادی صرف چھ سو تیس افراد پر مشتمل ہے۔ ان میں سے
یک ایک کو چیک کرنے کا عمل شروع کردیا گیا ہے۔ علاوہ
زیں ٹورسٹ آفس، گورنمنٹ ہیڈ کوارٹرز ''دی کاسل''
نک آف سینٹ ہیلینا، جیمس بے، پریڈ اسکوائر، رائفل
لب، کاسل گارڈنز، میوزیم آف سینٹ ہیلینا، تمام ہوٹل
ور گیسٹ ہاؤس میں بھی سرچ آپریشن جاری ہے حتیٰ کہ اس
لسلے میں لانگ ووڈ ہاؤس'' اور ''ڈارون ریسرچ سینٹر'' کی
لاشی کو نظر انداز نہیں کیا جارہا۔ ڈیوڈ کو زیر کرنے والا یہ
ر اسرار بندہ کہیں بھی چھپ نہیں سکے گا اور جیسا کہ میں نے
ہلے بھی عرض کیا ہے...... وہ جو کوئی بھی ہے، آج کی تاریخ
یں جیمس ٹاؤن کا کولمن ہاؤس (پولیس ہیڈ کوارٹرز) اسے
پنی کسٹڈی میں لے، لے گا۔''

''لانگ ووڈ ہاؤس'' وہ تاریخی عمارت ہے، ماضی
میں جہاں فرانسیسی ملٹری لیڈر اور عظیم فاتح نپولین بوناپارٹ
کو نظر بند رکھا گیا تھا۔ نپولین نے اپنی جلاوطنی کے ایام
لانگ ووڈ ہاؤس ہی میں گزارے تھے اور اسی مقام پر اس
کی فاتحانہ اور شاہانہ زندگی کا اختتام بھی ہوا تھا۔ ''ڈارون
ریسرچ سینٹر'' کی بھی اپنی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ معروف
محقق اور سائنس داں چارلس ڈارون نے جانداروں کے
ارتقائی عمل (نیچرل سلیکشن) کی تھیوری پر سارا کام جیمس
ٹاؤن کی سرزمین پر ہی سرانجام دیا تھا۔

''بہت خوب......!'' جیکب کی وضاحت کے جواب
میں سلور کوئین نے سراہنے والے انداز میں کہا اور پوچھا۔
''ڈیوڈ اس وقت کہاں ہے؟''

''وہ جنرل اسپتال کمپلیکس میں زیرِ علاج ہے۔''
جیکب نے جواب دیا۔ ''اس کے دونوں پاؤں کا کامیاب
آپریشن کردیا گیا ہے مگر افسوس کہ ''ایکیلیس ٹینڈن'' کے
کٹ جانے کے بعد وہ اب باقی کی زندگی اپنے پاؤں پر
کھڑا نہیں ہو پائے گا، گویا وہ وہیل چیئر کا محتاج ہو کر رہ
جائے گا۔''

''گندے انڈے ہوں یا پھر گندے بچے، انہیں
اپنی باسکٹ میں سنبھال سجا کر رکھنا عقلمندی نہیں ہے۔'' سلور
کوئین نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''آپ میرا مطلب
تو سمجھ ہی گئے ہوں گے مسٹر جیکب......!''

''یس میم! آپ کے حکم کی تعمیل کردی جائے گی۔''
جیکب نے فرمانبرداری بھرے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''آپ کوئی پہلی فلائٹ پکڑ کر جیمس ٹاؤن روانہ ہو
جائیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں سمجھتی
ہوں، کاسل ٹاؤن سے زیادہ جیمس ٹاؤن میں آپ کی
ضرورت ہے۔ ڈیوڈ کی معذوری بلکہ ''دائمی معزولی'' کے
بعد وہاں کا نظام ترتیب میں نہیں رہا۔ امید ہے، آپ سب
ٹھیک کردیں گے۔''

''میں آپ کی امید پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا
میم!''

''ایبکیل کا کچھ اتا پتا ہے؟''

''وہ اسپتال میں ڈیوڈ کی دیکھ بھال کررہی ہے۔''

''ایک فوٹیج میں وہ بندہ ایبکیل کے کان میں سرگوشی
کرتے ہوئے نظر آیا ہے۔'' سلور کوئین نے کریدنے
والے انداز میں کہا۔ ''اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ ایک لفظ
بھی سنائی نہیں دیا۔ آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ اس نے ایبکیل
کے کان میں کیا کہا ہوگا؟''

''نو میم!'' جیکب نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں جیمس ٹاؤن پہنچ کر پہلی فرصت میں یہ جاننے کی کوشش کروں گا۔''

''اور جب آپ پہلی فرصت میں یہ کام کر چکیں تو دوسری فرصت میں اس سے بھی زیادہ اہم معاملہ نمٹانا ہے۔'' سلور کوئین نے سفا کی سے کہا۔ ''ایجیلیل نے ہم سے غداری کی ہے۔ جب وہ مردود، ڈیوڈ کو کرسی پر باندھ رہا تھا تو ایجیلیل اس کی بھرپور مدد کرتی دکھائی دی ہے جس کے بعد یہ بھی سوچا جاسکتا ہے کہ ایجیلیل اس شخص کے ساتھ ملی ہوئی تھی ورنہ اسے ہر حال میں ڈیوڈ کا ساتھ دینا چاہیے تھا، چاہے اس میں اس کی جان بھی کیوں نہ چلی جاتی......!''

''میں آپ کا اشارہ سمجھ گیا میم!'' جیکب نے معتدل انداز میں کہا۔ ''ایجیلیل سے ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد اس کی زندگی کو آسان کر دیا جائے گا۔''

''اس دنیا میں سب سے قیمتی شے وفاداری ہے لہٰذا ہمارا جو غدار ہے، وہ موت کا حق دار ہے۔'' سلور کوئین نے بڑی رعونت سے کہا۔ ''ہمیں اپنے مشن کو کامیاب کرنے کے لیے جتنی بھی قربانیاں دینا پڑیں، ہم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔''

وہ تینوں کھاگ کمر خمیدہ یہودی بڈھے کورس کے انداز میں یک زبان ہو کر بولے۔ ''بے شک...... بلاشبہ...... ہر حال میں......!''

''گریٹر اسرائیل کا قیام ناگزیر ہے۔'' سلور کوئین نے بڑے عزم سے کہا۔ ''ڈیوڈ کنگڈم (سلطنتِ داؤدی) ہماری منزل ہے۔ ہم اپنے مسیحا سے کیا ہوا وعدہ پورا کر کے دکھائیں گے۔ ہم ان کی توقعات پر کھرے اتریں گے۔''

جیکب، اولیور اور نارمن اپنی عمر اور صحت کے اس مقام پر فائز تھے کہ جہاں انسان زندگی کو نہیں گزارتا بلکہ زندگی انسان کو گھسیٹتی نظر آتی ہے۔ سلور کوئین کے وہ تینوں معاونین بھی اپنی ٹوٹی پھوٹی بساط اور گئی گزری اوقات کے ساتھ دجال کی لونڈی کا ہر حکم بجا لانے کے لیے بے چین رہتے تھے۔

☆☆☆

جاسم نے جب ڈیوڈ کو عبرت ناک حالات میں پہنچانے کے بعد ''کام ختم، دکان بند'' کا نعرہ لگاتے ہوئے لفٹ کی جانب قدم بڑھائے تھے تو عقب میں اسے ایجیلیل کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ بھی اس کے پیچھے ہی ڈیوڈ والے کمرے سے نکل آئی تھی۔

''سنو......!'' ایجیلیل نے جاسم کو بے نام پکارا تھا۔ ''تم جو کوئی بھی ہو، میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتی لیکن جب تم نے مجھے لباس پہن کر کرسی پر بیٹھنے کی تاکید کی تھی تو ساتھ یہ بھی کہا تھا...... ''میں ڈیوڈ سے نمٹنے کے بعد تم سے بات کروں گا!'' ڈیوڈ کے ساتھ تم نے بہت بے رحمی کا سلوک کیا ہے اور مجھ سے بات کیے بغیر ہی یہاں سے جا رہے ہو۔ اپنے بارے میں بھی تو کچھ بتاتے جاؤ......!''

جاسم رک سا گیا اور پلٹ کر اسے اپنی جانب آنے کا اشارہ کیا۔ جب ایجیلیل اس کے نزدیک پہنچی تو جاسم نے اس کے کان میں یہ سرگوشی کی تھی۔

''قدرت کسی بھی انسان کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتی۔ وہ ہر کسی کو سنبھلنے کا کم از کم ایک موقع ضرور دیتی ہے۔ تم لوگ بھی سدھر جاؤ ورنہ میں تمہارے ساتھ بہت برا کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔''

یہ وہی سرگوشی تھی جو سلور کوئین کے پلے نہیں پڑی تھی اور اس نے ایجیلیل کو جاسم کا معاون سمجھ لیا تھا۔ حالانکہ کمرے کے اندر اور باہر ایجیلیل کا جو کردار رہا تھا، اس سے کہیں بھی یہ نہیں جھلکتا تھا کہ ایجیلیل نے ڈیوڈ کے خلاف، جاسم کا ساتھ دیا تھا مگر وہی بات کہ سلور کوئین کے سامنے وہ تینوں یہودی اکابرین زبان چلانے کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جیکب نے ایجیلیل کے ڈیتھ وارنٹ کی تکمیل کے لیے سلور کوئین کو یقین دہانی کرا دی تھی۔

جاسم نے لفٹ کے اندر داخل ہو کر واپسی کے سفر کے لیے ٹیلی پورٹیشن ٹیکنیک کے تمام تقاضے مرحلہ وار پورے کر دیے تھے اور اس عمل سے گزرنے کے بعد جب اس نے آنکھ کھولی تو وہ ہوٹل ریجنسی کے کمرے میں تھا جہاں سے ایک گھنٹا پہلے اس نے جیمس ٹاؤن کے لیے ٹیک آف کیا تھا۔

وہ فریش ہونے کے لیے واش روم میں گھس گیا۔ اس نے ایک بھرپور شاور لیا اور تیار ہو کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ ان لمحات میں وہ شدید بھوک محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں، خوب ڈٹ کر ناشتا کیا اور جب وہ اپنے کمرے میں آنے کے لیے ریسیپشن کے پاس سے گزرا تو وہاں موجود ایک طرح دار ریسپشنسٹ نے شائستہ لہجے میں اسے رکنے کے لیے کہا۔

''سر! پلیز، ون سیک......!''

جاسم ٹھہر گیا اور سوالیہ نظر سے ریسپشنسٹ کو دیکھا۔ مذکورہ ریسپشنسٹ نے کاؤنٹر کے نیچے سے ایک لفافہ

کال کر جاسم کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''سر! آج صبح
ایک بندہ یہ آپ کے لیے دے گیا تھا اور یہ تاکید بھی کی تھی
کہ آپ کو ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ جب آپ خود ہی ناشتے کے
لیے نیچے آئیں تو یہ لفافہ آپ کے حوالے کر دیا جائے۔''
جاسم نے ریسپشنسٹ کے ہاتھ سے وہ لفافہ لے کر
دیکھا تو اس پر ایک نام ''ثوبان قاسم'' لکھا نظر آیا۔
''بہت شکریہ......!'' جاسم نے مسکراہٹ کے ساتھ
کہا۔
''یو آر ویل کم سر......!''
''میں اپنے روم میں چند گھنٹے آرام کرنا چاہتا
ہوں۔'' جاسم نے معتدل انداز میں کہا۔ ''جب تک میں خود
نہ چاہوں، مجھے کوئی کال نہیں دینا۔ اگر کوئی مجھ سے ملنے
آئے تو اسے انتظار کرنے کو کہیں۔ امید ہے، آپ میری
بات سمجھ گئی ہوں گی؟''
''شیور سر۔'' ریسپشنسٹ نے دل آویز مسکراہٹ
جاسم کی جانب اچھالتے ہوئے یقینی لہجے میں کہا۔ ''ہوٹل
ایجنسی اپنے مہمانوں کا ہر لحاظ سے خیال رکھتا ہے، خصوصاً
ان کے آرام اور سکون کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔''
''گڈ......!''
''اس کے علاوہ بھی اگر کوئی خدمت ہو تو مجھے ضرور
بتائیے گا۔''
''ہاں...... کیوں نہیں!'' جاسم نے سر کی ہلکی جنبش
کے ساتھ معتدل انداز میں کہا اور اپنے کمرے کی جانب
بڑھ گیا۔
''ثوبان قاسم۔'' جاسم کا نیا نام تھا اور یہ راز ابھی تک
اس نے کسی اور کے ساتھ شیئر نہیں کیا تھا۔ لفافے کے اوپر
ثوبان قاسم لکھا دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ یہ اسی پُراسرار ہستی کا کوئی
کارنامہ ہے جس نے اسے اپنے چمتکارک عمل سے تین سال
آگے یعنی دوہزار بیس سے دوہزار تیئس عیسوی میں پہنچا دیا
تھا۔
کمرے کے اندر آنے کے بعد اس نے مذکورہ
لفافے کو کھول لیا۔ لفافے میں سے ایک پرچہ برآمد ہوا جس
کی مختصر تحریر کچھ اس طرح تھی۔
''ماریا آج دوپہر میں تم سے ملنے آئے گی۔ پہلی
کامیاب پرواز پر تمہیں مبارک ہو۔ اس پلینٹ ارتھ (کرۂ
ارض) پر یہ میرا تم سے آخری تحریری رابطہ ہے۔ اس کے
آگے تمام معاملات کو تمہیں خود ہی ہینڈل کرنا ہے اور میں
جانتی ہوں، تم کر لو گے۔ اگر کبھی مجھ سے ملنے کو دل چاہے تو
میرے پلینٹ پر چلے آنا۔ میں مریخ پر تمہارا بے مثال
استقبال کروں گی۔''
اِیشتار کا وہ دلچسپ پیغام پڑھ کر جاسم کے ہونٹوں پر
معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ ایش نے اسے ٹیلی پورٹیشن
کی ٹیکنیک سکھائی تھی جس کی مدد سے وہ اسی دنیا میں رہتے
ہوئے اِدھر سے اُدھر نادیدہ سفر کر سکتا تھا۔ اس دنیا سے باہر
دوسرے سیاروں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے انٹر
ڈائمینشنل سائنس میں ماہر ہونا ضروری تھا اور انٹر گلیکٹک سفر
تو اس سے بھی آگے کی چیز تھی۔ وہ پیرلل یونیورس (نظر
آنے والی کائنات کے متوازی ایک دوسری نادیدہ
کائنات) کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔
اِیشتار نے ماریا (ناجیہ) کی آمد دوپہر تک بتائی تھی۔
وہ خود بھی آج لنچ پر ناجیہ سے ملنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ جان
کر جاسم کو دکھ ہوا کہ اِیشتار اب اس سے تحریری رابطہ نہیں
کرے گی۔ تاہم یہ بات خوش آئند تھی کہ عالم رؤیا یا رُوبرو
ملنے کے امکان کو اس نے رد نہیں کیا تھا۔ اس نے اِیشتار کی
چند سطری چٹھی کو ضائع کیا اور آئندہ کا لائحہ عمل بنانے میں
مصروف ہوگیا۔
بریف کیس کے اندر سے ملنے والے طویل خط میں
اِیشتار نے جاسم کو اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی اجازت
دے دی تھی۔ ڈیوڈ کی خفیہ محفوظ کمین گاہ میں گھس کر اسے
عبرت ناک سبق سکھانے والی ہنگامی کارروائی اسی سلسلے کی
ایک کڑی تھی۔ اس مشن کی کامیابی کے بعد وہ خود کو کافی ہلکا
پھلکا اور پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔ لیکن ابھی بھی دل کے
ایک کونے میں ناآسودگی کا احساس باقی تھا۔ اس خلش کا
نکل جانا بھی ناگزیر تھا۔
ناجیہ کے آنے میں ابھی کافی وقت تھا۔ اس دوران
میں وہ دل کھول کر اپنے ارمان نکال سکتا تھا۔ اس دجالی
ٹولے نے پچھلے کچھ عرصے میں اس پر بہت زیادہ ادھار
چڑھا دیا تھا۔ مقروض ہونا ایک لعنت تصور کیا جاتا ہے لہٰذا
جاسم نے اس بوجھ کو مرحلہ وار اتارنا شروع کر دیا۔ ڈیوڈ کے
بعد اس کے ذہن میں جو نام چمکا، وہ دجال کی سسرالی رشتے
دار سلور کوئین کا تھا۔ اس عاقبت نااندیش شیطان کی خالہ
نے اپنی طاغوتی پالیسیوں کے ذریعے تمام دنیا کے، خصوصاً
فلسطین کے مسلمانوں کی زندگی کو عذاب ناک بنا رکھا تھا۔
اس سفاک اور بے رحم عورت کو انسانیت چھو کر نہیں گزری
تھی۔ ایک سلور کوئین ہی کیا، دجال کے سارے پیروکار ہی
ایک سے بڑھ کر ایک اوصاف خبیثہ کے مالک تھے۔

جاسم نے سب سے پہلے ہوٹل ریجینسی کے جی پی ایس۔ کوآرڈی نیٹس کو زیرِلب دہرایا۔ اس کے بعد کاسل ٹاؤن میں سلور کوئین کی اقامت گاہ کے جی پی ایس۔ کوآرڈی نیٹس...... زیرو فور پوائنٹ ٹو نائن سیون فائیو ڈگری ویسٹ اینڈ ففٹی فور پوائنٹ زیرو نائن ایٹ تھری ڈگری نارتھ دہرانے کے بعد آنکھیں بند کرلیں اور بڑے اعتماد کے ساتھ، بہ زبانِ خاموشی اس سائنس کی روح مخصوص ''کی نوٹ'' کو دہرادیا۔

''ج عتی ظوم تحظیم عن فوادرا!''

جب اس نے آنکھ کھولی تو خود کو ایک ڈریسنگ روم میں پایا۔ وہ کسی بوتیک یا سیلون کا نہیں بلکہ ابلیس کی مریدن سلور کوئین کا ڈریسنگ روم تھا۔ ڈریسنگ روم سے ملحقہ کمرے سے چند افراد کے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ان میں ایک عورت کی آواز نمایاں اور رعونت سے معمور تھی۔ جاسم کو یہ اندازہ قائم کرنے میں کسی دقت یا دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ وہ پُرغرور اور حاکمانہ آواز خبیث الاخبث سلور کوئین کی تھی۔ یہ وہی وقت تھا جب سلور کوئین اپنے تین زائد المیعاد عمروں والے نائبین سے آج کی تاریخ میں دوسری بار میٹنگ کررہی تھی۔

ڈریسنگ روم کا دروازہ اگرچہ بند تھا لیکن دروازے کے چوبی پٹ کے زیریں حصے میں، فرش اور دروازے کے درمیان ایک انچ کے برابر دائیں سے بائیں افقی خلا تھا جس کے توسط سے، دوسری جانب ہونے والی گفتگو کرسٹل کلیئر جاسم کی سماعت تک پہنچ رہی تھی۔ وہ فرش پر بیٹھ گیا اور اپنی توجہ کو دوسری سمت مرکوز کردیا۔ جاسم مطمئن تھا کہ جب تک وہ محفلِ نامعقولاں برخاست نہ ہو جاتی سلور کوئین کا ڈریسنگ روم کی طرف آنے کا کوئی امکان نہیں تھا اور جہاں تک باقی تین گھوسٹ یہودی اکابرین کا معاملہ تھا تو ان میں سے کوئی ڈریسنگ روم میں قدم رکھنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ تو سانس بھی اپنی میم کی اجازت ہی سے لیا کرتے تھے۔

لگ بھگ آدھے گھنٹے کے اس ہنگامی اجلاس نے جاسم کی معلومات میں گراں قدر اضافہ کردیا تھا۔ وہ دجالیوں کی ازلی ابدی مکاریوں اور مستقبل کے حوالے سے ان کی ناپاک پالیسیوں سے بھی کماحقہٗ آگاہ ہوگیا تھا۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ اس کاسل میں سلور کوئین کے علاوہ اس کا ملازم خاص بنجامن اور دو مسلح سیکیورٹی گارڈز بھی موجود تھے جن کے نام رافیل اور نکسن معلوم ہوئے تھے۔ یہ سن کر جاسم کو حیرت ہوئی تھی کہ ہائی کمان کی طرف سے سلور کوئین کی حفاظت کے لیے دو سیکیورٹی گارڈز اس لیے اس قدیم کاسل میں بھیجے گئے تھے کیونکہ اوپر والوں کو اس بات کا یقین تھا کہ ڈیوڈ کی جھوٹی عظمت کی ناک کاٹنے والا وہ جارحیت پسند شخص سلور کوئین کو نقصان پہنچانے کے لیے یہاں بھی آئے گا، یہ الگ بات کہ وہ تین چار گھنٹے میں اس بندے کی آمد کی توقع نہیں کررہے تھے۔ اس کے حساب کے مطابق، مرد مذکور کو آئندہ روز دوپہر کے بعد یا پھر شام میں اس کاسل تک پہنچنا چاہیے تھا۔ بہرکیف...... قدرت کی مصلحتوں کے سامنے انسانی اندازے دھرے رہ جاتے ہیں، چاہے انہیں قائم کرنے والا کوئی دجالی عبقری ہی کیوں نہ ہو۔

عام طور پر ٹارگٹ مشنز میں، اپنے شکار تک پہنچنے کے لیے متعدد مسلح محافظوں سے نمٹنا پڑتا ہے، اس کے بعد ہی مطلوبہ بندے یا بندی تک رسائی حاصل ہو پاتی ہے لیکن یہاں معاملہ اس کے بالعکس تھا۔ جاسم اس وقت سلور کوئین سے چند قدموں کی دوری پر، ڈریسنگ روم میں ہائی الرٹ موجود تھا اور اس کے تین محافظ کاسل میں اِدھر اُدھر سیکیورٹی کے نام پر جھک ماررہے تھے۔

جب تینوں یہودی اکابرین وہاں سے رخصت ہو گئے تو جاسم نے ڈریسنگ روم سے باہر نکلنے کا فیصلہ کرلیا۔ ٹیلی پورٹیشن کے پہلے کامیاب تجربے نے اس کے اعتماد کو فولادی قوت عطا کردی تھی۔ بزدل تو وہ پہلے بھی نہیں تھا مگر اب معاملہ کچھ اور ہوگیا تھا۔ اس نے بہ آہستگی ڈریسنگ روم کا دروازہ کھولا اور کوئی آواز پیدا کیے بغیر وہ باہر نکل آیا۔ اب وہ ایک شاہانہ نشست گاہ میں تھا۔

جاسم نے سلور کوئین کی تلاش میں نگاہ دوڑائی تو وہ ایک قیمتی اور آرام دہ صوفہ نما نشست پر براجمان نظر آئی لیکن اس کا چہرہ دوسری جانب تھا۔ گویا وہ اپنے ٹارگٹ کے عقب میں موجود تھا۔ اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور بلی کے مانند دبے قدموں سلور کوئین کی سمت بڑھنے لگا۔

ابھی وہ بمشکل دو قدم ہی چل پایا تھا کہ سلور کوئین نے اپنے علاوہ وہاں کسی اور کی موجودگی کو محسوس کرلیا۔ اس کے بدن میں اضطراری کیفیت رونما ہوئی اور اس نے ایک جھٹکے سے گردن گھما کر اپنے عقب میں دیکھا۔

ایک ہی وقت میں دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور ان کے چہروں پر مختلف قسم کے تاثرات نمودار ہوئے۔ جاسم کے چہرے پر حیرت اور سلور کوئین کے چہرے سے خوف کا تاثر نمایاں ہورہا تھا۔ جاسم کے سامنے اس وقت

ھوں دلوں کی دھڑکن جرمنی کی معروف ٹینس کھلاڑی اسٹیفی
راف موجود تھی اور سلور کوئین اس جنگجو بندے کے رُوبرو
تھی جس نے ڈیوڈ کی ڈیوڑھی توڑ پھوڑ ڈالی تھی۔
''جاسم! تم یہاں کیسے پہنچ گئے......؟'' سلور کوئین
نے حد درجہ حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے سراسیمہ لہجے میں
چھا اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔
''اسٹیفی گراف! تم یہاں کیسے پہنچ گئیں؟'' جاسم نے
کی بہ ترکی استفسار کیا اور ایک قدم آگے بڑھ کر ان الفاظ
ں اضافہ کر دیا۔ ''تم میری پسندیدہ ٹینس پلیئر ہو۔ میں نے
یشہ تمہیں ٹی وی اسکرین پر ٹینس بال کی پٹائی کرتے دیکھا
ہے۔ ویسے میری ہمیشہ سے تمنا رہی ہے کہ کبھی آمنے سامنے
ملاقات ہو مگر یہ توقع نہیں تھی کہ تم ٹینس کی دنیا کو خیرباد کہنے
کے بعد مکار یہودیوں کی آلہ کار بن کر ان کے مکروہ مشن کا
حصہ بن جاؤ گی۔ تمہارے نازی لیڈر ہٹلر نے تو یہودیوں کا
بینڈ باجا بجا کر رکھ دیا تھا اور تم انہی کے ہاتھ پاؤں مضبوط
کرنے میں لگی ہوئی ہو......؟''
اس بات چیت کے دوران میں جاسم دو قدم مزید
آگے بڑھ آیا تھا۔ اب ان دونوں کے درمیان چھ سے
سات فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ سلور کوئین نے اپنی اضطراری
کیفیت پر قابو پانے کے بعد سپاٹ آواز میں کہا۔
''تمہیں کوئی شدید نوعیت کی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں
ٹینس اسٹار اسٹیفی گراف نہیں ہوں، بس اس کے جیسی دکھتی
ہوں اور...... اور تم مجھ سے دور رہو......''
''کیسا حسین اتفاق ہے کہ ہم دونوں کو ہی غلط فہمی ہو
گئی ہے۔'' جاسم نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں جاسم نہیں
ہوں۔ ہاں، مگر قد کاٹھ اور جسامت میں اس کے جیسا نظر آتا
ہوں گا اور...... اور مجھے کسی بدبودار یہودن کے قرب کی
خواہش نہیں ہے۔ ویسے یہ جاسم ہے کون جسے تم نے اتنی
شدت سے یاد رکھا ہوا ہے؟''
سلور کوئین نے ٹٹولتی نظر سے جاسم کو گھورا اور چبھتے
ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''جب تم جاسم نہیں ہو تو پھر تمہیں کیسے
پتا کہ تمہاری قامت اور جسامت اس کے جیسی ہے؟''
''یہ تو ابھی تم ہی نے مجھے بتایا ہے کہ میں جاسم جیسا
لگتا ہوں۔'' جاسم نے اسے دماغی طور پر الجھانے کی کوشش
کرتے ہوئے کہا۔ ''ویسے میرا نام ثوبان ہے۔ تم اگر واقعتاً
اسٹیفی گراف نہیں ہو تو پھر کون ہو؟'' وہ ایک قدم مزید آگے
بڑھ آیا اور پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے...... کیا ہم آرام سے
بیٹھ کر بات نہیں کر سکتے؟''

سلور کوئین چند لمحات تک سوچتی نظر سے اسے دیکھتی
رہی پھر ذہانت بھرا سوال کیا۔ ''جب تم جاسم ہونے سے
انکاری ہو تو پھر تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں ایک یہودن
ہوں اور کسی بڑے کاز کے لیے کام کر رہی ہوں؟''
ان دونوں کی رُوبرُوئی کے موقع پر سلور کوئین کے
اعصاب چند لمحات کے لیے تناؤ میں آگئے تھے اور کسی حد
تک حواس بھی مختل ہو گئے تھے تاہم فوراً سے پیشتر اس نے
خود پر قابو پالیا تھا اور اب وہ پہلے والی سلور کوئین نظر آرہی
تھی۔ آہنی اعصاب اور فولادی ارادوں کی مالک ایک سنگ
دل اور سفاک دجالی کارکن......
''صرف میں ہی نہیں بلکہ باقی تین بھی دجالی مشن
سے تعلق رکھنے والے یہودیوں کو اچھی جانتے جانتے
ہیں......'' جاسم نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔
''باقی تین......؟'' سلور کوئین کے ماتھے پر الجھن
کے آثار نمودار ہوئے۔ ''تم کن تین کی بات کر رہے ہو؟''
''ہم کل چار ہیں اور دیکھنے میں بالکل ایک ہی جیسے
لگتے ہیں......'' جاسم نے منفی ذہانت کی علم بردار سلور کوئین کو
اپنی مثبت ذہانت کے شکنجے میں کستے ہوئے گہری سنجیدگی
سے کہا۔ ''جن میں سے ایک ثوبان یروشلم میں سرگرمِ عمل
ہے، دوسرا ثوبان بویریا میں اپنی ذمے داری نبھا رہا ہے،
تیسرے ثوبان نے آج صبح جیمس ٹاؤن میں ڈیوڈ نام کے کسی
نمرودی عزائم رکھنے والے شخص کو اس کی اوقات یاد دلائی
ہے اور چوتھا ثوبان یعنی میں، اس وقت سلور کوئین کے
سامنے کھڑا ہوں اور...... کیا ہم بیٹھ کر بات نہیں کر
سکتے......؟''
جاسم کے جواب نے سلور کوئین کو گڑبڑا کر رکھ دیا۔
قبل اس کے کہ وہ اس کے سوال پر کچھ کہتی، جاسم دو قدم اور
آگے بڑھ آیا پھر طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے وہ اس کی
مخصوص شاہانہ نشست کے سامنے بچھے صوفے پر جا بیٹھا اور
شاکی لہجے میں کہا۔
''مجھے یقین نہیں آرہا کہ تمہارے جیسی حسین و جمیل
عورت اتنی بداخلاق بھی ہو سکتی ہے کہ گھر آئے مہمان کو بیٹھنے
کے لیے کہنے کی بھی توفیق نہیں ہے تمہیں...... ویری بیڈ سلور
کوئین!''
''مہمان...... اور وہ بھی بن بلایا......!'' سلور کوئین
نے زہریلے انداز میں کہا اور اپنی نشست پر براجمان
ہونے کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''تمہارے پاس
صرف دس منٹ ہیں۔ جو بھی کہنا ہے، کہو اور یہاں سے چلتے

بنو ورنہ میں تمہارے خلاف کوئی سخت قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاؤں گی......"

"سخت قدم اٹھانے کی باری تو ہم فلسطینی مسلمانوں کی ہے۔" جاسم نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مُعاندانہ لہجے میں کہا۔ "کیا تم لوگوں نے ہم پر ظلم و ستم ڈھانے میں کوئی کسر چھوڑی ہے؟"

"میں نے یہ دس منٹ تمہاری بکواس سننے کے لیے نہیں دیے!" سلور کوئین نے پُرغرور انداز میں کہا۔ "تم نے ڈیوڈ، سلور کوئین، یروشلم اور یوریا کا ذکر کر کے اپنے لیے، میری دلچسپی کو اجاگر کر دیا ہے۔ اگر تم نئے دور کے یاسر عرفات بن کر ہمارے سامنے آ ہی گئے ہو تو اپنا مدعا بیان کرو۔ ابھی تک میں سمجھ نہیں پائی ہوں کہ تم اس کاسل میں داخل کیسے ہوئے ہو لیکن یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ یہاں سے تمہاری روح ہی واپس جائے گی۔ تمہارے ہاتھ پاؤں توڑ کر اذیت ناک موت سے ہم کنار کرنے میں مجھے مزہ آئے گا۔ تم نے میرے ریکٹ...... میرا مطلب ہے، اسٹیفی گراف کے ریکٹ سے ٹینس بال کی دھنائی ہوتے دیکھی ہے لیکن تم بالکل نہیں جانتے کہ میں تمہارے ساتھ کیا کرنے والی ہوں لہٰذا مرنے سے پہلے اپنے فلسطینی بھائیوں کا جھوٹا مقدمہ پیش کرو۔ میں تمہاری گزارشات سننے کو تیار ہوں حالانکہ تمہاری بدبختی تمہیں غلط وقت پر، غلط جگہ لے آئی ہے۔ تمہارا دس منٹ کا ٹائم شروع ہوتا ہے۔"

اِدھر سلور کوئین کی بات ختم ہوئی، اُدھر اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ سلور کوئین نے ڈسپلے پر نگاہ ڈالی اور ہاتھ کے اشارے سے جاسم (ثوبان) کو رکنے کا کہہ کر کال ریسیو کر لی۔ دوسری طرف اس کا گھریلو ملازمِ خاص بنجامن تھا۔

"میم! ان تینوں کے جانے کے بعد آپ مجھے کوئی کام بتانے والی تھیں۔" بنجامن نے فدویانہ انداز میں کہا۔

"ہاں، مجھے یاد ہے۔" سلور کوئین نے سرسری لہجے میں کہا۔ "میں تھوڑی دیر میں تمہیں اپنے پاس بلاتی ہوں۔ تمہارے نئے ساتھی کیا کر رہے ہیں؟"

"رائیل گیٹ کے نزدیک پوری طرح مستعد ہے۔" بنجامن نے بتایا۔ "اور نکسن گھوم پھر کر کاسل کے مختلف حصوں کی نگرانی کر رہا ہے۔"

"ویری گڈ!" سلور کوئین نے ستائشی انداز میں کہا۔ "اور تم بھی چوکس رہنا۔ میں ایک ضروری کام میں مصروف ہوں۔ اسے نمٹانے کے بعد تمہیں کال کرتی ہوں۔"

پھر دوسری جانب سے بنجامن کا جواب سنے بغیر اس نے سیلولر رابطہ موقوف کر دیا اور جاسم کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی رعونت سے کہا۔ "شروع ہو جاؤ......"

"معاملہ گزارشات سے بہت آگے بڑھ چکا ہے۔" جاسم نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر طوفانی لہجے میں کہا اور یکایک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "اب تو مظلوم فلسطینیوں کے ہاتھوں اور تم لوگوں کے گریبانوں کے بیچ کھینچا تانی کا عالمی مقابلہ منعقد ہونے جا رہا ہے۔ تمہیں ایک ایک زیادتی کا حساب دینا ہوگا۔"

"تم اپنے دس منٹ کو بڑی بیدردی سے ضائع کر رہے ہو جاسم!" سلور کوئین نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "تمہاری جار ثوبان والی کہانی نے مجھے بالکل متاثر نہیں کیا۔ میں صرف یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تم نے کم و بیش آٹھ ہزار کلومیٹرز کا سفر محض تین گھنٹے میں کیسے طے کر لیا۔ باقی جہاں تک میرا وجدان کام کرتا ہے، اس کے مطابق تم جاسم ہی ہو۔ تم نے کسی ماہر میک اپ آرٹسٹ سے اپنے حلیے میں کچھ خاص تبدیلیاں کرا رکھی ہیں اسی لیے پہچان میں نہیں آ رہے ہو لیکن یہ مت بھولو کہ میں نے تمہاری ہسٹری کو بڑی باریک بینی سے اسٹڈی کر رکھا ہے۔ تم نے چند گھنٹے پہلے ڈیوڈ کو جو اذیت ناک سزا دی ہے، وہ تمہارے ماضی کے ایک عمل کا عکس ہے۔ جن دنوں تم کراچی کی جیل میں ایک ناکردہ جرم کی سزا کاٹ رہے تھے تو تم نے اپنے ایک دشمن راجو کے ساتھ بھی ایسا ہی بہیمانہ برتاؤ کیا تھا۔ تم لاکھ خود کو چھپانے کی کوشش کر لو لیکن مجھے تمہارے جاسم ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ تم فلسطینی مسلمانوں کے حقوق کا راگ الاپ کر مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ تمہارا مسئلہ فلسطین ہے اور نہ ہی وہاں کے مسلمان۔ میں جانتی ہوں کہ تم کس خاردار راہ پر دوڑنے کی غلطی کر رہے ہو، خیر......" وہ لمحے بھر کو رکی پھر نہایت ہی سفاکی سے کہا۔

"تم مختلف مواقع پر ہمیں اس بات کا یقین دلا چکے ہو کہ تمہیں اپنا نہیں بنایا جا سکتا اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ تمہیں، تمہارے حال پر چھوڑ دیا جائے۔" سلور کوئین نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ "تم ہمیں اتنا زیادہ نقصان پہنچا چکے ہو کہ ہم تمہیں زندہ چھوڑ دینے کا رسک نہیں لے سکتے۔ شاید تمہاری موت میرے ہی ہاتھوں لکھی تھی جو بدقسمتی سے یہاں چلے آئے ہو۔ میں تمہارا ایجنڈا تمہارے ساتھ ہی اس کاسل میں دفن کر دوں گی۔"

بات ختم کرتے ہی سلور کوئین فائٹنگ اسٹانس میں

آ گئی۔ جاسم نے اُس کے کھڑے ہونے کے انداز میں بازوؤں کی پوزیشن سے اندازہ لگالیا کہ دجال کی وہ لونڈی مکس مارشل آرٹس میں مہارت رکھتی تھی۔ جاسم نے اس کے سامنے، ایک محفوظ سیلف ڈیفنس پوز بناتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تم نے مجھے بولنے کے لیے دس منٹ دیے تھے اور اس مختصر مدت میں سے بھی آٹھ منٹ تمہاری دجالی بکواس کی نذر ہو گئے جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تم لوگ دوسروں کے حقوق پر کس طرح ڈاکا ڈالتے ہو۔ میں عموماً عورتوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتا اس لیے ایک تمہی کو کرنا ہوگا۔ میں تو بس، اپنا تحفظ کروں گا اور اس کوشش میں جواباً میرا بھی ہاتھ اٹھ جائے تو اسے نظریۂ ضرورت سمجھ لینا' کیونکہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہو جاتا ہے۔ محبت میں تم سے کر نہیں سکتا اور جنگ تم نے مجھ پر مسلط کر دی ہے۔"

"مجھے ایک کی دعوت دے رہے ہو تو...... لو سنبھلو!" سلور کوئین نے جارحانہ انداز میں کہا۔

بات کے اختتام پر وہ کسی اسپرنگ کے مانند اچھل کر فضا میں بلند ہوئی پھر ایک تیز رفتار...... سائڈ فلائنگ کک جاسم کے سر پر مارنے کی کوشش کی۔ کوشش اس لیے کہ جاسم کوئی سینڈ بیگ نہیں تھا جو چپ چاپ اس کی کک کھا لیتا۔ سلور کوئین کے بلند ہوتے ہی وہ اس کے خطرناک ارادے کو بھانپ گیا تھا۔ اس نے اپنے قدموں پر کھڑے کھڑے کمر کے ٹوئسٹ سے جسم کے بالائی حصے کو سائڈ میں نکالا اور دفاعی وار کر دیا۔

سلور کوئین کا ٹارگٹ جاسم کا سر تھا مگر جاسم کی میکانکی پھرتی کے نتیجے میں اس کے سر کی پوزیشن پہلے والی نہیں رہی تھی چنانچہ سلور کوئین کی کھلی ٹانگ جیسے ہی اس کے سامنے سے گزری، اس نے سلور کوئین کی پشت کو بڑی مہارت سے پش دے دیا۔ سلور کوئین فضا میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے بجائے وہ کسی ٹوٹے ہوئے تارے کے مانند بے ڈھنگی پرواز کرتے ہوئے اس صوفے پر جا گری جہاں چند سیکنڈ پہلے جاسم بیٹھا ہوا تھا۔

جاسم نے لپک کر سلور کوئین کی شاہانہ نشست سنبھال لی اور زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "بعض لوگ شرافت کی زبان سمجھ جاتے ہیں لیکن تمہارے جیسے نامعقول اڑیل افراد کی سمجھ اس وقت تک کام کرنے کو آمادہ نہیں ہوتی جب تک انہیں ان کے مقام سے نہ گرایا جائے۔ اگر تمہارے ہوش ٹھکانے آ گئے ہوں تو مقصد کی بات کریں......؟"

"بھاڑ میں گیا تمہارا مقصد......!" وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو مشینی انداز میں عجیب سی حرکت دیتے ہوئے غصیلے لہجے میں بولی۔ "تمہاری یہ ہمت کہ تم میری سیٹ پر جا بیٹھو......" اس نے اپنے ہاتھوں کو ایسے گھمایا جیسے اس نے کوئی نادیدہ فٹ بال تھام رکھا ہو۔ "میں تمہیں برباد کر دوں گی جاسم!" اس نے غضب ناک انداز میں کہا اور مذکورہ فرضی فٹ بال کو جاسم کی طرف پھینک دیا۔

بادی النظر میں سلور کوئین کی یہ اضطراری حرکت جاسم کو انتہائی بچکانا سی لگی تھی۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ دجال کی کنیز نے بھونڈے انداز میں اپنی جھنجلاہٹ کا اظہار کیا ہے لیکن اگلے ہی لمحے اس کی سوچ کا فیوز اُڑ گیا۔ جاسم جسے کوئی خیالی فٹ بال سمجھ بیٹھا تھا، وہ درحقیقت توانائی سے بھرا ہوا ایک نادیدہ گولا تھا جو سیدھا آ کر اس کے سینے پر لگا تھا۔

سلور کوئین کے پھینکے ہوئے اس غیر مرئی گولے کے اندر بے پناہ حرکی توانائی بھری ہوئی تھی۔ اس نے اپنی کسی پُراسرار مخفی قوت کو ہتھیار کی شکل دے کر جاسم پر نادیدہ وار کیا تھا۔

سلور کوئین کا یہ وار کارگر ثابت ہوا۔ چشم زدن میں جاسم سلور کوئین کے سنگھاسن سمیت پیچھے کو الٹ گیا۔ جب تک جاسم اپنی میزبان کی مسند سے "جان چھڑا" کر کھڑا ہوتا، وہ آندھی اور طوفان کی رفتار سے اس کے سر پر پہنچ گئی تھی۔ پھر اس نے جاسم کو اٹھنے کا موقع نہیں دیا اور اس کے بدن کے مختلف حصوں پر اس نے تابڑ توڑ متعدد ٹھوکریں رسید کیں۔ پھر جاسم کو بھی موقع مل گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو بچا رہا تھا کہ اسی کوشش میں سلور کوئین کا ایک پاؤں اس کی گرفت میں آ گیا۔

جاسم نے جسم و جان کی پوری طاقت لگا کر اس کے پاؤں کو مضبوطی سے پکڑ کر کسی گاڑی کے اسٹیئرنگ کے مانند گھما دیا۔ جاسم کی اس غصیلی حرکت میں سلور کوئین کے لیے نفرت کا سمندر موج زن تھا۔ سلور کوئین کی فائٹنگ اسکل اور ماورائی طاقت سے انکار ممکن نہیں مگر جاسم کے مردانہ ہاتھوں کے مروڑے نے اس کی ساری پھرتی حلق کے راستے نکال باہر کی تھی جس کے نتیجے میں وہ تکلیف کی شدت سے کراہ اٹھی تھی اور لوٹ پوٹ ہو کر دور جا گری تھی تاہم اس نے اٹھنے میں ذرا دیر نہیں لگائی۔ اگلے ہی لمحے وہ دونوں ایک مرتبہ پھر رُوبرو کھڑے ایک دوسرے کو کینہ توز نظروں سے گھور رہے تھے۔

"میں اپنے اس اصول کا پابند نہیں رہا کہ میں عورتوں

پر ہاتھ اٹھانے کا قائل نہیں ہوں۔'' جاسم نے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔ ''تم نے مجھ پر حملہ کر کے مجھے جوابی حملے کی راہ دکھا دی ہے مگر میں سمجھ نہیں پارہا ہوں کہ تم نے میری طرف کیا پھینکا تھا؟''

''کیا تم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ تمہارے سوا اور کوئی اپنے وجود کی خفیہ طاقتوں سے کام نہیں لے سکتا؟'' سلور کوئین نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔ ''آج میں تمہیں موت کے گھاٹ اتارنے سے پہلے یہ احساس دلاؤں گی کہ اگر تم سوا سیر ہو تو کوئی ڈیڑھ سیر بھی ہو سکتا ہے۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے اپنے ہاتھوں کو اون لپیٹنے والے انداز میں، گولائی میں حرکت دینا شروع کی۔ جاسم سلور کوئین کی اس عجیب حرکت کا مزہ ''چکھ'' چکا تھا لہٰذا اس نے وہ پُراسرار عمل مکمل ہونے سے پہلے ہی اس پر جست لگا دی۔

جاسم کی یہ چھلانگ اتنی اچانک اور سریع الاثر تھی کہ سلور کوئین کا توازن بگڑ گیا اور وہ دونوں ایک دوسرے کو لیتے ہوئے دور تک لڑھکتے چلے گئے۔ ان کا یہ غیر اختیاری سفر اس نشست گاہ کی ایک دیوار کے پاس جا کر ختم ہوا۔ اگلے ہی لمحے وہ ایک بار پھر تن کر بہ مقابل آ چکے تھے کیونکہ انہوں نے فرش سے اٹھنے میں ایک ذرا سی تاخیر سے کام نہیں لیا تھا۔

سلور کوئین نے یکے بعد دیگرے جاسم کو تین فرنٹ کک رسید کیں۔ جاسم نے بیک فٹ پر جاتے ہوئے اس کے یہ مہلک وار خالی دیے اور سلور کوئین کی تیسری کک کی تکمیل کے ساتھ ہی جوابی حملہ بھی کر دیا۔ یہ جاسم کی ایک طوفانی وھیل کک تھی۔ سلور کوئین اپنا دفاع نہ کر سکی۔

جاسم کے پاؤں کی ایڑی سلور کوئین کی ٹھوڑی پر لگی اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو تھام کر ریورس گیئر میں چار قدم پیچھے چلی گئی۔ جاسم یہی سمجھا کہ اس کے وار نے سلور کوئین کی مت مار دی ہے لیکن یہ جاسم کی غلط فہمی تھی۔ سلور کوئین درحقیقت جاسم سے دور جانا چاہتی تھی تا کہ وہ اپنی پُراسرار قوت کا استعمال کر کے جاسم کو زیر کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

وہ جیسے ہی جاسم سے کچھ فاصلے پر گئی، اس نے اپنے ہاتھوں کو ایک مرتبہ پھر اس انداز میں گھمانا شروع کیا جیسے اس نے کوئی فٹ بال تھام رکھا ہو۔ یہ بات اچھی طرح جاسم کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ اگر سلور کوئین اپنے اس شیطانی عمل میں کامیاب ہو گئی تو منفی توانائی کا ایک خطرناک گولا اس کے بدن سے متصادم ہو گا اور وہ اس ناخوشگوار تجربے کو دہرانے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا۔

جاسم نے سلور کوئین کے ہاتھوں کی جادوئی حرکت کی تکمیل سے پہلے ہی ایک چوبی میز اٹھا کر اس کی طرف پھینک دی اور خود وہ قالین پوش فرش پر رولنگ کرتے ہوئے سلور کوئین کے پہلو میں پہنچ گیا۔

سلور کوئین نے جاسم کی چالاکی کو بھانپنے کے بعد اپنے عمل کو روک کر، خود کو میز سے بچانے کی غرض سے سائڈ میں لوٹ لگا دی۔ بدقسمتی سے یہ وہی جانب تھی جہاں جاسم پہلے سے موجود تھا۔ وہ لوٹ لگانے کے بعد جیسے ہی سنبھلی، جاسم نے اس کے چہرے کو نشانہ بنا کر ایک فٹ بال کک چلا دی۔

اب کی بار تکلیف کی شدت کا لیول کچھ زیادہ ہی تھا۔ سلور کوئین کے حلق سے ایک اذیت ناک چیخ خارج ہوئی اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی پھر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس نے جاسم پر مکوں کی بارش کر دی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کوئی ہیوی ویٹ باکسر ہو اور جاسم کو پنچنگ بیگ سمجھ کر پریکٹس کر رہی ہو۔

جاسم نے اس کے ایک لیفٹ اور دو رائٹ ہک پنچ کو بڑی مہارت سے بلاک کیا اور دھکا دے کر اسے پیچھے ہٹا دیا۔ سلور کوئین کی ناک سے خون جاری ہو چکا تھا۔ جاسم کی فٹ بال کک نے اس کی ناک کا نقشہ بدل ڈالا تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ جاسم اسے پُراسرار عمل کرنے کا موقع بھی نہیں دے رہا تھا اور جاسم سمجھ چکا تھا کہ اگر اس دجال کی خدمت گار کے جادوئی عمل سے محفوظ رہنا ہے تو اس کے ہاتھوں کو ناکارہ بنانا ہو گا۔ اگر سلور کوئین کے ہاتھ حرکت کے قابل نہ رہتے تو وہ سفلی توانائی کے گولے تیار کر کے جاسم پر نہیں پھینک سکتی تھی۔

سلور کوئین نے اپنی آستین کی مدد سے، ناک سے نکلنے والے لہو کو پونچھا اور جارحانہ انداز میں جاسم پر تین حرکاتی حملہ کر دیا۔ وہ برق رفتاری سے آگے بڑھی اور ایک کریسنٹ کک چلانے کے بعد اپنا دایاں گھٹنا جاسم کے پیٹ میں مارا اور ایک پنچ اس کی ناک پر جمانے کی کوشش کی تا کہ ''جان کے بدلے جان'' کے مصداق گھائل ناک کے بدلے گھائل ناک کی حجت تمام ہو جائے۔

جاسم اس کے ہنر سے آگاہ ہو چکا تھا لہٰذا اس نے بیدار مغزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سلور کوئین کی کریسنٹ

رگ کو بائیں کلائی سے بلاک کیا، پھر دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر اس کے گھٹنے کو اپنے پیٹ تک پہنچنے سے روکا اور جیسے ہی سلور کوئین نے اپنے مکّے سے اس کی ناک کو نشانہ بنانا چاہا، اس نے اندر آ کر بڑی سرعت سے اس کے بازو کو اپنے بائیں بازو کی لپیٹ میں لے کر اوپر کو اٹھایا اور مقبوضہ شانے کے جوڑ پر ایک دھواں دھار فرنٹ پنچ رسید کر دیا۔

یہ ایک خطرناک ڈبل اٹیک تھا۔ سلور کوئین کی کہنی اور کندھے کے جوڑ ایک ساتھ ناکارہ ہونے کے بعد سلور کوئین کے لیے کسی کام کے نہ رہے۔ وہ لٹکے ہوئے بے جان دائیں بازو کے ساتھ فلک شگاف آواز میں چلّا اٹھی۔ جاسم نے ایک لمبا اسٹیپ لے کر اس کے سینے پر سائیڈ پش کک رسید کر دی۔

سلور کوئین کسی توپ کے دہانے سے نکلے ہوئے گولے کے مانند فضا میں ساٹھ درجے کا حادہ زاویہ بناتے ہوئے سُرین کے بل سامنے والی دیوار سے جا ٹکرائی۔ وہ اللہ کی بندی اور دجال کی باندی خاصی سخت جان واقع ہوئی تھی۔ دیوار سے خوف ناک تصادم کو جھیلتے ہوئے وہ اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگی مگر اس کی یہ کوشش کما حقہ، بارآور ثابت نہ ہو سکی اور وہ لڑکھڑا کر دیوار کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئی۔

جاسم کو اس کی حالت پر ذرا سا بھی ترس نہ آیا۔ اس نے ایک اسٹیپ لیا اور فرنٹ پریشر کک سلور کوئین کے سلامت بائیں ہاتھ پر رسید کر دی۔ یہ وہی ہاتھ تھا جو سہارے کے لیے اس نے دیوار کے ساتھ ٹکا رکھا تھا۔ جاسم کی طاقتور کک نے سلور کوئین کے بائیں بازو کی کلائی پر وہ قیامت ڈھائی کہ وہ دھڑام سے نیچے قالین پوش فرش پر گری۔ اب وہ دونوں ہاتھوں کو حرکت دینے کے قابل نہیں رہی تھی، گویا جاسم نے اس کی پُراسرار شکتیوں کی بیٹری ڈاؤن کر دی تھی۔

ابھی تک سلور کوئین کے کسی محافظ نے اس نشست گاہ میں جھانکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی حالانکہ وہ دو سے تین بار کرب ناک انداز میں چیخی بھی تھی۔ اس سے جاسم کو یہ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ وہ سٹنگ روم مکمل طور پر ساؤنڈ پروف تھا لیکن احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ جاسم کو اپنا کام جلد از جلد نمٹا لینا چاہیے تھا لہٰذا اس نے سلور کوئین کی دونوں ٹانگوں کو پکڑ کر ہاتھ رکشا کے مانند فرش پر گھسیٹنا شروع کر دیا۔ اگرچہ سلور کوئین کا حشر نشر ہو چکا تھا، اس کے باوجود بھی وہ درد بھرے لہجے میں مستفسر ہوئی۔

"تم مجھے کہاں لے کر جا رہے ہو؟"

"مردار جانوروں کو کہاں لے جایا جاتا ہے؟" جاسم نے پوچھا۔

وہ نخوت بھرے انداز میں بولی۔ "یہ تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو۔"

"ٹھیک صرف ان لوگوں کے ساتھ کیا جاتا ہے جو دوسرے انسانوں کو بھی اپنے برابر کا انسان سمجھ کر ان کے ساتھ انسانیت بھرا برتاؤ کرتے ہیں۔" جاسم نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔ "مگر تم تو انسانوں خصوصاً فلسطینی مسلمانوں کو بھیڑ بکریوں اور کیڑے مکوڑوں سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے ہو اسی لیے صبح و شام تم ان کی نسل کشی میں مصروف رہتے ہو۔"

"ہم جو بھی کرتے ہیں، وہ انسانیت کے وسیع تر مفاد کے لیے ہوتا ہے۔" وہ مسلسل کراہ رہی تھی مگر اس کے لہجے کی فرعونیت میں ذرہ برابر کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ "لیکن یہ باریک باتیں تم جیسے کوڑھ مغز مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ تم لوگ اول درجے کے احمق ہو......"

"اوکے۔" جاسم نے گھسیٹنے کا عمل جاری رکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ "عقلمندی اور جہالت کے بارے میں، بعد میں بات کریں گے۔ پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ میں پچھلے آدھے گھنٹے سے تمہاری جو درگت بنا رہا ہوں، تمہاری ہائی کمان اس سے ابھی تک بے خبر کیوں ہے۔ کیا تمہارے اس کاسل کی یہ نشست گاہ مانیٹر نہیں کی جاتی؟"

"اوپر والے مجھ پر بھروسا کرتے ہیں۔" وہ اذیت بھرے فخریہ لہجے میں بولی۔ "اس لیے وہ مجھ پر نگرانی بٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ میں اپنے معاملات میں خود مختار ہوں۔"

"ہاں...... کیوں نہیں......!" جام نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "میں تمہاری خودمختاری کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر خوش ہو رہا ہوں...... ویل ڈن میڈم سلور کوئین!"

"اتنا تو بتا دو کہ تم اسد ہو یا پھر جاسم ہو؟" اس نے حسرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"میں جاسم ہوں اور نہ ہی کسی اسد، سعید، سعد یا مسعود کو جانتا ہوں۔" جاسم نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "میرا نام "اللہ کا عذاب" ہے اور یہ عذابِ الٰہی تم جیسے دجال کے مریدوں پر حال ہی میں نازل ہوا ہے......"

وہ سلور کوئین کو قالین پوش فرش پر کھینچتے ہوئے واش روم کے دروازے تک لے آیا۔ اس دوران میں بات چیت کا تلخ و ترش سلسلہ بھی جاری تھا۔

''تم نے ڈیوڈ کو زندہ کیوں چھوڑ دیا؟'' سلور کوئین نے ایک اہم سوال کیا۔

''اس لیے کہ......'' جاسم نے سلگتے ہوئے لہجے میں جواب دیا اور سلور کوئین کو واش روم کے فرش پر پٹخنے کے بعد ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کر دی۔ ''ہمارے ہاں عیبی جانوروں کی قربانی مکروہ سمجھی جاتی ہے۔''

''تت...... تم مجھے...... واش روم میں کیوں لائے ہو......؟'' وہ بکھری ہوئی آواز میں مستفسر ہوئی۔

سلور کوئین کا طمطراق، دم خم اور کس بل تو نکل چکے تھے لیکن وہ اپنی زبان کو روکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ جاسم نے اس کے دونوں گھٹنوں کو اپنے بوٹ کی طوفانی ضربات سے بُری طرح کوٹ ڈالا۔ ان لمحات میں جاسم کی سنگ دلی اور بے رحمی عروج کو پہنچی ہوئی تھی۔ وہ سلور کوئین کو جسمانی، ذہنی اور روحانی عذاب سے بہ یک وقت گزارنے کے عمل میں مشغول تھا۔ اس نے سفاک لہجے میں جواب دیا۔

''کوئی نطفۂ ناتصدیق نبوت کا جھوٹا دعوے دار ہو یا پھر یک چشم، منحوس صورت جعلی مسیا دجال کا پیروکار، ان دونوں قماش کے بدبختوں کی غلاظت بھری موت کے لیے بیت الخلا سے زیادہ موزوں مقام اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔''

''کک...... کیا تم مجھے...... جان سے مار دو گے؟'' وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔

''پیدا کرنا اور مارنا میرے مالک کے ہاتھ میں ہے۔'' جاسم نے اسے اٹھا کر باتھ ٹب کے اندر پھینکا اور پانی کا والو کھولنے کے بعد کہا۔ ''میں تو اس قادرِ مطلق کا ایک معمولی سا بندہ ہوں اور حسبِ توفیق شیطان کے انڈوں اور بچوں کی ''مزاج پُرسی'' میں مصروف رہتا ہوں۔ بس، اتنی سی بات ہے۔''

''میرا دم گھٹ رہا ہے۔'' سلور کوئین نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''مجھے یہاں سے نکالو اور جانے دو۔ میں پھر کبھی تمہارے راستے میں نہیں آؤں گی۔''

رسّی جل گئی تھی مگر اس کے بل ہنوز نظر آ رہے تھے۔

''میں تمہارے راستے میں خود اپنی مرضی سے آیا ہوں۔'' جاسم نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''اس لیے جب تک میں اپنا کام مکمل نہیں کر لوں گا، تمہیں کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ ہاں، البتہ تمہاری بدروح جب چاہے، قفسِ عنصری سے پرواز کرنے کے لیے آزاد ہے۔''

پہلی بار سلور کوئین کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیں نمودار ہوئی۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اس کا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ وہ فریادی لہجے میں بولی۔ ''میرا دم اکھڑ رہا ہے...... مجھے سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی ہے۔''

جاسم نے رکوع کے بل جھک کر سپاٹ آواز میں استفسار کیا۔ ''میں اس باتھ ٹب میں کیا بھر رہا ہوں؟''

''پانی......!'' سلور کوئین نے جواب دیا۔

''پانی کا فارمولا تو تمہیں معلوم ہی ہو گا؟''

''ایچ ٹو او......!'' وہ ہکلائی۔

''ایچ ٹو او (H_2O) میں دو مالیکیولز ہائیڈروجن ہوتے ہیں اور ایک مالیکیول آکسیجن کا'' جاسم نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا۔ ''اور سانس لینے کے لیے آکسیجن ناگزیر ہے۔ اگر تم دم گھٹنے کی کیفیت سے باہر آنا چاہتی ہو تو اس پانی کو اپنی ناک کے راستے پھیپھڑوں تک جانے دو اور...... اور پانی کے اندر موجود آکسیجن کو سانس بحال کرنے کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کرو۔ ان اذیت ناک لمحات میں تمہیں اچھی طرح یہ احساس ہو جائے گا کہ تم لوگوں کی ظالمانہ پالیسیوں نے کس طور فلسطینی معصوم بچوں کی سانسیں چھین لی ہیں۔ وہ لٹ پٹ کر اور گھٹ گھٹ کر مر رہے ہیں مگر تم ابلیس کی جائز اولاد اپنے کالے کرتوتوں کو انسانیت کے وسیع تر مفاد کا نام دیتے ہو۔''

اپنی بات کے اختتام پر جاسم نے اپنے دونوں ہاتھوں سے سلور کوئین کے پُرغرور سر کو غرقِ آب کر دیا اور اس وقت تک اسے دبائے رکھا جب تک اس کے اندر زندگی کی رمق باقی تھی۔ سلور کوئین کی موت کا منظر رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا مگر مجال ہے کہ جاسم کے دل کا کوئی کونا ذرا سا بھی پگھلا ہو۔ وہ پانی سے بھرے ہوئے باتھ ٹب کے اندر ماہیِ بے آب کے مانند تڑپتی اور پھڑکتی رہی اور پھر اس کا جسم ساکت ہو گیا۔

جاسم نے اس کے سر کو اپنے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ سلور کوئین کا بے جان لاشہ پانی کی سطح پر کسی شہتیر کے مانند تیرنے لگا۔ اس کا سارا گھمنڈ، طنطنہ اور اختیار پانی میں حل ہو گیا تھا۔

رہے نام اللہ کا...... باقی سب آنی جانی اور فانی ہے!

☆☆☆

ہوٹل زیجینی کے کمرے میں واپسی پر جاسم نے خوب جم کر غسل کیا، نئے کپڑے پہنے اور ایک قلم و کاغذ جیب میں

رکھ کر وہ کمرے سے نکل آیا۔ ریسیپشن پر پہنچ کر اس نے خوش شکل لڑکی سے کہا۔

"میں یہاں نزدیک ہی جارہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں واپس آجاؤں گا۔ اس دوران میں اگر ماریا نام کی کوئی لڑکی مجھ سے ملنے آئے تو پلیز اسے انتظار کرنے کا کہہ دیں۔"

ریسپشنسٹ نے مسکراہٹ بھرے چہرے کے ساتھ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے ریشم کے مانند نرم لہجے میں کہا۔ "اوکے سر، شیور......!"

"اگر وہ میرے کمرے میں بیٹھ کر انتظار کرنا چاہے تو آپ اسے چابی دے دیں۔ وہ میری فیانسی (منگیتر) ہے۔ ہم اسی ماہ شادی کرنے والے ہیں۔"

ریسپشنسٹ کی مسکراہٹ قدرے گہری ہوگئی۔ "میں سمجھ سکتی ہوں سر۔" اس نے خوش دلی سے کہا۔ "اینی ہاؤ...... آل دی بیسٹ سر!"

جاسم ہوٹل سے باہر نکل آیا اور مٹر گشت کرتے ہوئے کافی آگے نکل آیا۔ سلور کوئین (آنجہانی) کے ساتھ مقابلہ کم اور مار پیٹ زیادہ کرتے ہوئے اس کی حالت بھی خاصی خراب ہوگئی تھی لیکن ایک بھرپور شاور لینے کے بعد وہ تروتازہ ہوگیا تھا۔ اس وقت وہ خود کو خاصا ہلکا پھلکا اور اندر سے خوش محسوس کررہا تھا۔

ایشتار والے خط میں جاسم کو اپنے دل کا غبار اور دماغ کا بخار دھونے کی جو کھلی چھٹی دی گئی تھی، اس حوالے سے اس کے ذہن میں سرِدست دو ہی ٹارگٹ تھے۔ نمبر ایک، ابنِ شیطان ڈیوڈ اور دوسری بنتِ ابلیس سلور کوئین۔ آخر الذکر کو جاسم نے اپنے ہاتھوں سے واصلِ جہنم کیا تھا اور اول الذکر کو کسی بھی وقت مسٹر جیکب کی ٹیم موت کے گھاٹ اتارنے والی تھی۔ ان دونوں تجربات سے گزرنے کے بعد جاسم کو ایشتار کی اس بات پر یقین آگیا تھا کہ دجالی نیٹ ورک کے ڈیوڈ اور سلور کوئین جیسے کارکنان کو ختم کرنے سے ان کے سیٹ اپ پر کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ اس ملعون کے اطاعت گزاروں کی کمی نہیں تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک دجال کا عقیدت مند اپنی بہترین خدمات کے ساتھ انتظار کی قطار میں کھڑا تھا۔ بہرکیف...... ڈیوڈ اور سلور کوئین کو ان کے میرٹ پر سزا دے کر جاسم کے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس نے یروشلم اور بویریا میں بیٹھے ہوئے دجالی نظام کی بساط کے اہم مہروں کے دماغ میں سنگین خطرات کی گھنٹی بھی بجادی تھی۔ اس دنیا میں بازی مارنے کے لیے مخالفین کے دلوں پر آپ کا ڈر اور دہشت قائم رہنا چاہیے۔

بریف کیس کے اندر سے جو کچھ برآمد ہوا تھا، اس سامان میں جاسم کا سیل فون یا کوئی بھی سیل فون موجود نہیں تھا جس سے جاسم نے خود ہی یہ سمجھ لیا تھا کہ ایشتار اس کے سیل فون یا کوئی بھی گیجٹ استعمال کرنے کے حق میں نہیں ہے حالانکہ اس کے لیے لکھے گئے طویل خط میں ایسی کسی ممانعت کا ذکر نہیں تھا۔ گویا اس کے سیل فون استعمال کرنے پر پابندی عائد نہیں کی گئی تھی البتہ ایشتار نے اسے لہسن پیاز اور بیف کھانے سے سختی سے منع کررکھا تھا اور وہ اس پابندی کو دل و جان سے قبول کر بیٹھا تھا۔ اس وقت وہ ہوٹل ریجنسی سے ایک خاص مقصد سے نکلا تھا۔ وہ فوری طور پر اینجیلا سے رابطہ کرنا چاہتا تھا تاکہ اسے حرام موت مرنے سے بچا سکے۔

اینجیلا جاسم کی رشتے دار تھی اور نہ ہی دوست مگر اسے جس جرم کی بنا پر سزائے موت سنائی گئی تھی، اس کا تعلق براہِ راست جاسم کی ذات سے تھا۔ جاسم نے سلور کوئین کے ڈریسنگ روم میں رہتے ہوئے اسے اپنے نائبین سے یہ کہتے سنا تھا کہ...... اینجیلا نے جاسم کی مدد کرکے ان لوگوں سے غداری کی ہے لہٰذا اس کا مرجانا لازم ٹھہرتا ہے۔ سلور کوئین نے ڈیوڈ اور اینجیلا کو ٹھکانے لگانے کی ذمے داری مسٹر جیکب کو سونپ دی تھی اور کھاپڑ یہودی جیکب اپنی تمام تر شیطنیت کے ساتھ جیمس ٹاؤن کی کمان سنبھالنے کے لیے بہت جلد کاسل ٹاؤن سے روانہ ہونے والا تھا۔

خیالات کی اسی اُدھیڑ بُن میں چلتے ہوئے وہ ہوٹل ریجنسی کے نزدیک واقعی ایک منی مارٹ تک پہنچ گیا۔ اس نے اپنے فوری استعمال کے لیے ایک بیسک سیل فون خرید لیا۔ ایشتار کا مشورہ اپنی جگہ لیکن وہ چھوٹے موٹے کاموں کے لیے اِدھر اُدھر نادیدہ چھلانگیں نہیں لگا سکتا تھا۔ ایشتار کی طرح تمام گیجٹس سے پرہیز کی عادت ڈالنے میں وقت لگ سکتا تھا۔ فی الحال تو پھیلے ہوئے بکھیڑوں کو سمیٹنے کے لیے سیل فون ناگزیر تھا۔

جاسم جان چکا تھا کہ ڈیوڈ کو جیمس ٹاؤن کے "جنرل اسپتال کمپلیکس" میں رکھا گیا تھا اور اینجیلا ایک اٹینڈنٹ کی حیثیت سے ڈیوڈ کے نزدیک موجود تھی۔ اس نے گوگل سرچ کرکے مذکورہ اسپتال کا کانٹیکٹ نمبر نکال لیا اور ایک پبلک کال سینٹر سے اسپتال کال کی۔ اس مقصد کے لیے احتیاطاً اس نے اپنا نیا نکور سیل فون استعمال نہیں کیا تھا۔

دوسری گھنٹی پر اس کی کال اٹینڈ کرلی گئی۔ "جنرل

اسپتال جیمس ٹاؤن'' آپریٹر کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''کیا خدمت کرسکتی ہوں؟'' آپریٹر نے شائستہ لہجے میں پوچھا۔

''آج صبح چھ اور سات بجے کے درمیان ایک شخص کو ایمرجنسی کی حالت میں آپ کے اسپتال لایا گیا تھا۔'' جاسم نے دانستہ ڈیوڈ کا نام نہیں لیا تھا۔ ''اس بندے کے دونوں پاؤں کا آپریشن کیا گیا ہے۔''

محض چھ سو تیس نفوس پر مشتمل اس خوب صورت شہر میں اُس روز ڈیوڈ کی طرح کے کوئی چار چھ کیس تو ہوئے نہیں ہوں گے چنانچہ اسپتال کی ٹیلی فون آپریٹر فوراً سے پیشتر سمجھ گئی کہ جاسم کس بندے کا ذکر کررہا تھا۔

''یس سر!'' آپریٹر نے کہا۔ ''مسٹر ڈیوڈ اب ٹھیک ہیں مگر...... آئی ایم سوری...... میں آپ کی کال ان کے روم میں ٹرانسفر نہیں کرسکتی۔ ابھی وہ انتہائی نگہداشت میں ہیں۔ کسی کو ان سے بات کرنے کی اجازت نہیں۔''

''میں دراصل مسٹر ڈیوڈ سے بات نہیں کرنا چاہتا۔'' جاسم نے ہوشیاری سے کہا۔ ''میری ایک دوست ایمیلی مسٹر ڈیوڈ کا خیال رکھ رہی ہے۔ اگر آپ ایمیلی کو ریسپشن پر بلا کر میری اس سے بات کرادیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔''

''ہاں، یہ میں کرسکتی ہوں۔'' آپریٹر نے کہا پھر جاسم کا نام جانے بغیر بولی۔ ''پلیز ہولڈ آن......!''

لگ بھگ ایک منٹ کے بعد ایمیلی کی آواز جاسم کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''ہیلو...... کون؟''

''میں تمہارا ایک اجنبی دوست ہوں۔'' جاسم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور اپنی جیب سے کاغذ قلم نکالنے کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔ ''ایمیلی! تمہاری جان کو خطرہ ہے۔ میں تم سے بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں مگر اس کے لیے اسپتال کا فون استعمال کرنا مناسب نہیں ہے۔ مجھے اپنا کانٹیکٹ نمبر دو اور کسی محفوظ جگہ پر پہنچ کر میری کال کا انتظار کرو۔ ابھی میں تمہیں ایک پبلک کال سینٹر سے فون کررہا ہوں۔''

ایمیلی نے کوئی سوال کیے بغیر جاسم کو اپنا سیل نمبر نوٹ کرادیا پھر فون کا ریسیور رکھ کر وہ اسپتال کے کیفے ٹیریا میں آگئی۔ وہاں ذرا بھی رش نہیں تھا۔ اس نے اپنے لیے کافی آرڈر کی اور سیل فون کو ٹیبل پر رکھ دیا۔

کافی سے پہلے جاسم کی کال آگئی۔ اب کی بار جاسم نے اسے اپنے سیل فون سے کانٹیکٹ کیا تھا۔ ایمیلی نے فوراً کال اٹینڈ کرلی اور معتدل انداز میں کہا۔

''ہیلو......!''

''میں وہی ہوں جس نے آج صبح ونسینٹ اور الفریڈ کو ٹھکانے لگانے کے بعد ڈیوڈ کے ٹخنوں کو چیر ڈالا تھا۔'' جاسم نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ''میری بات پر یقین کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے لیکن مجھے امید ہے، تم میری بات پوری توجہ سے سنوگی...... ہیں نا؟''

''بالکل سنوں گی کیونکہ تم ایک اچھے انسان ہو......'' ایمیلی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں فوری طور پر تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ تم اس وقت کہاں ہو؟''

''سردست ہماری ملاقات ممکن نہیں ہے۔'' جاسم نے محتاط انداز میں کہا۔ ''فی الحال تم میری بات کو دھیان سے سنو، یہ سب سے زیادہ ضروری ہے۔ تمہیں اور ڈیوڈ کو ختم کرنے کا فیصلہ ہوچکا ہے۔ ڈیوڈ کی مجھے ذرا سی بھی پروا نہیں ہے لیکن میں تمہیں بچانا چاہتا ہوں اس لیے جتنا جلدی ممکن ہو، اسپتال سے نکل جاؤ...... دور، بہت دور چلی جاؤ۔ میں تم سے بعد میں رابطہ کروں گا۔''

''نہیں جاسکتی......!'' وہ بے بسی سے بولی۔ ''میں اس دنیا میں کہیں بھی جا چھپوں، یہ لوگ مجھے ڈھونڈ نکالیں گے۔''

''مطلب تمہیں ٹریک کرلیں گے......؟''

''ہاں!'' اس نے روہانسے لہجے میں جواب دیا۔

''ٹریکنگ ڈیوائس کا معاملہ ہے؟'' جاسم نے پوچھا۔

''بالکل!'' ایمیلی نے اثبات میں جواب دیا۔

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ انہوں نے ٹریکنگ ڈیوائس کو تمہارے جسم میں کہاں پلانٹ کررکھا ہے؟''

''لیفٹ پنڈلی میں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''غلامی کی زنجیر کی طرح۔ میں ان سے بغاوت کرکے کہیں نہیں جاسکتی۔''

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' جاسم نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''اس مسئلے کا مستقل حل تو یہی ہے کہ اس ٹریکنگ ڈیوائس کو تمہاری پنڈلی سے نکال کر کہیں پھینک دیا جائے لیکن یہ سرجری کے بغیر ممکن نہیں ہے۔''

''پھر......'' وہ جاسم کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ ''میں پریشان کیسے نہیں ہوں؟''

''اس مسئلے کا ایک عارضی حل ہے میرے پاس۔'' جاسم نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

ایمیلی نے بے ساختہ سوال کیا۔ ''وہ کیا؟''

''تم نے ایلومینم فوئل دیکھی ہے؟''

"ہاں دیکھی ہے۔" اینجیلا نے اثبات میں جواب دیا۔ "وہی سلور کلر کی پتی نا جو کھانا وغیرہ ریپ کرنے کے کام آتی ہے۔ اسے "فوڈ ریپر" بھی کہا جاتا ہے؟"

"ہاں، میں اسی پتی کی بات کر رہا ہوں۔" جاسم نے کہا۔ "تم فی الفور یہاں سے نکلو اور کسی اسٹور پر جا کر ایلومینیم فوئل کا پورا رول خرید لو پھر کسی محفوظ مقام پر بیٹھ کر اس پتی کو اپنی لیفٹ پنڈلی کے اردگرد خوب اچھی طرح لپیٹ ڈالو اور اوپر سے ٹیپنگ کر دو۔ اس احتیاطی تدبیر کے بعد مذکورہ ٹریکنگ ڈیوائس سے خارج ہونے والے سگنلز کسی ریڈار سسٹم کی گرفت میں نہیں آسکیں گے۔"

"کیا تمہیں یقین ہے......؟"

"ہاں، صد فیصد۔" جاسم نے اٹل انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے، میں تمہارے مشورے پر عمل کرنے کو تیار ہوں۔" اینجیلا نے معتدل انداز میں کہا۔ "لیکن اس سے پہلے تمہیں میرے چند سوالات کے جوابات دینے ہوں گے۔" وہ لمحے بھر کے لیے رکی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"سچی بات یہ ہے کہ میرا دل تم پر بھروسا کرنے کو کہہ رہا ہے مگر دماغ، دل کی مخالفت کر رہا ہے۔ میں تذبذب کا شکار ہوں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا...... میں اسی سلسلے میں تم سے چند سوالات کرنا چاہتی ہوں۔"

"سوال پوچھنا تمہارا حق ہے۔" جاسم نے کہا۔ "بتاؤ۔ کیا جاننا چاہتی ہو؟"

"وہ لوگ ڈیوڈ جیسے اہم آدمی کو کیوں مارنا چاہتے ہیں؟"

"میرے مقابلے میں ڈیوڈ کی کارکردگی نے ہائی کمان کو بہت مایوس کیا ہے۔" جاسم نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بتایا۔

اینجیلا نے پوچھا۔ "اور میرا کیا قصور ہے؟"

"تم نے ڈیوڈ کو کرسی پر باندھنے میں میری مدد کی تھی۔" جاسم نے بیچ اس پر واضح کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری یہ حرکت اوپر والوں کو بالکل پسند نہیں آئی۔ وہ اسے تمہاری غداری سمجھ رہے ہیں۔"

"تمہیں اتنے اندر کی باتیں کیسے معلوم ہیں؟"

"ان لوگوں سے میرا واسطہ کافی عرصے سے ہے۔" جاسم نے جواب دیا۔ "سمجھ لو، ان کی نظر میں، میں بھی ایک غدار ہوں۔ وہ مجھے ہلاک کرنے کی کئی بار کوشش کر چکے ہیں لیکن ہر مرتبہ میں انہیں جوتا مار کر آگے نکل جاتا ہوں۔"

"ہاں، آج صبح میں نے بھی تمہاری پھرتی دیکھی ہے۔" اینجیلا نے ستائشی انداز میں کہا۔ "تمہارے اندر وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو ان لوگوں کو ٹف ٹائم دے سکتی ہیں۔ اب آخری سوال......" وہ لمحے بھر کو تھمی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے کیوں بچانا چاہتے ہو؟"

"تمہارا گناہ یہ ہے کہ تم نے میری مدد کی ہے۔" جاسم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اور یہ گناہ تم نے میرے حکم پر کیا ہے۔ سو، تمہیں سزائے موت دیے جانے نے مجھے بے چین کر دیا ہے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میری ذات سے کسی کو نقصان پہنچے اور یہاں تو تمہارے ڈیتھ وارنٹ جاری کر دیے گئے ہیں۔ آسان الفاظ میں کہوں تو میں تمہاری جان بچا کر اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔"

"اوہ۔" اینجیلا نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "میں کچھ اور سمجھی تھی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" جاسم پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ "تم کیا سمجھی تھیں؟"

"تم نے ڈیوڈ کے بستر پر مجھے بے لباس دیکھا تھا۔" وہ بڑی بے باکی سے بولی۔ "مجھے لگا، میں تمہیں پسند آگئی ہوں۔"

"اگر میں ایسا ہی نظر باز ہوتا تو تمہیں لباس پہن کر کرسی پر بیٹھنے کو نہ کہتا۔" جاسم نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ویسے تم نے کمال کا جوبن اور جمال کی رعنائی پائی ہے۔ تمہارے نظر فریب سراپا کو کوئی بھی مرد لباس کے ساتھ بھی پسند کر سکتا ہے۔ مگر میں......!"

جاسم نے بات ادھوری چھوڑی تو اینجیلا نے ترنگ میں سوال کر دیا۔ "لیکن تم کیا؟"

"میں منگنی شدہ ہوں۔" جاسم نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ "چند روز میں میری شادی ہونے والی ہے۔"

"اوہ!" اینجیلا ایک گہری سانس لے کر رہ گئی پھر جلدی سے کہا۔ "آئی ایم سوری!"

"اِٹس او کے۔" جاسم نے سرسری انداز میں کہا۔ "تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اگر میری باتوں کا یقین آ گیا ہو تو اپنی جان بچانے کے لیے فوراً وہاں سے نکل جاؤ۔"

"میں نکل رہی ہوں۔" اینجیلا نے جلدی سے کہا۔ "تمہاری ہدایت پر عمل کرنے کے بعد میں تمہیں کال کروں گی۔"

''مجھے کانٹیکٹ کرنے کی غلطی نہیں کرنا۔'' جاسم نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ''بس، تم لانگ ووڈ ہاؤس کے نزدیک ہی رہنا۔ میں خود تم سے رابطہ کروں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گئی۔'' اینجلیل نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''لانگ ووڈ ہاؤس کو اب ایک ہوٹل میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور یہ سیاحوں کی توجہ کا مرکز بھی ہے کیونکہ اس کے ایک حصے میں ''نپولین بوناپارٹ'' کی یادگار کے طور پر ایک میوزیم بھی بنا دیا گیا ہے۔ میں ''لانگ ووڈ ہوٹل'' میں قیام کروں گی اور تمہاری کال کا انتظار بھی۔''

''گڈ آئیڈیا!'' جاسم نے معتدل انداز میں کہا۔

''آل دی بیسٹ!''

اینجلیل کے ''تھینکس'' کے جواب میں جاسم نے ''یو آر ویل کم'' کہہ کر سیلولر رابطہ موقوف کر دیا۔

☆☆☆

دوپہر کے دو بجے تھے۔ جاسم اور ناجیہ لنچ کے بعد ہوٹل کے کمرے میں آ گئے تھے۔ جب جاسم، اینجلیل سے فون پر بات کر کے واپس ہوٹل آیا تو اس کے تھوڑی دیر بعد ہی ناجیہ اس سے ملنے آ گئی تھی۔ چہرے کی معمولی تبدیلیوں کے باوجود بھی انہوں نے ایک دوسرے کو بہ آسانی پہچان لیا تھا۔ وہ دنیا والوں کے لیے اب ثوبان قاسم اور ماریا علیم الدین بن چکے تھے لیکن وہ اپنی حقیقت سے بہ خوبی آگاہ تھے۔ انہوں نے باری باری ایک دوسرے کو بتا دیا تھا کہ گزشتہ تین سال میں ان کی زندگی کس ڈھب سے گزری تھی۔

ماریہ (ناجیہ) نے ہوم فیلڈ روڈ پر واقع ڈگلس کی ''یو سی ایم'' یونیورسٹی سے سوشل سائنسز میں ''پی ایچ ڈی'' کرنے کے علاوہ ایک مقامی چائنیز انسٹی ٹیوٹ سے معروف طریقہ علاج ''ایکو پریشر'' اور ''ایکو پنکچر'' میں بھی مہارت حاصل کر لی تھی۔ مذکورہ انسٹی ٹیوٹ کو ''سوچی فانگ'' نامی ایک عورت چلاتی تھی۔

''سوچی کے انسٹی ٹیوٹ میں ذیشان نامی ایک لڑکا بھی میرے ساتھ ٹریننگ حاصل کر رہا تھا۔'' ناجیہ نے بتایا۔ ''ذیشان کا تعلق انگلینڈ کے ایک شہر ''ہاؤٹن ریجس'' سے ہے۔ ہاؤٹن ریجس، لندن سے سوا گھنٹے کی ڈرائیو پر واقع ہے۔ آج شام کو ذیشان کی شادی ہے۔ میں پانچ بجے والی فلائٹ سے لندن جا رہی ہوں۔ یہ پروگرام میں نے ایک ہفتہ پہلے بنا لیا تھا لیکن آج صبح مجھے ایک پیکٹ موصول ہوا ہے جس کی وجہ سے مجھے یہاں آنا پڑا۔''

''کیسا پیکٹ؟'' جاسم نے پوچھا۔

جاسم کے استفسار پر ناجیہ نے اپنے بیگ سے ایک پیکٹ نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا اور کہا۔ ''تم دیکھ لو۔''

جاسم نے ناجیہ کے ہاتھ سے وہ پیکٹ لے لیا اور اسے کھول کر دیکھا تو اندر سے اے فور سائز کے چند کاغذات برآمد ہوئے جو درحقیقت کسی قانونی دستاویز کا حصہ تھے۔ جاسم نے بغور اس دستاویز کا مطالعہ کیا تو اس پر ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ اس دستاویز کے مطابق اس سال مئی میں ناجیہ غفار داؤد نے اپنا کلفٹن کراچی والا لگژری اپارٹمنٹ کسی ماریا علیم الدین نامی یورپی عورت کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ پیپرز کا وہ سیٹ مذکورہ دستاویز کی کاپی تھی۔

جاسم نے اس ڈاکیومنٹ کی فوٹو کاپی کا جائزہ لینے کے بعد ناجیہ کی جانب سوالیہ نظر سے دیکھا تو اس نے سپاٹ آواز میں پوچھا۔ ''کچھ سمجھ میں آیا؟''

''ہاں، بالکل!'' جاسم نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''تم مئی میں کراچی گئی تھیں اور تم نے اپنا وہ اپارٹمنٹ خود ہی کو فروخت کر دیا ہے کیونکہ پہلے تم ناجیہ غفار داؤد تھیں اور اب ماریا علیم الدین ہو۔ تمہارا یہ کارنامہ مجھے پسند آیا۔ تم نے اپنی نئی شخصیت کا بڑا موثر استعمال کیا ہے۔ اس کے بعد تم بڑے سکون سے اس اپارٹمنٹ میں رہ سکتی ہو۔ ہمارے دشمنوں کو ذرا سا بھی شک نہیں ہوگا کہ جاسم سے تعلق رکھنے والی ناجیہ اس اپارٹمنٹ میں رہائش پذیر ہے۔ ویل ڈن ناجیہ!''

''زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''ایسا کچھ بھی نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو۔ میں نے تو اس...... تین سال کے عرصے میں آئل آف مین سے باہر قدم بھی نہیں نکالا۔ ان تین سالوں میں صرف ڈگلس اور کاسل ٹاؤن کے درمیان سفر کرتی رہی ہوں یعنی ہوٹل جارج سے اپنی یونیورسٹی تک آنا اور جانا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' جاسم نے چونکتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''ان پیپرز پر اسی سال کے مئی کی تاریخیں درج ہیں اور کئی مقامات پر تمہارے اور ماریا کے دستخط بھی نظر آ رہے ہیں۔ جب تم کراچی گئی ہی نہیں ہو تو پھر یہ سب کیسے ہو گیا؟''

''یہ تو تم جا کر اپنی اُس جن زادی مہربان دوست سے پوچھو۔'' ناجیہ نے کڑوے لہجے میں کہا۔ ''شاید تم نے میری بات پر دھیان نہیں دیا۔ میں بتا چکی ہوں کہ یہ پیکٹ آج صبح

ہی مجھے موصول ہوا ہے۔''

''اوہ...... اگر ایشتار نے ایسا کچھ کیا تھا تو اس نے مجھ سے ذکر کیوں نہیں کیا۔'' جاسم نے اُلجھن زدہ لہجے میں کہا۔

''اس فنکارہ نے ہمارے چہروں اور ہماری شخصیت کے ساتھ جو کیا ہے، کیا اس حوالے سے اس نے تم سے اجازت لی تھی؟'' ناجیہ نے تلخی بھرے انداز میں کہا۔ ''یا اس نے بعد میں تمہیں اس بارے میں کچھ بتانے کی زحمت گوارا کی۔'' وہ لمحے بھر کو رکی پھر اپنے بیگ سے ایک رقعہ نما کاغذ نکال کر جاسم کی طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''اِسے پڑھو۔ پھر تمہیں میری بات کا یقین آجائے گا۔''

جاسم نے مذکورہ چٹھی کو کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ یہ بھی اسی طرح کا ایک خط تھا جیسا جاسم کے بریف کیس میں سے برآمد ہوا تھا۔ مذکورہ خط کی تحریر کچھ اس طرح تھی۔

''ناجیہ! اس خط کو پڑھنے کے بعد ضائع کر دینا۔ تمہیں جو فوٹو کاپی کا سیٹ دیا گیا ہے، اس کے اوریجنل ڈاکیومنٹس کراچی میں جاسم کے دوست کامل کے پاس تمہاری امانت کے طور پر رکھوا دیے گئے ہیں۔ تمہارا جب بھی کراچی جانے کا موڈ ہو، مذکورہ کاغذات کامل سے لے لینا۔ تمہاری ذات سے متعلق تمام ضروری پیپرز تین سال پہلے تمہارے حوالے کر دیے گئے تھے جن کے مطابق تمہارا نام ماریا علیم الدین ہے اور تم سینٹ ہیلینا کی رہنے والی ہو۔ تمہاری اطلاع کے لیے بتایا جا رہا ہے کہ صرف تمہاری شکل اور حلیے ہی میں تبدیلی نہیں کی گئی بلکہ تمہارے فنگر پرنٹس، آئی ریٹینا اور ڈی این اے کے بعض معاملات کو بھی ضرورت کے مطابق تبدیل کیا گیا ہے اور اب تم پر آئل آف مین سے باہر جانے پر بھی کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ ان ڈاکیومنٹس کے بعد تو تمہارا جب دل چاہے، تم کراچی جا کر اپنے اپارٹمنٹ میں ماریا علیم الدین کی حیثیت سے رہ سکتی ہو اور وہ بھی بےخوف و خطر۔ تمہارے اور جاسم کے دشمن تم دونوں کو جاسم اور ناجیہ کی حیثیت سے کبھی شناخت نہیں کر سکیں گے۔ جاسم کا نیا نام ثوبان قاسم ہے اور وہ ڈگلس کے ہوٹل ریجنسی میں ٹھہرا ہوا ہے۔ آج تمہیں ہر صورت میں، دن میں جاسم سے ملاقات کرنا ہے۔ تم دونوں باہمی صلاح مشورے سے آئندہ کا جو بھی منصوبہ بناؤ گے، اس پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم لوگ دشمنوں سے محفوظ اپنی مرضی کے فیصلے کرنے کے لیے آزاد ہو۔''

اس چٹھی کے اختتام پر بھی راقم الحروف کا نام ندارد تھا لیکن جاسم جانتا تھا کہ یہ کارنامہ ایشتار کے سوا اور کسی کا ہو نہیں سکتا۔ اس نے ناجیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم نے ابھی تک اس پیغام کو ضائع کیوں نہیں کیا؟''

''یہ میں تمہیں دکھانا چاہتی تھی۔'' ناجیہ نے جواب دیا۔ ''تاکہ تم میری بات کا یقین کر سکو۔''

''کیا ان تین سالوں میں ہم ایک دوسرے سے اتنی دور چلے گئے ہیں کہ ہمیں اپنی بات کا یقین دلانے کے لیے کاغذی سہاروں کی ضرورت پیش آئے؟'' جاسم نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ایسی بات نہیں ہے جاسم!'' وہ جلدی سے بولی۔ ''دراصل، میں بہت زیادہ تھک گئی ہوں اس لیے دماغ میں الٹے سیدھے سوالات سر اٹھاتے رہتے ہیں۔''

''مجھے بھی ایک ایسے ہی خط کے ذریعے آئندہ کے لیے خصوصی ہدایات دی گئی ہیں۔'' جاسم نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں تمہیں اپنے اب تک کے کارناموں کے بارے میں بتا چکا ہوں۔ دو روز کے بعد مجھے فلسطین کے لیے نکلنا ہے۔ وہاں ایک دو خصوصی مشنز ہیں۔ ٹھہرو...... میں پہلے اس چٹھی کو ضائع کر دوں پھر بات کرتے ہیں۔''

جاسم اپنی جگہ سے اٹھا اور واش روم میں جا کر ناجیہ والے رقعے کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے فلش میں بہا دیا پھر دوبارہ ناجیہ کے پاس آ کر سوال کیا۔

''کیا تم نے کامل کو فون کر کے اپنے ''ماریا علیم الدین'' والے ڈاکیومنٹس کی تصدیق کی ہے؟''

''نہیں۔'' ناجیہ نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ مذکورہ پیکٹ آج صبح ہی مجھے ملا ہے اور اس خط میں تم سے ملنے کی ہدایت کی گئی تھی اس لیے بھی میں نے کامل کو فون کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ دوسری بات یہ کہ میں ہاؤٹن ریجبیس میں ذیشان کی شادی اٹینڈ کرنے کے بعد وہاں سے سیدھا کراچی جانے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ ان بدیسی ملکوں میں میرا جی نہیں لگتا۔ اپنے وطن کی بات ہی کچھ اور ہے...... تم بھی میرے ساتھ پاکستان چل رہے ہو نا؟''

بات کے اختتام پر ناجیہ نے سوالیہ نظر سے جاسم کی طرف دیکھا تو اس نے جواب میں کہا۔

''میں تمہیں بتا چکا ہوں نا، دو روز کے بعد مجھے اسرائیل جانا ہے۔ وہاں فلسطین میں مجھے چند روز بہت

زیادہ مصروف رہنا ہوگا۔ میں تو کہتا ہوں تم بھی میرے ساتھ چلو۔ وہاں سے واپسی پر ہم پاکستان چلے جائیں گے۔''

''اور میں بھی تمہیں بتا چکی ہوں کہ آج شام پانچ بجے کی فلائٹ سے میں ہاؤٹن ریجیس جا رہی ہوں۔ ڈبلن سے سیدھا لندن اور پھر وہاں سے بائی روڈ ہاؤٹن ریجیس!'' ناجیہ نے بھی جاسم ہی کے انداز میں جواب دیا۔ ''تم میرے ساتھ کیوں نہیں چلتے۔ ہم ایک ساتھ ذیشان کی شادی میں شرکت کریں گے۔ اس کے بعد پاکستان روانہ ہوجائیں گے۔''

اِدھر ناجیہ کی بات مکمل ہوئی۔ اُدھر جاسم کے سیل فون پر میسج ٹون سنائی دی۔ جاسم نے سیل فون اٹھا کر میسج پڑھا پھر ناجیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا فلسطین والا مشن ذیشان کی شادی سے زیادہ اہم ہے ناجیہ! ہاں، البتہ میں یہ کرسکتا ہوں کہ......''

جاسم والے سیل فون پر میسج ٹون دوبارہ بجی لیکن اس بار اس نے سیل فون اٹھا کر چیک نہیں کیا۔ ناجیہ نے اس کی ادھوری بات پر کہا۔

''ہاں تو...... البتہ تم کیا کرسکتے ہو؟''

''میں بھی تمہارے ساتھ ہاؤٹن ریجیس چلتا ہوں۔'' جاسم نے جواب دیا۔ ''تمہاری خاطر میں ذیشان کی شادی میں شرکت کرلوں گا۔ اس کے بعد ہم اپنی اپنی منزل کی جانب روانہ ہوجائیں گے۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ فلسطین والے مشن سے میں جلد ہی لوٹ آؤں گا۔''

جاسم کے سیل فون پر ایک مرتبہ پھر میسج ریسیو ہوا۔ اس دفعہ جاسم نے فون اٹھا کر اس میسج کا ریپلائی کیا جس کے بعد ایک اور میسج آیا پھر جاسم کا سیل فون خاموش ہوگیا۔

''تمہیں میرا یہ آئیڈیا کیسا لگا؟'' جاسم نے ناجیہ سے پوچھا۔

ناجیہ نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے جاسم کے سیل فون کو شک زدہ نظر سے گھورا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''جاسم! کیا تم نے مجھے ان تین سالوں کی مکمل کہانی سنادی ہے یا کہنے کو کچھ اور بھی ہے۔ یعنی کیا تم نے مجھ سے کچھ چھپایا ہے؟'' بات پوری کرنے کے بعد ناجیہ نے معنی خیز نظر سے جاسم کے سیل فون کو دیکھا۔

''میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا ناجیہ!'' جاسم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے تم سے دو باتیں دانستہ مخفی رکھی ہیں مگر اس کے لیے تم میری نیت پر شک نہیں کرنا...... مناسب وقت آنے پر میں تمہیں سب کچھ بتادوں گا۔''

''اور وہ مناسب وقت کب آئے گا؟''

''جب ہماری شادی ہوجائے گی۔'' جاسم نے انکشاف انگیز لہجے میں جواب دیا۔ ''اگر تم چاہو تو اس نیک کام کے لیے آج کی رات بھی موزوں ثابت ہوسکتی ہے۔ تم ذیشان کی شادی کو بھول کر میرے پاس رک جاؤ۔ ہم آج کی تاریخ میں شادی کرلیتے ہیں۔''

''لگتا ہے تمہارا دماغ ٹھیک سے کام نہیں کررہا۔'' ناجیہ نے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔ ''ذیشان میرا بہت اچھا دوست ہے۔ میں اس کی شادی کو مس نہیں کرسکتی۔''

''تو پھر تم کل واپس آجاؤ۔'' جاسم نے تجویز دینے والے انداز میں کہا۔ ''یا پرسوں بھی آسکتی ہو۔ میرے یہاں سے رخصت ہونے سے پہلے کبھی بھی آجاؤ، میں تمہیں شادی کے لیے تیار ملوں گا۔ اگر میں فلسطین چلا گیا تو پھر یہ معاملہ التوا کا شکار ہوجائے گا۔''

''میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ تمہیں شادی کی اتنی جلدی کیوں پڑی ہوئی ہے؟'' ناجیہ نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا۔

''جلدی مجھے نہیں، تمہیں پڑی ہوئی ہے ناجیہ!''

''کیا بات کررہے ہو؟'' وہ حیرت بھری آواز میں بولی۔ ''میں نے کب اپنی شادی کا ذکر کیا ہے؟''

''تم وہ دو معاملات جاننے کے لیے بے چین ہو جو میں نے تم سے چھپالیے ہیں۔'' جاسم نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اور میں تم پر واضح کرچکا ہوں کہ جب تک ہماری شادی نہیں ہوجاتی، میں اس بارے میں کچھ نہیں بتاسکتا۔''

''تم پر ایسی بے ہودہ پابندی کس نے عائد کی ہے؟''

''جس نے ہمیں نئی شناخت دے کر تمام دشمنوں سے محفوظ کردیا ہے۔''

''کیا تم ایشار کی بات کررہے ہو؟''

جاسم نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''کیا اس جن زادی کی تمہاری نظر میں اتنی زیادہ اہمیت ہے؟''

''وہ ہم دونوں کی محسن ہے ناجیہ!'' جاسم نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''تم خود اس بات کی گواہ ہو کہ اس نے متعدد مواقع پر ہماری مدد کی ہے۔''

''اور اس مدد کی ہمیں بڑی بھاری قیمت بھی چکانا

پڑی ہے۔" ناجیہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اس جن زادی کے فضول چکروں میں پڑ کر ہم نے اپنی شخصیت کھو دی ہے۔ ماریا علیم الدین کے چہرے کے ساتھ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے لنڈا بازار سے کوئی مکھوٹا خرید کر اپنے منہ پر سجا لیا ہو۔"

"تمہاری باتوں سے یہ لگتا ہے کہ تم ایشتار کی طرف بہت سے زیادہ بھری بیٹھی ہو۔"

"ایسی بات نہیں ہے جاسم!" ناجیہ نے تلخی بھرے لہجے میں کہا۔ "جب تک یہ جن زادی تمہاری زندگی میں نہیں آئی تھی۔ تم مکمل طور پر مجھے اپنے محسوس ہوتے تھے۔ اب کبھی اتفاق سے ہماری ملاقات یا بات ہو بھی جائے تو تمہارے پاس ایشتار کے ذکر کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے؟"

ناجیہ واقعتاً ایشتار کی جانب سے خوب بھری بیٹھی تھی۔ جاسم کی مجبوریاں اور مصلحت کے تقاضے اپنی جگہ لیکن ناجیہ بھی اپنی جگہ غلط نہیں تھی اور یہ ساری کی ساری غلط فہمی نما ٹینشن اس وجہ سے تھی کہ جاسم نے ناجیہ سے بہت کچھ چھپا رکھا تھا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا ناجیہ!" جاسم نے نرم لہجے میں کہا۔ "ایشتار اس دنیا کو چھوڑ کر ریڈ پلینٹ (مریخ) پر جا چکی ہے۔ ہمارے درمیان اب کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں ہے۔ بس مجھے اس کی عائد کی ہوئی شرط کا پاس کرنا ہے۔ ہماری شادی کے بعد میں تمہیں ان دو معاملات کے بارے میں بھی کھل کر بتا دوں گا۔ یہ سوچ کر مطمئن ہو جاؤ کہ ایشتار ہماری زندگی سے نکل چکی ہے۔"

"تو پھر یہ کون ہے؟" ناجیہ نے بے ساختہ سوال کیا اور جاسم کے سیل فون کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

"یہ ایک بیسک سیل فون ہے جو میں نے آج ہی خریدا ہے۔"

"میں سیل فون کے بارے میں نہیں بلکہ اس پر آنے والے میسجز کا پوچھ رہی ہوں۔"

"اوہ!" جاسم نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ وہی مصیبت زدہ لڑکی اینجلیل ہے جسے ڈیوڈ کے ساتھ ہی موت کی سزا سنا دی گئی ہے۔ میں تمہیں اینجلیل کے بارے میں بتا تو چکا ہوں۔"

"جاسم! تم کیا سینٹ ہلینیا کے صدر مملکت ہو یا پھر جیمس ٹاؤن کے میئر ہو جو اینجلیل اپنی سزا معاف کرانے کے لیے تمہیں میسجز کر رہی ہے؟" ناجیہ نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

جواب دینے کے بجائے جاسم نے اپنا سیل فون اٹھا کر ناجیہ کی طرف بڑھا دیا اور کہا۔ "تم خود دیکھ لو۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا جاسم!" وہ قدرے ندامت بھرے لہجے میں بولی۔ "مجھے تم پر پورا بھروسا ہے لیکن اس بور اور بے مقصد زندگی نے مجھے بہت زیادہ چڑچڑا اور سنکی سا بنا دیا ہے۔ کیا تم ایشتار کے بنائے ہوئے سیٹ اَپ اور دجالی تنظیم کے پھیلائے ہوئے جال کو بھول بھال کر اپنے وطن واپس نہیں جا سکتے؟ کیا ایشتار کی عائد کردہ پابندی کو توڑنے سے تمہیں کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے؟ کیا تمہیں اس بات پر بھروسا نہیں رہا کہ زندگی اور موت کا مالک اللہ تعالیٰ ہے؟ ہماری جو رات قبر میں ہے، وہ باہر ہو ہی نہیں سکتی۔"

"ناجیہ!" ناجیہ کی بات مکمل ہوئی تو جاسم نے معتدل انداز میں کہا۔ "مجھے اللہ تعالیٰ اور اس کی قدرت پر کتنا یقین ہے، یہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔ اگر میں نے تم سے شادی کرنے سے پہلے ایشتار کی عائد کردہ شرط کو توڑ دیا تو خدانخواستہ اس سے کوئی میری موت واقع نہیں ہو جائے گی۔ بس، میں چند حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین صلاحیتوں سے محروم ہو جاؤں گا۔ واضح کر دوں کہ مذکورہ پراسرار صلاحیتیں ایشتار ہی کی عطا کردہ ہیں اور میں نے انہی کی بدولت ڈیوڈ اور سلور کوئین کی مٹی پلید کی ہے۔ اس نکتے کو سمجھنے کی کوشش کرو کہ ایشتار ہماری کوئی دشمن نہیں ہے۔ وہ تو یہی چاہتی ہے کہ ہم جلد از جلد رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں۔"

"کیا اس جن زادی کی یہ خواہش ہے کہ تم مجھ سے شادی کر لو؟" ناجیہ قطع کلامی کرتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

"یہ میری خواہش ہے کہ ہم شادی کر لیں اور یقیناً تم بھی ایسا ہی چاہتی ہو۔" جاسم نے کہا۔ "جہاں تک ایشتار کی بات ہے تو وہ صرف اتنا چاہتی ہے کہ میں اپنی زندگی کے یہ دو راز صرف اپنی بیوی سے شیئر کر سکتا ہوں۔ اگر میں نے کسی اور کے سامنے زبان کھولی تو میں ان دو صلاحیتوں سے محروم ہو جاؤں گا۔"

"تمہاری بات میری سمجھ میں آ گئی ہے۔" ناجیہ نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "اور موجودہ صورتِ حال کا حل بھی میں نے سوچ لیا ہے۔" وہ لمحے بھر کو رکی پھر اپنی بات مکمل کر دی۔ "اور اس حل کے اندر میرا وہ ارادہ بھی شامل ہے جو میں نے سوچی فانگ کے انسٹی ٹیوٹ سے

تربیت حاصل کرنے کے بعد باندھا تھا۔"

"اور وہ ارادہ ہے کیا؟" جاسم نے دلچسپی سے پوچھا۔

"میں کراچی جا کر اپنے اپارٹمنٹ میں "ماریا کلینک" کے نام سے ایک نیک کام شروع کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔" ناجیہ نے مضبوط اور پُرعزم لہجے میں بتایا۔ "جہاں میں ایکو پریشر اور ایکو پنکچر کے ذریعے دکھی لوگوں کا علاج کروں گی۔"

جاسم نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی پوچھ لیا۔ "کیا اس دنیا میں مجھ سے زیادہ دکھی انسان کوئی اور بھی ہوسکتا ہے؟"

ناجیہ کھلکھلا کر ہنس دی اور کہا۔ "جاسم! تمہیں دماغی بلکہ نفسیاتی علاج کی ضرورت ہے۔"

"تو کیا سوچی فانگ کی سکھائی ہوئی تکنیک سے ایسا علاج ممکن نہیں ہے؟"

"کیوں نہیں۔" ناجیہ نے معنی خیز انداز سے کہا۔ "اس کے لیے مجھے تمہارے دماغ اور تمہاری نفسیات کے اندر درجن بھر سوئیاں چبھونا پڑیں گی اور یہ اسی وقت ممکن ہوسکے گا جب تم فضول کے بکھیڑوں پر لعنت بھیج کر مکمل طور پر میرے زیرِ علاج آجاؤ۔"

اِدھر ناجیہ کی بات ختم ہوئی، اُدھر جاسم کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ یہ سیل فون جاسم نے چند گھنٹے پہلے ہی خریدا تھا اور اس کا کانٹیکٹ اینجلیل کے سوا اور کسی کے پاس نہیں تھا، جاسم نے سیل فون اٹھایا تو ناجیہ نے سوال داغ دیا۔

"کس کی کال ہے؟"

"تازہ ترین بکھیڑا جس پر میں لعنت نہیں بھیج سکتا۔" جاسم نے جواب دیا۔ "اینجلیل کی کال ہے۔ میں فون کو اسپیکر پر ڈال رہا ہوں تاکہ تم بھی یہ گفتگو سن سکو۔"

"اگلے ہی لمحے جاسم نے فون کا اسپیکر آن کر کے اینجلیل کی کال اٹینڈ کر لی۔ "ہیلو!" اس نے معتدل انداز میں کہا۔

"میں بہت بڑی مشکل میں گھر گئی ہوں۔" اینجلیل کی متوحش آواز فون کے اسپیکر سے نشر ہوئی۔ "میں نے تمہارے دیے ہوئے مشورے کے مطابق اپنی لیفٹ پنڈلی پر ایلومینیم فوئل لپیٹ کر لانگ ووڈ ہوٹل میں ایک کمرا حاصل کر لیا ہے۔ یہ جیمس ٹاؤن کا ایک الگ تھلگ حصہ ہے۔"

"تو پھر مشکل کیا ہے؟" جاسم نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہاں پہنچنے تک تو سب خیریت ہی تھی۔" اینجلیل نے بتایا۔ "لیکن اس ہوٹل کے منیجر پر مجھے شک ہو رہا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ ڈیوڈ کے سیٹ اپ سے تعلق رکھتا ہے۔ جب میں اس کے پاس سے گزر رہی تھی تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا تھا اور پھر فون اٹھا کر کسی کو کال کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔"

"ہوسکتا ہے یہ محض تمہارا وہم ہو۔"

"میں نے بھی یہی سوچ کر خود کو بہلا لیا تھا۔" اینجلیل نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "لیکن وہ میرا وہم نہیں تھا۔ اس ہوٹل کے سامنے ابھی ابھی تین گاڑیاں آ کر رکی ہیں۔ میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھ رہی ہوں۔ نصف درجن افراد جدید اسلحے کے ساتھ ان گاڑیوں سے نکل کر ہوٹل کی جانب بڑھے ہیں۔ وہ یقیناً میرے لیے آئے ہیں۔ ہوٹل منیجر مورگن نے انہیں یہاں میری موجودگی کے بارے میں اطلاع دے دی ہے۔ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔" وہ روہانسی ہو گئی۔ "پلیز! تم جہاں کہیں بھی ہو، فوراً لانگ ووڈ ہوٹل آجاؤ۔ ایک تم ہی ہو جو ان وحشی درندوں سے مجھے محفوظ کر سکتے ہو اور...... اور تم نے میری جان بچانے کا وعدہ بھی کیا تھا...... تمہیں یاد ہے نا؟"

اینجلیل کی ڈری سہمی التجا میں تیز دستک کی آواز بھی شامل ہو گئی۔ موت کے ہرکارے اور دجال کے گماشتے اس بے بس اور لاچار لڑکی کی زندگی کا چراغ گل کرنے اس کے کمرے کے دروازے پر پہنچ گئے تھے۔ اینجلیل کی دلکشی اور دل فریبی میں کوئی کلام نہیں تھا۔ حسن کی وہ مورتی، دجال کے درندوں کے ہاتھوں پامال ہو کر اس دنیا سے اٹھ جائے، یہ جاسم کو گوارا نہیں تھا۔

"اینجلیل! ہمت نہیں ہارنا۔" جاسم نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ "تم صرف پندرہ سیکنڈ تک کسی بھی طرح انہیں اپنے کمرے سے باہر روکے رکھو۔ میں تمہارے پاس آرہا ہوں۔"

جاسم نے فون بند کر کے اپنی جیب میں ڈالا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے ناجیہ سے اس کی آنکھیں چار ہوئیں۔ ناجیہ کی آنکھوں میں صرف ایک ہی سنسنی خیز سوال تھا۔

"آٹھ ہزار کلومیٹرز اور صرف پندرہ سیکنڈ......؟"

> حیرت و تجسس کی تہ میں چھپی اس داستان کے باقی واقعات اگلے ماہ پڑھیے

وہم و گمان

جمال دستی

دولت... شرافت و نجابت کسی کی میراث نہیں... مگر کچھ لوگ اسے صرف اپنے تک محدود سمجھتے ہیں... ایک ایسی عورت کی کہانی جس پر پورے خاندان کی ذمّے داری تھی۔ دولت اس کے ہاتھوں سے ریت کے مانند پھسل چکی تھی مگر شرافت و احساسِ ذمّے داری رگوں میں دوڑ رہی تھی... عزت اس کے لیے زندگی کی ضمانت تھی... انتہائی کسمپرسی اور پُرآشوب رات و دن کھسک رہے تھے... اپنے پروں میں بچوں کو سمیٹے ہر دہشت و وحشت سے بچانا چاہتی تھی... مگر زمانے کے ترکش میں ابھی ایک تیر اور بھی ہے...

ماضی کی خوشگوار یادوں کے ہمراہ روشن مستقبل کی تلاش میں گم......

بس اسٹاپ کے پاس ہی سبزی منڈی تھی۔ شام کو یہاں سبزیاں بہت سستی ملتی تھیں۔ مسز جعفری کی پانچ بجے فیکٹری سے چھٹی ہوتی تھی۔ وہ ساڑھے پانچ بجے منڈی پہنچ جایا کرتی تھیں۔ سبزیوں کے ریٹ سات بجے کم ہوتے تھے۔ ساڑھے پانچ سے سات بجے کے درمیان کا یہ وقت بازار میں گزرتا تھا۔ سات بجے وہ تین دنوں کی سبزی لے کر گھر آجایا کرتی تھیں۔ وہ اس سے زیادہ باہر نہیں رہنا چاہتی تھیں۔ پچھلے دنوں اُن پر بہت بڑا سانحہ گزرا تھا۔ اُن کی لڑکی

ادا کی طبیعت خراب ہوئی۔ اسے الٹیاں ہو رہی تھیں۔ مسز جعفری کی جہاندیدہ نگاہوں نے معاملے کو جانچ لیا۔ اس کے باوجود بھی تصدیق کے لیے ڈاکٹر کے پاس آ گئیں۔ لیڈی ڈاکٹر نے چیک اَپ کرنے کے بعد تصدیق کر دی کہ وہ پریگننٹ ہے لیکن حمل زیادہ دنوں کا نہیں تھا اس لیے گولیوں سے افاقہ ہو گیا۔ گھر آنے کے بعد مسز جعفری نے جب ادا سے معاملے کے متعلق دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ ہمسایوں کے لڑکے وسیم نے اس کے ساتھ زبردستی کی تھی۔ وسیم پڑھا لکھا اور بظاہر شریف لڑکا دکھائی دیتا تھا لیکن ادا جھوٹ نہیں بولتی تھی۔ اس لیے انہوں نے وسیم سے بات چیت کی۔ وہ صاف مکر گیا بلکہ اس نے بعد میں مسز جعفری کے گھرانے کو بھی بہت بدنام کیا۔ فدا اور اس کی جھڑپ ہوئی۔ جس میں خون خرابا ہوا اور مالک مکان نے انہیں فوراً گھر چھوڑنے کا نوٹس دے دیا۔ مسز جعفری نے مالک مکان کے پاؤں پکڑ کر جان خلاصی کی۔ ان کے تین بچے تھے۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ جن کے نام بالترتیب فدا، ادا اور ردا تھے۔ ردا سب سے چھوٹی تھی اور فدا بڑا ہونے کے باوجود بھی غیر ذمے دار تھا۔ وہ تمام دن گلیوں میں آوارہ گھومتا پھرتا تھا۔ مسز جعفری نے اسے اپنے ساتھ فیکٹری میں لگانے کے لیے بہت زور دیا۔ لیکن وہ نہیں مانا۔ فیکٹری میں کام نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کبھی وہ فیکٹری ان کی اپنی تھی۔ جعفری صاحب کی ناگہانی موت کے بعد مسز جعفری نے اسے سنبھالنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن قرضوں میں ڈوبی ہوئی اس فیکٹری کو سنبھال نہ سکیں اس لیے بحالت مجبوری فروخت کرنا پڑی۔ انہیں جو رقم ملی وہ جلد ہی خرچوں کی نذر ہو گئی۔ تب مسز جعفری کو اپنی ہی فیکٹری میں کام کرنا پڑا۔ تنخواہ زیادہ نہیں تھی۔ اس لیے خرچہ بھی سوچ سمجھ کر کرنا پڑتا تھا۔ اخراجات بہت زیادہ تھے۔ اگر فدا اپنی ذمے داریوں کو سنبھال لیتا تو مسز جعفری کو کوئی غم نہ ہوتا۔ ادا اٹھارویں سال میں لگ گئی تھی جبکہ ردا سولہ سال کی تھی۔ جلد ہی ان دونوں کی شادیاں کرنا چاہتی تھیں لیکن فدا کو کوئی پروا نہیں تھی۔ اس نے اچھا وقت دیکھا تھا اور کسمپرسی کے یہ حالات اسے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ کہاں گاڑی، بنگلا اور نوکر چاکر اور کہاں بھوک و افلاس اور بے عزتی بھری زندگی۔ وہ چڑچڑا ہو گیا تھا۔ مسز جعفری بہت پریشان تھیں۔ قرضے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ مسز جعفری جتنا حالات پر قابو پانے کی کوششیں کر رہی تھیں، وہ اتنا ہی بے قابو ہوئے جا رہے تھے پھر ان پریشانیوں کی وجہ سے انہیں شوگر کا مرض لاحق ہو گیا۔

دوائیں بہت مہنگی تھیں۔ ان کی ہوش ربا قیمتوں نے تمام مہینے کے بجٹ کا ستیاناس کر کے رکھ دیا۔ اگلے مہینے انہوں نے دوائیں استعمال کرنا ترک کر دیں۔ لیکن بعض اوقات شوگر اچانک ہی کم ہو جایا کرتی اور انہیں چکر آنے لگتے۔ تب بھی انہوں نے ٹیبلٹ لینے سے پرہیز کیا۔ وہ ایسی حالت میں دو چار میٹھی گولیاں چوس لیا کرتی تھیں۔ مہنگائی روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھیں لیکن ان کی تنخواہ میں اضافہ نہیں ہوا۔ شوگر کی بیماری کیسے لاحق نہ ہوتی۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ یہ بیماری پریشانیوں سے بڑھ جاتی ہے۔ اور پریشانیوں نے تو ان کے گھر کا راستہ ہی دیکھ لیا تھا۔ سات بجے کے قریب جب سبزیوں کے ریٹ کم ہوئے تب انہوں نے بھاؤ تاؤ شروع کیا۔ دکان دار ان سے واقف تھے اس لیے رعایت کر دیا کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ اپنے ساتھ جتنی رقم لائی تھیں، وہ ختم ہو گئی اور اب انہیں گھر تک پیدل جانا تھا۔ ہر چند کے سبزیوں سے بھرے ہوئے تھیلے دو ہی تھے۔ لیکن ان کی انگلیوں میں گھسے ۔۔۔ جا رہے تھے۔ وہ اس سختی بھری زندگی کی عادی ہو چکی تھیں لیکن شوگر انہیں اندر سے دیمک کی طرح چاٹ رہی تھی اور وہ اپنے جسم کو کھوکھلا محسوس کرنے لگی تھیں۔ ان کا گھر بڑی منڈی سے پندرہ منٹ کی دوری پر تھا اور انہیں یہ خدشہ لاحق تھا کہ کہیں شوگر یک دم کم نہ ہو جائے۔ ان کے پرس میں میٹھی گولیاں موجود تھیں۔ لیکن اگر وہ غش کھا کر گر جاتیں تو پھر یہاں ان کی مدد کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ لوگ اسی طرح نظریں چرا لیا کرتے ہیں۔ جیسے تیسے چلتے ہوئے وہ گلی میں داخل ہو گئیں۔ وہاں کہرام مچا ہوا تھا۔ لوگوں کا ہجوم ان کے گھر کے سامنے موجود تھا۔ وہ بوکھلا کر آگے بڑھیں اور ہجوم میں راستہ بناتی ہوئی مکان کے سامنے آ گئیں۔ فدا اور وسیم آپس میں گتھم گتھا تھے۔ لوگ ان دونوں کو چھڑانے کی کوششیں کر رہے تھے۔ لیکن وہ آپے سے باہر ہوئے جا رہے تھے۔ مسز جعفری نے آگے بڑھ کر فدا کو گریبان سے پکڑ کر اپنی جانب کیا اور پے در پے دو تین تھپڑ اس کے منہ پر رسید کر دیے۔ شور مچاتے ہوئے ہجوم پر یکدم سکتہ طاری ہو گیا۔ وسیم بھی چابی ختم ہو جانے والے کھلونے کے مانند جہاں تھا وہیں کھڑا ۔۔۔ رہ گیا۔ اس کے ناک اور منہ سے خون بہہ کر گریبان کو رنگین کر رہا تھا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت سے فدا بھی دوچار تھا۔ تھپڑ کھانے کے بعد اس نے بپھرے ہوئے شیر کے مانند دہاڑتے ہوئے وسیم کو چند گالیاں دیں اور زمین پر تھوکنے کے بعد گھر کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ تمام محلے والے مسز جعفری کے پیچھے پڑ گئے۔ وہ انہیں تنبیہ

کررہے تھے کہ اگر فدا کے یہی لچھن رہے تو وہ سب مل کر انہیں محلے سے باہر نکال دیں گے۔ مسز جعفری بوکھلا کر گھر کے اندر آگئیں۔ انہوں نے جھٹکے کے ساتھ دروازہ بند کیا۔ ادا اور ردا اپنے بھائی کا منہ دھلا رہی تھیں۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے اور چہرے پر خراشیں پڑ گئی تھیں۔ مسز جعفری نے سبزیوں کا تھیلا ایک جانب رکھا اور فدا سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں۔

''جن گھروں میں جوان لڑکیاں ہوتی ہیں وہاں یہ حرکتیں زیب نہیں دیتیں۔ اگر تم نے اپنی روش تبدیل نہ کی تو شاید اس کا خمیازہ تمہاری بہنوں کو بھگتنا پڑے۔''

فدا تلخ لہجے میں بولا۔ ''آپ سارا غصہ مجھ پر ہی اتارنا۔ یہ نہ پوچھنا کہ قصوروار کون ہے۔ ادا کے متعلق غلط باتیں کررہا تھا اور مجھے قریب سے گزرتا دیکھ کر اس نے استہزائیہ انداز میں قہقہہ بھی لگایا تھا۔ میں نے تلملا کر اس کے چہرے پر تھپڑ جڑ دیا۔ تب محلے والوں نے بھی اس کا ساتھ دیتے ہوئے مجھے کھری کھری سنانے کی کوشش کی، اس کے بعد میں نے جو درگت اس کی بنائی وہ آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی لی ہوگی۔''

مسز جعفری نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ''کتے تو بھونکتے ہی ہیں، یہ عقلمندی تھوڑی ہے کہ ان کے ساتھ بھونکنا شروع کردیا جائے۔ وسیم نے جو بھی کیا ہے، اس کی سزا اسے جلد ہی مل جائے گی۔''

فدا پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اس کی داہنی آنکھ کے گرد سیاہ حلقہ نمودار ہوگیا تھا۔

مسز جعفری نے پریشان لہجے میں ادا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کپڑا گرم کرکے بھائی کی آنکھ کی ٹکور کرو اور ردا تم تھیلے میں سے دودھ نکال کر گرم کرلاؤ۔'' دونوں لڑکیاں کچن کی طرف چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد مسز جعفری اپنے دوپٹے سے فدا کا چہرہ صاف کرنے لگیں۔ لیکن وہ ماں کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولا۔

''صبح مالک مکان کی بیوی آئی تھی۔ اس نے مکان خالی کرنے کی دھمکی دی ہے اور پرچون والے نے بھی سامان دینے سے انکار کردیا ہے۔ اب گھر میں پکانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ یوں کب تک چلے گا۔ اپنی چوڑیاں بیچ دیں، مجھے صرف ایک لاکھ روپے کی ضرورت ہے میں باہر چلا گیا تو ہمارے دن پھر جائیں گے۔''

مسز جعفری ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے بولیں۔ چوڑیوں کی بات دوبارہ نہیں کرنا۔ وہ میں نے ردا اور ادا کے نام کردی ہیں۔ تمہارے لیے رقم کا انتظام کرنے کی کوشش کررہی ہوں، امید ہے جلد ہی کچھ نہ کچھ ہوجائے گا۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا پھر پیار بھرے لہجے میں بولیں۔

''تم بس ایک دو سال میرا ساتھ دو۔ فیکٹری میں بہت سی جگہیں خالی ہیں، بس ردا اور ادا کی شادی ہوگئی تو ہم دونوں ماں بیٹے کے لیے ایک ہی ملازمت کافی ہوگی۔''

ادا ابلتے ہوئے پانی کا ڈبا لے کر اندر آئی اور ردا نے گرم دودھ کا گلاس ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ لیکن فدا اماں کا ہاتھ جھٹک کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ادا نے کھولتے ہوئے پانی کا ڈبا زمین پر رکھ دیا اور پریشان لہجے میں ماں کو بتایا۔ ''ردا کو اسکول سے نکال دیا گیا ہے۔ اس کی چھ مہینے کی فیس جمع نہیں کروائی گئی۔ میری پرنسپل نے بھی جلد فیس جمع کروانے کی تنبیہ کی ہے۔''

مسز جعفری کو بہت زور سے چکر آیا اور وہ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر زمین پر بیٹھ گئیں۔ ادا نے ان کو سہارا دیا اور پلنگ پر بٹھاتے ہوئے بولی۔

''میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن آپ کو بعد میں بھی معلوم ہو ہی جاتا تھا۔ اس لیے چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ حالات بہت خراب ہوگئے ہیں۔ ہمیں اپنے اخراجات کو مزید کم کرنا ہوگا۔ میں نے اور ردا نے سوچا ہے کہ ہم تعلیم کو خیرباد کہہ دیں اور گھر میں ٹیوشن سینٹر کھول لیں۔ کچھ انکم ہوگی تو حالات میں بھی بہتری پیدا ہوجائے گی۔''

مسز جعفری نے اسے بے اختیار اپنے گلے سے لگالیا۔ پھر رُندھے ہوئے لہجے میں بولیں۔ ''مجھے بے حد افسوس محسوس ہوتا ہے۔ میں تم تینوں کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکی اور فیکٹری کی اس نوکری میں...... میں کچھ کر بھی نہیں پاؤں گی۔ اس لیے میں نے سوچا ہے کہ ہفتے اور اتوار کی چھٹی کے دوران کوئی اور کام تلاش کرنے کی کوشش کروں۔ میں نے ایم اے پاس کیا ہوا ہے اگر کسی اسکول میں ٹیچر کی نوکری مل گئی تو سیکنڈ ٹائم تم دونوں کے ساتھ مل کر ٹیوشن سینٹر کھول لوں گی۔''

ادا چپ ہوگئی اور ردا دودھ کا گلاس لے کر بھائی کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

مسز جعفری نے ادا سے پوچھا۔ ''کھانے کے لیے کچھ بنایا ہے یا نہیں۔''

ادا نے انکار میں سر ہلایا۔ ''پرچون والے نے راشن دینے سے انکار کردیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ پہلے پچھلا حساب چکتا کرو۔ پھر اگلے کے متعلق بات کرو۔''

مسز جعفری نے پرس میں سے سو سو کے دو نوٹ....

نکالے اور ادا کی جانب دیکھتے ہوئے بولیں۔ بجلی کے بل کی رقم میرے پاس رکھی ہوئی ہے۔ رات کے کھانے کے لیے دو سو روپے نکال لیتی ہوں۔ بعد میں رکھ دوں گی۔ اس رقم میں چھولے اور روٹیاں ہی آئیں گی۔ گزارا کرلیں گے۔ تم فدا کی آنکھ کی ٹکور کرو۔ میں ابھی واپس آتی ہوں۔ وہ دروازہ کھول کر باہر آگئیں۔ اگر ردا اور ادا کا ساتھ نہ ہوتا تو اب تک شوگر کی بیماری سے مر چکی ہوتیں۔ انہیں افسوس اس بات کا تھا کہ فدا ذمے داریوں کے لیے سنجیدہ نہیں تھا۔ اس کے سر پر باہر جانے کا بھوت سوار تھا۔ دینو کا ہوٹل قریب تھا۔ انہوں نے اس سے دو پلیٹ چھولوں کی لیں اور باقی بچ جانے والی رقم سے روٹیاں خرید کر گھر واپس چل دیں۔ دینو کے ہوٹل پر رش زیادہ ہونے کی وجہ سے انہیں پندرہ بیس منٹ لگ گئے اور جب انہوں نے گلی میں قدم رکھا تو پولیس کی گاڑی تیز رفتاری کے ساتھ ان کے قریب سے گزر گئی۔ ان کے گھر کے سامنے دوبارہ محلے والے جمع تھے۔ انہوں نے مسز جعفری کو بتایا کہ فدا کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ مسز جعفری چکرا کر زمین پر گر گئیں۔ ردا اور ادا دروازے کے پاس ہی کھڑی تھیں۔ وہ چیختی چلّاتی ہوئی باہر نکلیں اور ماں کو کھینچ تان کر اندر لے آئیں۔ انہوں نے مسز جعفری کو پلنگ پر لٹا دیا اور پانی کے چھینٹے چہرے پر مارنے لگیں۔ جلد ہی انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولیں۔ ''وسیم خود آیا تھا یا اس کا باپ بھی ہمراہ تھا؟''

ادا نے بتایا۔ ''مجھے کچھ معلوم نہیں، فدا دروازہ کھولنے کے لیے گیا تھا۔ پولیس نے اسے گاڑی میں بٹھا لیا نہ جانے گاڑی کے اندر اور کون کون تھا؟''

مسز جعفری پلنگ سے نیچے اترتے ہوئے بولیں۔ ''میں تھانے جاتی ہوں، تم دونوں دروازے کو اندر سے بند کر لو۔ کوئی بھی دروازہ کھٹکھٹائے تو کھولنا نہیں۔ میں جلدی واپس آتی ہوں۔'' انہوں نے چادر درست کی اور ہینڈ بیگ کاندھے سے لٹکا کر گھر سے باہر آگئیں۔ ان کے پاس لے دے کر بل کی تھوڑی سی رقم باقی بچی تھی۔ اس لیے رکشا پکڑ کر تھانے آگئیں۔ وسیم اور فدا دونوں کو حوالات میں بند کر دیا گیا تھا۔ وسیم کے والد طاہر صاحب انسپکٹر کے کمرے میں کرسی پر براجمان تھے۔ انسپکٹر شکل وصورت سے اچھا انسان دکھائی دیتا تھا۔ جب مسز جعفری کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ احتراماً کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا پھر انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جوان خون ہے اس لیے چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپس میں لڑ پڑتے ہیں۔ ہمارا مقصد انہیں گرفتار کرنا نہیں ہے۔ صرف سرزنش کر کے چھوڑ دینا ہے لیکن آپ اپنے لڑکے کو تحمل مزاجی اور ٹھنڈے دماغ کے ساتھ سوچنے کی نصیحت ضرور کیجیے گا۔ میں نے طاہر صاحب اور وسیم کو بھی سمجھا دیا ہے۔ آئندہ وہ بھی غیر ضروری بات چیت سے پرہیز کریں گے۔ یہ رپورٹ درج کروانا چاہتے تھے۔ میں نے انکار کر دیا۔ اگر رپورٹ درج ہو جاتی تو دونوں فریقین کے حق میں بہتر نہیں ہوتا۔''

مسز جعفری نے روتے ہوئے انسپکٹر کو یقین دلوایا کہ وہ آئندہ فدا کو گھر سے باہر قدم نہیں رکھنے دیں گی بلکہ وہ اسے اپنے ساتھ فیکٹری لے جائیں گی اور کوشش کریں گی کہ وہ فارغ نہ رہے۔''

انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلا دیا اور قریب کھڑے اہلکار سے دونوں لڑکوں کو حوالات سے باہر لانے کے لیے کہا۔ وہ باہر چلا گیا۔ تب انسپکٹر، طاہر صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''جتنے زخم آپ کے لڑکے کے چہرے پر موجود ہیں، اتنے ہی زخم مسز جعفری کے لڑکے کے چہرے پر بھی ہیں۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ دونوں ہم پلّہ ہیں۔ تاہم آپ کا لڑکا عمر میں مسز جعفری کے لڑکے سے بڑا ہے۔ اسے ہوش وحواس سے کام لینا چاہیے تھا۔''

طاہر صاحب غصیلے لہجے میں بولے۔ ''ہوش وحواس سے کام تو وہ تب لیتا جب معاملہ اختیار سے باہر نہ ہوتا۔ اس نے میرے بچے کے چہرے پر تھپڑ رسید کیا تھا۔ حالانکہ وہ عمر میں میرے لڑکے سے چھوٹا ہے۔ اگر آپ رپورٹ درج نہیں کریں گے تو میں حکام بالا سے رابطہ کروں گا۔''

انسپکٹر بولا۔ ''اس صورت میں آپ کے لڑکے کے خلاف بھی پرچہ درج ہوگا اور اسے بھی سزا بھگتنا ہوگی۔ بہتری اسی میں ہے کہ جیسا میں کہہ رہا ہوں، ویسا ہی کیجیے۔ بصورت دیگر قانونی کارروائی کے لیے آپ دونوں اپنے آپ کو تیار کر لیجیے۔''

طاہر صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ اسی اثنا میں اہلکار وسیم اور فدا کو لیے کمرے میں داخل ہوا۔

مسز جعفری کرسی سے اٹھ کر فدا کے قریب آگئیں اور اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولیں۔ ''اگر طاہر صاحب مطمئن نہیں ہوتے تو فدا ان سے معافی مانگنے کے لیے تیار ہے۔''

''معافی مانگنے کی ضرورت نہیں۔'' انسپکٹر بولا۔ ''ان دونوں کو تھانے میں لانا بھی صرف اس لیے مقصود تھا کہ وہ آئندہ محلے میں لڑائی جھگڑا کرنے سے گریز کریں۔ اب

آپ دونوں اپنے بچوں کو لے جائیں۔ رہی بات پرچہ کاٹنے کی تو سوچ سمجھ کر فیصلہ کیجیے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تھانے کے چکر لگانے کا وقت دونوں فریقین کے پاس نہیں ہوگا۔"

مسز جعفری نے فدا کا ہاتھ تھاما اور انسپکٹر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے تھانے سے باہر آگئیں۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ اتنی آسانی سے ان دونوں کی جان خلاصی ہو جائے گی۔ تاہم طاہر صاحب کی جانب سے انہیں اب بھی خدشہ لاحق تھا کہ وہ ضرور مزید قانونی کارروائی کریں گے۔ اس لیے انہوں نے دل میں تہیہ کرلیا کہ جتنی جلدی ہوسکا، وہ محلے کو چھوڑ دیں گی۔ فیکٹری کے چند کوارٹر تھے جن کی حالت نہایت مخدوش تھی اور ان میں گیس اور پانی کی سہولت بھی نہیں تھی۔ بجلی شام کو آتی تھی اور رات دس بجے کے بعد چلی جایا کرتی تھی۔ ماحول بھی کچھ مناسب نہیں تھا۔ اس لیے اب تک انہوں نے وہاں جانے سے گریز کیا تھا لیکن اب حالات اختیار سے باہر ہو گئے تھے اس لیے انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ وہ جلد وہاں منتقل ہو جائیں گی۔ بل کی تمام رقم رکشے اور کھانے پر خرچ ہوگئی تھی۔ تاہم یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ وہ بل اگلے ماہ بھی جمع کرواسکتی تھیں اس لیے رکشا پکڑ کر گھر آگئیں۔ ردا اور ادا بہت پریشان تھیں۔ ان کے گھر میں قدم رکھتے ہی بولیں۔

"مالک مکان نے مکان خالی کرنے کے متعلق کہا ہے۔ وہ بہت غصے میں تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ محلے میں پہلی دفعہ پولیس آئی ہے اور وہ ہماری وجہ سے آئی ہے۔ اس لیے وہ نہیں چاہتا کہ آئندہ بھی آئے۔ مکان کا تین مہینے کا کرایہ باقی ہے۔ اگر جمع کروادو تو محلے میں رہ سکتے ہو۔ ورنہ کل ہی مکان خالی کردو۔"

مسز جعفری کے ہونٹ خشک ہونے لگے۔ ادا نے انہیں پانی کا گلاس لا کر دیا اور وہ پینے کے بعد بولیں۔ "میں کل فیکٹری کے مالک سے بات کرتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی کوارٹر مل ہی جائے گا۔ تاہم تنخواہ میں سے کچھ رقم کٹ جائے گی۔ لیکن رقم تو مکان کا کرایہ دینے کی صورت میں بھی کٹتی ہے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ فیکٹری کے کوارٹروں میں پانی، بجلی اور گیس کی سہولت موجود نہیں ہے لیکن جو رقم فیکٹری جانے اور واپس آنے کے دوران بسوں کے کرائے کی صورت میں کٹتی ہے اس میں کچھ مزید رقم ڈال کر ہم گیس کا سلنڈر بھروالیں گے۔ بجلی شام سے لے کر دس بجے تک ہوتی ہے اور پانی فیکٹری سے کچھ دور ٹیوب ویل سے رہائشی لے کر آتے ہیں۔ سو ہم بھی لے آئیں گے۔ میرے خیال میں ہمیں زیادہ پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ تاہم ماحول ہمارے محلے سے بھی زیادہ خراب ہے۔ اس لیے تم تینوں کو احتیاط سے کام لینا ہوگا۔"

ردا بولی۔ "تو پھر میں کھانا گرم کرکے لاتی ہوں، منتقلی کی تیاریاں کل کرلیں گے۔"

ادا نے بتایا۔ "یہ اچھا ہوا کہ روٹیاں اور چھولوں والا شاپر محلے والوں نے دروازہ کھٹکھٹا کر دے دیا تھا۔ ورنہ آج کی رات بھوکے سونا پڑتا۔"

مسز جعفری اٹھ کر باتھ روم کی جانب آگئیں۔ ان پے در پے واقعات نے انہیں بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ پانی کے چند چھینٹے چہرے پر مارنے کے بعد حواس کچھ بحال ہوئے اور وہ دسترخوان کی طرف چلی آئیں۔ کھانا کھانے کا دل نہیں کررہا تھا۔ لیکن اگر وہ نہ کھاتیں تو بچے بھی نہ کھاتے۔ اس لیے زہر مار کرنے لگیں۔ کھانے کے بعد وہ جو پلنگ پر گریں تو انہیں معلوم ہی نہیں ہوا کہ کب ان کی آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ مسز جعفری کی نیند کچی تھی، فوراً آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ رات کا ایک بجنے والا تھا۔ اس وقت کون آسکتا تھا۔ یقیناً طاہر صاحب پولیس کو دوبارہ لے آئے تھے۔ وہ ہڑبڑا کر پلنگ سے نیچے اتر آئیں۔ ان کے قریب ہی ردا اور ادا سوئی ہوئی تھیں۔ فدا دوسرے کمرے میں تھا۔ دروازہ ایک دفعہ پھر کھٹکھٹایا گیا۔ انہوں نے چپلیں پہنیں اور کمرے سے نکل کر دروازے کی طرف آگئیں۔ دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا۔ انہوں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔ "کون ہے؟"

مردانہ آواز سنائی دی۔ "میں جلال الدین ہوں۔ جعفری صاحب کا دوست......! آپ سے کچھ بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔ دروازہ کھول دیجیے۔"

مسز جعفری سوچ میں پڑ گئیں کہ دروازہ کھولیں یا نہیں۔ رات کے اس پہر کچھ بھی ہوسکتا تھا اور وہ بھی ایسے گھر میں جہاں خواتین کی تعداد زیادہ ہو۔

آواز دوبارہ سنائی دی۔ "میں نے چند سال قبل جعفری صاحب سے قرضہ لیا تھا۔ میں وہ واپس کرنے آیا ہوں۔ چونکہ مجھے کل صبح کی فلائٹ سے کینیڈا واپس جانا ہے اس لیے مجبوراً رات کے اس پہر آنا پڑا۔"

جہاں تک مسز جعفری کو یاد تھا۔ فیکٹری قرضے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جعفری صاحب کسی کو قرضہ کیسے دے سکتے

تھے۔ تاہم انہوں نے کنڈی کھول دی۔ دروازے کے سامنے جو شخص کھڑا تھا، اسے انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا اور اس کے ہاتھوں میں سیاہ رنگ کا بیگ تھا۔ دروازہ کھلنے پر اس نے سیاہ بیگ مسز جعفری کے ہاتھوں میں تھما دیا پھر آہستہ لہجے میں بولا۔ ”دو سال قبل جب میں نے بیرونِ ملک جانے کا ارادہ کیا تو میرے پاس رقم نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں نے بہت سے دوستوں سے قرضہ لیا۔ ان میں جعفری صاحب بھی تھے۔ بیرونِ ملک کام اچھا چلا اور میں نے سوچا ملک جا کر اپنے محسنوں کی رقم واپس کر آؤں۔ مجھے معلوم ہوا کہ جعفری صاحب کی فیکٹری بک چکی ہے اور آپ اس محلے میں رہائش پذیر ہیں چونکہ آپ کا کوئی اکاؤنٹ نہیں تھا اس لیے میں کیش لے کر یہاں آ گیا۔ اس بیگ میں دو لاکھ روپے ہیں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ نوٹ بڑے ہوں تاکہ آپ کو سنبھالنے میں آسانی رہے۔“

مسز جعفری حیرت بھرے لہجے میں بولیں۔ ”لیکن جعفری صاحب نے قرضے کے متعلق نوٹ بک میں تحریر نہیں کیا۔ تاہم انہوں نے جس جس سے قرضہ لیا تھا، اس کی بابت ڈائری میں تحریر تھا۔“

جلال الدین نے بتایا۔ ”دراصل جعفری صاحب اور میری دوستی اتنی گہری تھی کہ وہ دینے والی رقم کو قرضے میں شمار ہی نہیں کرتے تھے اور رقم دیتے ہوئے انہوں نے مجھے تنبیہ بھی کی تھی کہ واپس لوٹانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ کے حالات بہتر نہیں ہیں اس لیے رقم لوٹانے آ گیا۔“

مسز جعفری نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ چند مزید رسمی باتیں کرنے کے بعد تیز قدموں کے ساتھ چلتا ہوا گلی سے باہر نکل گیا۔ مسز جعفری ہکا بکا اسے دیکھتی رہ گئیں۔ پھر دروازہ بند کر کے پلنگ کی طرف آ گئیں۔ رقم والا بیگ ان کے ہاتھوں میں تھا۔ دو لاکھ کی رقم معمولی رقم نہیں تھی۔ اس کا یک دم مل جانا کچھ غیر فطری معلوم ہو رہا تھا۔ وہ کم و بیش ایک لاکھ کی مقروض تھیں۔ پینتالیس ہزار تو صرف مالک مکان کو دینے تھے۔ دودھ والے، سبزی والے اور دوسرے لوگوں کے ادھار چکانے تھے۔ تقریباً ایک لاکھ خرچ ہو جاتے اور ایک لاکھ بچتے۔ جعفری صاحب کی وفات کے بعد ان کے کاندھوں پر جو ذمے داریاں اچانک ہی منتقل ہوئی تھیں، انہوں نے بوکھلا کر رکھ دیا تھا اور وہ ذمے داریاں پورا کرنے میں بری طرح ناکام ہوئی تھیں۔ وہ اپنے بچوں کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی تھیں لیکن حالات و واقعات نے انہیں ادھ موا کر کے رکھ دیا تھا۔ ان کی عمر بھی تیزی کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی اور وہ روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھیں۔ اس لیے محتاج ہو جانے سے پہلے ان کے لیے بہت کچھ کر جانا چاہتی تھیں۔

”ڈیڈی اچھی خاصی چلتی ہوئی فیکٹری چھوڑ کر گئے تھے۔ آپ نے اسے چند ہی دنوں میں برباد کر کے رکھ دیا۔ گھر میں ڈھنگ کا کھانا نہیں۔ پہننے کو کسی کے اترے ہوئے کپڑے بھی نہیں ہیں۔ آپ کی تنخواہ اتنی محدود ہے جس میں گزارا کرنے سے بہتر ہے کہ ہم خودکشی کر کے مر جائیں۔“ اس تلخ کلامی کے بعد ہر پل مسز جعفری یہی سوچتی رہتی تھیں کہ کس طریقے سے اپنی انکم میں اضافہ کریں۔ انہوں نے فیکٹری میں کام کرنے والے ورکر کو دل پر پتھر رکھ کر کہہ دیا تھا کہ اگر کوئی زکوٰۃ دینا چاہے تو وہ انہیں دے دے۔ تب انہوں نے اوور ٹائم ختم کر دیا۔ گھر میں بچوں کو ان کی ضرورت تھی۔

ان کے پاس اب دو لاکھ کی رقم تھی۔ وہ اپنے بچوں کے لیے بہت کچھ کر سکتی تھیں۔ انہوں نے سیاہ بیگ کھولا۔ اس کے اندر پانچ سو روپے کے نوٹوں کی گڈیاں موجود تھیں۔ نہ جانے نوٹ اصلی تھے یا نہیں۔ لیکن بظاہر دیکھنے میں اصلی اور نئے نکور دکھائی دیتے تھے۔ جیسے ابھی انہیں بینک سے نکالا گیا ہو۔ ایک دفعہ ان کے دل میں خیال آیا کہ وہ تمام رقم فدا کو دے دیں تاکہ اس کا بیرونِ ملک جانے کا خواب پورا ہو سکے۔ لیکن انہوں نے اس خیال کو رد کر دیا۔ وہ اسے غیر قانونی طور پر بیرونِ ملک نہیں بھیجنا چاہتی تھیں۔ اس کی عمر ہی کتنی تھی۔ صرف بیس سال۔ وہ ناسمجھ اور ناتجربہ کار تھا۔ ہاں جلال الدین بیرونِ ملک رہائش پذیر تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا لیکن اس کا نمبر یا پھر ایڈریس وہ اس سے نہیں لے سکی تھیں۔

کچھ دیر نوٹوں کا معائنہ کرتے رہنے کے بعد انہوں نے احتیاط کے ساتھ انہیں الماری کے اندر رکھ دیا اور سونے کے لیے لیٹ گئیں۔ اگلے دو دن آڈٹ کی وجہ سے فیکٹری میں کام بہت زیادہ رہا۔ وہ رات کو آٹھ بجے سے پہلے فارغ نہیں ہوتی تھیں۔ دن بھر کام کرنے کی وجہ سے اتنی تھک جاتی تھیں کہ ڈھنگ سے کھانا بھی نہیں کھا پاتی تھیں اور بستر پر گرتے ہی سو جاتی تھیں۔ اس دوران انہیں رقم کا خدشہ بھی لاحق رہتا تھا۔ انہوں نے بچوں کو ابھی تک اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ تاہم انہیں پانچ سو کے یہ کچھ نوٹ بحالت مجبوری رقم میں سے نکالنا پڑے کیونکہ ان کے پاس پھوٹی

کوڑی بھی باقی نہیں بچی تھی۔ مالک مکان کا اصرار بھی بڑھتا جارہا تھا۔ وہ مکان خالی کرنے کا کہہ رہا تھا۔ مسز جعفری نے منت سماجت کر کے اس سے ایک ہفتے کی مہلت لے لی تھی۔ وہ مان نہیں رہا تھا لیکن فیکٹری والوں نے جب مسز جعفری کے تقاضے کی حمایت کی تب بحالت مجبوری مان گیا۔ تاہم اس نے ایک ہفتے کے بعد فوری طور پر مکان خالی کرنے کے لیے کہہ دیا تھا۔

☆☆☆

اُلجھنیں تھیں کہ بڑھتی ہی جارہی تھیں۔ کوئی اچھی خبر سننے کو نہیں مل رہی تھی۔ ایک شام فیکٹری سے گھر آتے ہوئے انہیں بہت زور کا چکر آیا اور وہ سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئیں۔ دکان داروں نے ان کے منہ میں پانی ڈالا تو انہیں کچھ افاقہ ہوا، وہ اپنے آپ کو گھسیٹتی ہوئی گھر آ گئیں۔ رات کو وہ محلے کے کلینک گئیں۔ لیڈی ڈاکٹر نے ان کا چیک اپ کیا اور انہیں بتایا کہ شوگر بہت زیادہ ہے۔ وہ فوراً انسولین لگوائیں۔ یا پھر مستقل مزاجی کے ساتھ گولیوں کا استعمال کریں۔ وہ سنی اَن سنی کر کے گھر آ گئیں۔ ان کے پاس رقم موجود تھی لیکن وہ اسے اپنے علاج پر خرچ نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ یہ رقم ان کے بچوں کے لیے تھی۔ ادا نے ان سے ڈاکٹر کے پاس جانے کے متعلق پوچھا تو انہوں نے جھوٹ بول دیا کہ کمزوری کی وجہ سے چکر آئے تھے۔ ڈاکٹر نے انہیں آرام کرنے کا کہا ہے۔ تب ادا نے انہیں بتایا کہ وسیم تمام دن ان کے مکان کے سامنے ڈیرا ڈالے بیٹھا رہتا ہے۔ وہ کہتا تو کچھ نہیں ہے لیکن اس کے تیور خطرناک ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ فدا اور اس کے درمیان دوبارہ جھڑپ ہو جائے۔ مسز جعفری پریشان ہو کر پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ ردا بھاگ کر ان کے لیے پانی کا گلاس لے آئی۔

وہ پانی پینے کے بعد بولیں۔ ''میں نے بہت کوشش کر کے دیکھ لی لیکن فدا کو راہِ راست پر نہیں لاسکی۔ مجھے یقین ہے کہ آج نہیں تو کل وہ ضرور وسیم کا سر پھاڑ دے گا اور پھر وہ سب کچھ ہوگا جسے ہونے سے میں روکنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ پولیس اسے گرفتار کرلے گی۔ میں نے سنا ہے کہ تھانے کا انسپکٹر تبدیل ہو گیا ہے اور جو نیا آیا ہے۔ وہ بہت اکھڑ مزاج اور حرام خور ہے۔ وہ طاہر صاحب کے ساتھ مل کر ہمارے خلاف محاذ کھڑا کرے گا۔ یہ سب ہونے سے پہلے ہمیں اس محلے کو چھوڑ دینا ہوگا۔''

وہ چند لمحوں کے لیے چپ ہوئیں پھر ردا کی جانب دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''اپنے بھائی کو یہاں بلاؤ۔ مجھے تم تینوں سے کچھ بات چیت کرنی ہے۔''

ردا اٹھ کر ساتھ والے کمرے کی طرف چلی گئی۔

مسز جعفری نے ادا سے کہا کہ وہ الماری میں کپڑوں کے نیچے رکھا ہوا سیاہ بیگ نکال کر ان کے پاس لے آئے۔ ادا الماری کی طرف چلی گئی۔ اسی وقت فدا اور ادا کمرے میں داخل ہوئے۔ مسز جعفری نے ان دونوں کو پلنگ کے کنارے بیٹھنے کے لیے کہا۔ فدا بہت غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور دانت ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ وہ صرف مسز جعفری کا لحاظ کرتے ہوئے خاموش تھا ورنہ اب تک وسیم کا گلا گھونٹ کر اسے ختم کر چکا ہوتا۔ ادا سیاہ بیگ نکال کر ماں کے پاس لے آئی۔ اس نے بیگ ماں کے سامنے رکھ دیا اور قریب ہی بیٹھ گئی۔ مسز جعفری فدا سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں۔

''میں تمہاری دماغی کیفیت کو محسوس کرسکتی ہوں۔ اگر ردا اور ادا کا معاملہ نہ ہوتا۔ تب اس آوارہ لڑکے کی عقل کو ٹھکانے لگا چکی ہوتی۔ لیکن مجھے دونوں لڑکیوں کی عزت کا خیال ہے۔ ہم کل یہ محلہ چھوڑ دیں گے اور فیکٹری کے کوارٹر میں بھی نہیں جائیں گے۔ میں جو سوچ رہی ہوں۔ وہ سب تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا۔'' وہ کچھ دیر کے لیے چپ ہو گئیں۔ پھر افسردہ لہجے میں بولیں۔ ''تمہارے باپ کو مرے ہوئے ڈیڑھ دو سال کا عرصہ ہو گیا۔ ان کی وفات کے بعد حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا اور اب یہ عالم ہے کہ گھر میں کھانے کے لیے دال روٹی نہیں اور ہمیں دباؤ ڈال کر مکان چھوڑنے کے لیے مجبور کیا جارہا ہے۔ حالات بہت ابتر ہو گئے ہیں۔ میرا دل کرتا ہے کہ میں خودکشی کرلوں۔'' ان کی آواز رُندھ گئی اور وہ ہچکیاں لے کر رونے لگیں۔ ادا اور ردا نے بے اختیار ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور اسے چومنے لگیں۔ فدا بُت بنا خاموش بیٹھا تھا۔ کچھ دیر روتے رہنے کے بعد مسز جعفری نے دوپٹے سے آنسو پونچھے پھر افسردہ لہجے میں گویا ہوئیں۔

''جب تک تمہارا باپ زندہ تھا۔ ہم نے بہت اچھا وقت دیکھا۔ ان دنوں کوئی غم نہیں تھا۔ گھر میں پیسوں کی ریل پیل تھی۔ کوئی ہماری طرف میلی آنکھوں سے دیکھنے والا نہیں تھا۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں۔ جب ہم نگر کے ہل اسٹیشن پر چھٹیاں منانے جاتے تھے۔'' ان کی آنکھوں میں ستارے جھلملائے۔ جیسے وہ گزرے وقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں اور وہ لمحات ان کے دل و دماغ پر اثرانداز ہو رہے ہوں۔ وہ سرشاری سے بھرپور لہجے میں دوبارہ بولیں۔ ''وہ ہوٹل کتنا مہنگا تھا جس میں ہم مہینے بھر کے

لیے رہتے تھے۔"

مسز جعفری سنجیدہ لہجے میں بولیں۔ "ہم نگر کے ہل اسٹیشن جائیں گے۔ آب و ہوا تبدیل ہوگی تو دماغ پر اچھے اثرات نمودار ہوں گے۔ تب تک وسیم والا معاملہ بھی دب جائے گا۔"

تینوں بچوں کے چہروں پر حیرت کے تاثرات پیدا ہوئے۔

فدا نے پوچھا۔ "لیکن رقم کہاں سے آئے گی۔ ہوٹل اِن دی نگر کا کرایہ ان دنوں دس ہزار تھا۔ اب یقیناً بیس ہزار تو ضرور ہوگا۔ سات دنوں کے ایک لاکھ چالیس ہزار بن جائیں گے۔ اتنی رقم تو ہم نے خواب میں بھی نہیں دیکھی۔"

مسز جعفری نے سیاہ بیگ کھولا اور نوٹ ... نکال کر پلنگ پر بکھیر دیے۔ بچوں کی آنکھیں حیرت کے مارے کھل گئیں۔

فدا چلّاتے ہوئے بولا۔ "یہ کہاں سے آئے۔ میرے خیال میں لاکھ دو لاکھ سے اوپر ہوں گے۔"

مسز جعفری نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں، دو لاکھ ہیں۔ تمہارے باپ نے وفات سے پہلے کسی کو قرضہ دیا تھا۔ اس نے واپس لوٹایا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ دودھ والے اور پرچون والے کا قرضہ ادا کر دیتی ہوں۔ مالک مکان کو بھی ادائیگی کرنا ضروری ہے۔ ایک لاکھ کی رقم اسی میں چلی جاتی، پیچھے بچتا ہی کیا۔ لیکن اگر ہم اس رقم کو استعمال میں لائیں تو ہفتہ بھر نہایت سکون اور اطمینان سے گزار سکتے ہیں۔ ہم گزرے دنوں کو یاد کریں گے اور وہاں خوب ہلّا گلا کریں گے۔"

ادا بولی۔ "لیکن یہ رقم ٹور کے لحاظ سے بہت کم ہے۔ اگر ہوٹل کا کرایہ بیس ہزار ہوا تو سات دنوں کے ایک لاکھ چالیس ہزار بن جائیں گے۔ ہم کھائیں پئیں گے کیا؟ اس کے علاوہ وہاں جانے کے لیے بھی اچھی خاصی رقم درکار ہے۔"

مسز جعفری سوچ میں پڑ گئیں۔ وہ واقعی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ان کے پاس رقم بہت کم تھی اور اخراجات رقم کی مناسبت سے آسمان سے باتیں کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ انہیں سوچتا ہوا دیکھ کر فدا بولا۔

"ہوٹل اِن دی نگر فائیو اسٹار ہوٹل ہے۔ اس لیے اس کا کرایہ دوسرے ہوٹلوں سے زیادہ ہے۔ ہم عام ہوٹل میں ٹھہریں گے۔ جس کا کرایہ مناسب ہو۔ اس طرح کافی رقم کھانے پینے اور گھومنے پھرنے کے لیے بچ جائے گی۔"

مسز جعفری نے انکار میں سر ہلایا۔ "نہیں، ہم ہوٹل نگر میں ہی ٹھہریں گے۔ لیکن صرف تین دنوں کے لیے۔ اگر ہوٹل کا کرایہ بیس ہزار ہوا تو تین دنوں کا ساٹھ ہزار بن جائے گا اور ایک لاکھ چالیس ہزار کی رقم کھانے پینے اور تفریحات کے لیے بچ جائے گی۔"

ادا اداس لہجے میں بولی۔ "لیکن تین دنوں کے بعد ہمیں دوبارہ یہاں آنا ہوگا۔ تب ایک دفعہ پھر ادھار..... کی ادائیگی گھر کے اخراجات اور نوکری کی تلاش کی ضرورت پڑے گی تب ہم کیا کریں گے۔"

مسز جعفری غصیلے لہجے میں بولیں۔ "اس کے متعلق ہم بعد میں سوچیں گے۔ لیکن ابھی تم تینوں میری ایک بات کان کھول کر سن لو۔ ان تین دنوں کے دوران ہم میں سے کوئی بھی تلخ دنوں کے متعلق بات نہیں کرے گا۔ ہم وہاں اچھا وقت خوشگوار ماحول میں گزاریں گے۔ جیسے پہلے گزارا کرتے تھے۔ واپس آنے کے بعد میں سب کچھ سنبھال لوں گی۔ تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

مسز جعفری نے سوچ لیا تھا کہ انہیں کل ہر حالت میں اس محلے کو چھوڑنا ہوگا۔ "طاہر صاحب سے کچھ بعید نہیں کہ وہ آج رات ہی پولیس کو یہاں لے آئیں۔ میں کل صبح فیکٹری میں پانچ دنوں کی چھٹی کی درخواست دے آؤں گی۔ اس دوران تم تینوں روانگی کی تیاری کر لینا۔"

"ہم وہاں ٹرین سے جائیں گے یا پھر کوچ سے؟" ردا نے خوشی سے بھرپور لہجے میں پوچھا۔

"کوچ سے...... ٹرین ہل اسٹیشن تک نہیں جاتی۔ جب تمہارے والد زندہ تھے تب ہم اپنی گاڑی میں سفر کرتے تھے۔ اب چونکہ ہمارے پاس گاڑی نہیں ہے اس لیے ہم کوچ کے ذریعے جائیں گے۔ اب جلدی سو جاؤ تاکہ صبح سفر کے لیے فریش ہو جاؤ۔"

فدا اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور ادا بستر درست کرنے لگی۔

☆☆☆

اگلی صبح وہ ہل اسٹیشن جانے کی خوشی میں جلدی سو کر اٹھ گئے۔ ناشتا کرنے کے بعد مسز جعفری چھٹی کی درخواست دینے کے لیے فیکٹری چلی گئیں۔ ردا اور ادا جانے کی تیاریاں کرنے لگیں اور فدا کوچ میں سیٹیں کروانے کے لیے ٹرمینل چلا گیا۔ گلی سنسان پڑی تھی۔ وسیم کا کچھ اتا پتا نہیں تھا۔ مسز جعفری کو دھڑکا لگا ہوا تھا کہ دونوں باپ بیٹا کچھ نہ کچھ کریں گے ضرور...... اس لیے وہ جلد از جلد اس محلے کو چھوڑ دینا چاہتی

تھیں۔ انہوں نے دل میں تہیہ کرلیا تھا کہ اگر چھٹی نہ بھی ملی تو درخواست اپنی ٹیبل پر رکھ کر روانہ ہو جائیں گی اور ٹور سے واپس آنے کے بعد منت سماجت کر کے ڈائریکٹر کو منا لیں گی۔ وقار صاحب بہت اچھے اور نرم دل انسان تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ان کے چند آنسو دیکھنے کے بعد پگھل جائیں گے۔ لیکن اس دفعہ معاملہ کچھ مختلف تھا۔ وقار صاحب نے درخواست لینے سے صاف انکار کردیا۔ ان کا کہنا تھا کہ چونکہ مہینے کا آخر ہے اس لیے کام بھی بہت زیادہ ہے۔ مسز جعفری نے بہت منت سماجت کی لیکن وہ نہیں مانے۔ تب انہوں نے استعفیٰ لکھ کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ وقار صاحب نے حیرت بھری نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا۔ مسز جعفری کے چہرے پر غصے کے تاثرات تھے۔ انہوں نے ہفتے اور اتوار کے علاوہ شاذ و نادر ہی چھٹی کی تھی اور پانچ دنوں کی چھٹی پر ان کا حق بنتا تھا لیکن وقار صاحب کے صاف انکار کرنے پر انہیں اس حق پر ناانصافی کا گمان ہو رہا تھا۔

وقار صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ وہ جانتے تھے کہ مسز جعفری کام کے معاملے میں نہایت فرض شناس اور محنتی عورت تھیں۔ وہ انہیں کھونا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد بولے۔

''ٹھیک ہے۔ میں درخواست رکھ لیتا ہوں لیکن آپ کو پانچ دن کی تنخواہ نہیں ملے گی۔ اپنا نمبر کلرک کو لکھوا دیجیے گا۔ تاکہ آپ کے ساتھ رابطہ رہے۔''

مسز جعفری کے پاس موبائل نہیں تھا اور وقت بہت تیزی کے ساتھ گزر رہا تھا۔ اس لیے انہوں نے ہمسایوں کا فون نمبر لکھوا دیا۔ پھر آفس سے نکل کر بس پکڑنے کے بعد گھر آگئیں۔ ادا اور ردا تیاریاں مکمل کر چکی تھیں۔ سامان ایک بیگ کی صورت میں کمرے کے درمیان رکھا ہوا تھا۔ فدا ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ مسز جعفری نے اپنے کاغذات بیگ میں منتقل کیے۔ جن میں ان کا شناختی کارڈ اور ڈرائیونگ لائسنس سرفہرست تھا۔ کچھ دیر بعد فدا آگیا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور گریبان کے دو بٹن بھی ٹوٹے ہوئے تھے۔ مسز جعفری نے پریشان لہجے میں اس سے بٹن ٹوٹنے کی وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا۔

''ٹرمینل میں بھیڑ بہت زیادہ تھی۔ اس لیے دھکم پیل کی وجہ سے ٹوٹ گئے ہیں۔''

مسز جعفری جانتی تھیں کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے لیکن بس چلنے کا وقت ہوا جا رہا تھا اس لیے انہوں نے زیادہ بات چیت نہیں کی اور بیگ اٹھا کر دروازے لاک کر کے باہر آگئیں۔ انہیں ٹیکسی قریب ہی سے مل گئی۔ محلے سے دور نکلتے ہی انہوں نے فدا کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم وسیم کے ساتھ لڑ کر آرہے ہو نا؟ دیکھو جھوٹ نہ بولنا۔''

وہ خاموش رہا۔

مسز جعفری دوبارہ بولیں۔ ''اب اس کا باپ پولیس کو لے کر ہماری تلاش میں ہل اسٹیشن آئے گا۔ تب تمام ٹور کا ستیاناس ہو کر رہ جائے گا۔''

فدا نے جواب دیا۔ ''انہیں معلوم نہیں کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ وہ ہمیں محلے میں ہی تلاش کرتے رہیں گے۔ اس کے بعد مایوس ہو کر فائل بند کردیں گے۔''

مسز جعفری غصیلے لہجے میں بولیں۔ ''تو تمہارے خیال میں ہم ہل اسٹیشن سے واپس شہر نہیں آئیں گے اور پانچ دنوں کے دوران فائل بند ہو جائے گی، تمہاری خام خیالی ہے۔''

فدا نے بے پروائی سے کاندھے اُچکائے۔ ''واپس آنے کے بعد دیکھ لیں گے۔ ابھی تو ٹرمینل پہنچنے کی جلدی ہے۔ بس روانہ ہونے میں پندرہ منٹ باقی بچے ہیں اور ٹیکسی ڈرائیور گاڑی کو بہت آہستہ چلا رہا ہے۔''

مسز جعفری خاموش ہو گئیں۔ اس بدمزگی نے انہیں پریشان کر دیا تھا۔ ٹیکسی ٹرمینل میں داخل ہو گئی۔ وہاں رش بہت زیادہ تھا۔ ان کی مطلوبہ بس روانگی کے لیے تیار کھڑی تھی۔ ان کے بیٹھتے ہی بس روانہ ہو گئی۔ مسز جعفری نے سکون کا طویل سانس لیا۔ آخرکار وہ ان منحوس حالات سے فرار ہونے میں کامیاب ہو ہی گئی تھیں۔ اب نہ جانے فدا پیچھے کیا گل کھلا آیا تھا۔ اس کے متعلق تو پانچ دنوں کے بعد واپس آنے پر ہی معلوم ہو سکتا تھا لیکن وہ اب ان تلخ لمحات کے متعلق بالکل بھی نہیں سوچنا چاہتی تھیں۔ اس لیے سیٹ کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں۔ وہ پچھلی تمام رات سو نہیں سکی تھیں۔ اس لیے کچھ دیر بعد ہی خراٹے لینے لگیں۔ دوپہر کا کھانا انہوں نے راستے میں کھایا اور باقی کا پورا دن سفر طے کرنے کے بعد رات کو دس بجے کے قریب نگر پہنچ گئے۔ ان کے پاس سامان مختصر تھا۔ اس لیے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اور ٹیکسی پکڑ کر ہوٹل آگئے۔ ریسپشنسٹ کلرک نے ان کا استقبال کرتے ہوئے بتایا کہ کمرے کا کرایہ پندرہ ہزار روپے ہے۔ انہوں نے تین دنوں کے لیے کمرا بک کروایا اور بیگ لے کر کمرے میں آگئے۔ دروازہ کھولتے ہی جیسے پرانی یادوں کا دریچہ کھل گیا۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں وہ سب جعفری صاحب کے ساتھ آکر رہتے تھے۔ ٹیرس پر آرام کرسی رکھی ہوئی تھی۔ ردا اس پر بیٹھ کر جھولنے لگی۔ فدا نے ایل سی ڈی

آن کرلیا اور اپنی پسند کی مووی دیکھنے لگا۔ ردا اور مسز جعفری سامان کو بیگ میں سے نکال کر ترتیب دینے لگیں۔

سب کچھ پہلے جیسا ہی تھا لیکن حالات تبدیل ہو گئے تھے۔ دو سال پہلے جب وہ ہوٹل میں آئے تھے تب مطمئن اور خوش باش تھے۔ لیکن اب وہ حالات سے فرار ہو کر اس ہوٹل میں آئے تھے۔ پریشانیوں اور اُلجھنوں نے ان کے دل و دماغ کا محاصرہ کرلیا تھا۔ تاہم اب یہ تین دن ان کے اپنے تھے۔ وہ ان تین دنوں کو اپنی مرضی کے مطابق گزارنے کے لیے آزاد تھے۔ کمرے میں سامان ترتیب دینے کے بعد انہوں نے منہ ہاتھ دھویا اور ہوٹل کے ڈرائننگ روم میں آگئے۔ کھانا نہایت لذیذ اور پُرتکلف تھا۔ ان چاروں نے پیٹ بھر کر کھایا اور بل ادا کر کے واپس کمرے میں آگئے۔ تمام دن کے تھکے ہوئے تھے۔ اس لیے بیڈ پر لیٹتے ہی خوابِ خرگوش کے مزے لوٹنے لگے۔

☆☆☆

صبح مسز جعفری نے انہیں منہ اندھیرے جگا دیا۔ دو سال پہلے جب وہ جعفری صاحب کے ساتھ ہوٹل میں آتے تھے۔ تب منہ اندھیرے اٹھنے کے بعد واک کے لیے باہر جایا کرتے تھے۔ ان دنوں کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے وہ چاروں ہوٹل سے باہر آگئے۔ نگر کا چھوٹا سا بازار سنسان پڑا تھا۔ سرسبز پہاڑوں کے درمیان سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا تھا۔ ان کے پاس گزشتہ وقتوں کی طرح جاگرز اور ٹریک سوٹ نہیں تھے۔ تاہم دو لاکھ کی رقم ان کے پاس موجود تھی۔ وہ بعد میں خرید سکتے تھے۔ ہوٹل سے کچھ آگے دائیں جانب کچی پگڈنڈی تھی۔ وہ اس پر چلنے لگے۔ غیور کا کھوکھا بند پڑا تھا۔ اس کے پاس مچھلیاں پکڑنے والی بنسیاں اور چند گھوڑے تھے۔ جو نہایت شریف طبع اور معصوم تھے۔ جن پر سواری مشکل نہیں تھی۔ غیور ان کی لگامیں تھامے آگے چلتا تھا اور جعفری صاحب گھوڑوں کے پیچھے ہوتے تھے۔ زیادہ تر ادا اور فدا گھوڑوں پر سواری کرتے تھے۔ ردا کو ان سے خوف محسوس ہوتا تھا۔ اس لیے وہ انکار کر دیا کرتی تھی۔

کھوکھے کے پاس سے گزرتے ہوئے فدا بولا۔ ”میں غیور کو بلاتا ہوں۔ مجھے اس کے گھر کے متعلق معلوم ہے۔ گھڑ سواری کے بغیر صبح کی واک کا مزہ نہیں آئے گا۔“

مسز جعفری مسکرا کر رہ گئیں۔ ”گھڑ سواری کے دوران واک کہاں ہوتی تھی۔ لیکن بچے خوش اور مطمئن تھے۔“ اس لیے وہ بھی خوش تھیں۔

فدا کے جانے کے بعد ادا بولی۔ ”ہم مچھلیاں پکڑنے کے لیے دریا پر بھی جائیں گے۔“

ردا پُرجوش لہجے میں بولی۔ ”اور گاڑی کرائے پر لے کر سرکل آئی لینڈ بھی...... امی کو گاڑی چلانا آتی ہے اور کاغذات والے لفافے میں...... میں نے خصوصی طور پر ڈرائیونگ لائسنس رکھ دیا تھا۔“

مسز جعفری بولیں۔ ”مجھے اندیشہ لاحق ہے کہ کہیں رقم کم نہ ہو جائے۔ میرے خیال میں کچھ ہاتھ کھینچ کر خرچ کرنا ہوگا۔“ لڑکیاں چپ ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد غیور اور فدا دو گھوڑے لیے پگڈنڈی پر نمودار ہوئے۔ غیور پچاس سال سے کچھ اوپر کی عمر کا تھا۔ لیکن کھلی آب و ہوا میں رہنے کی وجہ سے اپنی عمر سے کم دکھائی دیتا تھا۔ وہ شلوار قمیص پہنتا تھا لیکن فر فر انگلش بولتا تھا۔ نگر میں ٹورسٹ بہت آیا کرتے تھے اور ان میں اکثریت غیر ملکیوں کی تھی۔ اس لیے وہ ان سے بات چیت کے دوران اچھی خاصی انگریزی بولنا سیکھ گیا تھا۔ قریب پہنچنے کے بعد اس نے مسز جعفری کو سلام کیا اور ان سے جعفری صاحب کے متعلق پوچھا۔ مسز جعفری کے چہرے پر اداسی کے گمبھیر سائے طاری ہونے لگے۔ ادا نے فوراً بات کو پلٹتے ہوئے کہا۔

”غیور چاچا! ہم کل بنسیاں لے کر ٹراؤٹ کے شکار کے لیے دریا پر جائیں گے۔ آپ اچھی والی بنسیاں ہمارے لیے علیحدہ کر دیجیے گا۔“

غیور نے اثبات میں سر ہلایا پھر فدا اور ادا گھوڑے پر بیٹھ گئے۔ ردا اور مسز جعفری گھوڑوں کے پیچھے چلنے لگیں۔ روشنی اچھی خاصی پھیل گئی تھی۔ تاہم سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ ہوا میں خنکی تھی اور ان کے پاس مناسب کپڑے نہیں تھے لیکن کھلی آب و ہوا اور مناسب ماحول نے ان کے دل و دماغ پر خوشگوار اثرات پیدا کر دیے تھے۔ وہ سب بہت خوش اور مطمئن تھے۔ انہیں اب کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ان تین دنوں کو اسی طرح گزارنا چاہتے تھے۔ جیسے آج سے دو سال قبل گزارتے تھے۔

پگڈنڈی سانپ کی طرح بل کھاتی اوپر جانے لگی۔ اس کے دونوں جانب گھنے درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ جن میں کہیں کہیں رنگ برنگی چھتریاں لگا کر ان کے نیچے لوہے کی کرسیاں نصب کر دی گئی تھیں۔ دونوں گھوڑے مناسب رفتار کے ساتھ اپنے مالک کے پیچھے چل رہے تھے۔ وہ سب پچھلے تلخ لمحات کو فراموش کر چکے تھے اور خوب صورت نظاروں میں کھو کر رہ گئے تھے۔ جہاں پگڈنڈی کا اختتام ہوتا تھا، وہاں زیرو پوائنٹ تھا۔ جلد ہی وہ وہاں پہنچ گئے۔ یہاں سے

نیچے نگر کا تمام شہر بخوبی دکھائی دیتا تھا۔ چوٹی کو ہموار کر کے سطح زمین پر ایک بہت بڑا ریسٹورنٹ تعمیر کیا گیا تھا۔ وہ جعفری صاحب کے ساتھ جب وہاں آتے تھے تو صبح کا ناشتا اسی ریسٹورنٹ میں کرتے تھے۔ اب بھی ان کا یہی ارادہ تھا۔ اس پوائنٹ کی ایک خوبی اور بھی تھی کہ یہاں سے رسیوں کے ذریعے پھسلتے ہوئے نیچے نگر تک جایا جاسکتا تھا۔ لیکن اس کے لیے عمر بیس سال سے زیادہ ہونا ضروری تھی اور تینوں بچے بیس سال سے کم تھے۔ اس لیے رسیوں کے ذریعے نیچے نہیں جاسکتے تھے۔ بہر حال گھوڑوں سے اترنے کے بعد وہ سب ریسٹورنٹ کے اندر آگئے۔ مسز جعفری نے پُرتکلف ناشتے کا آرڈر دے دیا۔ غیور گھوڑوں کو درختوں کے نیچے باندھنے کے بعد واپس نگر کی طرف چلا گیا۔ انہوں نے اسے گھنٹے بھر کے بعد آنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ مسز جعفری چند لمحوں کے لیے اداس ہوگئیں۔ انہیں گزشتہ دنوں کی یاد نے بے کل کر دیا تھا۔ جعفری صاحب جب بھی ریسٹورنٹ میں آتے تھے تو خواہش کا اظہار کیا کرتے تھے۔ وہ خواہش بھی پوری نہیں ہو سکی تھی۔ ریسٹورنٹ کے اوپر چند کمرے بنے ہوئے تھے۔ ان کمروں کا کرایہ بہت زیادہ تھا۔ ان کے لیے کرایہ دینا مشکل نہیں تھا لیکن وقت بہت کم تھا۔ بچوں کا دل نگر میں زیادہ لگتا تھا اور وہ ہوٹل میں رہنے کو ریسٹورنٹ کے کمروں پر ترجیح دیتے تھے۔ اس لیے جعفری صاحب کی خواہش دل میں ہی رہ گئی۔ مسز جعفری کے پاس بھی وقت کی کمی تھی اور پھر وہ بمشکل تمام ٹور کا خرچہ برداشت کر رہی تھیں۔ کمرے کا کرایہ دینا ان کے اختیار سے باہر تھا۔ بچوں نے خوب ڈٹ کر ناشتا کیا۔ نہ جانے وہ باپ کو یاد کر رہے تھے یا نہیں۔ لیکن انجوائے خوب کر رہے تھے۔ ناشتا کرنے کے بعد مسز جعفری نے پے منٹ کی۔ ریسٹورنٹ سے باہر نکلتے ہوئے فدا ضد کرنے لگا کہ وہ رسیوں کے ذریعے نیچے جائے گا۔ مسز جعفری دل تھام کر رہ گئیں۔ زیرو پوائنٹ نگر سے بہت اونچائی پر واقع تھا اور فدا کم عمر تھا۔ مسز جعفری کو امید تھی کہ کم عمر ہونے کی وجہ سے انتظامیہ انکار کر دے گی اس لیے کنٹرول روم کی طرف آگئیں۔ وہاں دو آدمی بیٹھے باتوں میں مشغول تھے۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد فدا ان ... دونوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''میں رسیوں کے ذریعے نیچے جانا چاہتا ہوں اور میری عمر بیس سال سے اوپر ہے۔ آپ میری والدہ سے پوچھ سکتے ہیں۔''

ان میں سے ایک مرد مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ آپ شناختی کارڈ ہمیں دکھا دیجیے۔''

فدا نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''میرے پاس شناختی کارڈ اپنی والدہ کی صورت میں موجود ہے۔ آپ ان سے تصدیق کرسکتے ہیں۔''

دونوں مردوں نے مسز جعفری کی طرف دیکھا۔ انہوں نے مجبوری کے عالم میں سر ہلایا۔ ٹور پر آنے سے قبل وہ دل میں تہیہ کر چکی تھیں کہ تینوں بچوں میں سے کسی کی بھی خواہش کو رد نہیں کریں گی۔ انہوں نے باپ کے مرنے کے بعد بہت مجبوری و لاچاری دیکھی تھی۔ اب جب ان کی جیب میں تین دنوں کے لیے رقم موجود تھی تو وہ انکار کیوں کرتیں۔ اس کے باوجود بھی انہوں نے رسیوں کے ذریعے نیچے جانے کی تفصیلات معلوم کیں۔ دونوں مردوں میں سے ایک نے مسز جعفری کو بتایا کہ یہ نہایت محفوظ اور آسان طریقہ کار ہے۔ فدا کو رسیوں اور ان کے آخر میں بندھے ہوئے کڑوں کے ساتھ اچھی طرح باندھ دیا جائے گا۔ ان کڑوں کے اوپر بغلوں کے قریب اور کمر کے پاس ایک آنکڑا لگا ہوا ہے۔ جو لوہے کی موٹی تار کے اوپر پھسلتا ہوا آگے جائے گا اور جلد ہی فدا کو نیچے والے کنٹرول روم تک پہنچا دے گا۔

مسز جعفری نے پریشان لہجے میں پوچھا۔ ''اگر وہ گھنے درختوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے کسی درخت سے ٹکرا گیا تب کیا ہوگا؟''

ان میں سے ایک نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ''لوہے کی تار کو اوپر سے نیچے لے جاتے ہوئے اس بات کا بخوبی خیال رکھا گیا ہے کہ وہ درختوں کے اوپر سے ہوکر نیچے کی طرف جائے۔ درمیان میں کچھ ایسے پوائنٹ بھی آتے ہیں جہاں تار کو درختوں کے قریب سے ہوکر گزرنا ہوتا ہے۔ وہاں سے درختوں کی شاخوں کو کاٹ دیا گیا ہے۔ اس لیے آپ مطمئن رہیے۔ آپ کے لڑکے کو کچھ نہیں ہوگا۔

مسز جعفری نے رقم کی ادائیگی کر دی اور کنٹرول روم کے درمیان فدا کو رسیوں اور کڑوں کے ذریعے جکڑ دیا گیا۔ کمرے کے سامنے کی دیوار شیشے کی تھی اور یہ شیشہ کھسک کر ایک جانب چلا جاتا تھا۔ کنٹرول روم پہاڑی کے آخر میں بنایا گیا تھا۔ اس لیے شیشے کے ہٹ جانے کے بعد نیچے گہرائی میں نگر کا شہر دکھائی دیتا۔ فدا کو شیشے کے پاس کھڑا کر دیا گیا اور اسے چند ہدایات دی گئیں کہ دوران سفر زیادہ ہلنے جلنے کی کوشش نہ کرے اور کسی بھی درخت کی شاخ کو پکڑنے سے بھی اجتناب کرے۔ جو تار اس کے سر کے اوپر سے گزر رہی ہے اور جس کے ذریعے آنکڑا پھسلتا ہوا نیچے جاتا ہے۔ اسے

پکڑنے سے بھی گریز کرے اور نیچے دیکھنے کے بجائے اگر سامنے دیکھے تو اس کے لیے بہتر ہوگا۔"

فدا نے اثبات میں سر ہلایا اور دونوں آدمیوں نے اسے ہلکا سا دھکا دے دیا۔ مسز جعفری نے بے اختیار آنکھیں بند کرلیں۔ ردا اور ادا شیشے کے پاس کھڑے ہو کر اپنے بھائی کو نیچے جاتا ہوا دیکھنے لگیں۔ فدا خوف زدہ ہونے کے بجائے بہت انجوائے کررہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ درختوں کے اوپر سے ہوتا ہوا نگر کی طرف چلا گیا اور ردا، ادا ماں کے پاس آگئیں۔ مسز جعفری کنٹرول روم سے نکل کر درختوں کے پاس کھڑے ہوئے گھوڑوں کی طرف بڑھنے لگیں۔ غیور واپس نہیں آیا تھا۔

مسز جعفری ادا سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں۔ "میرا دل ڈوبا جارہا ہے۔ نہ جانے فدا نیچے پہنچا ہے یا نہیں۔ میرے خیال میں ہم نیچے چلتے ہیں۔" دونوں لڑکیاں بے اختیار مسکرا دیں۔ انہیں معلوم تھا کہ ماں .... نے فدا کو اجازت تو دے دی تھی لیکن ان کا دل مطمئن نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے زیادہ بات چیت نہیں کی اور ماں کے ساتھ نیچے چل دیں۔ یہ سفر نہایت عجلت میں کٹا۔ جب ان تینوں نے بازار میں قدم رکھا تو وہاں فدا کو گھومتے ہوئے پایا۔ وہ موبائلز۔۔ کی دکان سے باہر آرہا تھا۔ مسز جعفری کے منہ سے اطمینان کا طویل سانس خارج ہوا۔ انہیں دیکھ کر فدا ان کی طرف آگیا اور موبائل خریدنے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ مسز جعفری اس کے حق میں نہیں تھیں۔ لیکن بات وہیں آکر ختم ہوجاتی تھی کہ ٹور کے دوران انہوں نے انکار نہیں کرنا تھا۔ وہ [illegible] انہیں یاد آیا۔ جعفری صاحب نے دکان کے اندر [illegible] یں۔ انہیں [illegible] چند سال قبل اسی دکان سے اسی ہزار روپے کا موبائل خرید کر انہیں گفٹ کیا تھا۔ بہت سی یادیں تھیں جو وقت کے ساتھ ساتھ یاد آرہی تھیں۔ اچھا ہوا کہ دکان کے مالک نے انہیں پہچانا نہیں۔ اسی ہزار کا موبائل خریدنا اب ان کی استطاعت سے باہر تھا۔ اس لیے انہوں نے دکان میں داخل ہونے سے پہلے ہی فدا کو بتادیا کہ بیس یا تیس ہزار سے زیادہ کا موبائل وہ نہیں خرید سکتیں۔ فدا مان گیا۔ دکاندار نے بھی ان کے حلیوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے مناسب قیمت کے سیٹ نکال کر شوکیس کے اوپر رکھ دیے۔ فدا نے ان میں سے جو پسند کیا۔ اس کی قیمت پینتیس ہزار تھی لیکن کچھ دیر کی مغز ماری کے بعد دکان دار تیس ہزار میں دینے کے لیے تیار ہوگیا۔ مسز جعفری نے رقم ادا کی۔ اور دکان دار نے موبائل کے اندر سم ڈال کر سیٹ ان کے حوالے کردیا۔ پھر وہ چاروں ہوٹل واپس آگئے۔ اب صرف کپڑوں کی خریداری باقی رہ گئی تھی۔ اُن کے پاس گھومنے پھرنے کے لیے مناسب کپڑے نہیں تھے۔ اس لیے نہانے دھونے کے بعد نگر کے بازار کی طرف آگئے۔ غیور کا کھوکھا کھلا ہوا تھا اور اس کے دونوں گھوڑے کھوکھے کے کنارے بندھے ہوئے تھے۔ مسز جعفری نے گھوڑوں کی سواری کی ادائیگی کی اور فدا نے مچھلیاں پکڑنے والی بنسیاں خریدنے کا وعدہ کیا۔ پھر وہ تینوں بازار کی طرف آگئے۔ باقی کا تمام دن خریداری کرتے گزر گیا۔

☆☆☆

رات کو وہ تھکے ماندے ہوٹل واپس آگئے۔ ان چاروں نے کھانا بازار میں کھالیا تھا۔ اس لیے کمرے میں داخل ہونے کے بعد سونے کی تیاری کرنے لگے۔ مسز جعفری کے بیگ میں وقار صاحب کا موبائل نمبر موجود تھا۔ نہ جانے کیوں اُن کی چھٹی حس کسی بہت بڑے طوفان کے آنے کا اعلان کررہی تھی۔ اس لیے بچوں کو سونے کا کہہ کر وہ فدا کا موبائل ہاتھوں میں تھامے ٹیرس کی طرف آگئیں۔ یہاں وہ آرام کرسی رکھی ہوئی تھی جو جعفری صاحب کو بہت پسند تھی۔ مسز جعفری انہیں اکثر کہتی تھیں کہ اگر آپ کو یہ پسند ہے تو نگر کے بازار سے خرید کیوں نہیں لیتے۔ میں نے کچھ دن پہلے وہاں دیکھی ہے۔ جعفری صاحب ہمیشہ انکار کردیتے تھے۔ وہ اتنی بھاری کرسی کو گاڑی میں رکھ کر شہر نہیں لے جانا چاہتے تھے۔ تاہم وہ وعدہ کرتے تھے کہ ایسی ہی کرسی شہر سے خرید لیں گے۔ لیکن وہ کرسی خرید نہیں سکے۔ زندگی نے انہیں موقع ہی نہیں دیا۔ مسز جعفری کرسی پر بیٹھ کر وقار صاحب کا نمبر ملانے لگیں۔ جلد ہی رابطہ ہوگیا۔ انہوں نے اپنا نام بتایا تو وقار صاحب [illegible] تفصیل [illegible] آواز سنائی دی۔

"آپ فوراً چھٹیاں [illegible] آجایئے۔ آج صبح فیکٹری میں پولیس آئی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ کے لڑکے نے محلے کے کسی لڑکے کو سر پر ڈنڈا مار کر ہلاک کردیا ہے۔ وہ اسے گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے لاعلمی کا اظہار کردیا۔"

مسز جعفری کا دماغ گھوم کر رہ گیا۔ انہیں توقع تھی کہ فدا ضرور وسیم کا سر پھاڑ دے گا لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اسے قتل ہی کردے گا۔ اب اگر فدا گرفتار ہوجاتا تب طاہر صاحب اسے پھانسی... چڑھانے کی پوری کوشش کرتے اور اگر وہ پھانسی... چڑھ جاتا تو پیچھے بچتا ہی کیا۔ انہوں نے جلدی سے موبائل بند کردیا اور دل میں تہیہ کیا کہ وہ اب شہر واپس نہیں جائیں گی اور وقار صاحب کو بھی دوبارہ فون نہیں کریں

گی۔ موبائل کے ذریعے ان کی لوکیشن ٹریس کی جا سکتی تھی لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ وہ گھر سے آگے کہاں جائیں۔ جلد ہی ان کے پاس رقم ختم ہو جاتی۔ تب انہیں مجبوراً شہر جانا پڑتا۔ اس وقت ان کے پاس ڈیڑھ لاکھ سے کچھ اوپر کی رقم موجود تھی۔ جس میں سے ہوٹل کا کرایہ دینا ابھی باقی تھا۔ اگر وہ احتیاط کے ساتھ رقم خرچ کرتیں تو ایک ہفتہ بہ آسانی کسی سستے ہوٹل میں گزار سکتی تھیں۔ لیکن یہ سوچ کر ان کا دل ڈوبا جا رہا تھا کہ اگر انہیں تلاش کرتے ہوئے پولیس نگر آ جاتی تو پھر کیا ہوتا۔ جب تک رقم ان کے پاس تھی وہ چھپ سکتی تھیں اور جب رقم ختم ہو جاتی تب ان کا چھپنا ممکن نہیں رہتا۔ اب یہ ہو سکتا تھا کہ وہ بچوں کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیتیں۔ اس صورت میں وہ محتاط ہو جاتے اور فضول خرچی کرنے سے پرہیز کرتے۔ ورنہ تو وہ جس طریقے سے رقم خرچ کر رہے تھے۔ وہ واقعی دو دنوں کے دوران ختم ہو جاتی۔ لیکن انہوں نے فوراً ارادہ بدل دیا۔ وہ بچوں کو حالات کے متعلق بتا کر ان کی خوشی کو غم میں تبدیل نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے غیر محسوس طور پر ہاتھ کھینچ کر اخراجات کو کم کرنے کا ارادہ کیا اور اٹھ کر بیڈ روم میں آ گئیں۔ تینوں بچے تمام دن کی تھکن اتارنے کے بعد بیڈ پر آڑے ترچھے سو رہے تھے۔ مسز جعفری نے ایک سائڈ پر جگہ بنائی اور وہاں لیٹ گئیں۔

☆☆☆

وہ تمام رات جاگتی رہیں۔ صبح ان کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ ناشتے کے لیے ریسٹورنٹ جانے سے قبل انہوں نے فدا کو بازار بھیج کر سر درد کی گولیاں منگوائیں۔ گولیاں کھانے کے بعد کچھ افاقہ محسوس ہوا تو انہوں نے سنجیدہ لہجے [illegible] فدا سے پوچھا۔ ''تم یہاں آنے سے قبل [illegible] سے ملنے کے لیے [illegible] گئے تھے؟''

فدا نے چونک کر ان کی جانب دیکھا پھر غصیلے لہجے میں بولا۔ ''اسے سبق سکھانا ضروری تھا۔ وہ حد سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے دوستوں کو بھی ادا کے متعلق الٹا سیدھا بتا دیا ہے۔ وہ سب مجھے دیکھتے ہی نعرے بازی کرنے لگتے تھے۔ یہاں آنے سے قبل وہ مجھے سنسان سڑک پر تنہا مل گیا۔ میں نے اسے خوب مارا اور قریب... پڑے ہوئے چارپائی کے ڈنڈے کے ساتھ اس کا سر پھاڑ دیا۔'' مسز جعفری کا دل دھک سے رہ گیا۔ ان کا اکلوتا لڑکا قاتل بن گیا تھا۔ ان کے دل میں آیا کہ وہ فدا کو وسیم کے مرنے کے متعلق بتا دیں لیکن انہوں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ ان کے بچوں کے پاس صرف دو دن باقی تھے اور وہ ان دو دنوں کو برباد نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

اس لیے چپ ہو گئیں۔ فدا نے یہ نہیں پوچھا کہ انہیں کس نے بتایا کہ وہ وسیم سے ہاتھا پائی کرنے کالج گیا تھا۔ ناشتا کرنے کے بعد مسز جعفری نے ان تینوں سے تفریح کے متعلق دریافت کیا۔

فدا بولا۔ ''ہم غیور سے بنسیاں خرید کر دریا پر ٹراؤٹ فش کے شکار کے لیے جائیں گے۔''

مسز جعفری نے اثبات میں سر ہلایا۔ ان کے سر کے درد میں کافی حد تک کی واقع ہو گئی تھی لیکن طبیعت بوجھل تھی۔ انہوں نے بچوں کو طبیعت کی ناسازی کے متعلق نہیں بتایا۔ ادا نے ان سے پوچھا بھی تھا۔ انہوں نے اسے دلاسا دیا کہ انہیں افاقہ ہو گیا ہے۔ وہ چاروں ریسٹورنٹ سے اٹھ کر کمرے میں آ گئے۔ انہوں نے کپڑے تبدیل کیے۔ گزشتہ روز کی خریداری کام آئی۔ دو سال کے بعد انہوں نے اپنی پسند کے لباس زیب تن کیے تھے۔ ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ ان کو خوش دیکھ کر مسز جعفری کی طبیعت بھی کافی حد تک بحال ہو گئی۔

ہوٹل سے نکل کر وہ چاروں غیور کے کھوکھے کی طرف آ گئے۔ انہوں نے بنسیاں خرید یں۔ غیور نے انہیں بنسیوں کے ساتھ ایک خوب صورت شیشے کی بوتل بھی دی۔ جس میں کینچوے کلبلا رہے تھے۔ انہیں کانٹے میں پرو کر دریا میں ڈال دیا جاتا۔ اگر مچھلی کینچوے پر منہ مارتی تو کانٹا اس کے حلق میں پھنس جاتا اور ڈوری کو کھینچنے پر مچھلی باہر آ جاتی۔ مسز جعفری نے کھانے پینے کا مختصر سامان ہمراہ لیا اور چاروں دریا کے کنارے آ گئے۔ بچوں نے بنسیوں [illegible] دور [illegible] میں ڈال دیں اور مچھلی پھنسنے کا انتظار کرنے لگے جبکہ مسز جعفری دریا کے کنارے لگی ہوئی چھتری کے نیچے نصب کرسی پر بیٹھ گئیں۔

ان کا دماغ سوچوں کے گھیرے میں تھا۔ وہ جتنا بھی حالات کو بھلانے کی کوشش کرتی تھیں اتنا ہی سوچوں کے گرداب میں پھنستی چلی جاتی تھیں۔ بات معمولی نہیں تھی اور حقیقت سامنے آ گئی تھی۔ وسیم کو واقعی فدا نے ہلاک کیا تھا۔ اگر وہ فدا کو قانون کے حوالے کر دیتیں تو یہ ممکن تھا کہ عدالت اسے پھانسی کی سزا دینے کے بجائے عمر قید کی سزا سنا دیتی۔ لیکن طاہر صاحب کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ ان کی پوری کوشش ہوتی کہ فدا کو پھانسی پر لٹکایا جاتا اور مسز جعفری کے پاس تو وکیل کو فیس دینے کی رقم بھی نہیں تھی۔ ان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا۔

انہوں نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھاما اور بچوں کی

طرف دیکھا۔ وہ دریا کے کنارے حالات سے بے خبر بیٹھے تھے۔ وہ تین دنوں کو خوب انجوائے کررہے تھے۔ اب ان کے پاس اگلا ایک دن باقی بچا تھا، اس کے بعد کیا ہونا تھا۔ مسز جعفری کو اس سوچ نے پاگل کر کے رکھ دیا تھا۔ مچھلیوں کے شکار کے دوران رقم زیادہ خرچ نہیں ہوئی تھی۔ بنسیاں اور کھانے پینے کا سامان تھوڑی سی رقم میں آ گیا تھا۔ ناشتے پر بھی کچھ زیادہ خرچہ نہیں ہوا تھا لیکن انہوں نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ہوٹل کا کرایہ ادا نہیں کریں گی اور پرسوں صبح خاموشی کے ساتھ نگر سے آگے کے لیے روانہ ہو جائیں گی۔ دوپہر کا کھانا انہوں نے دریا کے کنارے کھایا اور شام کی چائے بازار کے ریسٹورنٹ میں پینے کے بعد اپنے کمرے میں آگئے۔ دن اتنی تیزی کے ساتھ گزر گیا کہ انہیں نگر سے آگے جانے کے متعلق سنجیدگی کے ساتھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ رات کا کھانا انہوں نے کمرے میں کھایا۔ ٹی وی پر خصوصی پروگرام پیش کیا جارہا تھا۔ فدا رات دیر تک دیکھتا رہا۔ روا اور ادا تمام دن دریا کے کنارے بھاگتے دوڑتے رہنے کی وجہ سے تھک گئی تھیں۔ اس لیے بستر پر لیٹتے ہی سوگئیں۔

لیکن آج کی رات بھی نیند مسز جعفری کی آنکھوں سے دور تھی۔ فکر اور سوچ نے انہیں پاگل کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ سونا چاہتی تھیں۔ لیکن سوچیں انہیں سونے نہیں دیتی تھیں۔ ان کا سر درد کی وجہ سے پھٹا جارہا تھا۔ آنکھیں خون کے مانند سرخ ہو رہی تھی۔

تمام رات کروٹیں بدلتے ہوئے گزر گئی۔ صبح کے قریب انہیں بخار چڑھ گیا۔ اس لیے ناشتا کمرے میں ہی کیا۔ بچوں نے ان کی حالت کو دیکھ کر ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے اصرار کیا۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ انہیں معلوم تھا کہ ڈاکٹر کے پاس ان کی بیماری کا علاج نہیں تھا۔ انہیں بھرپور نیند کی اشد ضرورت تھی اور جو حالات چل رہے تھے، ان حالات میں سکون کی نیند آنا ناممکن تھا۔ تفریح کے لیے بچوں کے پاس آخری دن تھا۔ وہ اسے برباد نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ کل انہیں کوئی فیصلہ کر کے اس پر عمل درآمد کرنا تھا۔ انہوں نے درد کی دو مزید گولیاں پانی کے ساتھ نگلیں اور بچوں کو لے کر کمرے سے نیچے کی طرف چل دیں۔ ریسپشنسٹ کلرک کے پاس پولیس کے دو اہلکار کھڑے پوچھ گچھ کررہے تھے۔ وہ فوراً قریبی گیلری کی طرف آگئیں۔ پولیس اہلکاروں نے چند لمحے بات چیت کرنے کے بعد ریسپشنسٹ کو چھوڑ دیا اور ہوٹل سے باہر کھڑی جیپ میں بیٹھ کر بازار کی طرف چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد مسز جعفری نے بچوں کو ہوٹل سے باہر جانے کے لیے کہا اور خود ریسپشنسٹ کلرک کی طرف آگئیں۔ وہاں نوجوان لڑکا بیٹھا رجسٹر میں کچھ لکھ رہا تھا انہوں نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ”پولیس کیوں آئی تھی؟ ہوٹل میں ڈاکو تو نہیں گھس آئے؟“

لڑکے نے انکار میں سر ہلایا۔ ”نہیں، انہیں کسی فیملی کی تلاش ہے۔ جو دو دن پہلے نگر آئی ہے۔ چونکہ ان کے پاس تصاویر نہیں تھیں۔ اس لیے میں نے لاعلمی کا اظہار کر دیا۔“

مسز جعفری پریشان ہو کر ہوٹل سے باہر نکل آئیں۔ اب ان کا سرعام بازار میں گھومنا پھرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس لیے بچوں کے پاس آنے کے بعد انہوں نے بتایا۔ ”ہم سرکل آئی لینڈ جارہے ہیں۔ چونکہ واپس آنے میں دیر ہو جائے گی اس لیے کھانے پینے کا سامان ہمیں بازار سے خریدنا ہوگا۔“

بچے خوش ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں انہوں نے کھانے پینے کا سامان پیک کروالیا۔ نگر کے بازار سے کچھ ہٹ کر غیور کے کھوکھے کے پاس گاڑی کرائے پر دینے والوں کا مختصر آفس تھا۔ جعفری صاحب وہاں سے جیپ کرائے پر لیتے تھے۔ انہیں اس کے لیے اپنا شناختی کارڈ اور ایڈوانس رقم وہاں جمع کروانی پڑتی تھی۔ وہ ڈرائیونگ لائسنس بھی دیکھتے تھے۔ وہاں کا عملہ ان سے واقف تھا۔ انہوں نے ہچکچاہٹ کے بغیر سرخ رنگ کی آلٹو ان کے حوالے کر دی۔ جن دنوں حالات بہتر تھے ان دنوں اکثر و بیشتر بازار کے کاموں کے لیے مسز جعفری گاڑی کا استعمال کرتی تھیں۔ اس لیے ان کے پاس نہ صرف ڈرائیونگ لائسنس موجود تھا۔ بلکہ ان کی ڈرائیونگ بھی قابلِ رشک تھی۔ بچوں نے کھانے پینے کا تمام سامان ڈگی میں رکھ دیا اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ فدا نے گاڑی چلانے کے لیے اصرار کیا۔ لیکن مسز جعفری نے منع کر دیا۔ اس کے پاس ڈرائیونگ لائسنس نہیں تھا اور مسز جعفری کوئی ایسی غلطی نہیں کرنا چاہتی تھیں جو پولیس کو اپنی جانب متوجہ کرنے کا باعث بن سکے۔ ان کی طبیعت خراب ہوتی جارہی تھی۔ سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ آنکھیں سوج کر بند ہونے لگی تھیں۔ اس لیے انہوں نے بازار سے سن گلاسز خرید کر آنکھوں پر لگا لیے۔ تاکہ کوئی ان کی حالت کو دیکھ کر ان کی جانب متوجہ نہ ہو سکے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور نگر کے بازار سے گزرتے ہوئے اس کا رخ قریبی پہاڑوں کی طرف کر دیا۔ بازار کے درمیان میں پولیس اسٹیشن کی مختصر عمارت تھی۔ اس کو دیکھ کر انہیں کچھ ڈھارس بندھی۔ وہ دو کمروں پر مشتمل تھی۔ جس میں عملہ بھی زیادہ نہیں تھا۔ گیٹ پر دو اہلکار متعین تھے۔ وہ تیزی

سے گاڑی کو آگے لے گئیں۔
کچھ دیر بعد وہ پہاڑی علاقے میں داخل ہو گئے۔ سرکل آئی لینڈ ایک مختصر جزیرہ تھا جو خوب صورت جھیل کے درمیان واقع تھا۔ اس تک جانے کے لیے اسٹیمر کا استعمال کیا جاتا تھا۔ جزیرے کے اندر خوب صورت پکنک پوائنٹ تھے۔ چونکہ آئی لینڈ نگر سے کافی فاصلے پر واقع تھا اس لیے وہاں گاڑی کے بغیر جانا ممکن نہیں تھا۔
گاڑی پہاڑی کے درمیان جاتی ہوئی سڑک پر اوپر چڑھنے لگی۔ انہیں چوٹی تک سفر کرنا تھا۔ سڑک پہاڑی کے گرد گھومتی ہوئی اوپر کی طرف جاتی تھی۔ دونوں جانب گہری کھائیوں کے درمیان چیڑ اور بانس کے بلند و بالا درخت تھے۔ سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ مسز جعفری کو یہ دلفریب اور سرسبز پہاڑی علاقہ بہت پسند تھا لیکن بگڑتے ہوئے حالات کی وجہ سے یہ خوب صورتی ان کی نگاہوں میں ماند پڑ گئی تھی۔ ان کا دماغ سن تھا اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہونے لگی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد گاڑی پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئی۔ اس وقت وہاں رکنا بے معنی تھا۔ اس لیے انہوں نے گاڑی کو نیچے کی طرف جاتی ہوئی سڑک پر ڈال دیا۔ چونکہ بچوں کو معلوم تھا کہ ماں.... کی طبیعت ناساز ہے اس لیے وہ خاموش بیٹھے تھے۔ ان کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے مسز جعفری نے فدا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
''تم تینوں خاموش کیوں ہو؟ میری طبیعت اب پہلے سے بہتر ہے۔ گاڑی کا ٹیپ ریکارڈر آن کر دو اور کوئی اچھا سا گانا لگا دو۔ تم تینوں کے پاس گھومنے پھرنے کے لیے آج آخری دن ہے۔ اسے خوب انجوائے کرو۔ فدا نے ٹیپ ریکارڈر کو آن کر دیا۔ ماحول کچھ بہتر ہوا تو بچوں نے بات چیت شروع کر دی اور چپس کے لفافے کھولنے لگے۔ لیکن مسز جعفری کو کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ایک معمول کی طرح گاڑی کے اسٹیئرنگ کو دائیں بائیں گھما رہی تھیں۔

☆☆☆

سرکل آئی لینڈ قدرتی جھیل کے درمیان چھوٹی سی پہاڑی کو ہموار کر کے بنایا گیا تھا۔ وہاں تک جانے کے لیے اسٹیمر کا کرایہ بہت زیادہ تھا۔ تاہم وہ سواریوں کو وہاں چھوڑ کر بھی آتا تھا اور شام کے قریب واپس بھی لاتا تھا۔ مسز جعفری نے جھیل کے پاس درختوں کے جھنڈ میں گاڑی پارک کی اور بچوں کے ساتھ اسٹیمر کی طرف آ گئیں۔ اسٹیمر میں دس کے قریب لوگ بہ آسانی بیٹھ سکتے تھے۔ پانچ بیٹھ گئے تھے اور پانچ کا انتظار تھا۔ کچھ دیر کے بعد اسٹیمر بھر گئی اور جزیرے کے گرد ایک لمبا چکر کاٹ کر اس نے ان سب کو مخصوص مقام پر اتار دیا۔ یہاں سے سیڑھیاں اوپر جزیرے کی طرف جاتی تھیں اور کچھ اوپر جا کر ختم ہو جاتی تھیں۔ وہاں سے کچی پگڈنڈی آگے بڑھتی تھی۔ جس کا اختتام پہاڑی کی ہموار سطح کے قریب جا کر ہوتا تھا۔ یہاں سرسبز گھاس سے مزین قالین بچھا ہوا تھا۔ اردگرد گھنے درخت تھے۔ ایک جانب چند دکانیں اور چھوٹا سا کیفے بنا ہوا تھا اور دوسری جانب کچھ جھولے تھے۔ مسز جعفری ایک چھوٹی دری اپنے ساتھ لائی تھیں۔ انہوں نے دری کو گھاس پر بچھایا اور سامان کو ترتیب دینے کے بعد قریب ہی لیٹ گئیں۔ ان کے سر کا درد بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ وہ سونا چاہتی تھیں لیکن درد انہیں سونے نہیں دے رہا تھا۔ ادا اُن کے سرہانے بیٹھ کر ان کا سر دبانے لگی۔ انہوں نے اسے منع کر دیا۔ وہ بچوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ اس لیے انہیں دلاسا دیتے ہوئے بولیں۔
''میں اب پہلے سے کافی بہتر ہوں۔ تم تینوں جزیرے پر گھومو پھرو۔ میں کچھ آرام کروں گی۔ پھر کیفے میں جا کر کافی پئیں گے۔ ادا، اماں کو چھوڑ کر وہاں سے جانا نہیں چاہتی تھی لیکن ان کے اصرار کرنے پر اٹھ کر چلی گئی اور مسز جعفری دوبارہ لیٹ گئیں۔ ان کا دماغ درد کی شدت سے پھٹا جا رہا تھا لیکن اس کے باوجود بھی سوچوں نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ آزادی کا آخری دن بھی آدھے سے کچھ زیادہ گزر چکا تھا۔ انہیں کل کے متعلق کچھ فیصلہ کر لینا چاہیے تھا۔ ابھی تک انہوں نے صرف کھانے پینے اور تفریح کے اخراجات کی ادائیگی کی تھی اور ان کے پاس ایک لاکھ سے کچھ اوپر کی رقم موجود تھی۔ اس رقم سے اگر وہ ہوٹل کا کرایہ ادا کرتیں تو ان کے پاس صرف واپس جانے کی رقم باقی بچتی۔ لیکن شہر واپس جانا اب ممکن نہیں تھا اور آگے کے سفر کے لیے ان کے پاس اچھی خاصی رقم کا ہونا ضروری تھا۔ اگر ہوٹل کے کمرے کی ادائیگی نہ کرتیں تب بھی رقم کب تک چلتی پھر انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ نگر سے آگے شہر کون سا تھا۔ تاہم یہ معلومات نیٹ کے ذریعے بہ آسانی حاصل کی جا سکتی تھیں۔ نگر سے آگے جانے میں گاڑی مددگار ثابت ہو سکتی تھی۔ انہوں نے دل میں تہیہ کیا کہ وہ گاڑی واپس نہیں کریں گی اور اس کے ذریعے آگے کا سفر طے کریں گی۔ لیکن انہوں نے اس خیال کو رد کر دیا۔ اس صورت میں گاڑی رینٹ پر دینے والے چوری کی رپورٹ تھانے میں درج کرواتے اور پولیس کو ان چاروں کی موجودگی کے متعلق معلوم ہو جاتا جبکہ ابھی تک انہیں مسز جعفری کی موجودگی کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ ان چند سوچوں نے ان کے

دماغ کو ہلا کر رکھ دیا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ انہیں چمکتی ہوئی دھوپ بُری لگ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر سائے میں آ گئیں۔ تینوں بچے جھیل کے کنارے مچھلیاں پکڑنے میں مصروف تھے۔ غیور سے خریدی ہوئی بنسیاں وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ بچوں کو خوش دیکھ کر انہیں کچھ اطمینان کا احساس ہوا۔ پولیس ابھی ان سے کافی دور تھی۔ تو پھر وقت سے پہلے بلاوجہ پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ انہوں نے سر کو ایسے جھٹکا جیسے پریشانیوں کو پرے دھکیل دینا چاہتی ہوں پھر واپس دری کی طرف آ گئیں۔ اسی وقت موبائل کی گھنٹی بجی۔ وہ رات کو سوتے ہوئے موبائل کو آف کر کے سوئی تھیں۔ شاید فدا نے آن کر دیا تھا۔ اسکرین پر وقار صاحب کا نمبر موجود تھا۔ انہیں اس کی توقع نہیں تھی۔ یقیناً کوئی غیر معمولی بات ہو گئی تھی۔ جس نے انہیں فون کرنے پر مجبور کیا تھا۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد انہوں نے کال ریسیو کر لی۔

وقار صاحب کی پریشان آواز سنائی دی۔ ”مسز جعفری! آپ جہاں بھی ہیں وہاں سے فوراً فرار ہو جائیے۔ پولیس نے آپ کا نمبر مجھ سے لینے کے بعد لوکیشن کو ٹریس کر لیا ہے۔ وہ کسی بھی وقت آپ تک پہنچنے والے ہیں۔ موبائل آف کر دیجیے اور ہو سکے تو اسے دوبارہ آن نہ کیجیے گا۔“

مسز جعفری کے دماغ کو شدید جھٹکا لگا اور درد کی شدت سے اُن کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔ انہوں نے موبائل آف کیا اور اسے کھول کر اندر سے سم نکالنے کے بعد نیچے دریا کی طرف آ گئیں۔ ان سے چلنا بھی دوبھر ہوا جا رہا تھا۔ لیکن پولیس کا سن کر وہ اپنے آپ کو گھسیٹتی ہوئی جھیل تک آ ہی گئیں۔ بچے کنارے کے پاس بیٹھے مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ ان کی توجہ مسز جعفری کی جانب نہیں تھی۔ انہوں نے سم کو جھیل میں پھینک دیا پھر کچھ سوچنے کے بعد موبائل کو بھی پانی میں پھینک دیا اور بچوں کی جانب آ گئیں۔ انہوں نے تینوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ تفریح کو ملتوی کر کے واپس ہوٹل جانا ہو گا۔ ہم کل دوبارہ آ جائیں گے۔“

ادا پریشان ہو گئی۔ فدا اور ردا بھی بنسیاں چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

ادا بولی۔ ”میں آپ کے لیے گولیاں لاتی ہوں، میرے بیگ میں موجود ہیں۔“

مسز جعفری نے انکار میں سر ہلایا۔ ”نہیں، گولیاں میں کھا چکی ہوں۔ مجھے ان سے افاقہ نہیں ہوا۔ میں ڈاکٹر کے پاس جانا چاہتی ہوں۔“

فدا نے بنسیاں سمیٹیں اور مسز جعفری، ادا اور ردا کے ساتھ چلتی ہوئی دری کی جانب آ گئیں۔ انہوں نے عجلت کے عالم میں سامان سمیٹا۔ اس دوران فدا نے انہیں بتایا کہ اسٹیمر جزیرے کی طرف آ رہا ہے۔ وہ سامان اٹھا کر نیچے کی طرف چلے آئے۔ جھیل کے کنارے اسٹیمر ان کا منتظر تھا۔ وہ اس میں بیٹھ کر دوسرے کنارے آ گئے۔ ان کی گاڑی جھنڈ کے درمیان کھڑی تھی۔ اس میں بیٹھتے ہوئے مسز جعفری نے سوچا۔ اگر پولیس کو لوکیشن معلوم ہو گئی تو پھر انہوں نے نگر کے تھانے میں فون کر دیا ہو گا اور نگر کی پولیس کو ہوٹل تک پہنچنے کے لیے چند منٹ درکار ہوں گے۔ شہر میں فیملی ہوٹل دو یا تین تھے۔ جن میں سرفہرست ہوٹل اِن دی نگر تھا۔ وہاں سے انہیں بہ آسانی معلوم ہو جاتا کہ وہ چاروں وہیں رہائش پذیر تھے اور کرائے کی کار لے کر سرکل آئی لینڈ کی جانب گئے ہیں۔ انہیں کار کا ماڈل اور نمبر بھی بکنگ کلرک سے بہ آسانی معلوم ہو جاتا تو پھر اس کا مطلب تھا کہ انہیں واپس نگر نہیں جانا چاہیے تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ مختصر پہاڑی کے دونوں جانب کوئی مستقل آبادی نہیں تھی اور وہاں فوجی چوکیاں بھی بہت تھیں۔ اس لیے انہیں پہاڑی کو عبور کر کے نگر کے پاس سے ہو کر آگے جانا تھا۔ ان کے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے گاڑی کو پہاڑی والے راستے ..... پر چڑھا دیا۔ دوپہر کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ انہوں نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ وہ دماغی طور پر بہت تھک چکی تھیں۔ ان کے دل میں خیال آیا کہ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیں۔ لیکن اس صورت میں بھی وہی ہونا تھا جو اَب ہو رہا تھا۔ انہیں فدا کو پھانسی سے بچانے کے لیے سرتوڑ کوشش کرنا پڑتی اور ان کی ناکامی حتمی تھی۔

گاڑی بہت تیز رفتاری کے ساتھ اوپر چڑھ رہی تھی۔ بل کھاتی سڑک کے موڑ بہت خطرناک تھے۔ انہیں مڑتے ہوئے گاڑی کو آہستہ کرنا پڑتا تھا اور پھر اچانک ہی ایک موڑ مڑتے ہوئے پولیس جیپ سامنے سے نمودار ہوئی۔ مسز جعفری نے جیپ کے پاس سے گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔ تو پولیس اہلکار نے چیختے ہوئے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ ان کی مطلوبہ گاڑی سائڈ سے گزری ہے۔ جیپ سڑک کے درمیان رک گئی۔ مسز جعفری بیک مرر میں انہیں دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے گاڑی کی رفتار میں اضافہ کر دیا۔ جیپ مڑ کر اُن کے پیچھے آنے لگی۔ ایک اہلکار دروازے میں لٹکا انہیں گاڑی روکنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ مسز جعفری نے رفتار مزید بڑھا دی۔ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے کے بعد انہیں بل کھا کر اوپر آتی

ہوئی سڑک کا کچھ حصہ دکھائی دیا۔ وہاں سے بھی پولیس کی ایک جیپ تیز رفتاری کے ساتھ اوپر آرہی تھی۔ وہ ان دونوں جیپوں کے درمیان پھنس گئیں۔ اب فرار ممکن نہیں رہا تھا۔ سرکل آئی لینڈ سے روانہ ہوتے ہوئے انہوں نے دل میں تہیہ کیا تھا کہ اگر ایسے حالات سے سامنا کرنا پڑا تب وہ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے نہیں کریں گی۔ وہ فدا کو پھانسی چڑھتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھیں اور اگر دیکھ لیتیں تو اس کے غم میں پاگل ہو جاتیں۔ ردا اور ادا کو یتیم خانے بھجوا دیا جاتا یا پھر معاشرے کے زہریلے پنجے چیر پھاڑ کر رکھ دیتے۔ تمام گھرانے کی تباہی ان کے نصیب میں لکھ دی گئی تھی۔ ان کا دماغ یکلخت ماؤف ہو گیا اور انہوں گاڑی کو پہاڑ کی چوٹی کے پاس جا کر روک دیا۔ اُن کے پیچھے آتی ہوئی جیپ نے زور سے ہارن دیا پھر سامنے والے موڑ سے دوسری جیپ نمودار ہوئی۔ بچوں نے زور زور سے چلّا کر مسز جعفری کو گاڑی بھگانے کے لیے کہا۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر بچوں کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ جعفری صاحب کے مرنے کے بعد وہ اپنے بچوں کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکی تھیں۔ ان کے دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں۔ اب مزید سوچنا ان کے اختیار سے باہر ہو گیا تھا۔ ناک سے خون کی دھار نکل کر ٹھوڑی سے ہوتی ہوئی ان کے کپڑوں پر گری اور انہوں نے گھبرا کر ایکسیلریٹر پر پاؤں رکھ دیا۔ پولیس کی دونوں گاڑیاں ان کی گاڑی کے پاس آکر رک گئیں۔ لیکن ابھی اہلکار نیچے اترنے بھی نہیں پائے تھے کہ مسز جعفری کی گاڑی جھٹکا کھا کر آگے بڑھی اور سامنے کھڑی جیپ کی سائڈ سے ہو کر پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گر گئی۔ پولیس اہلکاروں کے منہ حیرت کے مارے کھل گئے۔ وہ بھاگ کر چوٹی کے کنارے آئے۔ اس کے فوراً بعد زوردار دھماکا ہوا۔ پھر آگ کے شعلے بلند ہونے لگے اور سب کچھ ختم ہو کر رہ گیا۔

☆☆☆

پولیس انسپکٹر کے کمرے میں طاہر صاحب موجود تھے۔ اُن کے چہرے پر شدید حیرت کے تاثرات ثبت تھے۔ انسپکٹر انہیں بتا رہا تھا کہ گاڑی میں موجود مسز جعفری کے علاوہ تینوں بچے موقع پر ہی ہلاک ہو گئے ہیں۔ معلومات کرنے پر اتنا معلوم ہوا ہے کہ تین دن قبل انہوں نے ہوٹل اِن دی نگر میں کمرا کرائے پر لیا اور ان تین دنوں کے دوران مختلف مقامات پر تفریح کے لیے جاتے رہے۔ وہ زیرو پوائنٹ بھی گئے اور اس کے بعد سرکل آئی لینڈ۔ انہوں نے غیور کے گھوڑوں پر سواری کی۔ یعنی وہ خوش اور مطمئن تھے۔ مجھے کچھ نہیں آرہی کہ انہوں نے خودکشی کیوں کی۔'' انسپکٹر چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا۔ پھر دوبارہ ہمکلام ہوتے ہوئے بتانے لگا۔

''لیکن ان کی خودکشی میں آدھے سے زیادہ ہاتھ آپ کا ہے۔ آپ کو وسیم کی ہلاکت کی جھوٹی رپورٹ درج نہیں کروانی چاہیے تھی۔ وہ صرف زخمی ہوا تھا۔ ہر چند کے اُس کی طبیعت اب بھی ناساز ہے۔ تاہم وہ مرا نہیں ہے۔''

طاہر صاحب غصیلے لہجے میں بولے۔ ''وہ زندہ لاش کی طرح بستر پر پڑا ہے۔ میں نے جھوٹی رپورٹ درج نہیں کروائی۔ آپ ڈاکٹر سے معلومات کر سکتے ہیں۔ اُس کا دماغ بُری طرح متاثر ہوا ہے۔ اگر صحت مند ہو بھی گیا۔ تب بھی اس کی یادداشت چلی جائے گی اور وہ کبھی بھی نارمل زندگی نہیں گزار سکے گا۔''

انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلایا پھر رنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''میں مانتا ہوں کہ شاید وہ دماغی طور پر صحت مند نہ ہو سکے لیکن بہرحال وہ ہلاک نہیں ہوا۔ آپ کی جھوٹی رپورٹ کی وجہ سے مسز جعفری اور ان کے بچے موت کے منہ میں چلے گئے۔''

طاہر صاحب تلخ لہجے میں ہمکلام ہوئے۔ ''آپ شاید بھول رہے ہیں کہ میں نے جھوٹی رپورٹ لکھوانے کے لیے نذرانے کے طور پر تیس ہزار روپے کی رقم آپ کی خدمت میں پیش کی تھی اور اب آپ مجھے ہی لعن طعن کر رہے ہیں۔''

انسپکٹر مسکرایا پھر یکلخت سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''مجھے ایک لاکھ کی رقم مزید چاہیے۔ اس فیملی کی ہلاکت کے بعد معاملہ حکام بالا تک جا پہنچا ہے۔ میڈیا معاملے کو اچھال رہا ہے۔ اس لیے میری نوکری خطرے میں ہے۔ اگر آپ نے رقم دینے سے انکار کیا تو آپ کے ساتھ مجھے بھی گرفتار کر لیا جائے گا۔''

طاہر صاحب کو بہت زور سے چکر آیا۔ وسیم کے علاج پر رقم پانی کی طرح خرچ ہو رہی تھی اور وہ پائی پائی کے محتاج ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کے پاس اپنے مکان کے سوا اور کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ اگر وہ مکان بیچ دیتے تو اس سے حاصل ہونے والی رقم کچھ ہی دنوں میں انسپکٹر کی نذر ہو جاتی۔ اس کے بعد فٹ پاتھ ان کا مقدر بن کر رہ جاتا۔ مکافاتِ عمل کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اگر ایک خاندان حادثات کی نذر ہوا تھا تو دوسرا بچ کیسے سکتا تھا۔ اس لیے انسپکٹر سے جھوٹ بولنے کے بعد وہ تھانے سے باہر آگئے کہ جلد رقم کا بندوبست کر لیں گے۔ چاہے اس کے لیے انہیں اپنی بیوی کے زیورات ہی کیوں نہ بیچنا پڑیں۔

❖❖❖

شریف قاتل

ماہ نور

کسی کسی کی زندگی پر خوش کن لمحات کا بسیرا نہایت قلیل مدت تک رہتا ہے... خوشی، مسرت، انبساط نہایت تیزی سے کترا کر گزر جاتے ہیں... اس کے ساتھ بھی یہی ہوا...

ایک شریف قاتل کی شرافت اور ایک امیر گواہ کا شاہانہ تجاہل......

وہ کلہاڑی تھی...... قاتل کلہاڑی۔ ہفتے کے روز آدھی رات میں وہ کلہاڑی حرکت میں آئی۔ علاقہ گلشن اقبال کا تھا۔ گلشن بلاک 6، گلشن تھانہ بلاک 6 میں ہے۔ قاتل کی جرأت و دیدہ دلیری حیران کن تھی۔ قتل تھانے کے قریب تیسری گلی میں ہوا۔ یہ جگہ پورشنز کا جنگل تھی۔ یہ کیا، کراچی تقریباً پورا ہی پورشن مافیا نے بھر دیا ہے۔ جواز بھی ہے کہ اتنی بڑی آبادی کہاں جائے۔

قاتل کا نام شرافت تھا۔ یہ بھی مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا...... "شریف قاتل" شرافت نے نہایت بے رحمی سے اپنی شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ہی بیوی پر کلہاڑی کی افادیت آزمائی تھی۔ مقتولہ کے جسم پر کلہاڑی کے تیس وار کیے گئے تھے۔

گھروں کے چھوٹے چھوٹے پورشن تھے۔ دو منزلہ، تین منزلہ۔ آپس میں ملے ہوئے۔ شرافت سیڑھیوں پر پیچھا کرتا ہوا بیوی کے پیچھے کچن میں گھسا اور کام تمام کر دیا۔ پڑوسی نے چیخ پکار سن کر قریبی تھانے میں فون کر دیا۔

پولیس فوراً ہی جائے واردات پر پہنچ گئی۔ شرافت خون آلود فرش پر گھٹنوں کے بل مردہ بیوی کی انگلی سے شادی کی

بھی نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس نے پولیس کو قتل کی وجہ نہیں بتائی۔ تاہم اعتراف جرم کرلیا۔ اعتراف کرنا ہی تھا۔ انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ قاتل و مقتولہ موجود تھے اور آلۂ قتل بھی جس پر انگلیوں کے نشانات سامنے آنے والے تھے۔ خوفناک منظر بتا رہا تھا کہ وہ عادی مجرم ہے جبکہ وہ شرافت کا پہلا جرم، پہلا قتل تھا۔ دونوں کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ بلاک 6 میں ہی شرافت کی پلاسٹک کے برتنوں کی دکان تھی۔ آمدنی خاص نہیں تھی۔ پورشن کا ایک کمرا اس نے کرائے پر چڑھا دیا تھا۔ کرائے دار کا نام امیر تھا۔ غریب کرائے دار کا نام امیر...... یہ بھی عجیب سی بات تھی۔ امیر کی نمکو کی دکان اچھی چلتی تھی۔ امیر کی ایک نمایاں خوبی اس کی جوانی اور وجاہت تھی۔ اگرچہ ذہنی طور پر کسی حد تک وہ بونگا ہی تھا۔ اکثر اوقات بولتا پہلے اور سوچتا بعد میں تھا۔ موجود منظر نامے میں امیر مرکزی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ بعض سوالات کے جوابات وہ زیادہ ہی تیزی سے دے رہا تھا۔

☆☆☆

تھانے میں وہ میرے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا۔ شرافت کے پاس انکار کی گنجائش ہی نہیں تھی لہٰذا وجہ قتل بھی وہ بہ آسانی بتا دیتا لیکن میں نے ضروری کارروائی کے بعد اسے سب انسپکٹر دلاور کے حوالے کردیا۔ مجھے امیر ایک دلچسپ کردار محسوس ہو رہا تھا۔ تھانے میں فون امیر کو کرنا چاہیے تھا کیونکہ وہ اس گھر میں تھا۔ رات کا ایسا وقت تھا کہ وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ گھر سے باہر تھا۔ نہ یہ بیان دے سکتا تھا کہ اس نے چیخ پکار سنی ہی نہیں تھی۔

میرے پہلے سوال کے جواب میں امیر نے کہا۔ "میرا جواب وہی ہے جو میں پولیس کو پہلے بتا چکا ہوں۔"

اس کا جواب مجھے معلوم تھا لیکن پولیس کا اپنا طریقہ کار ہوتا ہے۔

"تم نے کیا جواب دیا تھا؟ کیا حرج ہے اگر وہ جواب مجھے بھی بتا دو۔"

"میں رات ساڑھے گیارہ بجے باہر نکل گیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"کیوں بھئی، یہ کون سا وقت تھا گھر سے باہر جانے کا؟" انسپکٹر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ وقت تو سونے کا تھا مگر مجھے لگا کہ کھانا ہضم نہیں ہو سکا ہے۔ اس لیے کچھ دیر ٹہلنے کے لیے نکل گیا تھا۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ چائے پیو گے یا بوتل؟" میں مسکرایا۔

"چائے۔" وہ بولا اور مسکرا کر سوال کیا۔ "آپ کا نام؟"

میں نے بیج کی طرف اشارہ کیا۔ "راشد کمالی۔"

اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔

چند رسمی سوالات میں یہ باتیں شامل تھیں کہ ماں باپ، بیوی بچے کہاں ہیں...... وغیرہ وغیرہ۔ وہ تنہا تھا۔ ماں باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ رشتے دار پنجاب میں تھے۔

"شرافت کو کب سے جانتے ہو؟"

"چار سال سے۔ وہ کبھی کبھار میری دکان پر آتا تھا اور یہاں میں چھ مہینے سے ہوں۔"

"مطلب، تم شرافت کو خوب سمجھ گئے ہو گے؟"

"ہاں، دوسروں سے زیادہ۔" امیر نے کہا۔

"لیکن تم اسے اتنا نہیں سمجھے تھے کہ وہ اپنی بیوی کو قتل کرنے والا ہے؟" میں نے غیر محسوس انداز میں اسے پن چبھوئی تھی۔ اس کے فہم کو چیلنج کر کے اکسانے کی کوشش کی تھی۔

امیر کے تاثرات تبدیل ہوئے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "میں نے شرافت کے رویّے میں تبدیلی دیکھ لی تھی۔ ایک مہینے سے میں نوٹ کر رہا تھا۔"

میری چال کامیاب ہو گئی تھی۔ ایسے موقع پر امیر کو ٹوکنا یا اس کی طرف دیکھنا حماقت تھی۔

"میں سمجھتا ہوں کہ تم اسے خوب سمجھ گئے تھے بلکہ میں دعویٰ کرتا ہوں کہ تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ اس نے بیوی کے خلاف خونخواری کا مظاہرہ کیوں کیا؟"

"راشد صاحب! آپ بھی خوب ہیں۔" امیر نے سینہ پھلا کر کہا۔ "شرافت رنگین مزاج تھا اور یہاں وہاں موقع ملتے ہی منہ مارتا رہتا تھا جبکہ بیوی کو اس نے گھر میں قید کیا ہوا تھا۔ صاحب، ایک بات بتاؤں؟"

"کیوں نہیں، تم کافی سمجھ دار ہو۔" میں نے اُس کے شانے پر تھپکی دی۔

"بیوی اس نے گھرداری کے لیے رکھی ہوئی تھی۔ گھماتا پھراتا تک نہیں تھا اور خود عیاشیاں کرتا تھا۔"

"لیکن وہ تو شریف تھا؟"

"اوہو، راشد صاحب! نام کا شریف تھا۔ ایسے تو ہم بھی "امیر" ہیں لیکن کرایہ مشکل سے نکلتا ہے۔" امیر نے مزاحیہ انداز اختیار کیا۔

"تم باتیں کام کی کرتے ہو۔" میں نے اُسے مزید اکسایا۔ "کوئی کام کی بات بتاؤ۔"

"دیکھو صاحب! مرد جتنا بھی ہوشیار ہو، عورت کے اندر ایک حس ہوتی ہے جو اسے بتا دیتی ہے کہ اُس کا مرد کیا کرتا

پھر رہا ہے۔‘‘

’’یار! کمال کی بات کی ہے۔ تمہیں کوئی اور کام کرنا چاہیے۔ ٹی وی پر ٹرائی کرو۔‘‘ میں نے کہا۔

’’آپ ہی کچھ کرو۔ ایک اور بات صاحب......!‘‘

’’ایک منٹ...... اور چائے منگواتا ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’راشد صاحب! ایسے مرد اپنی عورت کو کسی سے بات بھی کرتا دیکھ لیں تو جھلس کر رہ جاتے ہیں...... صاحب! شرافت نے کلہاڑی کے ذریعے شرافت کے معنی بدل دیے۔‘‘

’’کیا شرافت نے مقتولہ کو کسی اور مرد کے ساتھ دیکھ لیا تھا؟‘‘

’’نہیں، ایسا تو نہیں تھا۔ میرے خیال میں ایسا نہیں تھا۔‘‘

’’تو پھر کسی نے اشارہ دیا ہوگا، شاید تم نے؟‘‘

امیر نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’میں نے کوئی اشارہ نہیں دیا تھا لیکن اس کے سوا کوئی اور بات نہیں ہوسکتی؟‘‘

’’تو پھر اسے کیونکر پتا چلا؟‘‘ میں نے سوال کیا۔

’’علامات...... صاحب! علامات......‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘

’’وہ بدل گئی تھی۔ میک اپ کرنے لگی تھی، ہنسنا مسکرانا، اچھے کپڑے نکال کر پہننا وغیرہ وغیرہ۔ بس شرافت جیسا شکی مزاج کھٹک گیا۔‘‘

’’تو کیا شرافت خفیہ آدمی کو پہچان گیا تھا؟‘‘

’’نہیں۔ اتنی دور وہ نہیں جاسکتا تھا۔‘‘

’’لیکن تم سمجھ گئے تھے کہ وہ آدمی کون ہے جو شرافت کی بیوی کے ساتھ گھپرے اُڑا رہا تھا؟‘‘

’’ہاں، روبی کو بھی پتا چل گیا تھا کہ شوہر کو شک ہوگیا ہے۔‘‘

’’روبی...... مطلب بیوی؟‘‘

’’ہاں، روبی اس کی بیوی کا نام تھا۔‘‘ امیر رواں ہوگیا تھا۔ ’’ایک ماہ قبل شرافت نے روبی پر حملہ کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ خطرے میں ہے۔‘‘

’’کیسا حملہ؟ تم نے پولیس کو کیوں نہیں بتایا؟‘‘

’’وہ [illegible] بات نہیں کی۔ [illegible] گھر آیا تو وہ دونوں کچن میں تھے۔ روبی کونے میں تھی اور شرافت کے ہاتھ میں چھری تھی۔ انہوں نے میرے آنے کی آواز سن لی۔ شرافت نے ارادہ ترک کردیا اور ہنستا ہوا سنک کے پاس چلا گیا۔‘‘ امیر نے کہا۔

’’اگر وہ اپنا کام کرچکا ہوتا تو تمہیں بھی نہیں چھوڑتا۔‘‘ میں نے کہا۔

’’ظاہر ہے۔‘‘ امیر نے اعتراف کیا۔

میں کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگیا۔ مقتولہ پر اتنے وار کیے گئے تھے کہ میں اس کے حسن و جمال کے بارے میں فوراً کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

’’کیا روبی خوش شکل تھی؟‘‘ میں نے سوال کیا۔

’’بدشکل بھی نہیں تھی۔‘‘ امیر نے کہا۔

’’کیا شرافت نے اسے ختم کرنے کی کوئی اور کوشش نہیں کی؟‘‘

’’دوسری بار اُس نے روبی کو گلا دبا کر مارنے کی کوشش کی۔ محض اتفاق ہے کہ اُس روز بھی میں نے دیکھ لیا۔ میں کسی کام سے گھر کے باہر جارہا تھا۔ اس نے مساج کا بہانہ بنایا اور ہٹ گیا۔‘‘ وقفے کے بعد امیر نے کہا۔ ’’میں اور شرافت جمعے کے روز کام نہیں کرتے۔ کلہاڑی وہ جمعے کو لایا تھا۔ اس نے مجھے دکھائی بھی تھی۔ وہ آخری وقت تک بے خبر تھا کہ میں اس کے عزائم تاڑ چکا ہوں۔‘‘

’’اور تم نے جب بھی پولیس کو خبردار نہیں کیا؟‘‘ میں نے اعتراض کیا۔ امیر نے جواب دینے کے بجائے دوسری بات شروع کردی۔

’’قتل والے روز روبی میرے کمرے میں آئی۔ وہ رو رہی تھی۔ پتا نہیں کیسے اس نے کلہاڑی کی جھلک دیکھ لی تھی۔ وہ خوفزدہ تھی۔ وہ مجھ سے مدد کی طلب گار تھی۔ میں نے کہا کہ اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب تک میں گھر میں ہوں، شرافت، روبی کو نقصان پہنچانے کی ہمت نہیں کرے گا۔‘‘

’’لیکن تم کپڑے بدل کر باہر نکل گئے؟‘‘ میں نے کہا۔

امیر نے شانے اُچکائے۔ ’’ہاں، پولیس کو میں نے بتایا تھا کہ میں باہر چلا گیا تھا۔‘‘

کافی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ میں خود کو بیمار محسوس کررہا تھا۔ میں نے پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ امیر کو پیش کی۔

’’شاید تم اس لیے نکل گئے کہ اس مرتبہ تم نے محسوس کیا کہ تم بھی خطرے میں ہو؟‘‘ میں نے اندازاً کہا۔

’’ہاں، ہم سب [illegible] [illegible] ہو۔‘‘ اس نے گہرا کش لے کر دھواں باہر پھینکا۔ ’’لیکن ایک بات اور تھی......‘‘

’’وہ کیا؟‘‘ میں نے دلچسپی محسوس کی۔

’’راشد صاحب! میرا دل بھر گیا تھا۔‘‘

اس نے مسکراتے ہوئے دوسرا کش لیا۔

❖❖❖

میں ایک پرانے ٹائپ رائٹر پر ایک گواہ کا انٹرویو ٹائپ کرنے میں منہمک تھا اور یہ دیکھنے سے قاصر تھا کہ میری ڈیسک کے دوسری طرف ایک بچہ بہت بے صبری سے کھڑا ہے مگر میری توجہ فوراً اپنی ٹائپنگ کی طرف مبذول ہو گئی ...... یہ میری ملازمت کا وہ حصہ تھا جو مجھے سب سے کم پسند تھا۔ کاغذ پر کی ہوئی کوئی ایک غلطی آپ کو ایک یا دوسری طرف سے مشکل میں ڈال سکتی تھی، خواہ وہ وکیلِ استغاثہ ہو یا وکیلِ صفائی۔ ایک مرتبہ آپ خیالات کو کاغذ پر اتار دیں، وہ آپ کے ہی الفاظ کو آپ کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش

زور آزمائی

ثمرین شمیم

جنگ ہو یا امن دونوں صورتوں میں بدمزگی مزاجوں کا حصہ رہتی ہے... مشرق ہی میں نہیں مغربی معاشرے میں بھی جہالت اور عداوت کے خوگر خوب کھل کر سامنے آتے ہیں... ایسے ہی دو گروہوں کے درمیان ہونے والی زور آزمائی...

جرم کے خاتمے اور مجرم کی تلاش کا انوکھا طریقۂ کار......

کرتے ہیں، خاص طور پر بھاری معاوضہ لینے والے وکیل صفائی ان رپورٹس لکھنے سے بھی زیادہ جو چیز مجھے سخت ناپسند تھی، تو وہ تھے یہ وکیل۔

بچہ میری توجہ حاصل کرنے کے انتظار میں تھک چکا تھا۔ بالآخر اس نے اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے مجھے پکارا۔ ”سنو! کیا تم ایوریٹ میٹ لینڈ ہو؟“

میں نے سر اٹھا کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی، کیونکہ میں اپنے دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیوں سے ٹائپ کرنے میں مصروف تھا اور ٹائپ رائٹر میں حرف V تلاش کرنے کی کوشش میں تھا کہ میں لفظ وکٹم لکھ سکوں۔ اس وقت کسی بھی قسم کی مداخلت کی گنجائش نہیں تھی۔

”ابھی جاؤ بچے، میں مصروف ہوں۔“

”میں تمہارے لیے کچھ لایا ہوں۔“

”ہاں ہاں، بس ایک منٹ......“ جیسے ہی مجھے حرف V نظر آیا، میں نے اس کو ٹائپ کرنے کے لیے اس کی، کی پر دباؤ ڈالا، بچہ ڈیسک کی دوسری طرف سے میرے قریب آیا اور ایک سرخ سیب ٹائپ رائٹر کے اوپر اس جگہ رکھا، جہاں اس کی کیز اس کی ربن سے جا ملتی ہیں۔ اور ٹائپنگ آرم لاک ہو گیا۔

”یہ کیا بدتمیزی ہے؟ میں نے تم سے سیب نہیں مانگا تھا اور تم ہو کون؟“

بچہ سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا رہا۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا اور اس کے سر پر ایک نرم ٹوپی تھی۔

”میں وہاں کورٹ کے کونے میں کھڑا سیب بیچتا ہوں۔ آپ اپنے کام پر جاتے ہوئے تقریباً روز ہی میرے سامنے سے گزرتے ہیں۔“

”ہاں! تو......“

”تو آج ایک بندے نے مجھے پچیس روپے دے کر کہا کہ میں یہ سیب آپ تک پہنچا دوں۔ عام طور پر میں ایک سیب دس روپے کا بیچتا ہوں، لیکن وہ شخص یہ چاہتا تھا کہ آپ تک یہ سیب لازمی پہنچ جائے۔“ میں نے ارد گرد دیکھا کہ کہیں میرا کوئی دوست یا ساتھی مجھ سے کسی قسم کا مذاق تو نہیں کر رہا ہے؟ مگر باہر تو ہر فرد ہی اپنے کام اور اپنے مسائل میں اُلجھا ہوا نظر آیا اور ہم دونوں پر کسی کی بھی توجہ نہیں تھی۔

میں واپس بچے کی طرف مڑا۔ ”اس شخص کا نام کیا تھا؟“

”اس نے مجھے اپنا نام نہیں بتایا۔“

”اچھا تو دیکھنے میں کیسا نظر آتا تھا؟“

”بہت عمدہ لباس پہنا ہوا تھا اور ساتھ فیڈورا ہیٹ بھی پہنا ہوا تھا اس نے، اچھی گاڑی تھی۔ اس کی جیکٹ کے اندر ایک ہولسٹر بھی تھا، محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ہولسٹر اس نے کندھے پر لٹکایا ہوا ہو۔ مجھے تو وہ کوئی گینگسٹر لگ رہا تھا۔“

اب میری توجہ پوری طرح بچے کی طرف مبذول ہو چکی تھی۔

”اس شخص نے اس سیب کے ساتھ کوئی پیغام بھی دیا تھا تم کو؟“ بچے کے چہرے پر میرے سوال کے ساتھ ایک تاثر ابھرا۔

”ہاں! اس نے کہا کہ میں تم سے کہوں ریتبو، اس کا جو بھی مطلب تھا۔“

اب میں ٹائپنگ روک چکا تھا، میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ سکے نکالے، بچے کو دیے اور اس سے کہا کہ وہ دفع ہو جائے۔ جب وہ وائس اسکواڈ۔ بے سے جا رہا تھا، تو وہ ایسے خوش تھا کہ جیسے کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔ بغیر کسی محنت کے آج اس کی اچھی کمائی ہو گئی تھی۔ وہ سکے کو اپنے انگوٹھے کی نوک پر رکھ کر ہوا میں اچھال کر اس کو اپنی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر کیچ کر رہا تھا۔

میں نے اپنا کوٹ پہنا، ہیٹ ریک سے اپنا فیڈورا ہیٹ اتارا، سیب اٹھایا اور آفس سے باہر آ گیا۔ چلتے چلتے میں ......سیب سے دو بائٹ لے چکا تھا اور میری نظریں دونوں ہی سمت میں مسلسل گھوم رہی تھیں۔ میرے بائیں طرف کی ایک گلی کے موڑ پر ہی وہ مجھے کھڑا نظر آ گیا، جس کی مجھے توقع تھی۔ جیک کلیری۔

میں اور وہ جنگ عظیم کے دوران فرانس میں انکل سام کے رینبو ڈویژن میں تھے۔ ہم دونوں نے خندقوں میں ایک ساتھ بہت وقت گزارا تھا۔ کم از کم ایک سے دو بار دونوں نے ہی ایک دوسرے کی جان بھی بچائی تھی۔ اس کے بعد جیک اپنے رشتے داروں کی طرف آئرش موب چلا گیا، جبکہ میں نے پولیس فورس میں سیکنڈ گریڈ کے نائب جاسوس کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا۔ پھر بھی ہم نے مختلف دنیاؤں میں ایک دوسرے کے لیے بہترین کا انتخاب کیا۔ ہم نے مل کر کام کیا اور بہت سے نشیب و فراز ساتھ دیکھے، کچھ چیزیں روزمرہ کے کاموں، ضروریات اور آپ کی ملازمت سے کہیں زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ سب کچھ بہت آسان تھا، لیکن اس بات پر غور کیا جائے کہ ہمارے کیریئر کے راستے کتنے مختلف تھے تو، یہ واقعی بہت زیادہ مشکل تھا۔

میں نے وہ گلی عبور کی۔ جیک مجھے آتے دیکھ کر اس گلی

میں بہت پیچھے چلا گیا۔ میں نے گلی میں قدم رکھتے ہوئے اس امر کو یقینی بنایا کہ کوئی مجھے دیکھ نہ رہا ہو۔ میں اس کی گاڑی کے قریب پہنچا۔ وہ اپنی سرخ سیڈان کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا پال مال سگریٹ پی رہا تھا۔

''تمہیں میرا پیغام مل گیا ہے نا؟''

''تم مجھے کال کر سکتے تھے، ہم دونوں پریشانی سے بچ سکتے تھے۔''

''میں سوئچ بورڈ پر کسی کو بھی اپنی آواز پہچاننے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا اور ہم میں سے کوئی بھی اس بات کا متحمل نہیں تھا کہ کوئی بھی تیسرا فرد ہماری باتیں سن لے۔''

''ٹھیک ہے، بتاؤ کیا بات ہے؟'' اس نے مجھے اپنی آئرش مسکراہٹ سے نوازا، جیسے اس نے ایسا مذاق کیا ہو، جو اس مذاق کی پنچ لائن کو جانتا ہو۔

''میں نے سوچا کہ تمہیں کردار ادا کرنے کا موقع دے دوں۔''

مجھے یقین نہیں تھا کہ اس کے ذہن میں کیا چل رہا ہے لیکن میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ جو کچھ وہ کہنے والا ہے، مجھے پسند آئے گا بھی یا نہیں؟

''یہ ٹھیک ہے، اپنے بستر کے نیچے رکھے ہوئے سگار کے ڈبے میں، میں نے پہلے ہی کافی ربن اور ٹن میڈل جمع کر رکھے ہیں۔ ان کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ ان میں سے کسی اور کی ضرورت نہیں ہے، لہٰذا میں تمہاری پیش کش کو مسترد کرتا ہوں۔''

جیک نے کندھے اچکا کر اپنے منہ سے سگریٹ کے دھوئیں کو اڑایا۔ ''تم پر منحصر ہے، لیکن تمہیں اسے ہر حال میں سننا ہی چاہیے۔'' میں نے اپنا بایاں پاؤں اس کی کار کے اگلے بمپر پر رکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا، ٹھیک ہے، بتاؤ کیا بات ہے؟''

''میں بتا رہا ہوں کہ یہ تمہارے لیے بہترین آفر ہے۔'' جیک نے کہا۔ ''دو چیزیں ہیں، جو میرے دماغ میں چل رہی ہیں، لیکن میں فی الحال یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے متعلق ہیں یا نہیں؟ پہلی بات یہ کہ تمہیں علم ہوگا کہ ملبری اسٹریٹ پر اسپگیٹی کھانے والوں کے ہجوم میں سے ایک کے لیے ایک بہت بڑا وکیل کام کر رہا ہے۔ پردے کے پیچھے وہی تمام تار ہلا رہا ہے تاکہ ان لوگوں کو سٹی ہال کے لیے ہر قسم کا اجازت نامہ حاصل ہو سکے جو اُن کے کاروبار کو مزید جائز بنا دے۔''

''تمہیں اُس کے نام کا علم ہے؟''

''نہیں! اس معلومات کو انہوں نے اپنے بڑوں تک ہی محدود رکھا ہوا ہے۔''

''تمہیں یہ سب خبریں کہاں سے مل رہی ہیں؟''

جیک نے مجھے صرف ایک مسکراہٹ سے نوازا۔ ہم کتنے ہی قریبی ساتھی سہی، لیکن وہ اپنے ذرائع مجھ پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے سیب کا آخری بائٹ لیا اور اس کا بقایا حصہ گلی کی دوسری طرف پھینک دیا۔ اب وہ سننے کا وقت آ گیا، جو وہ مجھے واقعی بتانا چاہتا تھا۔

''اب اس بڑے بلاک بسٹر پلان کا دوسرا حصہ بتاؤ، وہ کیا ہے؟''

''تم اس موٹے پیٹ والے اور بڑی مونچھوں والے بوڑھے کو جانتے ہو جس کا نام گز پی بوشیٹی ہے؟''

''ہاں! کیمورا کے مالکان میں سے ایک نیپلز سے آیا ہے، اس کا بروکلین کی عدالت میں اپنا ایک گروپ ہے۔''

''اور تم البرٹو کو سیسیلین مافیا کے باعث ہی جانتے ہو؟''

''وہ اس موب کا ہٹ مین ہے۔'' میں تھوڑا سا سیدھا ہوتے ہوئے اس سے پوچھنے لگا۔ ''اس سب کا مجھ سے کیا تعلق ہے؟''

''مجھے خبر ملی ہے کہ پارسی، بوشیٹی کو گولی مارنے والا ہے۔ ان کی کوئی پرانی رنجش ہے اور حال ہی میں بھی دونوں کے درمیان تصادم ہوا ہے۔ میں تمہیں موقع دے رہا ہوں کہ تم اس تصادم کو روک کر اپنے شہر کی گلیوں میں ہونے والی ہنگامہ آرائی کو روک لو۔''

''یہ تو بہت ہی مناسب بات ہے کہ ایک آئرش گینگسٹر ہمارے ملک کے شہری کی طرح سوچ رکھتا ہے۔''

جیک صرف ہنس کر رہ گیا۔

''میں تم کو بتاؤں گا کہ میں ایک آئرش بوٹ لیگر ہوں، گینگسٹر نہیں، ہم کاروباری افراد کا ایک خاندان ہے، جو کینیڈا سے ایسی مصنوعات لاتا ہے، جو ہر فرد کی ضرورت ہے، لیکن حکومت نہیں چاہتی کہ یہ مصنوعات عام افراد کے پاس ہوں اور تم مجھے غلط مت سمجھو۔ مجھے اس کی پروا نہیں کہ اطالوی ایک دوسرے کو مار ڈالتے ہیں، یہ ہم آئرش باشندوں کے مقابلے میں کافی کم ہے، لیکن یہ تھوڑی سی تباہی، جس کے بارے میں، میں بات کر رہا ہوں، ایک ایسے علاقے میں ہونے والی ہے، جو تمام موب والوں کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ کاروبار کے لیے مختص ہے۔''

''اور یہ مبینہ تصادم کس جگہ ہونے والا ہے؟''

''وہسکی کرب۔ تمہارے گھر سے تقریباً دو بلاکس کے

فاصلے پر۔"

میں ڈسکی کرب کو جانتا تھا۔ وہ فورس میں موجود تمام پولیس والوں کے لیے نہایت شرمندگی کا باعث تھا۔ کرب دراصل بروم، گرینڈ اور الزبتھ اسٹریٹس کے ساتھ والا علاقہ تھا، جس کو کئی بوٹ لیگرز شراب کے تبادلے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ان کی آخری کھیپ سے بہت زیادہ وہسکی جب بچ جاتی تھی تو، وہ جن یا رم کی تجارت کرتے تھے، کہ وہ اپنے روٹ اسپیک ایزیز کو جو کچھ بھی سپلائی کرتے ہیں، اس میں توازن پیدا کر سکیں۔ ڈسکی کرب کو ٹامی پنوکیو چلا رہا تھا، جس کو جو میسیر یا کی پشت پناہی حاصل تھی۔ کرب۔ ڈسکی کو موب کے لیے حفاظت کے ساتھ خرید و فروخت کے لیے بھی غیر جانب دار زمین قرار دے دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود ایک مبینہ غیر جانب دار زون کے لیے، کرب کے ساتھ ساتھ گینگ لینڈ کے بھی کئی قتل ہو چکے ہیں، جن کا معاوضہ اوپری سطح کے افراد ادا کرتے تھے۔ اسی لیے نچلے درجے والوں کو کرب کے علاقے میں تجارت میں خلل ڈالنے کی اجازت نہیں تھی۔ قتل کی تحقیقات کرنا اگرچہ ایک مختلف کام تھا، کیونکہ عام شہری گلیوں میں بکھری ہوئی لاشوں پر زیادہ صبر نہیں کرتا۔ یہ کمیونٹی کے لیے برا محسوس ہوتا ہے، حالانکہ مرنے والے بھی گٹر میں خون بہانے والے غنڈوں سے زیادہ کچھ نہیں تھے۔ مجھے اس تصادم کو شروع ہونے سے قبل کسی نہ کسی طرح ختم کرنا ہی تھا۔

"یہ مبینہ شوٹنگ کب ہونے والی ہے؟"

جیک نے اپنی ویسٹ کوٹ کی جیب سے ایک جیبی گھڑی نکالی اور اس کا ڈھکن کھولتے ہوئے کہا۔ "میرے وقت کے مطابق اس تصادم کے آغاز سے قبل تم کو 20 منٹ کا وقت مل جائے گا۔" پھر وہ اپنی گھڑی کو کان سے لگائے سنتا رہا۔ "اف...... یہ بے کار چیز کام نہیں کر رہی۔ میں آج صبح اس کو سیٹ کرنا بھول گیا تھا۔"

اس نے اپنے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے اپنی گھڑی کے اوپری حصے میں بنی ہوئی دھاتی ناب کو گھمانا شروع کیا کہ گھڑی دوبارہ چلنے لگے۔ اس نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

"تم شاید اب جانا چاہتے ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ گھڑی کب سے رکی ہوئی ہے۔ بوڑھے گزبی کا وقت ویسے ہی پورا ہوا چاہتا ہے۔"

"شکریہ۔" میں اس کے پاس سے ہٹ گیا۔

میں ڈسکی کرب کے عین اسٹیشن کے دوسری طرف سے تقریباً ایک بلاک پہلے سے آ رہا تھا۔ میں اسٹیشن کی طرف گیا تو وہاں میں نے پیچ فز کو پکڑا۔ وہ لیفٹیننٹ کے ڈاگ رابرز تھے۔ نوجوان، ناتجربہ کار اور اس وقت بھی یونی فارم میں ملبوس تھا۔ ہم نے ایک ساتھ بھاگتے ہوئے دو بلاکس ریکارڈ ٹائم میں پار کر لیے۔ یہاں تک کہ جب ہم ڈسکی کرب تک پہنچے تو میں ہانپنے لگا تھا۔ وہاں کسی قسم کی کوئی بھی چیخ پکار نہیں تھی، کوئی چھینا جھپٹی نہیں تھی۔ اس قتل و غارت کو روکنے کے لیے ہم شاید جلدی آ گئے تھے۔ اب ہمیں صرف بوڑھے باس کو تلاش کرنے اور اسے علاقے سے باہر لا کر گرفتار کرنے کے لیے کچھ جعلی الزامات کی ضرورت تھی۔ میں نے چمڑے کے براؤن ہڈ والی جیکٹ پہنے ہوئے ایک ڈاکو کا بازو پکڑا اور کارگو ایریا میں کھڑے ایک ڈیلیوری ٹرک کے ساتھ اس کو جھکایا،

جس کے اوپر کینوس کا کور چڑھا ہوا تھا اور اس کور کو ٹرک کے اطراف میں دھاتی ہوپس کے ساتھ باندھا گیا تھا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس ٹرک میں کون سا سامان موجود ہے؟

''سنو بڈی! گز بی بوشیٹی کہاں ملے گا؟''

بڈی نے وردی میں ملبوس بیچ فز کو دیکھا اور پھر میری طرف دیکھا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے بازو سے ہٹایا۔

''میں تمہارا دوست نہیں ہوں اور میں تم جیسے لوگوں سے بات نہیں کرتا۔''

اسی وقت بلاک میں دور سے گولیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے ساتھ ہی چیخ پکار بھی سنائی دی۔ اس کے بعد کاروں اور ٹرک کے انجنوں کے کریک ہونے اور سیمنٹ کے فرش پر چمڑے کے جوتوں کی دوڑ کی آواز بھی آنے لگیں۔ میں نے آوازوں کی سمت بیچ فز کو بھیجا اور میں دوسرے راستے کی طرف چلا گیا۔ ہر شخص اسی سمت سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے پانی کے بہاؤ کے مخالف سمت تیرنا۔ انسانوں کا یہ سمندر دیکھ کر مجھے اپنا پستول باہر نکالنا پڑا، لیکن مجھے شبہ تھا کہ میرا اعشاریہ 38 بور کا پستول میرے لیے مددگار بھی ثابت ہوگا کہ نہیں؟

وہاں پہنچ کر میری آنکھوں کے سامنے جو منظر تھا، اس میں بہت سے مرد و خواتین ایک چھوٹے ہجوم کی صورت میں، فٹ پاتھ پر پڑے ہوئے کسی شخص کو لاتیں اور مکّے مار رہے تھے۔

''ہے......'' میں چلّاتے ہوئے آگے بڑھا۔ ''ہٹو پیچھے ......چھوڑو اس کو۔''

کچھ افراد نے میری طرف دیکھا اور پھر اسی کام میں مصروف ہو گئے، جو وہ کر رہے تھے۔ باقی ہجوم نے میری طرف دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی اور اپنے کام میں مصروف رہا اور اس لڑکے کو مکّے اور لاتیں مارتا رہا۔

میں نے آسمان کی طرف پستول کا رخ کر کے چند فائر داغ دیے اور آخر کار وہ سب بکھر کر خود کو بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ ان میں سے کچھ، خاص طور پر مرد، یہ دیکھنے کے لیے وہیں رک گئے کہ وہاں آگے کیا ہونے والا ہے؟ وہاں زیادہ تر افراد کی زبان پر مغلظات اور کوسنے ہی تھے۔

سیمنٹ کے فٹ پاتھ پر سجدہ ریز آدمی کو دو گولیاں لگی تھیں اور اس کے زخم سے کافی خون بہہ رہا تھا۔ ایک ریوالور اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ سے تقریباً چھ فٹ دور پڑا تھا، اس کی آنکھ سوجی ہوئی تھی اور ہجوم کی طرف سے پڑنے والی تمام ضربوں کے باعث اس کی ناک بھی خون آلودہ تھی۔ میں نے اپنا پیر اس کی گردن کے نیچے پھنسا کر اس کا سر اوپر اٹھایا۔ یہ البرٹو پارسی تھا، مافیا کا نام نہاد قاتل۔

میں اپنا گھٹنا زمین پر رکھ کر اس کے اوپر جھک گیا۔

''البرٹ! تم ایسے بالکل اچھے نہیں لگ رہے ہو، کیا ہوا ہے؟''

ایک دو بار ہانپنے کے بعد اس نے فٹ پاتھ پر خون تھوک دیا۔ یہ اچھا تھا کہ خون میرے جوتوں پر نہیں آیا۔

''میں کاپرز سے بات نہیں کرتا۔''

یہ الفاظ آج دوسری بار میرے کان میں پڑے تھے۔ میں اپنے اندر اب حوصلے کی کمی پا رہا تھا۔ میں نے اپنا گھٹنا اس کے زخمی کاندھے سے پیچھے ہٹایا، تاکہ میرے سوٹ کی پینٹ پر خون نہ لگے۔

''تمہیں ایک بات بتاؤں البرٹ؟'' میں نے کہا۔ ''اگر تم مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتے تو میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ ایسی صورت میں وہ ہجوم شاید واپس آئے اور تمہیں پھاڑ ڈالے۔ وہ تم کو بالکل پسند نہیں کرتے ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہاں، اس علاقے میں رہنے والے افراد اس روز روز کی ہونے والی فائرنگ سے تھک گئے ہیں۔ ذاتی طور پر مجھے ایسا لگتا ہے کہ اب وہ تم غنڈوں پر پوری طرح چوکس ہو گئے ہیں۔'' ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میں وہاں لگے ہوئے لیمپ پوسٹ سے بات کر رہا ہوں۔

''کیا وہ مجھے مل گیا؟'' پارسی نے فٹ پاتھ پر سر جھکاتے ہوئے پوچھا۔

میں اس کی حرکات پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ بیچ فز کر کے بل پھیل کر لیٹے ہوئے ایک آدمی کے اوپر جھکا ہوا تھا۔ اس آدمی کی لاش کے قریب ایک ریوالور پڑا ہوا تھا۔ میرے اور بیچ فز کے بالکل درمیان ایک ادھیڑ عمر گھریلو خاتون موجود تھی۔

وہ فٹ پاتھ پر اپنی ٹانگ پکڑے بیٹھی تھی۔ ایک دو اور خواتین اس کو تسلی اور دلاسے دے رہی تھیں۔ اس کے لباس کے نچلے حصے سے بہتا ہوا خون بتا رہا تھا کہ ایک آوارہ گولی اس کی ران میں لگی ہے۔ اگر ہجوم مُشتعل تھا، تو اس میں کوئی تعجب نہیں تھا۔

''ہاں!'' میں نے کہا۔ ''اس کو گولی لگی تو ہے، لیکن وہ اب تک زندہ ہے۔ تم نے ایک بوڑھی عورت کو بھی زخمی کر دیا ہے، جو خود ہی اپنی کفیل ہے۔''

''میں یہ ماننے سے انکار کر دوں گا کہ میں نے اس بوڑھی عورت کو گولی ماری ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اور اس

کے علاوہ، جس آدمی کو میں نے گولی ماری تھی، وہ میں نے اپنا دفاع کیا تھا۔

"میں یہ سب نہیں جانتا البرٹ۔ مجھے ابھی یہ پتا لگانا ہے کہ گزبیچی کے پاس اس حوالے سے کیا کہانی ہے؟"

"تم کو بھی صاف نظر آرہا ہوگا کہ پہلے اس نے مجھے گولی ماری ہے۔"

"اس کی فکر نہ کرو البرٹ! اور کچھ بھی نہیں ہوا اگر تو...... تم کو پھر بھی قانون کی خلاف ورزی اور بغیر اجازت کے آتشیں اسلحہ رکھنے کے جرم میں اندر کیا جاسکتا ہے۔"

پارسی نے ہنسنے کی کوشش کی لیکن اس کے بجائے وہ محض کھانس کر رہ گیا۔

"تم اس بار غلط ہو کاپر! میرے پاس گن رکھنے کا لائسنس ہے۔ ہمارے وکیل نے ہم کو پہلے ہی کور کیا ہوا ہے۔"

یہ یقیناً وہی وکیل ہوگا جس کا ذکر جیک نے گلی میں مجھ سے کیا تھا۔

"میں اس وکیل کو دیکھ لوں گا۔ کیا نام ہے اُس وکیل کا؟ میں اس کے بارے میں ضرور جاننا چاہوں گا۔"

"میں اس کا نام بھول گیا۔"

"ٹھیک ہے تو یہ بتاؤ کہ گزبیچی پر حملہ کس کے کہنے پر کیا؟"

"میں کچھ بھی نہیں بتاؤں گا۔"

"بہتر ہے کہ اب تم مجھ [illegible] صاف صاف بات [illegible] [illegible] یہاں سے چلا گیا تو گلی کے اس پار موجود وہ ہجوم تمہارے گرد کسی گدھ کی طرح منڈلا رہا ہوگا۔"

"ہجوم۔"

"ہجوم؟ مردہ جانوروں کی طرح۔ کیا تم لوگ کبھی شہر سے باہر نہیں گئے ہو؟"

"ذرا پیدل سفر کر کے دیکھو کاپر۔"

"بالکل! اگر وہ کسی بھی دھوکا دہی کے بارے میں سوچ رہا ہے تو میں وہاں جا کر گزبیچی کی موت کا اعلان کردوں گا۔"

میں یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا اور ہجوم پر بھرپور نظر رکھتے ہوئے وہاں سے گزرتے ہوئے پیچ فز کے پاس آیا کہ دیکھوں وہ کیسا کام کر رہا ہے؟ میں نے راستے سے ہی پارسی کا ریوالور اٹھا لیا تھا۔ وہ اتنی اچھی حالت میں بھی نہیں تھا کہ مجھے کسی بھی وقت جلد فرار کے بارے میں فکر کرنی پڑے، لیکن وہ رینگ کر اپنی گن کے پاس ضرور جاسکتا تھا۔

ہجوم کے کچھ مردوں نے اس طرف ہٹنا شروع کر دیا جہاں پارسی بالکل چت پڑا ہوا تھا۔

"کام کیسا جا رہا ہے؟" میں نے پیچ فز سے پوچھا۔

اس نے پارسی کے ارد گرد اکٹھے ہو جانے والے افراد پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ وہاں کچھ مسئلہ ہے۔"

"یہ ایک بہت بڑے منصوبے کا ایک چھوٹا سا نظارہ ہے، جو ہم نے دیکھا۔" میں نے کہا۔ "مواصلات کے حوالے سے میرے اور البرٹ کے درمیان ایک چھوٹی سی غلط فہمی ہے۔ اگر وہ اس پر دوبارہ حملہ کریں تو مجھے مطلع کر دینا۔" میں نے گھٹنے زمین پر ٹیک کر تین انگلیاں گزبیچی کے دل کی شریان پر رکھ دیں۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔

"کیا اس نے آخری سانسیں لینے سے پہلے کچھ کہا تھا؟"

"نہیں، جب میں یہاں پہنچا تو یہ مر چکا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ ابھی ..... کسی اور سے اس بارے میں ذکر نہ کرنا اور جب تک میں گزبیچی سے بات کر رہا ہوں، مجھے نظر انداز کردو۔"

"لیکن وہ تو مر چکا ہے۔"

"اس حوالے سے اپنی آواز پست رکھو۔ میں اس کوشش میں ہوں کہ البرٹ کو توڑ کر اس حوالے سے کچھ نہ کچھ معلومات حاصل کر لی جائیں۔" یہ کہہ کر میں نے اپنا [illegible] کان گزبیچی کے منہ [illegible] اور دو بار سر کو ایسے ہلایا، جیسے میں اس کی کسی بات پر متفق ہوں۔ میں چند منٹ تک اسی پوز میں بیٹھا رہا۔ اس سے پہلے کہ میں کھڑا ہوتا، میں نے گزبیچی کے چہرے پر ایسے ہاتھ پھیرا، جیسے میں آخری بار اس کی آنکھیں بند کر رہا ہوں۔

"اس تمام مرحلے کے دوران کیا البرٹ میری طرف دیکھ رہا تھا، جو میں نے گزبیچی کے ساتھ کیا؟" میری پشت پارسی کی طرف تھی۔ میں نے پیچ فز سے پوچھا۔

"ہاں، وہ دیکھ رہا تھا لیکن اب وہ دیگر پریشانیوں میں گھرنے والا ہے۔"

"ہجوم اس کی طرف دوبارہ جھپٹنے کے موڈ میں نظر آرہا ہے۔"

"ہاں۔"

"اچھا! مجھے بتاؤ کہ پہلا شخص اس کو لات مارنے والا کون ہوگا؟" میں نے پیچ فز کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں البرٹ کے مسئلے میں خیال رکھوں گا۔ آپ کو ایک کال باکس ملا، اس کے علاوہ ہمیں کچھ ایمبولینس اور کچھ

بیک اَپ کی ضرورت ہے۔ فٹ پاتھ پر بیٹھی اس خاتون کو طبی مدد کی ضرورت ہے اور ہمیں اس سے نمٹنے کے لیے ایک ہجوم بھی مل گیا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹ کر تیزی سے چلا گیا۔

میں اس طرف واپس آیا، جہاں البرٹ پڑا ہوا تھا۔

''ارے...... ارے...... اتنے لوگ۔'' میں چلّایا۔ اس بار وہ سب رک کر میری طرف دیکھنے لگے۔ ''میرے قیدی کے ساتھ بدسلوکی کر کے مجھے گولی چلانے پر مجبور نہ کریں۔''

ہجوم البرٹ سے دور ہو گیا۔ صرف ایک آدمی وہیں کھڑا رہا اور اس نے البرٹ کو ایک کک ماری۔ میں نے اپنا ریوالور اس کی طرف بڑھا کر گننا شروع کیا۔ ''ایک...... دو......'' جیسے ہی میں تین پر پہنچا، وہ گلی کے پار قدم رکھ چکا تھا اور تہ خانے کی سیڑھیوں میں خود کو غائب کر چکا تھا۔ میں نے البرٹ کے پاس دوبارہ گھٹنے ٹیک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا لباس بے حد خراب لگ رہا تھا۔

''میں تمہیں کیا بتاؤں البرٹ، ایمبولینس کو یہاں پہنچنے میں کچھ وقت لگے گا۔ تم مجھ سے اپنے گناہوں کا اقرار کر سکتے ہو، جیسا کہ بوڑھے بوسٹی نے مرنے سے ایک منٹ پہلے اعتراف کیا اور اگر تم ایسا نہیں کرتے......''

''تم کوئی پادری نہیں ہو اور میں ایسا کچھ بھی نہیں کرنے والا۔''

''کم آن، البرٹ! یہ تو ہم دونوں ہی جانتے ہیں کہ تم نے اپنی مجرمانہ زندگی میں کئی افراد کا قتل کیا ہے۔''

''تم یہ ثابت کرو۔'' البرٹو نے جرح کی۔

''یہ سب لوگ گینگسٹر نہیں تھے۔ تم چاہتے ہو کہ ان سب کی بے گناہ موت کی ذمّے داری تم پر آجائے۔''

''ہاہاہا، میرا وکیل مجھے ہر اس چیز سے باہر نکال لے گا جس کے بارے میں آپ کا پرزنے مجھ پر الزامات عائد کیے ہیں۔''

''تم مجھے زیادہ چوائس کا موقع نہیں دے رہے ہو البرٹ۔ لہٰذا میرا اندازہ ہے کہ اب مجھے اپنا آخری کارڈ کھیلنا ہی پڑے گا۔''

''آگے بولو کاپر۔ جتنا بُرا کر سکتے ہو، کرلو۔'' اس نے کھانستے ہوئے دوبارہ تھوکا۔ وہ میرے جوتوں کے قریب آگیا۔ ''لیکن اگر تم مجھے جلد ہی ہسپتال نہیں پہنچاتے تو میں اپنے وکیل کے ذریعے تم پر ڈیوٹی میں بے پروائی اور اپنے درد اور تکلیف کا مقدمہ دائر کروں گا۔''

''ٹھیک ہے البرٹ، مجھے لگتا ہے کہ اس معاملے میں تمہارے باس مسٹر میسیر یا کو اب شامل کر لیا جائے۔''

''کیا مطلب؟''

میں نے اس کے زخمی کندھے پر آہستہ سے تھپکی دی اور اپنی آواز دھیمی رکھتے ہوئے کہا۔ ''الوداع البرٹ، بہت بُرا لگ رہا ہے کہ ہم کچھ بھی نہ کر سکے۔''

میں کھڑا ہوا۔

''اگر تم مجھے دوبارہ اس گروہ کے لیے چھوڑ دیتے ہو......'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''میرا وکیل تم کو مصلوب کر دے گا۔''

دور سے سائرن کی آواز ایسی آئی، جیسے وہ تیزی سے قریب آتے جا رہے ہیں۔ میں نے اپنی آواز اتنی بلند کر لی کہ سڑک تک جا سکے۔

''کسی چیز کی فکر نہ کریں مسٹر پارلیسی۔ اب جبکہ آپ ریاست کے ثبوت کو جو میسیر یا اور سیسیلین مافیا کے خلاف استعمال کرنا چاہتے ہیں تو میں آپ کی حفاظت کے لیے ہر طرح سے حاضر ہوں۔''

گلی کے پار پڑوسیوں کے ہجوم میں ایک ہنگامہ برپا ہوا۔ البرٹو پارلیسی کے چہرے پر ایک اُلجھن سی تھی۔

اس نے بیٹھنے کی کوشش کی لیکن شدید کمزوری کی وجہ سے وہ اٹھنے سے قاصر رہا۔

میں نے اس کا فیڈورا کیپ اٹھایا اور اس کے سر کے نیچے تکیے کی طرح رکھ دیا، جیسے مجھے اس کے آرام کا بہت خیال ہو۔

''تم ایک بہادر مرد ہو مسٹر پارلیسی، بس، وہیں رک جاؤ، ہم تم کو اسپتال پہنچا دیں گے۔''

دو ایمبولینسوں کو وہاں تک لایا گیا۔ سفید پتلون، جیکٹس اور ٹوپیوں میں ملبوس اس کے اٹینڈنٹس گاڑیوں سے باہر نکلے اور ایک دو اسٹریچر زاتارنے لگے۔

میں نے ایمبولینس میں سے دو اٹینڈنٹس کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

''جلدی کرو، یہاں پر۔''

''میں اس معاملے کو حل کرنے کے لیے اپنے وکیل سے رابطہ کروں گا۔'' البرٹو نے کمزور آواز میں کہا۔ ''وہ جو سے بات کرے گا، اسے بتائے گا کہ واقعی یہاں کیا ہوا ہے۔ وہ جو، کو قائل کرے گا کہ میں نے ایک چوہا تک نہیں مارا ہے۔''

مجھے امید ہے کہ تم دونوں ضرور یہ کوشش کرو گے۔ میں نے سوچا۔ جو میسیر یا اتنا ہی بے وقوف ہے۔ اس نے تم دونوں کو صرف خود کو محفوظ رکھنے کے لیے مروایا ہے۔

❖❖❖

دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہر انسان اپنے وقت پر آکر اپنا کردار ادا کرتا ہے... اور پھر رخصت ہو جاتا ہے... شیکسپیئر کے اس خیال کو بڑی شہرت ملی... کیونکہ دنیا کے اس جنگل میں ہر مزاج کے انسان موجود ہیں... کچھ شکاری جو درندوں جیسا مزاج رکھتے ہیں اور باقی وہ جو ان درندوں کی خوراک بنتے ہیں... ایسے میں ہر معصوم جانور نے اپنے بچاؤ کا الگ ہی طریقہ اپنا رکھا ہے... اب اس میں کبھی کامیابی ملتی ہے اور کبھی ناکامی اور کبھی درندوں پر اپنا وار ہی الٹ جاتا... یہی کھیل تماشا ہی زندگی کی حقیقت ہے... ایک بوڑھی عورت کا قصہ جو درندہ نما انسانوں کے چنگل میں پھنس گئی تھی... بوڑھی عورت کا ماضی اس بات کا گواہ تھا کہ اس نے کبھی کسی محاذ پر ناکامی کا سامنا نہیں کیا تھا...

کھیل تماشا

مظہر سلیم ہاشمی

شکار اور شکاری کے بیچ ہونے والے کھیل کا پرتجسس اور سنسنی خیز کھیل تماشا......

ایک سال پہلے......

زندگی بہت کٹھن ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی انسان کو ایسے موڑ پر لا کر کھڑا کر دیتی ہے جہاں پر کوئی نہ کوئی تکلیف دہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ رات کی تاریکی میں اسے اچانک ہی ایک ایسی پیشکش ملی تھی جسے قبول کرنے میں کوئی بھی دنیا پرست شخص ایک لمحہ نہ لگاتا۔

"کیا میں یہ سب کر پاؤں گا؟" ایک سوچ اس کے ذہن میں ابھری۔

اس نے اپنی قمیص کے دائیں جانب دیکھا جو خالی جھول رہی تھی...... کسی زمانے میں وہاں اس کا بازو ہوتا تھا۔

''کرنا یا نہ کر پانا الگ بات ہے۔ پہلے تو فیصلہ کرو کہ تم یہ کرنا چاہتے بھی ہو یا نہیں؟'' دماغ میں ایک اور خیال آیا۔

''اتنی دولت بغیر کسی محنت کے مل رہی ہے تو کیا حرج ہے......'' دل نے کہا۔

''لیکن یہ جرم ہے......'' دماغ نے دلیل دی۔

''اس عمر میں تمہیں گھر بیٹھے کروڑوں کا مال مل جائے تو بُرا کیا ہے؟'' دل بولا۔

''پکڑے گئے تو اس عمر میں خوار ہو کر رہ جاؤ گے۔'' دماغ کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔

''کوئی کیوں شک کرے گا؟'' دل نے لالچ دیا۔ ''ایک قریب المرگ بڑھیا کی موت پر کتنا ہنگامہ ہو جائے گا؟ لیکن یہ سوچو تمہاری زندگی سنور جائے گی۔''

''زندگی ابھی بھی اتنی بُری تو نہیں ہے؟'' دماغ کی یہ دلیل کچھ کمزور تھی۔

''ہاہاہا......'' دل نے قہقہہ لگایا۔ ''پتا نہیں پھر تمہارے نزدیک بُری زندگی کیا ہو گی؟ ویسے بھی یہ اس بڑھیا پر احسان ہو گا۔ تم اسے اس کی اذیت سے نجات دلا دو گے......اس سے بڑھ کر بھلائی کا اور کیا کام تم کر سکتے ہو؟''

دل کے تابڑ توڑ حملوں نے دماغ کو پسپا کر دیا تھا۔ وہ ایک ناپسندیدہ فعل پر آمادہ ہوتا جا رہا تھا......بس ضمیر کو سُلانے کی دیر تھی اور سب صحیح لگنے لگا تھا۔ مچلتا دل سوال کرتے دماغ کو تھپکیاں دے کر سُلا چکا تھا...... اس نے پیشکش قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ضمیر سو جائے تو پھر کوئی گناہ، گناہ نہیں لگتا۔ کوئی جرم، جرم محسوس نہیں ہوتا...... بلکہ جیسا اس وقت وہ سوچ رہا تھا، انسان ویسے ہی سوچنے لگتا ہے کہ وہ کوئی بھلائی کا کام کرنے لگا ہے۔

☆☆☆

خوف کی سب سے بُری صورت وہ ہوتی ہے جو تعاقب کرتے ہوئے آپ کے گھر تک پہنچ جائے اور چاہ کر بھی اس سے چھٹکارا پانا ناممکن لگنے لگے۔

وہ خوف جو رات کو کمرے کی کنڈی لگائیں تو آپ کے ساتھ ہی مقید ہو جائے۔ کچھ ایسا خوف جو دن کے چوبیس گھنٹے ساتھ رہے اور کسی سرطان کی طرح آپ کو اندر ہی اندر سے گھن کی طرح چاٹتا رہے۔

شہر کے مضافات میں ایک مختصر الوجود، چڑیا میں سٹے ہوئے برف جیسے سفید بالوں والی بوڑھی عورت جدید طرز کے ریکلائنر پر ٹیک لگائے ہوئے تھی۔ وہ اپنے شاندار بنگلے کی کھڑکی سے سڑک کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ سڑک ہمیشہ کی طرح سنسان تھی لیکن اس کے مختصر وجود میں طوفان برپا تھا۔ پچھلے تیس سال سے وہ یہ منظر دیکھ کر لطف اندوز ہوتی آئی تھی لیکن آج اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ ایسے خوف کا شکار ہو گئی تھی جو اس کے وجود میں سرایت کرنے لگا تھا۔

اس کی عمر اسّی کے لگ بھگ تھی لیکن وہ جسمانی طور پر اب بھی صحت مند تھی۔ فی الحال ذہنی طور پر اس کا سکون برباد ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ پچھلی رات مسلسل ان درندوں کے بارے میں سوچتے ہوئے سوئی تھی جو اس کی پُرسکون زندگی میں عذاب بن کر وارد ہوئے تھے۔

دو درندے......ایک نر اور ایک مادہ۔

نیند سے بیدار ہونے کے بعد اس کا ذہن ایک بار پھر اس مادہ اور نر درندے کی جانب چلا گیا تھا۔ وہ صبح سے اب تک ان کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔

''کیا ان درندوں سے بچنے کی کوئی صورت ہے؟''

یہ سب سوچتے ہوئے اس نے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور روح تک میں اس کی تاثیر محسوس کی۔

کھڑکی سے چھن چھن کر آتی ہوئی دھوپ نے اس کے بازو اور ہاتھوں کی پیلاہٹ کو نمایاں کر دیا تھا لیکن وہ اس سے بھی محظوظ ہو رہی تھی۔ جاڑے کا موسم جاتے جاتے پھر سے آ گیا تھا اور اس بار بارشوں نے شہرِ اقتدار میں اپنا خوب اثر دکھایا تھا۔ بڑے دنوں بعد سورج نے درشن کرائے تھے۔ اگرچہ اس کی دھوپ میں تیزی نہ تھی لیکن خون کو جما دینے والی سردی میں یہی غنیمت تھا۔ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا ہمیشہ ہی بہتر ہوتا ہے۔

بہار کا موسم آنے میں ابھی کچھ وقت تھا مگر وہ درختوں میں پھر سے ہریالی آنے کا سوچ کر ہی اداس ہو گئی۔

''کیا میں یہ پھول پودے اور بہار پھر سے دیکھ پاؤں گی؟'' ان درندوں کی وجہ سے اس کا ذہن عجیب وسوسوں کا شکار ہو کر رہ گیا تھا۔

باہر کے موسموں سے بے نیاز اس کے نیم گرم بیڈروم میں دنیا بھر کی ہر سہولت تھی لیکن ذہنی آزار ایسے تھے کہ وہ ان سب سے بے پروا ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ہر وقت چھائی رہنے والی مسکان اب پیشانی پر تفکر آمیز تیوری

میں تبدیل ہو چکی تھی۔
ان درندوں کا خوف...... جس نے ہر خوشی پر ڈاکا ڈال لیا تھا۔
ان دونوں سے یہ تعلق تین ماہ قبل شروع ہوا تھا۔ بیگم عائشہ صدیقی نامی وہ خاتون ابھی تک ان درندوں کا طریقہ کار نہیں سمجھ پائی تھی لیکن ایک بات روزِ روشن کی طرح عیاں تھی۔ وہ دونوں درندے اسے کھیل تماشے میں لگا کر عن قریب اس کی جان لینے والے تھے۔
بیگم عائشہ صدیقی کے وجود میں ایک بار پھر خوف سے جھرجھری دوڑ گئی۔

☆☆☆

اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سن کر وہ گھبرا کر پلٹی تھی...... بغور دیکھنے پر بھی اسے کوئی نظر نہ آیا تو وہ تیز قدموں کے ساتھ چلنے لگی۔
باربینہ ہفتے میں چھ دن بیگم صدیقی کے گھر کام کرنے جاتی تھی اور اس کی واپسی تک شام کے سائے گہرے ہونے لگتے تھے۔ وہ پیدل ہی آتی جاتی تھی۔ بیگم صاحبہ کے بنگلے سے اپنے کوارٹر تک پہنچنے میں اسے بمشکل دس بارہ منٹ ہی لگتے تھے۔
بنگلا پوش علاقے میں تھا جو عموماً ویران رہتا تھا۔ راستے میں ایک سنسان گلی اور پھر جنگل کے ساتھ واقع ایک ویران سے کھلے میدان کے بعد اس کا محلہ آجاتا تھا جہاں عموماً چہل پہل رہتی تھی۔
ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا لیکن آج بنگلے سے نکلتے ہی اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ کسی کی نگاہوں کے حصار میں ہے۔ ایک بار تو وہ خوف سے کپکپا کر رہ گئی لیکن کسی کو اپنے آس پاس نہ دیکھ کر اس نے ایک اطمینان کی سانس لی اور اپنے گھر کی جانب چلنے لگی۔
ابھی وہ سنسان گلی پار کرنے ہی والی تھی جب قدموں کی چاپ نے اسے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ شام کے ملگجے اندھیرے میں کوئی ذی روح اسے دکھائی نہ دیا۔ موسم ایسا تھا کہ اس کی وجہ سے پرندے اور جانور بھی سرِ شام ہی اپنی پناہ گاہوں میں دبک جاتے تھے۔
''بار...... بی...... نہ۔'' ایک خرخراتی سی پکار سن کر اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔
''کک...... کون ہے؟'' باربینہ نے پلٹ کر پوچھنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز جیسے گلے میں ہی پھنس کر رہ گئی

تھی۔
جواب ندارد۔ کوئی بھی اسے نظر نہیں آیا لیکن وہ قدموں کی چاپ کو اپنی سماعت کا دھوکا سمجھ سکتی تھی لیکن اپنے نام کی پکار کو نظرانداز کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔
گلی کا اختتام تھا۔ اسے کچھ نہ سوجھا تو اپنے گھر کی جانب دوڑ لگا دی۔ سفید رنگ کے شٹل کاک برقع میں ملفوف اس کا بھاری وجود دوڑتے ہوئے عجیب مضحکہ خیز سا لگ رہا تھا لیکن وہ ایسے دوڑ رہی تھی جیسے اسے دنیا کی کوئی پروا نہ ہو۔
دوڑتے ہوئے بھی اسے مسلسل ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے میدان کے ساتھ متصل جنگل سے کسی درندے کی آنکھیں اسے اپنی نگاہوں کے حصار میں رکھے ہوئے ہیں۔ اپنے محلے تک پہنچتے پہنچتے اس کی سانس اور ہمت دونوں

جواب دینے لگی تھیں لیکن اس نے اپنی رفتار میں کوئی کمی نہ آنے دی۔

محلے کے آغاز میں ہی ایک جنرل اسٹور نما دکان تھی۔ اس کی جھلک دیکھتے ہی اس نے دوڑنا تو موقوف کر دیا لیکن اپنی چال کی تیزی برقرار رکھی۔ یہاں زندگی رواں دواں تھی۔ پان سگریٹ پینے والے نوجوان گلی میں ہی ٹہل رہے تھے اور ایک جانب چھوٹے لڑکوں نے کرکٹ کا کھیل سجایا ہوا تھا۔

''کھیلتے ہوئے سردی شاید ان پر اثر انداز نہیں ہوتی اور اسکول جاتے موت آتی ہے۔'' باربینہ اپنی پھولی سانسوں کے ساتھ بڑبڑا کر رہ گئی۔ ''یہ اسکول والے بھی پتا نہیں اتنی چھٹیاں کیوں دے دیتے ہیں، ہمارے زمانے میں تو یہ نہیں ہوتا تھا۔''

وہ اپنے کوارٹر والی گلی میں پہنچی تو وہاں بچوں کا ایک اور گروہ کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھا۔

''یہ موئے اس ویران میدان میں کھیل لیا کریں تو کیا حرج ہے؟'' وہ دل ہی دل بچوں کو بُرا بھلا کہے بغیر نہ رہ سکی۔ ابھی تک اس کے ذہن میں وہ پکار گونج رہی تھی جس نے اسے بے تحاشا دوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔

بچوں میں سے ایک چھوٹا لڑکا اسے دیکھتے ہی دوڑ کر اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔ باربینہ اس حرکت پر مسکرا کر رہ گئی۔ وہ اس کا اپنا بیٹا شہروز خان تھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے کوارٹر میں داخل ہوئی۔ دو کمروں کا یہ کوارٹر تھا جس کا صحن شروع ہوتے ہی ختم ہو جاتا تھا۔

''السلام علیکم بچو۔'' اس نے اپنے بچوں اور شوہر کو سلام کیا تو پھولی ہوئی سانس کے اثرات اس کی آواز میں واضح تھے۔ اس کی بڑی بیٹی زرینہ اور چھوٹی شہرینہ پڑھ رہی تھیں جبکہ شہروز کرکٹ بال کو چھپاتے ہوئے پڑھنے کا ناٹک کر رہا تھا۔

''بیٹا...... تمہاری سانس کیوں پھولی ہوئی ہے؟'' باربینہ کے شوہر دانیال خان نے سلام کا جواب دینے کے بجائے سوال کرنا مناسب سمجھا۔ موبائل فون پر کوئی ویڈیو دیکھتے ہوئے بھی اس نے لمحوں میں باربینہ کی حالت کا تغیر محسوس کر لیا تھا۔

تشویش سے زیادہ اس کی آواز میں باربینہ کو تفتیش کا عنصر زیادہ محسوس ہوا۔ ''وہ......'' باربینہ اصل بات بتاتے ہوئے ایک لمحے کے لیے رک گئی۔

چند سال پہلے کی کئی ہزار سوچوں نے جیسے اچانک ہی اس کے دماغ پر حملہ کر دیا تھا۔

بچوں کی اسکول فیس...... بھوک سے لرزتے اُن کے چہرے...... دانیال کو کبھی کام ملتا کبھی نہ ملتا...... ایک وقت کے کھانے سے لے کر اگلے کھانے تک کی امید اور بے یقینی...... اور سب سے بڑھ کر دانیال کی نام نہاد غیرت۔

یہ نوکری کرنے کی اجازت بھی اسے مشکل سے ملی تھی اور جب سے اس نے بیگم صدیقی کے گھر کام شروع کیا تھا تب سے کم از کم اسے یہ اطمینان ضرور ہو گیا تھا کہ اس کے بچے رات کو بھوکے نہیں سوئیں گے۔ بیگم صدیقی تنخواہ تو مناسب دیتی ہی تھیں، ساتھ میں ہفتے کے سات میں سے پانچ دن اسے گھر میں پکا کھانا بھی ساتھ دے دیتی تھیں۔ یہ سب سوچ کر ہی باربینہ نے طے کر لیا کہ اصل بات گول کر جانا ہی بہتر رہے گا۔

''وہ......'' باربینہ نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے بات مکمل کی۔ ''نماز کو... دیر ہو رہی تھی اس لیے میں تیز چلتے ہوئے آئی ہوں۔''

شوہر کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات دیکھتے ہوئے وہ اپنا شٹل کاک برقع اتارتے ہوئے واش بیسن کی جانب وضو کرنے بڑھی۔ گہری سانسیں لیتے ہوئے وہ دل ہی دل میں اللہ سے معافی مانگ رہی تھی کہ اس نے اپنے رب کے نام پر شوہر سے جھوٹ بول دیا تھا۔

☆☆☆

''چھکا......'' نجم بے اختیار اپنی سیٹ سے اٹھتے ہوئے چلایا۔

اسٹیڈیم میں میچ پوری گہما گہمی کے ساتھ چل رہا تھا اور وہ اکیلا نہیں تھا جو بلا ادھر ہی گیند کو باؤنڈری پار جاتے دیکھ کر خوشی سے چلا اٹھا تھا۔

ملکی لیول پر ہونے والا ٹی ٹوئنٹی کپ اگرچہ ہوا ہے ابھی سے شروع ہوا تھا لیکن عوامی مقبولیت پانے اور سیکیورٹی خدشات دور ہو جانے کے بعد اب پاکستان میں ہی سارے میچز ہونے لگے تھے۔ راولپنڈی کے اس کرکٹ اسٹیڈیم کی حالت بہت اچھی نہیں تھی لیکن تفریح کو ترسی ہوئی عوام آس پاس کے شہروں سے بھی امنڈ آئی تھی۔ اس وقت بھی اسلام آباد اور پشاور کی ٹیمیں ایک دوسرے کے مدِمقابل تھیں اور عوام کا ایک جمِ غفیر میچ دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑا تھا۔

نجم جنجوعہ ایک دوسرے درجے کا وکیل تھا جو وکالت کم اور اپنے کلائنٹس کے لیے جاسوسی کر کے زیادہ کما لیا کرتا تھا۔ پاکستان میں نجی جاسوسی کا پیشہ ناپید تھا اس لیے یہ کام

اکثر وکیل اور صحافی ہی کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔
ابھرے بدن، بکھرے بالوں اور کھچڑی داڑھی کے ساتھ وہ فلمی جاسوسوں جیسی وجاہت سے محروم تھا لیکن خود کو ٹام کروز سے کم سمجھنا اس کی فطرت میں ہی نہیں تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ جتنا ٹام کروز کے بال لہراتے تھے اس سے زیادہ نجم کے دبلے بدن پر کھلے کپڑے لہراتے تھے۔ اس وقت بھی وہ ایک چیک والی کھلی شرٹ اور جینز پہنے ہوئے تھا۔
میچز اور فلموں کا شدید شوقین ہوتا تو پھر بھی قابل قبول تھا لیکن ایک اس کی بری عادت نے کبھی اسے معاشی طور پر زیادہ خوشحال نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ جواری تھا اور جُوا کھیلنے کی لت کا بری طرح سے شکار تھا۔ کسی بھی قسم کی شرط لگانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ جہاں وہ لاکھوں قمار بازی سے کماتا تھا وہیں ایک ہی ہلّے میں لاکھوں اس کے ہاتھ سے نکل بھی جایا کرتے تھے۔
اس وقت بھی میچ سے زیادہ اس کی دلچسپی اس بات میں تھی کہ اس نے جس ٹیم پر پیسہ لگایا ہے، وہ جیت جائے۔ اسی وقت اگلی بال پر بلے باز نے ایک شان دار 'کور ڈرائیو شاٹ' کھیلتے ہوئے مخالف ٹیم کو چوکا رسید کر دیا۔
''آج تو اسلام آباد ٹیم جیتے ہی جیتے۔'' اس نے بلند آواز میں کہا جس میں سکون کی گہری آمیزش تھی۔
اپنے لگائے ہوئے پیسے منافع کے ساتھ وصول ہونے کا اطمینان ہوتے ہی اس کی دلچسپی میچ سے کم ہو گئی تھی اور اب وہ اپنے دوسرے شوق کی تکمیل کے لیے نظریں دوڑانے لگا۔
ایک دوست کی بدولت وہ اس وقت وی آئی پی اینکلیو میں تھا۔ کئی امیر زادیوں نے اس کا حلیہ دیکھ کر برے برے منہ بنائے تھے لیکن وہ ان لڑکیوں میں انٹرسٹڈ ہی نہیں تھا۔ اسے بڑی عمر کی عورتیں پسند آتی تھیں اور وہ اپنے حلقہ احباب میں ''آنٹی لوور'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ چھکا اور پھر چوکا لگنے کے بعد بیشتر عوام بیٹھ چکی تھی لیکن وہ نظریں گھماتے ہوئے اسی کوشش میں تھا کہ اسے اپنے مطلب کی کوئی 'آنٹی' مل ہی جائے۔
جیسے شکر خورے کو شکر مل جاتی ہے، ویسے ہی اس کی نگاہِ انتخاب پر پورا اترتی ایک خاتون اس کی نظروں کو بھا گئی۔ اس کی سیٹ سے تین چار قطار اوپر ایک جانب سیٹ پر بیٹھی خاتون کو اس نے مرکزِ نگاہ بنا لیا جس کے اردگرد کی چند سیٹیں خالی تھیں۔
سرخ و سپید رنگت والی، پینتالیس پچاس سالہ وہ خاتون جدید تراش کا پرکشش لباس پہنے ہوئے تھی جس پر دوپٹا اس نے تکلفاً ہی گلے میں لٹکایا ہوا تھا۔ سن گلاسز اس نے آنکھوں کے بجائے بالوں میں کیچر کی طرح پھنسائے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں نئے ماڈل کا فون اور انگلیوں میں نگینے والی انگوٹھیاں اس کی امارت کو ظاہر کر رہے تھے۔
میچ میں اس کی دلچسپی نجم کی طرح نہ ہونے کے برابر تھی کیونکہ وہ بھی متلاشی نگاہوں سے کچھ ڈھونڈتی محسوس ہو رہی تھی۔ اگر اس کے ساتھ کوئی تھا بھی تو اس وقت وہاں موجود نہیں تھا کیونکہ وہ قدرے بے چین سی دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے ہی اس کی نگاہیں نجم سے ٹکرائیں، وہ مسکرا اٹھا۔
نجم کو یہ بھی غلط فہمی تھی کہ جب وہ مسکراتا ہے تو بالکل شاہ رخ خان لگتا ہے۔
وہ خاتون نجم کی اس دیدہ دلیری پر گڑبڑا کر ادھر اُدھر دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔ یہ اطمینان ہونے کے بعد کہ یہ دانتوں کی نمائش اس کے لیے ہی کی گئی ہے، اس نے بغور نجم کو دیکھا اور ایک پھیکی سی جوابی مسکراہٹ سے نواز دیا۔
''یاہو......'' نجم نے دل ہی دل میں نعرہ لگایا۔
وہ 'ہنسی تو پھنسی......' والے مقولے کا دل سے قائل تھا۔ اب اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ واپس اپنی سیٹ پر بیٹھ جائے۔ وہ راستہ بناتے ہوئے خاتون کی نشست والی قطار کی جانب بڑھا۔ تماشائیوں کے جوش و خروش میں یہ کافی مشکل کام تھا کیونکہ میچ اپنے آخری مراحل میں داخل ہو گیا تھا اور راولپنڈی کی عوام اسلام آباد کی ٹیم کو پورے دل کے ساتھ سپورٹ کرنے میں مصروف تھی۔
وہ ہجوم میں جگہ بناتا اطمینان سے اس خوش رُو خاتون سے دو نشست کے فاصلے پر ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ خاتون دزدیدہ نگاہوں سے نجم کو دیکھ رہی تھی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ ایک بار پھر ان دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں تو نجم نے دانت نکال کر ایک اور مسکراہٹ سے اسے نواز دیا۔
''کیا میں آپ کو جانتی ہوں؟'' خاتون نے جزبز ہوتے ہوئے پوچھا۔
''مائی سیلف نجم......نجم جنجوعہ۔'' اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ''میں ہائی کورٹ ایڈووکیٹ ہوں۔''
''میں مریم ہوں۔'' خاتون نے اپنا نام تو بتایا لیکن نجم کے مصافحے کے لیے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کر دیا۔

نجم نے بالکل بھی بُرا نہ مانا اور اپنا بڑھا ہوا ہاتھ غیر محسوس انداز میں نیچے کرلیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کم ہی خواتین پہلے ہی رابطے میں بے تکلف ہوتی ہیں۔

''بیوٹی فل نیم ......'' نجم نے مریم نامی اس خوش شکل خاتون پر ڈورے ڈالنے کا آغاز کیا ہی تھا کہ کسی نے اس کی بات کاٹ دی۔

''سوری مما...... آپ کو زیادہ دیر ویٹ کرنا پڑا۔'' ایک مضبوط ڈیل ڈول والا نوجوان پیچھے سے آکر مریم سے بولا۔ ''لیکن یہ انتظار ضائع نہیں ہوا...... ایک مطلب کی پارٹی مل گئی ہے۔''

نوجوان اپنی ہی رو میں بولتا چلا گیا لیکن نجم جنجوعہ کو اپنے اور مریم کی جانب متوجہ پاکر خاموش ہو گیا۔ نیلی جینز اور سفید ٹی شرٹ پہننے کے بعد اس نے ایک نیلے اور سرخ چیک والی شرٹ، اس طرح اوڑھ رکھی تھی کہ بٹن بند کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

نجم کی امیدوں پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ مریم ایسے کسی ستائیس اٹھائیس سال کے ہٹے کٹے مرد کی ماں ہوگی۔

بے پرواحلیے والا یہ نوجوان اسے بالکل بھی پسند نہیں آیا تھا۔ مریم جیسی نرم ونازک خاتون ایسے مشٹنڈے کی ماں لگتی ہی نہیں تھی...... لیکن دونوں کے چہرے کی شباہت اور گوری رنگت بتا رہی تھی کہ وہ دونوں آپس میں رشتے دار ہی ہیں۔

وہ توقع کر رہا تھا کہ مریم اس کا تعارف کرائے گی لیکن اس کے تاثرات سے ایسا کچھ ظاہر نہ ہوا۔ کچھ دیر کی تکلف آمیز خاموشی کے بعد وہ بولی۔

''کس پارٹی کی بات کر رہے تھے زریاب؟'' وہ نجم کے بجائے اپنے بیٹے سے مخاطب تھی۔

''بیگم عائشہ صدیقی......'' زریاب اپنی بھاری آواز میں بولا تو اس کے انداز میں جوش جھلک رہا تھا۔ ''وہاں اندر، وی آئی پی بوتھ میں چلیں وہاں چل کر میں آپ کو ان سے ملواتا ہوں۔''

مریم نے ایک نگاہِ غلط نجم پر ڈالی اور اس سے کسی قسم کی معذرت کیے بغیر اٹھ کر اپنے بیٹے کے ساتھ خراماں خراماں چلتے ہوئے انکلیوژر کے اندر والے ہال میں گھس گئی جہاں پر انتظامیہ کی جانب سے ہائی ٹی بوفے کا بندوبست کیا گیا تھا۔

''ہونہہ......'' نجم جنجوعہ نے اس کی اس حرکت پر بُرا سامنہ بنایا۔

میچ دیکھتے ہوئے زیادہ دیر تک اس کا موڈ خراب نہ رہ سکا۔ اسلام آباد کی ٹیم جیت چکی تھی اور وہ اس پر لگائی گئی رقم کے مطابق اس وقت کوئی ساڑھے سترہ لاکھ روپے کما چکا تھا۔

''جیب میں پیسہ ہو تو شکار بڑے......'' یہ سوچ کر ہی وہ دیگر تماشائیوں کے ساتھ جیت کا جشن منانے میں معروف ہو گیا۔

☆☆☆

یہ تین ماہ پہلے کی بات تھی جب مریم اور اس کا بیٹا زریاب خان بیگم عائشہ صدیقی کی زندگی میں آئے تھے۔

وہ کرکٹ یا کسی بھی قسم کے کھیلوں میں دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ میچ پر جانے کا فقط ایک ہی مقصد تھا کہ بیگم صدیقی کے شوہر شاہد صدیقی کے نام پر میچ کے بعد ایک ہائی ٹی بوفے کے ساتھ ساتھ فنڈ ریزنگ کی ایک تقریب بھی تھی۔ اگرچہ مریم اور زریاب بھی اپنی چال ڈھال سے کھیلوں کے شیدائی دکھائی نہیں دیتے تھے لیکن انہوں نے ٹیم کے کھلاڑیوں اور کھیل پر ایسے ایسے تبصرے کیے جیسے ہر کھلاڑی پر پوری تحقیق کی ہو۔

ایک گھنٹے سے زیادہ تو انہوں نے بیگم صدیقی کو ہی اپنے گھیرے میں لے کر باتیں کی تھیں۔ وہ بھی ان سے باتیں کرکے خوش تھی کیونکہ انہوں نے اسے مہمانِ خصوصی سمجھنے کے بجائے ایک عام عورت کی طرح ہی گپ شپ کی تھی۔

''آپ خوش قسمت ہیں جو ان سب لوگوں کو ذاتی طور پر جانتی ہیں۔'' زریاب کا اشارہ شہر اقتدار کے برسرِ اقتدار لوگوں کی جانب تھا۔

''کراچی میں تو آلودگی نے سانس لینا محال کر دیا تھا......'' مریم بولی۔ ''وہاں پر کاروبار بھی کامیاب ہو سکتا ہے جب تک آپ بھتا مافیا کو وقت پر بھتا دیتے رہو...... ایک مہینے لیٹ ہو جاؤ تو ایسا نقصان پہنچاتے ہیں کہ کئی ماہ کا منافع برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔''

''میں تو سمجھتا ہوں کہ پراپرٹی کا کاروبار ہی سب سے بہترین ہے۔'' زریاب نے اپنا خیال پیش کرنا ضروری سمجھا۔ ''مجھ سے جتنی بار مرضی پوچھ لو، میں اسی کا ہی مشورہ دوں گا۔''

بیگم صدیقی ان کی باتوں اور انداز سے بہت متاثر ہوئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس مشکل میں پڑنے والی

ہے۔

اگلے دن رات کا کھانا اس نے مریم اور زریاب کے ساتھ ہی کھایا۔

وہ اپنے شوہر کے پسندیدہ ریسٹورنٹ آئی تھی جہاں اس کے لیے کھڑکی کے پاس والی ایک نشست مخصوص کر دی جاتی تھی لیکن مریم کے اصرار پر وہ ایک ایسی جگہ پر بیٹھے جہاں سے انہیں کوئی باہر سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس پوری محفل کے دوران پانچ فٹ کی بڑھیا پر زریاب جیسا چھ فٹ کا جوان حاوی رہا۔ ساتھ میں مریم کی باتیں ایسی تھیں کہ وہ ہر موضوع پر بلاتکان بولتی ہی چلی جاتی تھی۔ انہوں نے بیگم صدیقی کو بل بھی ادا کرنے سے منع کر دیا اور اس عشائیے کو اپنی طرف سے دعوت قرار دے دیا۔

خان فیملی نے اپنا تعلق بلوچستان کے ایک سردار خاندان سے بتایا۔ کراچی میں ان کا خاندان ہجرت کر کے گیا تھا لیکن وہاں پر ان کے معاملات میں کچھ جرائم پیشہ عناصر کی دھمکیاں اتنی زیادہ شمولیت اختیار کر گئیں کہ انہوں نے اپنا سب کچھ سمیٹ کر اسلام آباد شفٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

خوش رُو اور خوش ادا مریم خود کو اڑتالیس سال کا بتاتی تھی لیکن کہیں سے بھی وہ چالیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ خوب صورت ناز و انداز کی وجہ سے اس کی ہر بات پر یقین کر لینے کو دل کرتا تھا۔ یقیناً وہ ایک مسحور کن شخصیت کی مالک تھی۔

دوسری جانب اس کا بیٹا زریاب بائیس تیئس سال کا نوجوان تھا لیکن اپنی بے ترتیب داڑھی، بکھرے بال اور بھاری بھرکم ڈیل ڈول کی وجہ سے اٹھائیس تیس کا بھرپور مرد نظر آتا تھا۔

مریم سے جب اس نے اس کے شوہر کے بارے میں پوچھا تو وہ یک بارگی خاموش ہو گئی تھی۔ زریاب کا چہرہ سرخ ہوا لیکن وہ کچھ بولا نہیں تھا۔

”وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔“ مریم کا آزردہ لہجہ سن کر وہ بھی افسردہ ہوئی تھی لیکن پھر مزید کوئی سوال نہ کیا۔

ڈنر کے دوران ہی جب انہیں معلوم ہوا کہ بیگم صدیقی اپنے بنگلے کی انیکسی کرائے پر دینے کا سوچ رہی ہیں تو ان کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔

”میں تو زریاب سے کب سے کہہ رہی ہوں کہ کسی اچھی لوکیشن پر مکان کرائے پر لے لو۔ ریسٹ ہاؤس میں رہنا مجھے پسند نہیں ہے۔“ مریم نے کہا۔ ”ویسے بھی ہمارے پاس جو انویسٹمنٹ ہے اسے ہم اپنے رہائشی مکان کی خرید میں ضائع نہیں کرنا چاہتے ہیں۔“

بیگم صدیقی نے اشارے کنائیوں میں واضح کر دیا کہ وہ جس پوش علاقے میں رہتی ہے، وہاں پر ایک انیکسی افورڈ کرنا بھی کسی مہنگے ہوٹل یا ریسٹ ہاؤس کے مقابلے میں بہت زیادہ مہنگا پڑ سکتا ہے لیکن مریم اس معاملے میں مُصر رہی۔

بیگم صدیقی نے انیکسی کا کرایہ اتنا زیادہ رکھا ہی اس لیے تھا تاکہ وہ مڈل کلاس یا نودولتیوں کو اپنے معاملات سے دور رکھ سکے۔ البتہ خان فیملی کے لیے اس کے دل میں ایک نرم گوشہ پروان چڑھنے لگا تھا اس لیے اس نے کرائے میں بھی تخفیف کر دی۔

پیسوں کے معاملے میں اس نے البتہ اپنے مرحوم شوہر کی نصیحت کو ملحوظ خاطر رکھا تھا کہ معاہدہ ہونے سے قبل خان فیملی کی کراچی والی سابقہ رہائش اور دیگر حوالہ جات کی مکمل تصدیق کروائی۔ وہاں سے ان کے بہترین مالی اور کرائے داری کے معاملات میں وقت کی پابندی کی تصدیق ہونے کے بعد ہی معاہدہ تکمیل تک پہنچایا۔

بیگم صدیقی کو کرائے دار رکھنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اپنے شوہر سے اسے اولاد کے سکھ کے علاوہ دنیا کی ہر آسائش ملی تھی۔ اس کے مرحوم شوہر نے اس کے لیے اتنی جائداد اور فنڈز چھوڑے تھے کہ وہ مہینے کے لاکھوں بھی اُڑاتی تو اس کی دولت میں بہت فرق آنے والا نہیں تھا۔ کُل وقتی ملازم رکھنے کا اسے شوق نہیں تھا اور اس معاملے میں اس کے شوہر شاہد صدیقی نے ہی اسے خوفزدہ کر رکھا تھا کہ اکثر بوڑھے لوگ ملازموں کے ہاتھوں معمولی رقوم کے ہاتھوں جان گنوا دیتے تھے۔

رشتے دار کوئی قریبی تھے نہیں۔ ایک بہن تھی جو کب کی وفات پا چکی تھی جبکہ اکلوتا بھانجا اگرچہ معذور تھا لیکن اتنا خوددار کہ اس سے بھی رقم نہیں مانگتا تھا۔ بلکہ اکثر تو وہ تحفے تحائف بھی بھیجنے پر ناراضی کا اظہار کرتا تھا جو وہ اس کی مدد کے لیے بھجواتی تھی۔ بدلے میں وہ بھی اپنی خالہ کو گفٹ بھیج دیا کرتا تھا۔ اس نے تو لاہور سے آ کر اسلام آباد رہنے سے بھی صرف اس وجہ سے انکار کر دیا تھا کیونکہ وہ اپنی خالہ کا دستِ نگر بن کر نہیں رہنا چاہتا تھا۔

بیگم صدیقی کو مریم بہت دلکش اور بھلی لگی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر اس کی بیٹی ہوتی تو اس وقت بالکل مریم جیسی ہوتی۔ زریاب جیسے نواسے کا اس نے البتہ کبھی سوچا ہی نہیں

تھا۔

"شاید نوجوان لڑکے ایسے ہی ہوتے ہیں۔" یہ سوچ کر وہ اپنے دل میں آئے محبت بھرے جذبات کی تشفی کرتی تھی۔

باربینہ سے بھی اسے محبت تھی لیکن وہ اپنے خاندانی پس منظر کے باعث ان کی عزت تو بہت کرتی تھی لیکن کبھی کھل کر بات نہیں کرتی تھی جیسے کسی بھی اچھے ملازمت پیشہ شخص کا رویہ ہوسکتا ہے۔ بیگم صدیقی کو اب اپنی زندگی میں کسی ایسے تعلق اور رشتے کی کمی محسوس ہوتی تھی جو اُن کے ساتھ برابری کی سطح پر بات کر سکے۔

خان فیملی اس کے بنگلے سے متصل انیکسی میں جلد ہی اپنے ساز وسامان کے ساتھ شفٹ ہو گئی۔ بیگم صدیقی کے بنگلے اور انیکسی کا گیٹ اور لان ایک ہی تھا۔ وہ باربینہ کے ساتھ جب پہلی بار ان کے پاس چائے اور دیگر لوازمات لے کر گئی تو ایک بار ٹھٹک کر رہ گئی۔

انیکسی میں تین بیڈروم تھے۔ صرف ایک استعمال میں لایا گیا تھا جبکہ باقی دونوں میں سامان اسٹور کر دیا گیا تھا۔ وہ کوئی مڈل کلاس سے متعلق ہوتے یا اگر جگہ دستیاب نہ ہوتی تو کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن تین تین بیڈروم ہوتے ہوئے بھی اسے ایک جوان لڑکے کا اپنی ماں کے ساتھ کمرا شیئر کرنا عجیب لگا تھا۔

بیگم صدیقی کی فطرت میں ہی اچھائی تھی اس لیے اس نے اس بات کو بھی ان کا نجی معاملہ سمجھ کر نظر انداز کرنا مناسب سمجھا۔ وہ دونوں اس کے ساتھ بااخلاق اور ہمدردانہ رویہ رکھتے تھے۔ سب سے اچھی بات اسے یہ لگی تھی کہ وہ اسے بوڑھی عورت سمجھ کر ہمدردی نہیں جتاتے تھے ورنہ اکثر لوگ تو بزرگوں کو بالکل ہی لاغر بچہ سمجھ کر عجیب سلوک شروع کر دیتے تھے۔

اگرچہ وہ اپنی بزرگی کی وجہ سے جسمانی طور کچھ کمزور ضرور ہوئی تھی لیکن چلنے پھرنے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ اسلام آباد کی سوشل لائف سے پوری طرح استفادہ کرتی تھی۔ اکثر تقریبات میں اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ کسی بھی ریسٹورینٹ میں کوئی ایسا ویٹر مل جاتا جو اس کے بڑھاپے کو نشانہ بناتا تو وہ اسے آڑے ہاتھوں لیتی تھی۔

ابتدائی دو ہفتوں میں مریم اور اس کا بیٹا مثالی کرائے دار ثابت ہوئے۔ چیزوں کا خیال کرنے والے اور اپنی مالک مکان کی عزت کرنے والے۔ وہ زیادہ شور کرنے والے بھی نہیں تھے اور اپنے کام سے کام رکھنا پسند کرتے تھے۔ بیگم صدیقی کی نیند کچی تھی اس لیے وہ اسی حوالے سے سب سے زیادہ پریشان تھی لیکن کرائے داروں کی خاموش فطرت پر خدا کا شکر ادا کر کے رہ گئی۔

بس یہی ابتدائی عرصہ سکون کا عرصہ تھا۔

پھر ان کا روز ہی آمنا سامنا ہونے لگا۔ پہلے پہل تو بیگم صدیقی کو یہی لگا کہ یہ ٹکراؤ اتفاقیہ ہو جاتا ہے لیکن بعد میں وہ شک میں مبتلا ہو گئی۔

وہ باربینہ کے ساتھ شاپنگ کر کے آتی تو مریم اسے گیٹ پر مل جاتی...... وہ کسی تقریب میں لنچ کر کے آتی تو زریاب اپنی ماں کے ساتھ لان میں کرسیاں ٹیبل سجا کر چائے پینے میں مصروف ہوتا اور اسے بھی اپنے ساتھ شامل ہونے کی دعوت دے دی جاتی...... کبھی کبھی تو وہ اسے اپنے بنگلے کے دروازے پر ہی مل جاتے اور بلا مقصد بات چیت شروع کر دیتے۔

بیگم صدیقی کو دیکھ کر ان کے چہرے کھل اٹھتے تھے اور وہ ہمیشہ اسے اپنے ساتھ بٹھا کر گپ شپ لگانے پر اصرار کرتے تھے۔ قصے، کہانیاں، لطیفے...... کیا نہیں تھا جو وہ اسے محظوظ کرنے کے لیے نہیں سناتے تھے۔ اس سب کے ساتھ ساتھ وہ بیگم صدیقی پر سوالات کی بوچھاڑ بھی کر دیتے تھے۔

"کہاں کہاں چندہ دیتی ہیں؟"
"کتنے فیملی ممبرز حیات ہیں؟"
"کوئی قریبی دوست؟"
"وکیل کون ہے؟"
"بزنس کے معاملات کون دیکھتا ہے؟"

ان سب سوالات کے دوران وہ اپنی امارت کا رعب جھاڑنا بھی نہیں بھولتے تھے کہ وہ بہت جلد ایک بہت بڑی سرمایہ کاری کرنے والے ہیں لیکن اپنے لیے کوئی اچھا پارٹنر تلاش کر رہے ہیں۔

"میں تو سمجھتا ہوں کہ پراپرٹی کا کاروبار ہی سب سے بہترین ہے۔" زریاب کسی رٹو طوطے کی طرح ایک ہی جملہ ایسے موقع پر کہہ دیتا تھا۔

"سانس بھی حلق میں اٹک جاتی ہے جب پراپرٹی کی قیمتیں گریں۔" بیگم صدیقی سوچ کر رہ جاتی تھی لیکن زریاب سے ایک بار بھی یہ کہا نہیں۔ وہ ہمیشہ سے ریٹائر بزرگ کی زندگی گزارتی ہوئی نہیں آئی تھی۔ اپنے شوہر کے ساتھ رہ کر اس نے زندگی اور بزنس کا خوب تجربہ کیا تھا۔

اسے کبھی کبھی تو لگتا تھا کہ شاید وہ اسے ٹھگنے کے لیے جال پھیلا رہے ہیں لیکن اب تک ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ مریم یا زریاب نے اسے سرمایہ کاری یا پارٹنرشپ کی پیشکش کی ہو۔ شاید وہ صرف اس کا تعلق استعمال کرتے ہوئے اسلام آباد کی ایلیٹ کلاس میں شمولیت کے خواہش مند تھے...... اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

ان کی حد سے بڑھی بے تکلفی اور بداخلاقی کی وجہ سے بیگم صدیقی بہت جلد ان سے بیزار ہوگئی۔ پہلی ملاقات کا جادو ایک ماہ میں ہی اتر گیا تھا۔

مریم کا قد بھی چھوٹا تھا لیکن بہرحال وہ بیگم صدیقی کے پانچ فٹ قد کے مقابلے میں چند انچ زیادہ ہی تھی۔ البتہ اس کی زبان کتنی دراز تھی اس کا اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا۔ وہ ہر موضوع میں اپنے مطلب کی بات شروع کر دیتی اور اگلے انسان کی بات کاٹنے میں بھی کوئی حرج محسوس نہیں کرتی تھی۔

''نہیں شکریہ......'' کا مطلب اس کی ڈکشنری کے بالکل الٹ تھا اور وہ اسے ''مزید سناؤ......'' کے مترادف سمجھتی تھی۔

زریاب اس دوران اکثر چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ سجائے رکھتا تھا جیسے اس نے کسی کا جھوٹ پکڑ لیا ہو۔ اپنے ڈیل ڈول کے ساتھ بالوں بھرے چہرے کی وجہ سے کبھی کبھی وہ کسی بھالو جیسا لگتا تھا۔ لطیفہ سنانے کے بعد وہ خود ہی ہنستا تھا اور اس کے لطیفے بھی تقریباً ناشائستہ ہی ہوتے تھے۔

مریم اور زریاب کو نظرانداز کرنا یا ان سے دور ہونے کی کوشش کرنا بیگم صدیقی کو مہنگا پڑ گیا جیسے کسی نے جلتی پر تیل ڈال دیا ہو۔ انہوں نے اپنی کوششیں مزید تیز کر دیں۔ مریم کچھ نہ کچھ کھانے کے لیے بنا کر پہنچ جاتی۔ باربینہ کا شوہر دانیال بنگلے پر جزوقتی مالی کا کام کرتا تھا، وہ بھی نجانے کیا کہہ کہلا کر زریاب نے اپنے ذمے لے لیا۔

بیگم صدیقی کو لگنے لگا تھا کہ جیسے وہ دونوں اس کے انتظار میں گیٹ کے پیچھے چھپے رہتے ہیں اور جیسے ہی وہ گھر سے باہر قدم رکھتی ہے، وہ چھلانگ کر باہر آجاتے ہیں۔ لیے لوکے اور نانی ماں کا انداز ایسا ہوتا تھا جیسے یہ کوئی اتفاقی ملاقات نہیں بلکہ پہلے سے طے شدہ کوئی میٹنگ ہو رہی ہو۔

بیگم صدیقی کی زندگی عذاب ہوتی جا رہی تھی۔ اگر گیٹ کے باہر سڑک پر مل جاتے تو بالکل جونک کی طرح چمٹ جاتے تھے۔

باربینہ اگر ساتھ ہوتی تو ان کے رویے پر ہکا بکا رہ جاتی لیکن بیگم صدیقی ہر جگہ شاپنگ پر اسے ساتھ لے کر نہیں جاتی تھیں۔ وہ کسی بھی بات کی پروا کیے بغیر خود ہی بنا دعوت کے پیچھے پیچھے گھس آتے تھے۔ بڑے مزے سے اندر داخل ہو کر وہ دونوں صوفے پر براجمان ہو جاتے۔ مریم بھی کافی اور کبھی چائے بنانے لگ جاتی اور زنانہ گفتگو کے ایک نہ ختم ہونے والے سلسلے کا آغاز کر دیتی۔

''کراچی شہر کے حالات خراب تھے...... شکر ہے یہاں ایسا نہیں ہوتا۔ لیکن پھر بھی احتیاط کرنی چاہیے۔''

''خدا کے لیے میری جان چھوڑ دو......'' بیگم صدیقی پھٹ کر یہ سب کہنا چاہتی تھی لیکن کہہ نہیں پاتی تھی۔

بیگم صدیقی کا ان کے حوالے سے سارا رومان ختم ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے وکیل اور رئیل اسٹیٹ ایجنٹ سے بات کی لیکن کرائے داری کا معاہدہ پکا تھا اور بغیر کسی وجہ کے وہ انہیں نکال نہیں سکتی تھی۔

معاملات مزید خراب ہونے لگے۔ زریاب اور اس کی ماں مریم اب جاتوں باتوں میں ایسی بات کر جاتے تھے جسے سن کر بیگم صدیقی کو خود پر قابو پانا مشکل ہو جاتا تھا۔ ان کے منہ سے کوئی ایسی بات پھسل جاتی تھی جو بیگم صدیقی کی نجی زندگی یا مالی معاملات سے متعلق ہوتی تھی...... اور ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہ تھی جو اس نے انہیں بتائی ہو۔ وہ حیران ہوتی تھی کیا یہ دونوں اب اس کی ڈاک چوری کر کے پڑھنے لگے ہیں؟ وہ اس کی جاسوسی کر رہے تھے۔

لیکن کیا وہ اس بات کو ثابت کر سکتی تھی؟

پولیس رپورٹ کا کیا فائدہ ہوتا؟

کیا اس معاملے کا کوئی حل ہے؟

پولیس کے پاس جاتی تو وہ اسے ایک خبطی بڑھیا اور پاگل مالک مکان سمجھ کر نظرانداز کر دیتے۔ وہ واقعی ان سے تنگ آگئی تھی۔

اور پھر ایک ایسا خوفناک واقعہ پیش آیا کہ یہ تنگی اور پریشانی خوف میں تبدیل ہوگئی۔

اس دن باربینہ چھٹی پر تھی...... بیگم صدیقی گروسری شاپنگ کر کے آئی تو مریم اور زریاب حسبِ توقع اسے لان میں ہی مل گئے۔ مریم نے اس کے ہاتھ سے بیگ لیے اور زریاب نے کمالِ مہربانی سے چابی لے کر اس کا دروازہ کھول دیا۔

بیگم صدیقی ان دونوں کی اس حرکت پر اس قدر بھونچکارہ گئی کہ ذرہ برابر بھی احتجاج نہ کر سکی...... لیکن اگر

احتجاج کر بھی لیتی تو ان چکنے گھڑوں پر اس کا اثر کہاں ہونا تھا۔

پندرہ منٹ تک وہ بیٹھے باتیں بگھارتے رہے...... چائے اور پانی وہ آج ساتھ ہی لائے تھے۔ بیگم صدیقی کو بھی پینے کی پیشکش کی لیکن اس کا موڈ خراب تھا تو اس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر اچانک ہی مریم نے اپنا جہازی سائز کا پرس اٹھایا اور بیگم صدیقی کے اوپری منزل والے بیڈروم کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

''ایکس کیوزمی۔ میں ذرا واش روم یوز کرلوں۔'' وہ جاتے ہوئے بولی تھی۔

''مریم...... یہ نیچے مہمانوں والا واش روم ہی یوز کرو...... اوپر جانے کی کیا ضرورت ہے؟'' بیگم صدیقی کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

آج اس نے پہلی بار کسی بات پر اعتراض کیا تھا اور اسے توقع نہیں تھی کہ بدلے میں اسے یہ ردِعمل دیکھنے کو ملے گا۔ چھ فٹ کا زریاب کھڑا ہوا اور کسی ہیبت ناک درندے کے مانند غرایا۔

''مما کو جو واش روم اچھا لگے گا وہ اس میں ہی جائیں گی۔ آپ چپ کر کے بیٹھ جاؤ مسز صدیقی۔''

بیگم صدیقی کو لگا کہ اس کا آخری دن آگیا ہے۔ زریاب کا وحشی پن ایسا تھا کہ جیسے وہ ان کو اپنے ہاتھوں سے پیٹ پیٹ کر ہی جان سے مار ڈالے گا۔ وہ سہم کر صوفے کے ایک کونے میں دبک گئی۔

زریاب ایسے ہو گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ ایک بار پھر کسی پراپرٹی کا ذکر کرنے لگا جو اس کے خیال میں سونے کی کان ثابت ہو سکتی تھی۔

مریم کسی بات کی پروا کیے بغیر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا چکی تھی۔

بیگم صدیقی بمشکل اپنے ہاتھوں کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے چائے کی چسکیاں لینے لگی۔ چائے کی پیشکش ٹھکرا دینے کے بعد اب اس نے قبول کر لی کہ کہیں زریاب پھر نہ غرانے لگ جائے۔ وہ اس کی باتوں پر بس اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔

مریم پندرہ بیس منٹ کے بعد واپس آئی...... اپنے بیٹے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا تو وہ کھڑا ہو گیا۔ دونوں بیگم صدیقی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہاں سے روانہ ہو گئے۔

بیگم صدیقی نے بھاگ کر دروازہ لاک کیا اور اپنے بیڈروم میں پہنچی۔ کافی تلاشی کے باوجود وہ کوئی خفیہ کیمرا یا ریکارڈنگ ڈیوائس تلاش نہ کر سکی۔ الماری کی اسے لگا جیسے تلاشی لی گئی ہو لیکن اس بات کو وہ مکمل یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتی تھی۔

کمرے کے سامان کے ساتھ زیادہ چھیڑ چھاڑ نہیں کی گئی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو بیگم صدیقی کے ساتھ بہت ہی برا ہوتا تھا...... اس کمرے کی خفیہ تجوری میں اس وقت ستر کروڑ کے لگ بھگ کیش اور جیولری موجود تھی۔

بیگم صدیقی نے وقتی طور پر اطمینان کا سانس لیا...... لیکن وہ سہم کر رہ گئی تھی۔ خان فیملی کی دست درازیاں اپنی حدیں پار کرنے لگی تھیں اور ایک خوف سا اس کے وجود میں اترنے لگا تھا۔

اس دن ہی بیگم صدیقی نے انہیں درندوں کا نام دیا...... ایک نر اور ایک مادہ۔

☆☆☆

لڑکی کی کم عمری اور معصومیت چہرے سے جھلک رہی تھی...... لیکن میک اپ نے جیسے اس کی عمر میں اضافہ کر دیا تھا۔ سبز رنگ کی ہائی نیک پہنے ہوئے وہ خوب صورتی کا پیکر لگ رہی تھی۔ براؤن بالوں میں مصنوعی گھونگھر ڈال کر اسٹائلنگ کی گئی تھی جبکہ سرخ و سپید رنگت پر بڑے سلیقے سے ہلکے پھلکے میک اپ کی تہ جمائی گئی تھی۔ اپنی ہلکی بھوری آنکھوں میں حیرت کا تاثر لیے وہ استعجاب سے سرخ لب کھولے ایک جانب دیکھ رہی تھی۔

یہ کسی تقریب کی تصویر تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس لڑکی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کی فوٹو بنائی جا رہی ہے کیونکہ وہ پوز دینے کے بجائے اپنی ہی کسی دھن میں مگن دکھائی دے رہی تھی۔

''یہ...... یہ بینہ کی فوٹو تمہارے پاس کیسے آئی؟'' باربینہ نے حیرت اور خوف کی ملی جلی کیفیت میں سوال کیا۔

جواب میں کسی خونخوار درندے جیسی ہنسی سننے کو ملی۔

اس گفتگو کا آغاز تھوڑی دیر قبل ہوا تھا جب باربینہ، بیگم صدیقی کے گھر کام کرنے کے لیے آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا بھی تھا جس میں ناشتہ وغیرہ کا سامان تھا۔ جنگل کے پاس والے ویران میدان کو پار کر کے جب وہ سنسان گلی میں پہنچی تو اپنے شٹل کاک برقع کو سر کے اوپر کر کے چہرہ نکال لیا۔

''تمہیں ڈکیتی کے بارے میں پتا چلا؟'' سوال سن کر ایک بار تو وہ اچھل پڑی۔

دبے قدموں وہ نجانے کہاں سے آیا تھا اور اچانک ہی سوال داغ دیا۔

"کہاں......؟ کس کے گھر ہوئی ڈکیتی؟" بارینہ کے ہاتھ سے تھیلا چھوٹ کر نیچے گر گیا۔

وہ زریاب کی اچانک آمد اور اس کے بعد اس بے خبری پر گھبرا ہی گئی تھی۔ اسے لگا کہ وہ بیگم صدیقی کے بارے میں کوئی منحوس خبر سنا رہا ہے۔ وہ ہنستے ہوئے جھکا اور تھیلا اٹھا کر اس کے حوالے کیا۔

"یہاں ساتھ والے سیکٹر میں کسی اکیلی عورت کے ہاں ہوئی ہے۔" وہ بولا۔ "ڈکیتوں نے گھر میں نقب لگائی اور اس عورت کے سارے کاغذات اور جیولری وغیرہ لے گئے ہیں۔"

"کاغذات؟" بارینہ حیرت سے بولی۔ "پیسوں کا تو سنا تھا لیکن کاغذات کون اٹھاتا ہے؟"

"پیسے اور جیولری نہ ہوں تو لوگ کاغذات ہی اٹھا لیتے ہیں۔" وہ بارینہ کو کسی ناسمجھ بچے کی طرح سمجھاتے ہوئے بولا۔ "مجھے تو اب تمہاری مالکن کی فکر کھائے جارہی ہے کہ کہیں اس کے ساتھ کچھ ایسا نہ ہوجائے۔"

"اللہ نہ کرے ایسا ہو۔" بارینہ بے ساختہ کہہ اٹھی۔

"ہاں......اللہ نہ کرے۔" زریاب کے لہجے میں طنز نمایاں تھا۔ "ویسے کیا تمہیں معلوم ہے کہ مسز صدیقی اپنے کاغذات وغیرہ کہاں رکھتی ہیں؟ کوئی تجوری وغیرہ ہے یا اپنی الماری میں ہی ایسی چیزیں سنبھال کر رکھتی ہے؟"

"نہیں...... میں نہیں جانتی۔" بارینہ اس کے ارادے سمجھ کر یکلخت ہی سخت لہجے میں بولی۔

"دیکھو......" زریاب کسی زہریلے سانپ کے مانند پھنکارا۔ "اگر تم نہیں بتاؤ گی تو میں مسز صدیقی کی حفاظت نہیں کر پاؤں گا۔ ایسے میں اگر ان ڈکیتوں نے مسز صدیقی کو لوٹ لیا تو وہ اپنی ساری دولت سے محروم رہ جائیں گی۔ اور دولت ہی نہیں ہوگی تو تمہیں وہ نوکری پر بھی نہیں رکھ پائیں گی۔"

"تو......؟" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔

"تو یہ کہ شہرینہ اور شہروز کو واپس سرکاری اسکول میں جانا پڑے گا۔" زریاب زہریلی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ "اور زرینہ کو اپنے آرٹس کالج سے چھٹی کرنا پڑے گی۔"

"تم ......تم میرے بچوں اور ان کے سکولوں کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟" بارینہ کی آنکھیں زریاب کی معلومات پر پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں کیونکہ اس نے باقاعدہ کالج کا نام لے کر یہ سب کہا تھا۔

یہ وہ لمحہ تھا جب زریاب نے اپنے اسمارٹ فون کی اسکرین پر بارینہ کو اس کی بیٹی زرینہ کی تصویر دکھائی۔ یہ کالج کی ویلکم پارٹی کی فوٹو تھی جس میں وہ اپنی ماں سے ضد کرکے باقاعدہ بیوٹی پارلر سے تیار ہوکر گئی تھی۔

"میں جانتا ہوں کہ مسز صدیقی کے کہنے پر ہی اسے کالج میں داخل کروایا گیا ہے اور تمہارے بچوں کی تعلیم کا خرچہ بھی وہی اٹھا رہی ہیں۔" زریاب نے مزید انکشافات کیے۔ "اگر ایسے میں تم تعاون نہیں کروگی تو خسارے میں ہی رہوگی اور یہ نقصان تمہاری اولاد تک بھی پہنچ سکتا ہے۔"

"تم بکواس کر رہے ہو......" بارینہ کی پٹھانی غیرت نے جوش مارا۔ "زرینہ کے باپ کو پتا چلا تو وہ تمہاری جان لے لے گا۔"

"ہاہاہا......" زریاب نے ایک قہقہہ لگایا۔ "وہ کام چور شخص، بیوی کی کمائی کھانے والا۔ میرا کیا بگاڑ لے گا؟ وہ تو میری ایک دھمکی کے بعد کبھی مسز صدیقی کے لان میں کام کرتے ہوئے بھی نظر نہیں آیا۔"

بارینہ اب تھوڑی خوفزدہ ہوگئی۔ وہ وجہ نہیں جانتی تھی لیکن پچھلے کچھ عرصے سے دانیال نے واقعی بیگم صدیقی کے ہاں کام پر آنا بند کردیا تھا۔

"میرے ساتھ تعاون کرو...... اگر تمہیں کسی تجوری کا علم نہیں بھی ہے تو پتا کرو۔" زریاب نے گھٹیا انداز میں دھمکی دی۔ "ورنہ تم تو شاید برداشت کر جاؤ لیکن یہ تمہاری خوبصورت زرینہ برداشت نہیں کر پائے گی۔"

بارینہ خوف کے مارے سر ہلاتے ہوئے وہاں سے ہٹ گئی۔ سامان کا تھیلا پکڑ کر بنگلے کی جانب جاتے ہوئے اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ بیگم صدیقی کی مہربانیوں سے وفا کرے یا اولاد کی خاطر سب کچھ داؤ پر لگا دے۔

☆☆☆

وقت نے یہ بات ثابت کی ہے کہ غاصب ہی سب سے بڑے ظالم ہوتے ہیں۔

کسی کو اپنی ملکیت پر قبضہ کرنے سے نہ روکا جائے تو پھر ان کے لالچ کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا اور نہ ہی کوئی انتہا۔ پھر وہ اپنے اس لالچ میں کسی پر بھی ظلم کرنے سے باز نہیں آتے ہیں۔

بیگم صدیقی سے عمر میں پندرہ سال بڑا شوہر چار سال قبل دنیا چھوڑ گیا تھا اور اب وہ نہیں جانتی تھی کہ اس نے مزید کتنا وقت اس دھرتی پر گزارنا ہے۔ وہ باقی ماندہ زندگی

جھمیلوں سے دور رہ کر گزارنا چاہتی تھی لیکن ان درندوں نے سارا سکون غارت کر دیا تھا۔

کسی وائرس کی طرح وہ اس کی زندگی کا حصہ بنے تھے اور خوشی کا ہر لمحہ کھا گئے۔ بے فکری کے عالم میں وہ کھاتی پیتی تھی، صدقہ خیرات کرتی، لوگوں کی ہر طرح کی مدد کرنا اس کی فطرت تھی اور اسے یہ سب کر کے دلی اطمینان و سکون ملتا تھا۔

یہ سب کچھ فنا ہو کر رہ گیا تھا۔

اس دن کے خوفناک واقعے کے بعد سے وہ اب یہ سب کچھ کرنے کے بجائے اس فکر میں رہتی تھی کہ درندے مزید اس کے خلاف کیا کرنے والے ہیں؟

بیگم عائشہ صدیقی نے ایک بھرپور زندگی گزاری تھی۔ اولاد نہ ہوئی تو اس کے شوہر نے اس بات کو اپنی اور اس کی زندگی کا روگ نہیں بننے دیا تھا۔

اسے کبھی بھی ان معاملات کی پروا نہیں رہی تھی اس لیے دونوں میاں بیوی اکیلے رہنا پسند کرتے تھے۔ اسلام آباد کی پُرسکون فضاؤں میں اپنی حفاظت کا ایسا بندوبست کرنے کی کبھی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی تھی جس میں وہ چاروں جانب گارڈز کے گھیرے میں رہیں۔

پاکستان کی ترقی اور اتار چڑھاؤ اس نے سب دیکھے تھے۔ امریکا کی شاہراؤں سے لے کر نیوزی لینڈ کے جزائر تک اس نے سیاحت کی ہوئی تھی۔ اگرچہ اب اس کے شوہر کا ہوٹل بزنس ایک بورڈ آف ڈائریکٹرز چلاتا تھا جو ہر ماہ لاکھوں کا منافع اس کے اکاؤنٹ میں بھیجتا تھا لیکن ایک عرصے تک وہ اپنے شوہر کے ساتھ خود بھی ان بورڈ ممبرز میں سے ایک رہی تھی۔ ریٹائر ہونے کے بعد اس نے ایک اپنی آمدن کا ایک بڑا حصہ یتیم خانوں اور بیواؤں کو بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ بزنس کے دوران اس نے اپنے کئی مخالفین کو زیر کیا تھا اور اس کا شوہر شاہد صدیقی اکثر اس کی معاملہ فہمی کی تعریف کیا کرتا تھا۔

اس فطرت کے ساتھ جب وہ مریم اور زریاب کے زیرِ اثر آئی تو اپنے گھر کے کمرے تک ہی محدود ہو کر رہ گئی۔

''ان درندوں کو آخر کس نے اس کی راہ پر لگا دیا تھا؟'' اس نے پریشان ہوتے ہوئے سوچا۔ ''لیکن میں ان کے خلاف ایسا کیا کروں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے؟''

ارادے تو اس کے مضبوط تھے لیکن جسمانی لحاظ سے اب وہ ایسی نہیں رہی تھی کہ خود سے ان درندوں کے خلاف کچھ کر سکتی۔ وہ اپنی سوچوں میں کھوئی تھی کہ مرکزی دروازے میں چابی لگنے کی آواز سے چونک اٹھی۔

''انہوں نے ڈپلیکیٹ بھی بنوالی؟'' خوف کی ایک لہر اس کے بدن میں دوڑ گئی۔

باربینہ کو سامان کا تھیلا اٹھائے اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس نے سکون کی سانس لی...... لیکن پھر چونک کر رہ گئی۔

'باربینہ کی آنکھوں میں آنسو ہیں؟' اس نے پریشان ہو کر سوچا۔

''پھر تو دانیال سے کسی بات پر جھگڑا نہیں ہو گیا؟'' بیگم صدیقی نے اندازہ لگانے کے بجائے براہِ راست ہی پوچھنا مناسب سمجھا۔

''نہ...... نہیں ایسا کچھ نہیں۔'' باربینہ تیزی سے بولی۔

''اچھا اچھا...... ٹھیک ہے۔'' بیگم صدیقی اتنی جلدی انکار پر کچھ سوچنے کے بعد اسے دلاسا دیتے ہوئے بولی۔ ''لیکن جو بھی بات ہے، وہ بتاؤ مجھے۔''

باربینہ کچھ بتانے کے بجائے بیگم صدیقی سے نظریں چراتے ہوئے تھیلے سے سامان نکال کر کچن میں رکھنے لگی۔ دو انڈے ٹوٹ گئے تھے...... اور یہ دیکھ کر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

''میرے خیال میں انڈے ٹوٹنے پر تمہیں اتنا دکھ تو نہیں ہونا چاہیے؟'' بیگم صدیقی نے کہا۔

''کچھ بھی نہیں ہوا۔'' باربینہ نے ایک بار پھر نظریں چراتے ہوئے کچن کی کھڑکی سے انیکسی کی جانب پریشانی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

بیگم صدیقی پر اچانک ہی انکشاف ہوا کہ باربینہ کے آنسو کسی گھریلو جھگڑے کا نتیجہ نہیں ہیں۔ اس کی بے چینی کی وجہ بھی 'درندے' ہی ہیں۔

''کون سا درندہ تھا...... ؟ نر یا مادہ؟'' بیگم صدیقی نے اچانک پوچھا۔

''زر......'' باربینہ کہتے کہتے گڑبڑائی۔ وہ جانتی تھی کہ بیگم صدیقی نے کسے درندوں کا لقب دے رکھا ہے۔ ''کوئی نہیں۔''

بیگم صدیقی سمجھ گئی کہ باربینہ کو بہت زیادہ ڈرایا دھمکایا گیا ہے۔ ''مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟ میرے ہوتے ہوئے وہ تمہارا بال بھی بانکا نہیں کر سکتے۔''

''یہی تو فکر ہے بیگم صاحبہ......'' باربینہ بالآخر پھٹ پڑی۔ ''مجھے کچھ کہہ دیتے تو پروا نہیں تھی۔ وہ تو آپ جیسی

نیک اور فرشتہ عورت کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور اس کے لیے میرے بچوں کو نقصان......"

وہ کہتے کہتے پھر رو پڑی تھی۔ بیگم صدیقی نے اس کے قریب آ کر تھپکیاں اور تسلی دی۔ پانچ فٹ کی ایک بڑھیا لمبی چوڑی باربینہ کو تسلی دیتی عجیب تو لگ رہی تھی لیکن اس کی شخصیت میں کچھ ایسی بات تھی کہ باربینہ نے ایک سکون سا اپنے سینے میں پھیلتا ہوا محسوس کیا۔

اس نے الف سے ے تک ساری کہانی بیگم صدیقی کو سنادی کہ کس طرح سے زریاب نے اس کا راستہ روک کر دھمکیاں دی ہیں۔ اس نے چند دن پہلے اپنا تعاقب ہونے والا واقعہ بھی اس کے گوش گزار دیا۔ بیگم صدیقی اس دوران اسے ٹشو پیپر تھماتی رہی تا کہ وہ اچھی طرح رو دھو کر اپنے دل کی بھڑاس نکال سکے۔

زریاب جیسے جانور کا سامنا کرنا آسان بات نہیں تھی اور باربینہ تو تنہا یہ سب سہہ کر آئی تھی۔ "اس کے سوا تو اور کچھ نہیں کہا؟"

باربینہ نے انکار میں سر ہلا دیا۔ "آپ ان لوگوں کو نکال کیوں نہیں دیتیں یہاں سے؟"

"کاش یہ اتنا آسان ہوتا۔" بیگم صدیقی نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "پاکستان میں قانونی طور پر کچھ کرنا آسان نہیں ہوتا...... اور اس کام کے لیے میں غنڈے نہیں بلانا چاہتی ہوں۔"

"اس نے میری بیٹی کے بارے میں بھی بہت غلط باتیں کی ہیں۔" باربینہ کی آنکھیں پھر بھیگ گئیں۔ "اس معصوم کا کیا قصور ہے؟"

بیگم صدیقی نے اسے نیا ٹشو پکڑاتے ہوئے کہا۔ "تم میرے شوہر کو تو جانتی تھیں نا باربینہ؟"

"ہاں...... ان کے آخری دنوں میں ہی آپ نے مجھے اپنے ہاں ملازم رکھا تھا۔" باربینہ نے جواب دیا۔

کئی بار منع کرنے کے باوجود باربینہ خود کو ملازم کہتی تھی تو بیگم صدیقی کو اچھا نہیں لگتا تھا لیکن انہوں نے اسے ٹوکنے کے بجائے اپنی بات آگے بڑھائی۔

"ان کے ساتھ میں نے دنیا جہان کی سیر کی ہے...... ایک بار ہم ملائشیا گئے تھے اور وہاں ایک 'نیچر ریزرو' دیکھا۔ یہ ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں ہر قسم کا چرند پرند کسی بھی قسم کی انسانی دراندازی کے بغیر آزادی سے رہتا ہے۔ وہاں ہمیں ٹورسٹ گائیڈ نے ایک تتلی دکھائی تھی۔ اس کا نام 'اٹلس موتھ' ہوتا ہے اور اس کے پر آٹھ انچ تک پھیلے ہوتے ہیں۔"

"اتنی بڑی تتلی......؟" باربینہ نے آنکھیں پٹ پٹائیں...... اسے سمجھ نہیں آیا تھا کہ بیگم صدیقی یہ کہانی کیوں سنا رہی ہیں۔

"ہاں...... اتنی ہی بڑی...... لیکن پھر وہ ہوتی تو ایک تتلی ہی ہے۔ پرندوں اور سانپوں سے اسے بچنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوتا ہے۔ تو قدرت نے اسے ایک صلاحیت دی ہے...... اس کے پروں پر ایسے نشان ہوتے ہیں کہ وہ مخصوص انداز میں جب اپنے پنکھ پھیلاتی ہے تو ایسا لگتا ہے دو کوبرا سانپ بیٹھے ہوں۔ شکاری درندے اسی خوف میں رہ جاتے ہیں کہ وہ تتلی کا شکار کریں یا پھر سانپوں سے خود کو ڈسوالیں جو پھن پھیلائے بیٹھے ہیں۔"

"سچ میں......؟" باربینہ واقعی حیران رہ گئی۔

"ہاں باربینہ...... بس اسی کشمکش و پیچ میں کوئی اس تتلی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔" بیگم صدیقی نے کہا۔ "مجھے بھی اب کچھ ایسا ہی کرنا پڑے گا کہ یہ درندے مجھ سے خوفزدہ ہو کر میرا پیچھا چھوڑ دیں۔"

"یہ سب آپ کیسے کریں گی؟" باربینہ نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ تم مجھ پر چھوڑو......" بیگم صدیقی نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ "آؤ میں تمہیں دکھاؤں میرے بھانجے احمد فریدی نے میرے لیے کیا بھیجا ہے؟"

"پھول بھیجے ہوں گے ہر بار کی طرح۔" باربینہ نے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔

"نہیں...... اس بار تحفے میں لیٹسٹ آئی فون بھیجا ہے۔ تم جانتی ہو میں تو ان اسمارٹ فونز کی اتنی عادی نہیں ہوں لیکن یہ کمال کا فون ہے...... اس میں خفیہ ریکارڈنگ کی سہولت بھی ہے۔ مجھے اب ان درندوں نے کچھ کہا تو میں سب ریکارڈ کرلوں گی۔"

"اوہ...... بیگم صاحبہ آپ پولیس کو بتا دیں...... آپ خود کہاں انہیں سنبھالیں گی؟" باربینہ کے لہجے میں تشویش کا عنصر تھا۔ "آپ سے بھاگ بھی گئے تو وہ کسی اور معصوم کے درپے ہو جائیں گے۔"

"جنگل میں تو تتلی نے بس اپنی جان بچانی ہے......" بیگم صدیقی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "باقی جنگل اپنا آپ خود سنبھالے گا۔"

باربینہ جب گھر واپس گئی تو اسے بیگم صدیقی کی باتوں سے بڑا حوصلہ ملا تھا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ کاتب

تقدیر نے قسمت میں کیا لکھا ہے؟

اس بات کو ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ اسے یہ پتا چلا کہ درندوں نے ایسا حملہ کیا ہے جس میں بیگم صدیقی کی لاش تک نہیں ملی۔ اپنی پوری کوشش کے باوجود وہ بیگم صدیقی کو نہیں بچا پائی تھی۔

شاید درندے جان گئے تھے کہ یہ بڑھیا سانپ نہیں بس ایک معمولی بے بس تتلی ہے۔

☆☆☆

ایک سال بعد......

''تو آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کے لیے کسی کو تلاش کروں؟ کوئی بندہ کھو جانے کا کیس ہے؟'' نجم جنجوعہ نے بمشکل اپنی ڈکار روکتے ہوئے کہا۔ سحری میں حلق تک ٹھونس لینے کے بعد اسے اکثر یہ شکایت ہو جاتی تھی۔

''بندہ نہیں ہے؟'' جواب آیا۔

''اوہو...... بندہ نہیں ہے تو عورت ہوگی۔'' نجم نے اپنی سمجھداری کا مظاہرہ کیا۔

''عورت تو ہے لیکن نہیں ہے......'' سامنے بیٹھی خاتون نے اپنی چادر ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا بات ہوئی؟'' نجم نے ایک ابرو اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''عورت ہے لیکن زندہ نہیں ہے...... اس کی لاش کو تلاش کرنا ہے۔'' خاتون جو کہ باربینہ تھی نے اپنی بات سمجھائی تو نجم جیسے تڑپ کر رہ گیا۔

''واہ...... یہ تو کسی ناول کا نام ہونا چاہیے...... 'لاش کی تلاش'۔'' نجم نے ایک مشہور جاسوسی رائٹر کا ڈائیلاگ استعمال کیا لیکن باربینہ کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

نجم دل مسوس کر رہ گیا۔ وہ کسی بھی ناول کے ڈائیلاگ یا رائٹر کا حوالہ دیتا تھا تو معدودے چند لوگ ہی ردِ عمل دیتے ورنہ بیشتر کو اس کی بات کوئی بونگی ہی لگتی تھی۔ اسی وجہ سے اس نے فلمیں دیکھنے کا شوق اپنا لیا تھا۔ تھوڑے ہی سہی لیکن کم از کم انڈین ہیروز کے سستے ڈائیلاگ سن کر لوگ اس کا مدعا سمجھ تو جاتے ہی تھے۔

''آپ میت کہہ لیں...... لیکن اسے لاش نہ کہیں مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔'' باربینہ نے کہا تو نجم ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

نجم جنجوعہ کے دفتر میں باربینہ جب آئی تھی تو وہ اسے بڑی گھریلو قسم کی خاتون لگی...... کسی مڈل کلاس گھرانے کی عورت جو کہیں باہر جانے کے لیے نسبتاً قیمتی لباس خرید کر پہن تو لیتی ہے، لیکن زیادہ وقت اسے سنبھالنے میں لگا دیتی ہے۔

اسے اس عمر کی خواتین پسند تھیں لیکن اس خاتون کا گھریلو پن دیکھ کر وہ نظر بازی سے باز رہا تھا۔ کچھ اثر رمضان کا بھی تھا جس کی وجہ سے اس نے 'آنکھیاں' دیکھ کر آنکھیں سینکنے سے توبہ کی ہوئی تھی۔

چادر میں لپٹی ہوئی وہ خود کو اور اپنی چادر کو بمشکل سنبھال رہی تھی جیسے اسے اس کا استعمال کرتے ہوئے زیادہ وقت نہ ہوا ہو۔ جب اس نے کھوئی ہوئی چیز تلاش کرنے کا مدعا بیان کیا تھا تو اس کی توجہ نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔

البتہ اب ایک لاش کا ذکر سن کر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس کی سنسنی پسند طبیعت میں جوش و جذبہ آ گیا تھا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ کوئی شاندار کیس ہاتھ لگنے والا ہے۔

وہ اپنے آئی پیڈ پر اس میچ کی جھلکیاں دیکھ رہا تھا جس میں اس نے بھی دو لاکھ کی بازی ہاری تھی۔ غیر متوقع طور پر ناک آؤٹ راؤنڈ میں اسلام آباد کی ٹیم نے پشاور کی ٹیم کو چت کر دیا تھا۔

اب اسے پیسوں کی ضرورت تھی اور کلائنٹ چاہے گھریلو ہو یا پروفیشنل اسے اپنی فیس سے مطلب تھا۔

''کچھ مزید بتائیں گی اس بارے میں مسز خان......''

اس نے اس طرح کہا جیسے نام بھول گیا ہو۔

''باربینہ خان......''

''روبینہ......''

''نہیں...... باربینہ۔''

''بار...... بی...... نا۔'' نجم نے اس کے نام کے ٹکڑے کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کسی لاش کا ذکر کر رہی تھیں۔''

''میری رفیق...... میری ہمدرد...... میری مالکن۔'' باربینہ کے لہجے میں رنجیدگی در آئی تھی۔

نجم جنجوعہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔ اس قسم کے گھریلو کلائنٹ مالی طور پر بہت فائدہ مند ثابت نہیں ہوتے تھے لیکن اس کی جواری فطرت نے ایسے کیسز کے لیے 'کھیل تماشا' کی اصطلاح گھڑ رکھی تھی۔ عموماً ایسے کیسز میں کوئی نہ کوئی ایسا پیچیدہ کھیل ہوتا تھا جو بھرپور تماشے کا سبب بنتا تھا۔

''تقریباً ایک سال پہلے میں نے اپنی ہمدرد دوست کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دیا۔'' باربینہ بولی۔

''مجھے دلی افسوس ہے۔'' نجم نے روایتی انداز میں تعزیت کی۔ آئی پیڈ کو اس نے سلیپ موڈ پر ڈال دیا۔

''یہ دیکھیں......'' باربینہ نے اپنے تھیلے نما پرس سے کاغذات کا ایک پلندہ نکالتے ہوئے کہا۔

ان میں اخبارات کے تراشے اور کمپیوٹر پرنٹ آؤٹ شامل تھے۔ وہ ترتیب سے انہیں نجم کی آفس ٹیبل پر سجانے لگی۔

''یہ سب کیا ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''بیگم عائشہ صدیقی کے قتل پر شائع ہونے والی خبریں۔''

نجم جنجوعہ نے عقابی نگاہوں سے ان اخباری تراشوں کا جائزہ لیا۔ عائشہ صدیقی ایک بزرگ خاتون تھی جو ماں بیٹے کی جوڑی کے ہاتھوں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ ایک خاتون نے اس کیس میں گواہی دی تھی جو اس کے سامنے براجمان تھی...... باربینہ خان جو کہ بیگم صدیقی کی گھریلو ملازمہ تھی اور اس کا شوہر دانیال خان بھی مالی کے طور پر کام کرتا تھا۔

''آپ یہ سب تفصیل سے دیکھیں۔ پھر آپ کو سمجھ آجائے گا میں کیا چاہتی ہوں؟'' باربینہ نے اعتماد سے کہا۔

نجم کا کلائنٹ کے ساتھ ابتدائی سیشن بغیر فیس کے ہوتا تھا اور وہ کیس ہاتھ میں لیتے ہوئے کوئی جلدی نہیں کرتا تھا۔ لیکن یہ سب دیکھ کر اس کے خون کی گردش تیز ہوگئی۔ یہ سارا کھیل ایسا تھا جو زبردست تماشا بن سکتا تھا۔ اس کی خواہش کے عین مطابق...

☆☆☆

فائنل میچ ختم ہونے کے باوجود اسٹیڈیم تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہارنے والی ٹیم کے کپتان کو میدان کے وسط میں نیم برہنہ کرکے لکڑی کے ستونوں سے باندھا گیا تھا۔ وہ اس وقت صرف پتلون پہنے ہوا تھا اور ہاتھوں کو اوپر کرکے باندھے جانے کی وجہ سے اس کے چہرے پر اذیت نمایاں تھی۔ جیتنے والی ٹیم کا کپتان ہنٹر لے کر نمودار ہوا تو اسٹیڈیم اس کے نام کے نعروں سے گونج اٹھا۔

''بڑے خوش تھے تم کہ اس بار تو فائنل جیت ہی جاؤ گے؟'' جیتنے والا کپتان بولا۔ ''لیکن تمہاری قسمت میں ہی فائنل ہارنا لکھا ہے۔ اب بھگتو اپنی سزا۔''

یہ کہتے ساتھ ہی اس نے کپتان کی پشت پر ہنٹر برسانے شروع کردیے۔ ہارنے والا کپتان درد کے مارے چیخنے لگا اور عوام خوشی کے مارے تالیاں بجا رہی تھی۔

نجم جنجوعہ اپنے پسندیدہ کھلاڑی کے ساتھ ہونے والا یہ ناروا سلوک دیکھ کر برداشت نہ کرسکا۔

''بند کرو یہ تماشا۔'' وہ ہاتھ میں تلوار لے کر نمودار ہوا۔

وہ اس وقت مشہورِ زمانہ فلم 300 کے کردار لیونائڈس کے حلیے میں تھا۔ البتہ اس جیسے تراشیدہ جسم کا حامل نہ ہونے کی وجہ سے اس نے ایک دھاری دار کرتہ پہن رکھا تھا جو اس کے دبلے بدن پر لہرا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ گھمسان کا رن پڑتا اس کی آنکھ کھل گئی۔

نجم جنجوعہ دبلا پتلا تھا لیکن بے وقت کھانے کی وجہ سے اس کا تھوڑا سا پیٹ باہر نکل آیا تھا۔ سحری کے وقت اس نے تین پراٹھوں کو چکن چنے اور دو عدد آملیٹ کے ساتھ نمٹایا تھا اس لیے وہ بدہضمی کا شکار بھی ہوگیا تھا۔

اسی بدہضمی کی وجہ سے اب وہ اپنے خواب پر شرمندہ ہو رہا تھا۔ رات اس نے ایک بار پھر مقامی کرکٹ لیگ کی ایک ٹیم پر پیسے لگا دیے تھے۔ ملتان کی ٹیم کی اسلام آباد سے فائنل میں شکست پر وہ دل مسوس کر رہ گیا تھا۔ اس کی پسندیدہ ٹیم ایک بار پھر فائنل ہار گئی تھی حالانکہ اسے پورا یقین تھا کہ اس بار وہی جیتیں گے۔ پسندیدہ ٹیم کے ہارنے کا صدمہ جو تھا سو تھا، اسے اپنے سات لاکھ مزید ڈوبنے کا دکھ زیادہ تھا۔

''یہ انہوں نے رمضان میں میچز رکھ کر زیادتی کی ہے...... میں اپنی ساری شرطیں ہار رہا ہوں۔'' اس کے ذہن میں سوچ آئی۔ ''شاید ربّ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ میں حرام کی کمائی کھاؤں۔''

دوپہر کا وقت ہو رہا تھا، شرمسار سا ہو کر وہ بستر سے اٹھا اور وضو کرکے نماز ادا کی۔ اس نے آفس ایک ایسی جگہ پر لیا تھا جو راولپنڈی اور اسلام آباد کا سنگم کہلاتی تھی۔

آفس کے ساتھ متصل کمرے کو ہی اس نے اپنا بیڈروم بنا لیا تھا۔ اس کی فیملی کشمیر سے تھی لیکن اب سب اسلام آباد میں ہی رہتے تھے۔ وہ گھر والوں سے تنگ تھا اور گھر والے اس سے اس لیے اس نے اپنی رہائش الگ کرلی تھی۔ تیکنیکی اعتبار سے وہ ابھی تک 'کنوارا' ہی تھا۔

کورٹ سے باہر آنے کے بعد وہ اپنا حلیہ یکسر تبدیل کرلیتا تھا۔ جینز کے ساتھ شرٹ میں وہ اکثر یہی گنگناتا رہتا تھا...... 'ابھی تو میں جوان ہوں۔' آج بھی اس نے گہری نیلی جینز کے ساتھ ہلکی نیلی شرٹ پہن کر خود کو کالج بوائے بنانے کی کوشش کی تھی۔

بار بینہ دو دن پہلے اسے جو مواد فراہم کر کے گئی تھی، وہ تقریباً اس نے سارا دیکھ لیا تھا۔ اسے یہ پڑھ کر افسوس ہوا تھا کہ بیگم صدیقی نے ایک بھرپور زندگی گزارنے کے بعد آزادی سے ایک گوشے میں زندگی گزارنے کی کوشش کی تھی اور اسے زریاب اور مریم جیسے درندوں نے برباد کر کے رکھ دیا۔

"لعنت ہو ان جنگیوں پر......" اسے اس بات پر زیادہ غصہ آیا کہ انہوں نے ایک ہتھوڑے سے ضربیں لگا کر بیگم صدیقی کو مارا...... اس کی لاش کو ایک کوڑا اکٹھا کرنے والے پلاسٹک بیگ میں لپیٹا اور پھر کسی نامعلوم مقام پر دفنا دیا۔

اخباری تراشوں کے خلاصے کے مطابق ایک کرکٹ میچ پر ملاقات کے بعد مریم خان اور زریاب خان نے بیگم صدیقی کو اپنے جال میں پھنسایا اور اس کے ہی گھر میں اس کی زندگی اجیرن کر دی۔ اکیلی امیر خاتون آسان شکار ثابت ہوئی۔ تین ماہ تک انہیں برداشت کرتے رہنے کے بعد وہ آخر ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔ اس نے ان کی دھمکیوں کو فون کے ذریعے ریکارڈ کرنے کی کوشش کی اور پکڑی گئی۔ انہوں نے زبردستی اس سے ایک معاہدے پر دستخط کرائے جس میں اس کی کروڑوں کی جائداد کوڑیوں کے مول اپنے نام کروائی تھی۔ آخر میں انہوں نے ایک الیکٹرک ٹیزر کی مدد سے بیگم صدیقی کو بے بس کیا اور ہتھوڑے کے وار کر کے ختم کر دیا۔

بار بینہ جب اگلے دن کام پر آئی تو اپنی مالکن کو لاپتا پایا۔ اسے حالات سے واقفیت تھی اس لیے اس نے فوراً پولیس کو کال کی اور زریاب و مریم کے بارے میں سب بتا دیا۔ ان دونوں کے خلاف جب پولیس نے تفتیش کا آغاز کیا تو پتا چلا کہ وہ کراچی اور اس سے قبل لاہور میں بھی اس قسم کی وارداتیں کر چکے تھے لیکن کوئی انہیں 'خان فیملی' کے نام سے شناخت نہیں کر پایا تھا۔ پولیس نے سرچ وارنٹ لے کر جب ایجنسی کی تلاشی لی تو وہاں سے بہت سے ایسے شواہد ملے جن سے انکار کرنا ناممکن تھا۔

ایک الیکٹرک ٹیزر ملا جس میں بیگم صدیقی کی کھال پھنسی ہوئی تھی...... ایک ہتھوڑے پر اس کے بال اور خون تھے جبکہ دستے پر زریاب کے فنگر پرنٹس...... ایک ٹیپ پر مریم اور بیگم صدیقی دونوں کے ڈی این اے ملے۔ ایک گاربیج بیگز کا رول بھی ملا جس میں سے تین بڑے پلاسٹک بیگ غائب تھے۔

راولپنڈی کی ایک سیکیورٹی میٹریل فراہم کرنے والی شاپ کے مالک نے تصدیق کی۔ الیکٹرک ٹیزر اس کی دکان سے زریاب نے ہی کیش دے کر خریدا تھا۔

آئی ٹی فرانزک والوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ بیگم صدیقی کے بینک اکاؤنٹ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی گئی ہے اور اس کے لیے زریاب نے اپنا لیپ ٹاپ استعمال کیا تھا۔ پولیس والوں کو بیگم صدیقی کے گھر سے چالیس کروڑ کی جیولری کی انشورنس کے کاغذات ملے تھے۔ ان میں سے دو نیکلیس مریم کے جیولری باکس سے برآمد ہوئے جبکہ باقی زیورات کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

الیکٹرونک میڈیا کے ساتھ ساتھ سوشل میڈیا پر بھی اس کیس کا بہت چرچا کیا گیا۔ عدالتی کارروائی بہت تیزی سے مکمل ہوئی تھی۔ عدالت میں جب وکیل صفائی نے الزام کی صحت سے انکار کرتے ہوئے یہ کہا کہ ڈکیتوں کی کارروائی ہو سکتی ہے یا بیگم صدیقی خبطی تھیں اور بس پکڑ کر کہیں نکل گئی ہوں گی تو جج کو بہت غصہ آیا۔

جج نے واقعاتی شہادتوں کو اہمیت دی لیکن لاش نہ مل سکنے اور زریاب کے جسمانی ریمانڈ کے باوجود جائے تدفین کے حوالے سے کوئی بھی معلومات فراہم کرنے سے انکاری ہونے کی بنا پر سزائے موت دینے سے گریز کیا۔

ماں بیٹے دونوں کو جب عمر قید کی سزا ہوئی تو دونوں گلے لگ کر خوب روئے تھے۔ اس موقع پر کسی نے ان کی ویڈیو بنا کر سوشل میڈیا پر اپ لوڈ کر دی تھی جو کانٹیکسٹ کے بغیر دیکھنے والوں میں وائرل ہو گئی تھی۔

"مجھے امید تھی کہ پولیس بیگم صدیقی کی لاش ڈھونڈ لے گی لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔" بار بینہ نے کہا۔

وہ اس وقت نجم جنجوعہ کے آفس میں ایک بار پھر موجود تھی اور اخباری تراشوں کا حوالہ دے رہی تھی۔

ٹول پلازا والوں کے مطابق زریاب کی کار اسلام آباد کے مضافات میں بیگم صدیقی کے قتل سے چند دن پہلے دیکھی گئی تھی۔ پولیس کو شبہ تھا کہ لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے ایسی ہی کسی جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا۔ زریاب کے مطابق وہ وہاں پر پلاٹ دیکھنے گیا تھا لیکن کسی نے اس بات کا اعتبار نہیں کیا کیونکہ وہ ایک نیم دلدلی علاقہ تھا۔

"وہ اپنی ذات میں زیادہ مذہبی نہیں تھیں لیکن وہ جس طرح سے غریبوں کی امداد کا کام کرتی تھیں، وہ قابل رشک تھا۔ رمضان شروع ہوتے ہی مجھے رہ رہ کر ان کا خیال آنے لگا کہ وہ کیسے غریبوں کی مدد کرتی تھیں۔ اب ان کا بھی حق بنتا

ہے کہ ان کی ایک قبر ہو جہاں لوگ فاتحہ خوانی کے لیے جا سکیں۔'' بار بینہ نے تیزی سے اپنی بات مکمل کی۔

نجم نے اثبات میں سر ہلا کر اس کی بات کی تائید کی اور پھر بولا۔ ''مسئلہ یہ ہے کہ یہ بڑی عام سی موت تھی۔''

''عام؟'' بار بینہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''میری بات سمجھیں......'' نجم نے اس کے بدلتے تاثرات دیکھ کر فوراً وضاحت پیش کی۔ ''عام کا مطلب یہ ہے کہ سب کچھ دو جمع دو چار کی طرح ہوا ہے۔ قتل ہوا...... ثبوت ملے...... پھر قاتل پکڑے گئے اور انہیں سزا بھی مل گئی۔ ایسے کیسز میں پھر لوگ دیگر شواہد کو نظر انداز کر کے ضائع کر دیتے ہیں۔ اس طرح کے معاملے میں کچھ تلاش کرنا مہنگا سودا بن جاتا ہے۔''

''میرے پاس تین لاکھ روپے ہیں...... اس سے زیادہ میں ایک پائی بھی نہیں ادا نہیں کر سکتی۔'' بار بینہ نے قطعی لہجے میں کہا۔

''اتنے میں، میں زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے تک کام کروں گا۔'' نجم نے کہا۔ ''اگر معاملہ سلجھ گیا تو بہت اچھی بات ہے اگر نہ ہو سکا تو میں اخراجات کی مد میں کوئی رقم نہیں لوں گا اور اسی فیس پر ہی اکتفا کرلوں گا۔''

نجم کو پیسوں کی ضرورت تھی لیکن وہ بار بینہ کے جذبے سے متاثر ہوا تھا۔ عام طور پر اخراجات کی مد میں لی جانے والی رقم ہی اس کا اصل منافع بنتی تھی لیکن اس کیس میں وہ اب سب کچھ خود بھی جاننا چاہتا تھا۔

''اور فیس کی بات تو بعد میں کرلیں گے...... پہلے میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ آپ نے سب کچھ اچھی طرح سوچ لیا ہے؟''

''کیا مطلب؟'' بار بینہ کے چہرے پر سوال ہی سوال تھے۔

''یہ ایک ہولناک جرم ہے...... اگر تلاش کرتے ہوئے میں کچھ پوچھوں گا تو آپ کو سب سچ سچ بتانا ہوگا۔ وہ ساری اذیت ایک بار پھر برداشت کرنا ہوگی جو اس وقت سہی تھی۔ اور بھی کچھ تکلیف دہ مراحل آ سکتے ہیں۔''

''مثلاً......؟''

''مثلاً یہ کہ اگر لاش کو ٹھکانے لگانے سے پہلے اس کی بے حرمتی کی گئی ہو تو......'' نجم نے کاٹ پیٹ کے بجائے بے حرمتی کا لفظ استعمال کیا لیکن بار بینہ کے چہرے سے ہی وہ جان گیا کہ وہ اس کی بات اچھی طرح سمجھ گئی ہے۔

''میں بس اتنا چاہتی ہوں کہ کوئی ایسا مقام...... ایسی نشانی ضرور ہونی چاہیے جہاں پر ان کے لیے لوگ دعا کر سکیں۔'' بار بینہ نے آہستگی سے کہا۔

نجم نے ایک رسید بک نکالی اور اس میں سے ایک تین لاکھ کی رسید کاٹ کر بار بینہ کے حوالے کر دی۔ قانونی مشورے کی مد میں یہ فیس وہ وصول کر کے کام جاسوسی کا کرنے والا تھا۔ اپنی اس آمدنی کو وہ ہمیشہ صاف رکھتا تھا۔ البتہ جوئے والے کمائی کی کسی کو بھنک بھی نہیں پڑنے دیتا تھا۔

''اپنا فون نمبر دے دیں...... میں آپ کو کال کرلوں گا۔'' نجم نے کہا تو بار بینہ ایک بار ہچکچا کر رہ گئی۔

''آپ بس واٹس ایپ پر میسج کر دیجیے گا...... کال مت کیجیے گا۔ میں موقع دیکھ کر آپ کو خود کال کرلوں گی۔'' وہ اپنا فون نمبر دیتے ہوئے بولی۔

''وجہ پوچھ سکتا ہوں؟'' نجم نے سوال کیا۔

''میرے شوہر......'' وہ قدرے تذبذب کی کیفیت میں بولی۔ ''میں نے یہ سب کرنے سے پہلے ان سے مشورہ کیا تھا۔ انہوں نے اس مسئلے میں الجھنے سے منع کیا تھا اور میں یہ سب اب ان کے علم میں لائے بغیر کر رہی ہوں۔''

''اور وہ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟''

''آپ یہ نیوز ایک بار اچھی طرح دیکھ لیں......'' وہ اخبار کی تراشوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''ان میں بعض رپورٹرز نے پولیس کے اس شک کو بھی رپورٹ کیا ہے کہ زریاب اور مریم کے ساتھ ساتھ کوئی تیسرا شخص بھی اس سارے معاملے میں شامل تھا۔ میرے شوہر کا کہنا ہے اگر ہم نے لاش کی تلاش شروع کی تو ہم خطرے میں پڑ سکتے ہیں۔''

نجم نے سر ہلایا اور کچھ مزید معلومات وغیرہ لے دے کر اسے رخصت کیا۔

''کوئی تیسرا بھی اس میں شامل ہے...... انٹرسٹنگ۔'' نجم نے سوچا۔

اس کے مطابق کھیل اب دلچسپ مرحلے میں داخل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اظفر یا جو اپنے تھانے کا انچارج تھا۔ صبح صبح کا وقت تھا اور دفتری اوقات تبدیل ہونے کے باوجود وہ فجر کے بعد سے مسلسل مصروف تھا۔

وہ ابھی ابھی ایک میٹنگ اٹینڈ کرنے کے بعد آیا اور اپنی کرسی پر گر ہی گیا۔ بیٹھنے کے بجائے گرنے کا لفظ ہی مناسب تھا کیونکہ جسمانی مشقت تو وہ برداشت کرلیتا تھا

لیکن یہ اپنے بڑوں کے ساتھ ہونے والی میٹنگز اسے تھکا دیتی تھیں۔

اس نے ایک نگاہِ غلط اپنے ڈیسک پر پھیلی فائلوں پر ڈالی اور اس کے بعد اپنے ملاقاتی کی جانب متوجہ ہوا۔

"کچھ کھاؤ گے؟"

"نہیں...... میرا روزہ ہے۔" نجم جنجوعہ نے جواب دیا۔

"ارے واہ...... نو سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی؟" باجوہ نے طنز کیا۔

وہ اور نجم ایک دوسرے کو بچپن سے جانتے تھے اور ان کی دوستی بڑے ہونے کے بعد بھی چل رہی تھی۔

"جیسے تم اندھوں میں کانے راجہ ہو تو میں نو سو چوہے کھا کر حج کو کیوں نہیں جا سکتا؟" نجم نے جوابی وار کیا۔

باجوہ کرپٹ پولیس سسٹم میں ایک غنیمت کردار تھا۔ وہ نہ صرف اپنا کام اچھی طرح کرتا تھا بلکہ اس نے پولیس کے دامن پر لگے رشوت والے داغ کو بھی بڑی حد تک دھونے کی کوشش کی تھی۔ تفتیش کار بھی وہ بہترین تھا اور روایتی ڈنڈے والی پولیس گردی سے کوسوں دور رہتا تھا۔

"ہاہاہا......" باجوہ اس کی بات پر ہنستے ہوئے بولا۔ "بھئی معذرت کے ساتھ میں تو ڈیوٹی پر ہوں تو کچھ کھائے بغیر نہیں رہ سکتا اس لیے روزہ نہیں رکھا۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک جانب رکھا لنچ باکس کھولا تو آلو کے پراٹھوں کی مہک پورے کمرے میں پھیل گئی۔ وہ بڑے بڑے نوالے بنا کر کھانے لگا کیونکہ میٹنگ میں وہ کچھ کھا ہی نہیں سکا تھا۔

"روزہ تمہارا اور تمہارے رب کا معاملہ ہے...... میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" نجم نے کہا۔ "تم یہ بتاؤ کہ میرا کام ہوا یا نہیں؟"

باجوہ نے پراٹھے کا ایک بڑا نوالہ حلق میں ٹھونستے ہوئے ایک پتلی سی فائل کی جانب اشارہ کیا اور پھر بولا۔ "میرا نہیں خیال کہ اس سے تمہیں کوئی بہت زیادہ مدد ملے گی۔ کیس کلوز ہونے کے بعد اس میں کوئی ایسا سراغ نہیں رہ گیا تھا جس پر پولیس نے کام نہ کیا ہو۔"

"کہیں نہ کہیں سے تو کام شروع کرنا ہی ہے۔" نجم نے کندھے اچکائے۔

"بڑے ہی کوئی عجیب ماں بیٹا تھے......" باجوہ نے کیس پر تبصرہ کیا۔ "خیر تم یہ بتاؤ کہ تمہاری کلائنٹ کو اب لاش کا خیال کیوں آ گیا؟"

"بس اسے لگا کہ ہر مسلمان کو قبر ضرور نصیب ہونی چاہیے۔"

"چلو تم کوشش کر لو...... میرا خیال تو یہی ہے کہ مضافات کے دلدلی علاقے میں ہی کہیں لاش کو ٹھکانے لگایا گیا تھا۔" باجوہ بولا۔

"یہ بات تو اخبار میں بھی رپورٹ ہو چکی...... مجھے ایگزیکٹ لوکیشن بتاؤ۔" نجم نے کہا۔

"یار، جو بارانی جھیل تھی...... اس کے نالے کا رخ بدل دیا گیا تھا۔ اب وہاں بارش ہو جائے تو پانی... آتا ہے لیکن اتنا نہیں کہ اسے باقاعدہ کوئی جھیل کہا جائے...... وہی لوکیشن ہے۔"

"اوہ صحیح......" نجم ہونٹ گول کرتے ہوئے بولا۔

"ویسے تم پولیس میں ہی آ جاؤ۔ کم از کم وکالت والی مکھیاں مارنے سے تو بچ جاؤ گے۔" باجوہ نے کہا۔

"تمہاری پولیس والی مکھیاں مارنے اور کھانے سے بہتر ہے کہ میں عدالتوں کے دھکے کھا لوں۔" نجم نے اس کے آفس میں پھیلی ہوئی مکھیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو دونوں ہنسنے لگے۔

نجم نے فائل کھول کر جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ایک حصہ زریاب خان پر ہی مشتمل تھا۔ اس میں اس کی کارروائیاں تفصیل سے بیان کی گئی تھیں۔ زیادہ تر اس کی مصروفیات یہی تھیں کہ وہ پراپرٹی سائٹس کا وزٹ کرتا تھا جہاں پر کوئی نہ کوئی ہاؤسنگ اسکیم شروع کی جا سکتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بیگم صدیقی کو لوٹنے کے بعد آنے والی رقم کو خرچ کرنے کی منصوبہ بندی بھی ساتھ ساتھ ہی کر رہا تھا۔

"اچھی تفتیش کی ہے اور رپورٹ بھی دلچسپ ہے۔" نجم نے فائل کا سرسری جائزہ لینے کے بعد کہا۔ "یہ زریاب مضافاتی علاقے میں کب گیا تھا؟"

"مجھے یاد نہیں...... شاید قتل سے کوئی دو دن پہلے کا ریکارڈ ہے۔"

"دو دن پہلے......؟" نجم سوچ میں پڑ گیا۔

"ہاں یہی سے ہمیں شک ہوا۔"

"کس بات کا شک؟"

"یہی کہ کوئی تیسرا شخص بھی شامل ہے......"

"وہ کس طرح؟"

"دیکھو...... یہ صرف شک ہی ہے۔ زریاب نے تو اعترافِ جرم نہیں کیا تھا لیکن ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ لاش کو

ٹھکانے لگانے والا فرد کوئی اور تھا۔ اسی لیے قتل والی رات زریاب کے مضافاتی علاقے جانے کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔"

"میری کلائنٹ کا بھی یہی کہنا ہے...... لیکن انہیں کسی تیسرے کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟"

"زریاب اور مریم واردات کے وقت پبلک میں تھے تاکہ اپنے لیے گواہ اکٹھے کر سکیں۔ اصل میں تو وہ واقعاتی شہادتوں پر پھنسے ہیں...... انہیں بارینہ کے بارے میں اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ پولیس سے اتنی جلدی رابطہ کر لے گی کہ انہیں ان چیزوں کو ٹھکانے لگانے کا موقع ہی نہیں ملے گا۔ لاش انہوں نے کسی تیسرے کے ذمے لگائی تھی جس نے اپنا کام احسن طریقے سے پورا کر دیا۔" باجوہ نے تفصیل بتائی۔

"اس شخص کو کیا ملا؟" نجم نے پوچھا۔ "جیولری تو تقریباً ساری ہی ری کور کر لی گئی تھی۔"

"جو تجوری لوٹی گئی ہے اس میں کیش بھی تو ہوگا۔" باجوہ بولا۔ "اس کا ہمیں کوئی نام و نشان تک نہیں ملا۔"

"مریم یا زریاب نے کسی تیسرے کی نشاندہی کی ہے؟"

"نہیں......" باجوہ نے ایک اور نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ اس بار اس نے پودینے کی چٹنی میں پَرا ٹھا ڈبو کر لقمہ لیا تھا۔

"انہوں نے تو کسی ڈکیت گروپ کا نام لیا تھا...... ان کے وکیل نے بھی یہی اینگل استعمال کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہوسکا۔" باجوہ نوالا نگلتے ہوئے گویا ہوا۔ "شاید انہیں امید ہے کہ جیل میں کوئی بارہ چودہ برس پورے کرنے کے بعد وہ اس سے کچھ حاصل کر سکیں اس لیے خاموش ہیں۔"

"میں اب جاتا ہوں یہاں سے ورنہ تم میرا روزہ خراب کر دو گے۔" نجم نے اس کے چہرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں پودینے کی چٹنی اس کی مونچھوں کو بُری طرح بھگو رہی تھی۔

نجم جب وہاں سے روانہ ہوا تو اس کی چھٹی حس چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ کیس میں رچایا گیا کھیل مزید خطرناک ہونے جارہا ہے۔

☆☆☆

ناکام اور ناامید......

نجم جنجوعہ اگر اپنی کیفیت کو بیان کرتا تو یہی دو الفاظ کا استعمال کرتا۔

وہ اس وقت وہیں موجود تھا جہاں پر زریاب نے قتل سے دو دن قبل وزٹ کیا تھا۔ یہ اتنا بڑا علاقہ تھا کہ وہاں پر اگر کسی کو دفن کیا جاتا تو کئی صدیاں لگ جاتیں تلاش میں پھر بھی ناکامی ہی حصے میں آتی۔

دلدلی جھیل بالکل دلدل نہیں تھی۔ یہاں کسی کسی جگہ پر چار پانچ فٹ کے گڑھے بھی تھے جن میں پانی تھا۔ باقی ایک بڑا حصہ پانی پر ہی مشتمل تھا۔ چپو کی مدد سے کشتی بھی یہاں چلائی جاسکتی تھی۔ کئی ہزار آبی پرندے یہاں پر موجود تھے۔ علاقہ خوبصورت تھا لیکن عوامی جگہ اس لیے نہیں بن سکا تھا کیونکہ حفاظتی اقدامات نہ ہونے کی وجہ سے کوئی جھیل میں پھنس جاتا تو وہ اس کے لیے واقعی کسی دلدل سے کم ثابت نہ ہوتی۔

البتہ یہ علاقہ کسی ہاؤسنگ اسکیم کے لیے بھی مناسب نہیں تھا۔ اگر آپ زبردستی یہاں کچھ بنا بھی دیتے تو سیلاب کا اندیشہ رہتا جس طرح سے کچھ عرصہ قبل اسلام آباد کے لوگ بھگت چکے تھے۔ برساتی نالوں پر کالونیاں بنانا مہنگا ترین سودا تھا۔

وہ گاڑی سے نکل کر چہل قدمی کرنے لگا۔ یہاں پر پانی دو تین فٹ تک ہی تھا۔ کیچڑ سے آلودہ اور براؤن رنگت والا سیلا پانی۔ کہیں کہیں صرف کیچڑ تھی۔ یہاں کوئی بھی لاش کو لپیٹ کر گاڑ دیتا تو تلاش ناممکن ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ پولیس کو یہاں سے کوئی ڈیڈ باڈی نہیں ملی تھی۔

اپنے جوتے صاف کرتے ہوئے اس نے سوچا کہ اگر ہیلی کاپٹر کی مدد سے کوشش کی جائے تو یا پھر انفرا ریڈ ٹیکنالوجی کا استعمال کیا جائے۔ پھر سر جھٹک کر خود سے ہی مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"اتنا خرچا کون کرے گا؟"

"لیکن اب کیا کیا جائے......؟ وہ بلند آواز میں چلّایا۔ اس کی بھیانک آواز سن کر کچھ پرندے ساتھ والے درخت سے اڑ گئے۔

"تم لوگوں نے صحیح اس پراپرٹی پر قبضہ کیا ہوا ہے۔" اس نے پرندوں کو کہا اور اچانک ہی اسے ایک خیال آیا۔ زریاب کی فائل میں پراپرٹی ڈیلرز کے حوالے سے بہت سے کاغذات لگے ہوئے تھے۔

"زبردست...... مجھے وہی جانا چاہیے۔ شاید بیگم صدیقی کی لاش کو ہم سب بالکل ہی غلط جگہ پر تلاش کر رہے ہیں۔"

☆☆☆

تھوڑی ہی دیر میں وہ پراپرٹی ریکارڈ آفس میں تھا۔ پٹواری سسٹم ختم ہونے کے بعد بہت سارا لینڈ ریکارڈ سسٹم کمپیوٹرائزڈ کر دیا گیا تھا۔

وہ کمرشل کنسٹرکشن ڈپارٹمنٹ کے پرمٹ فراہم کرنے والے آفس پہنچا تو وہاں ایک آدم بیزار خاتون کے سوا کوئی نہیں تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر منہ بنایا اور رسمی علیک سلیک کی۔

تمام سرکاری افسران روزہ رکھ کر عوام پر احسان کرتے تھے اس لیے ان میں سے بیشتر دفتر آنے کی زحمت نہیں کرتے تھے۔ جو آجاتے تھے وہ عوام کا کام کرنے کے ہر دو منٹ بعد اپنے روزے سے ہونے کا جتانا نہیں بھولتے تھے۔

اسے کافی انتظار کرنا پڑا تب جا کر وہ آدم بیزار خاتون اس کے مطلوبہ تین فولڈر اٹھا کر لائی۔

''یہاں سائن کریں۔''

اس نے کر دیے۔

''کیا میں انہیں لے کر جا سکتا ہوں؟''

''نہیں......''

''لیکن مجھے......''

اس سے قبل کہ وہ اپنی بات مکمل کرتا خاتون اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ''آپ انہیں پڑھ لیں...... یاد کر لیں...... یا فوٹو کاپی کر لیں...... کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن آپ انہیں یہاں سے لے کر نہیں جا سکتے۔''

''میں کاپی کروانا چاہوں گا۔'' وہ فوراً بولا۔

فوٹو کاپی مشین کی سہولت وہاں دستیاب تھی لیکن اس کا آپریٹر ابھی تک آفس نہیں آیا تھا۔ کافی دیر جھنجلانے کے بعد جب وہ آدم بیزار خاتون کے پاس وہ واپس آیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''میں اپنی مشین پر بھی اس کی کاپیز بنا سکتی ہوں۔''

''تو اتنی دیر سے بتایا کیوں نہیں؟'' نجم نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

خاتون نے فوٹو کاپی کی قیمت بتائی تو اس کا پارا ایک بار پھر چڑھنے لگا لیکن اس کے ذہن میں ایک پلان تھا اس لیے اس نے چند فولڈرز کی کاپی کی قیمت ہزاروں میں ادا کرنے کی حامی بھر لی۔

یہ اور یجنل پرمٹ ایشوز تھے۔ جو کنسٹرکشن کمپنیاں بیگم صدیقی کے علاقے کے آس پاس بلند و بالا عمارتیں بنا رہی تھیں یہ ان میں سے تین کمپنیوں کا ریکارڈ تھا۔

زریاب کی پولیس فائل میں ان پرمٹ کی کاپیاں موجود تھیں۔ یہ سب باجوہ اور اس کے ساتھیوں نے زریاب کے ڈیسک سے اکٹھی کی تھیں۔ زریاب پراپرٹی کے دھندے کی ہر وقت باتیں کرتا تھا تو ان کی موجودگی کوئی اچھنبے کی بات نہیں تھی۔

لیکن نجم کو کچھ عجیب لگا تھا۔

ایسی کمپنیوں کے پرمٹ کی کاپیاں آخر زریاب کے پاس کیوں تھیں جن سے اس کا کوئی لینا دینا ہی نہیں تھا؟ نجم کو اصل شک اس لیے ہوا تھا کیوں کہ یہ تینوں پرمٹ عمارتوں کی بنیاد ڈالنے کے لیے دیے گئے تھے۔

کوئی لاش اگر وہاں دفنا دی جائے جہاں کنکریٹ کا پہاڑ تعمیر ہونے والا ہو تو کون ڈھونڈ پائے گا ایسی لاش؟

لیکن اب اسے سراغ لگانا تھا کہ ان تین میں سے کس عمارت کی بنیاد میں بیگم صدیقی کی لاش تھی تاکہ وہ اپنی کلائنٹ کو مطمئن کر سکے۔

اس کے ذہن میں ایک آئیڈیا آ گیا تھا جس کے تحت وہ لاش والی بلڈنگ تک پہنچ سکتا۔ اس نے رقم کی ادائیگی کے بعد فوٹو کاپیز اور اصل فولڈر اٹھا کر ایک جانب رکھی کرسیوں پر بیٹھنا پسند کیا تاکہ سکون سے اپنا کام کر سکے۔ جب اس نے دیکھا کہ آدم بیزار خاتون اس کی جانب متوجہ نہیں ہے تو اس نے اپنی کارروائی ڈال دی۔

اس نے ابتدائی ایک دو صفحات فولڈرز کے اصلی رکھے اور انہیں ان کی نقول سے تبدیل کر دیا۔ واپسی پر آدم بیزار خاتون کو اس کی چالاکی کا پتا ہی نہیں چلا اور اس نے وہاں سے فرار کی راہ اختیار کی۔

اس کی اگلی منزل فرانزک آفس تھا جہاں نادرا کا سارا فنگر پرنٹ ڈیٹا بھی دستیاب تھا۔

☆☆☆

خدا کی قدرت تھی کہ جب وہ فرانزک آفس پہنچا تو وہاں اسے اپنا وہ دوست کرم جان مل گیا جو اس کا کام بنا کوئی چون و چرا کیے کر سکتا تھا۔ کرم جان نے اس کے کام کو اہمیت دی اور فوراً ہی لیبارٹری میں فولڈر بھجوا دیے۔

اپنے کام کی نوعیت بتا کر وہ ویٹنگ روم میں جا بیٹھا اور موبائل پر کرکٹ میچ کی جھلکیاں دیکھنے لگا۔ یوٹیوب پر ویڈیو چلائی تو پہلے اشتہار آ گیا۔ وہ جھنجلانے ہی لگا تھا کہ وہاں پر فلسطین کے بھوکے بچوں کی امداد کی اپیل سن کر رک گیا۔

''کتنا برا وقت آ گیا ہے امتِ مسلمہ پر کہ اسرائیل

کے ظلم و بربریت پر بڑے بڑے مسلم ممالک کوئی ایکشن لینے کے بجائے چھوٹی چھوٹی اسلامی تنظیمیں کھانا پہنچانے کی تگ و دو میں مصروف تھیں۔'' اس نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے سوچا۔

وہاں پر ایک کافی مشین بھی لگی ہوئی تھی۔ کافی بناتے بناتے اسے یاد آیا کہ اس کا روزہ ہے تو اس نے بنی ہوئی کافی ڈسٹ بن میں پھینک دی۔

''اتنے دن ہو گئے اور ابھی تک عادت نہیں بنی کہ روزے میں بندہ خیال کرے۔'' اس نے سوچا۔

اس کے دوست کرم جان نے تقریباً ایک گھنٹے بعد اس کے پاس آ کر کہا۔

''اچھا بھئی نجم..... تقریباً سات لوگوں کے فنگر پرنٹ ہمیں ملے ہیں۔''

''ہاں تو ان کے بارے میں کوئی معلومات؟'' نجم نے پوچھا۔

''وہ تو میں بتاتا ہوں.... لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس یہ اوریجنل ڈاکومینٹس کہاں سے آئے ہیں؟'' کرم نے سوال کیا۔

''یہ تو مت ہی پوچھو.....'' نجم نے رسان سے کہا۔ ''میں دو نمبری کر سکتا ہوں لیکن تمہیں اس کی اجازت نہیں ہے۔''

''تمہارا کوئی بھی کام کرنا کیا کم دو نمبری ہے؟'' کرم نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

''تمہیں اگر ایک فیصد بھی شک ہوتا کہ میں دو نمبر کام تم سے کرواتا ہوں تو تم نے میری شکل بھی نہیں دیکھنی تھی۔'' نجم نے اپنے بالوں کے نادیدہ پف کو جھٹکا دیا۔ ''خیر تفصیل بتاؤ کیا پتا چلا ہے فنگر پرنٹس سے۔''

''دو کا تو کوئی ریکارڈ نہیں ملا ہے۔ یعنی سادہ سے لوگ ہیں اور امکان ہے کہ وہی بلڈرز ہیں۔'' کرم نے ہنستے ہوئے بتانا شروع کیا۔ ''ایک تمہارے ہیں۔ اپنے بارے میں تم جانتے ہی ہو۔ باقی تین وہاں کے عملے کے ہیں۔''

''یعنی کہ.....؟''

''یعنی کہ تم جو زریاب خان کے فنگر پرنٹس چاہتے تھے وہ کسی بھی پرمٹ پر نہیں ملے ہیں۔'' کرم خان نے اس کی اُمیدوں پر گھڑوں پانی انڈیلتے ہوئے کہا۔

نجم کا دل زور سے دھڑکا..... اسے لگا ابھی کوئی انکشاف ہونے والا ہے۔

''آخری فنگر پرنٹس کس کے ہیں؟''

''تم یقین نہیں کرو گے؟'' کرم نے کہا۔

''کیوں نہیں کروں گا؟ مجھے تمہاری صلاحیتوں پر پورا یقین ہے۔''

''لیکن اس بندے کا بھی کوئی کریمنل ریکارڈ نہیں ہے۔''

''پھر اتنا سسپنس کیوں پھیلا رہے ہو؟'' نجم بے چینی سے بولا۔

''اس کا نام دانیال خان ہے۔''

پانچ سیکنڈ لگے اور نجم کے دماغ کی بتی روشن ہو گئی..... وہ تو باربینہ کے شوہر کا نام تھا۔

جب گڑے مردے اکھیڑے جائیں تو کوئی نہ کوئی ایسا بھی نکل آتا ہے جس پر انسان کفِ افسوس ملنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا۔

☆☆☆

نجم جنجوعہ کا ایک اُصول تھا..... چاہے وہ پرائیویٹ جاسوس بن کر کام کر رہا تھا لیکن اس کے ہر کام میں کسی پولیس والے یا جاسوس جیسی پرفیکشن ہوتی تھی۔

وہ اپنے دفتر میں تھا اور اب تک ملنے والے تمام شواہد کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ افطاری کر کے وہ سو گیا تھا اور اب سحری کے وقت اس کی آنکھ کھلی تھی..... انڈے پراٹھے اور چائے کے ساتھ ساتھ وہ کئی فکریں بھی کھا رہا تھا۔

''کیا یہ ممکن تھا؟''

''کیا دانیال خان وہی تیسرا شخص تھا جس کے بارے میں اس نے اپنی بیوی کو خبردار کیا تھا؟''

''کیا وہی تھا جس نے بیگم صدیقی کی لاش کو ٹھکانے لگایا تھا؟''

سوالات ہی سوالات تھے جو اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے اور وہ ان کے ممکنہ جوابات تلاش کرنے میں مگن تھا۔

ہر سوال کا جواب ایک ہی سامنے آ رہا تھا۔

''ہاں..... دانیال خان ہی اس معاملے میں ملوث ہے۔''

وہ بیگم صدیقی کے ہاں جز وقتی ملازم رہا تھا۔ باربینہ اس کی بیوی تھی اور وہ اس سے کوئی بھی معلومات چالاکی سے حاصل کر سکتا تھا۔

وہ زریاب اور مریم سے بھی واقف تھا اور ان کے ساتھ بات چیت کرتے رہنے کے ثبوت بھی تھے۔ مفت میں آتا ہوا پیسہ کس کو بُرا لگتا ہے؟ وہ مزدوری بھی کرتا تھا اور یقیناً

کنسٹرکشن ورکرز سے بھی واقف ہوگا۔
"یہ بھی ممکن ہے کہ جس بلڈنگ کی بنیاد میں بیگم صدیقی کی لاش گاڑی گئی ہو وہ وہاں پر بطور مزدور کام کرتا ہو۔" نجم کے ذہن میں سوچ آئی۔
اور کیا وجہ ہوسکتی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو لاش ڈھونڈنے کے عمل سے روکنے کا خواہاں تھا۔ اس نے کسی تیسرے قاتل سے ڈرانے کی کوشش بھی کی تھی۔ لیکن کوئی تیسرا کیسے اس بات سے واقف ہوسکتا تھا کہ باربینہ ایک سال بعد اپنی مالکن کی لاش کی تلاش کا ٹاسک کسی کو دینے والی ہے؟
"لیکن اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟" نجم نے خود سے سوال کیا۔
اس کے پاس زیادہ آپشن نہیں تھے۔ اگر اسے کسی اشتہاری شخص کا سراغ ملتا تو وہ پولیس کو بتانے کا پابند تھا۔ اور ایسے بھیانک جرم کے مجرم کو تو کسی قیمت پر آزاد رہنے کا کوئی حق نہیں تھا۔
"لیکن بیچاری باربینہ کا کیا ہوگا؟ وہ تو ساری عمر پچھتاتی رہے گی کہ ایک قاتل کی بیوی تھی اور اس نے خود ہی اسے پکڑوانے میں مدد کی۔" نجم نے سوچا۔
"کچھ بھی کرنے سے پہلے مجھے مزید ثبوت اکٹھے کرنے ہوں گے۔" اس نے خود کلامی کی۔
اسی وقت سائرن بجا اور فجر کی اذانیں ہونے لگیں۔ نماز کے بعد اس کے دل سے ایک ہی دعا نکلی۔
"یارب...... اس معاملے میں کوئی ناانصافی نہ ہونے دینا۔"

☆☆☆

یہ تراویح کے بعد کا وقت تھا۔ وہ اس وقت مڈل کلاس آبادی کی کالونی میں موجود تھا جہاں تین اور چار مرلے کے مکان موجود تھے۔
بیگم صدیقی نے اپنی وصیت کے مطابق سب کچھ اپنے بھانجے احمد فریدی کے نام کر دیا تھا لیکن باربینہ... خدمت کے صلے میں نوازی گئی تھی۔ اس کالونی میں چار مرلے کا بنا بنایا مکان اس نے باربینہ کے نام کر دیا تھا اور تقریباً کیش میں دس لاکھ کی رقم اس کے نام چھوڑی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے بزنس کے منافع میں سے ایک ٹرسٹ قائم کیا تھا جو باربینہ کے تینوں بچوں کی سولہ سال تک تعلیم۔ کے اخراجات برداشت کرنے کا پابند تھا۔
باربینہ نے ملنے والی رقم کچھ انویسٹ کر کے ماہانہ منافع لینا شروع کر دیا تھا جبکہ باقی ماندہ رقم سے اپنے گھر سے فروزن فوڈ اور دیگر دیسی کھانوں کا بزنس شروع کر دیا تھا۔ آن لائن فوڈ ایپس نے اس معاملے میں اس کی بہت مدد کی تھی اور اس وقت بھی گھر کا خرچا وہی چلا رہی تھی۔
نجم نے اپنی کرائے کی ایس یو وی میں بڑی دیر سے دانیال کا پیچھا کرنا شروع کیا ہوا تھا۔
بظاہر دانیال کے بارے میں اسے جو معلومات ملی تھیں، وہ ایک خوش باش انسان کے طور پر سامنے آیا تھا۔ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا اور ساری زندگی محنت مزدوری کر کے ہی گزاری تھی۔ چھوٹے موٹے کاموں۔ کے دوران اس نے دو نمبر کام بھی کیے تھے لیکن کبھی اتنے بڑے۔، پیمانے پر نہیں کیے تھے کہ پولیس کی نظروں میں آجاتا۔ ویسے بھی وہ کوئی اتنا جی دار شخص نہیں تھا کہ ان مسئلوں میں الجھتا۔
اس کی زندگی میں تبدیلی اس وقت آئی جب اس کی بیوی باربینہ نے بیگم صدیقی کے ہاں کام کرنا شروع کیا۔ کام چور تو وہ تھا ہی اب بیوی کمانے لگی تو اس کی ہڈحرامی میں اضافہ ہوگیا۔ اب بیگم صدیقی نے اتنا نواز دیا تھا لیکن اس کی عادات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔
"لیکن جیسا بھی ہے وہ ان بچوں کا باپ اور باربینہ کا شوہر ہے۔" نجم کے دل میں بات آئی۔ نجانے کیوں پچھلے کچھ دنوں سے اس کا دل گداز ہوگیا تھا۔
نجم بظاہر تو اپنے آئی پیڈ پر کوئی فلم دیکھنے میں مصروف لگ رہا تھا لیکن وہ کیمرے کی مدد سے نگرانی کا عمل جاری رکھے ہوئے تھا۔ ایپل کی پروڈکٹس نے جاسوسی کے عمل کو آسان بنا دیا تھا۔
آج ان لوگوں نے باربی کیو بنایا تھا اور گھر کے سامنے والے لان میں بیٹھ کر افطاری کی تھی۔
اب دانیال باربی کیو گرل کو دھو رہا تھا۔ گھر میں ایک گیراج بھی تھا جسے وہ لوگ گاڑی کے لیے استعمال نہیں کرتے تھے کیونکہ ان کے پاس کوئی کار نہیں تھی۔ وہاں پر دانیال نے اپنا کاٹھ کباڑ بھر رکھا تھا۔ گرل دھونے کے بعد اس نے بڑی احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے گیراج کا دروازہ کھولا تو نجم چونک گیا۔ معمولی سامان رکھنے کے لیے اتنی احتیاط کرنا سمجھ سے باہر تھا۔
اس محلے میں تراویح کے بعد بچے کرکٹ نہیں کھیلتے تھے اس لیے نجم کو آسانی ہوگئی ورنہ اسے جو کارروائی کرنی تھی، وہ ناممکن ہوجاتی۔ اس نے دو گھنٹے مزید انتظار کیا تو بیشتر عوام خوابِ خرگوش کے مزے لینے لگی۔ بہت سے لوگ جلدی سو گئے تھے تاکہ سحری کے وقت بیدار ہوسکیں۔ اس

دوران میں نجم اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔
شک تو اسے پہلے ہی دانیال کے رویے سے ہو گیا تھا اس لیے اس نے سب سے پہلے گیراج میں تلاشی لینے کا فیصلہ کیا۔ اگر وہاں سے کچھ نہ ملتا تو وہ گھر کے باقی کمروں کا جائزہ لیتا۔
گیراج میں داخل ہونے میں نجم کو بالکل بھی مشکل پیش نہیں آئی۔ اس کام کے لیے اس کے پاس مختلف ماسٹر کیز موجود تھیں۔ گیراج کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا تھا۔ باربینہ اور دانیال اپنے پچھلے مکان کی ساری یادیں سمیٹ کر لے آئے تھے۔ دانیال مزدوری وغیرہ اور اس طرح کے کام کرتا تھا تو گیراج میں اس کے مختلف آلات بکھرے ہوئے تھے۔
ایک جانب ہاتھ سے دھکیلنے والی ٹرالی پڑی تھی۔ شیلفوں میں باغبانی کے آلات تھے۔ ایک جانب لکڑی کی شیٹیں وغیرہ بھی پڑی تھیں۔ بجلی کی استعمال شدہ تاروں کا ڈھیر بھی ایک جانب بکھرا ہوا تھا۔
''ایسے تو ساری رات گزر جائے گی۔'' دانیال نے خود سے سرگوشی کی۔
وہ ایک جگہ ٹھہر کر گردن گھمانے لگا تاکہ دیکھ سکے کہ کہاں پر کچھ چھپایا جائے تو انسانی نفسیات کے تحت کوئی اس جگہ پر دوسری نگاہ ڈالنا بھی گوارا نہیں کرے گا۔ پنسل ٹارچ کی روشنی میں وہ ایک ایک چیز کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔
''اور یہاں کچھ ملنے کا امکان ہے......'' وہ سوچتے ہوئے ایک کونے کی جانب بڑھا۔
اس کونے میں استعمال شدہ پینٹ کے ڈبے پڑے تھے۔ انہیں کوئی بھی چوری نہیں کر سکتا تھا۔ دھول مٹی کی اتنی تہیں وہاں جمی ہوئی تھیں جیسے برسوں سے کسی نے صفائی نہ کی ہو۔ پینٹ کے ڈبے ادھ کھلے تھے اور ان پر واضح نشان نظر آرہے تھے۔
تیسرے اور چوتھے ڈبے میں وہ ثبوت مل گیا تھا جس کی تلاش میں وہ بڑی دیر سے خوار ہو رہا تھا۔ روپے اور ڈالرز... کی گڈیوں کے ساتھ ساتھ اسے دو عدد ڈائمنڈ بریسلیٹ بھی ملے جبکہ ایک سونے کا ہار بھی تھا۔
''مل گیا......'' اس نے دل ہی دل میں نعرہ لگایا۔
یہ سب یقیناً بیگم صدیقی کو ٹھکانے لگانے کا معاوضہ تھا جو اس کی ہی تجوری سے اڑایا گیا تھا۔
دانیال جیسے بندے نے عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس معاوضے کو بینک میں رکھنے کی کوشش نہیں کی ورنہ اپنے پس منظر کی وجہ سے پکڑا جاتا۔ زریاب اور مریم نے اس کا نام نہ لے کر دانش مندی سے کام لیا تھا ورنہ دانیال کے پاس ان کے خلاف اتنا مواد موجود تھا کہ سزا عمر قید کے بجائے پھانسی کی ملتی۔
نجم نے خاموشی سے ان سارے شواہد کی تصاویر بنائیں۔ اس نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ مزید ڈبے کھول کر بھی دیکھتا رہا۔ آخر اسے ایک ڈبے میں وہ چیز بھی مل گئی جس کام کے لیے اس کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔
اس نے بیگم صدیقی کی آخری آرام گاہ کا سراغ لگا لیا تھا۔

☆☆☆

بیالیس انچ کے فلیٹ اسکرین ٹی وی پر ایک ویسٹرن کاؤ بوائے فلم چل رہی تھی لوگ گھوڑے دوڑاتے پھر رہے تھے جبکہ ایک کاؤ بوائے اپنے پسٹل سے ریڈ انڈین افراد پر فائرنگ کرتے ہوئے ان کا قتل عام کر رہا تھا۔
''میں آجاؤں اندر؟'' دروازے پر ایک ہلکی سی دستک ہوئی اور نسوانی آواز نے سوال کیا۔
''آجائیں آجائیں......'' نجم جنجوعہ نے ٹی وی کو ریموٹ کنٹرول سے بند کرتے ہوئے کہا۔
باربینہ اس کے دفتر میں داخل ہوئی تو ایسے دیواروں کو دیکھنے لگی جیسے پہلی بار آئی ہو۔ ہاں یہ حقیقت تھی کہ اس نے پہلی بار دیوار پر کرکٹ کے پوسٹر بغور دیکھے تھے ورنہ پچھلی بار تو اتنی الجھی ہوئی تھی کہ کچھ بھی اس کے مشاہدے میں نہ آیا تھا۔
''میرا بیٹا شہروز بھی کرکٹ کا دیوانہ ہے۔'' وہ بولی۔
''بس مجھے بھی بہت شوق ہے.... آپ بیٹھیں۔'' نجم نے ایک جانب رکھے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''آپ نے میسج کیا تھا کہ آپ کو کچھ ملا ہے۔'' باربینہ نے کہا۔
نجم نے اثبات میں سر ہلایا۔
آج تک اس کی جاسوسی گھر سے بھاگے ہوئے ٹین ایج لڑکوں اور لڑکیوں کی تلاش تک محدود رہی تھی۔ کبھی کبھی شکی میاں بیوی کے کہنے پر بھی وہ پیچھا کرنے کی ڈیوٹی کر لیتا تھا...... لیکن اپنی نوعیت کا یہ پہلا کیس تھا۔
اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ باربینہ کس طرح کا ردِعمل دے گی۔
وہ مزید اسے اندھیرے میں نہیں رکھ سکتا تھا......
''شاید آپ کو یہ سب جان کر بالکل بھی اچھا نہ لگے

لیکن......"

"آپ نے مجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ میری طبیعت کے خلاف بھی کوئی نتائج نکل سکتے ہیں۔" باربینہ نے ایک گہرا سانس لے کر اس کی بات کاٹ دی۔

نجم نے اقرار میں سر ہلایا اور اٹھ کر دوسرے کمرے کا دروازہ کھول کر کسی کو اندر آنے کے لیے اشارہ کیا۔

باربینہ کا حیرت سے منہ کھلا کا کھلا رہ گیا جب اس نے اپنے شوہر کو دروازے سے نکل کر آتے دیکھا۔ دانیال شرمسار سا، سر جھکائے ایک پھیکی ہنسی ہنستا ہوا باربینہ کے پہلو میں جا کر بیٹھ گیا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" وہ ابھی تک حیرت کے جھٹکے سے باہر نہیں آئی تھی۔

نجم اپنی آفس چیئر پر بیٹھ گیا جس نے اس کے کم وزن کے باوجود صدائے احتجاج بلند کرنا ضروری سمجھا۔ تیل دینے کے باوجود اس کی چوں چراں ختم نہیں ہوتی تھی۔

"ہاں دانیال...... بتاؤ اپنی بیوی کو۔" اس نے کہا۔

دانیال لب بستہ بیٹھا رہا...... باربینہ کچھ دیر اسے دیکھنے کے بعد نجم کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔

"کیا یہ بیگم صدیقی کے بارے میں بات کرنے سے ڈر رہا ہے؟"

گول چہرے والے دانیال کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"میری جان باربینہ......" وہ بولتے بولتے اٹک گیا۔

"جان شان کو گولی مارو...... مجھے بتاؤ تم اس معاملے میں کہاں سے آ گئے ہو؟" باربینہ کا پارا چڑھنے لگا تھا۔

"میں نے تم سے کچھ باتیں چھپائی ہیں......" وہ نظریں چراتے ہوئے بولا۔ "تمہیں یاد ہے جب تم نے مجھے بتایا تھا کہ زریاب بیگم صدیقی کے کاغذات کے بارے میں تم سے پوچھ گچھ کر رہا تھا؟"

"ہاں......" باربینہ تیزی سے بولی۔ "اور میرے انکار پر اس نے مجھے اور میری بیٹی کو نقصان پہنچانے کی دھمکی دی تھی۔"

"یہی سب کچھ اس نے میرے ساتھ بھی کیا تھا......" دانیال نے بتایا۔ "انہوں نے کہا کہ تم بہت نیک عورت ہو اور اس کام میں مدد نہیں کرو گی۔ وہ میری مدد سے پھر اپنا مقصد پورا کرنا چاہتے تھے۔"

"تم......؟" باربینہ کے حلق سے سرگوشی نما آواز نکلی۔ جو اس کی سمجھ بوجھ میں آ رہا تھا، وہ بہت خوفناک تھا۔

"ہاں...... میں۔" دانیال نے اقرار کیا۔ "مگر بات صرف کاغذات کے حصول تک محدود نہیں تھی...... وہ کسی اور معاملے میں بھی میری مدد چاہتے تھے۔"

"کک...... کیا؟" باربینہ اب خوفزدہ ہو گئی تھی۔

"مریم نے مجھے بتایا کہ بیگم صدیقی شوہر کی وفات کے بعد سے بہت اداس ہیں اور اب مزید زندہ نہیں رہنا چاہتیں۔"

"کیا مطلب؟" باربینہ کی آنکھیں کھل گئیں۔

"مریم نے بتایا کہ بیگم صدیقی کو کینسر ہے۔"

"کیا بکواس ہے......؟" باربینہ تنک کر بولی۔ "وہ بالکل بھی بیمار نہیں تھیں...... اگر ایسا ہوتا تو مجھے معلوم ہوتا۔ وہ اس لعنتی عورت سے زیادہ تندرست تھیں جو انہیں کینسر کی مریضہ کہہ رہی تھی۔"

"لیکن مریم اور اس کے بیٹے نے مجھے بتایا کہ انہیں کینسر ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ تمہیں اپنی وصیت سے نکال رہی ہے...... اور اگر وہ ابھی مر جاتی ہے تو اپنی وصیت میں کوئی تبدیلی نہیں کر پائے گی۔ وہ اس کام کے لیے میری مدد مانگ رہے تھے۔" دانیال نے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ تفصیل بتائی۔

"تمہاری مدد......" باربینہ کی نگاہیں اب شعلے اگلنے لگی تھیں۔ "انہیں تمہاری مدد بیگم صدیقی کی جان لینے کے لیے درکار تھی؟"

"وہ کہتے تھے کہ بیگم صدیقی اتنی امیر ہے پھر بھی لالچی ہے اور ہم جیسے غریبوں کا خیال نہیں کرتی...... یہ تو سراسر ناانصافی ہے۔ اس کی دولت پر ہم جیسے غریبوں کا بھی حق ہے۔"

"اور تم نے مجھے یہ بات نہیں بتائی...... تم نے یہ بات کسی کو بھی نہیں بتائی کہ وہ درندے کتنے خطرناک ارادے رکھتے ہیں؟" باربینہ کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا۔

"میں نے بتا دیا تھا......" دانیال نے آہستگی سے کہا۔

"کسے؟ پولیس کو؟" باربینہ چلائی۔ "جھوٹ بول رہے ہو تم...... مجھے تمہارے بیان میں ایسی کوئی بات یاد نہیں ہے۔"

دانیال نے بے بسی سے نجم کی جانب دیکھا کہ وہ ہی اب اس کی کوئی مدد کر سکتا تھا۔

نجم جنجوعہ جواب تک ان دونوں کی گفتگو پوری توجہ سے سن رہا تھا...... اس نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر ریموٹ کنٹرول اپنی میز سے اٹھا کر ٹی وی آن کر دیا۔ اس

کا ویب کیمرا آن کرنے کے بعد اس نے واٹس ایپ کے ذریعے ایک نمبر پر ویڈیو کال کی۔

تھوڑی دیر تک اسکرین پر کالنگ لکھا نظر آیا جو پھر رنگنگ میں تبدیل ہو گیا۔ پھر اچانک سے ایک بزرگ خاتون کا مہربان چہرہ اسکرین پر نمودار ہوا۔

''کیسی ہو باربینہ؟'' بیگم عائشہ صدیقی کی آواز گونجی۔ ''بڑے عرصے بعد تمہاری صورت دیکھنے کو ملی۔''

☆☆☆

نجم جنجوعہ کو دانیال کے گیراج میں رقم اور جیولری کے بعد ایک خط ملا تھا۔ یہ خط بیگم صدیقی نے دانیال کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

خط میں تفصیل سے لکھا تھا، کہ وہ لاہور کے کس علاقے میں جا کر اپنے بھانجے احمد فریدی کے ساتھ رہتے ہوئے اپنی باقی ماندہ زندگی گزارے گی۔ اس نے ایمرجنسی کی صورت میں اپنا رابطہ نمبر بھی لکھ دیا تھا۔ خط میں ...... کچھ جیولرز کا ایڈریس بھی تھا جہاں وہ جا کر ڈائمنڈ بریسلیٹ اور سونے کا ہار بغیر کسی پریشانی کے بیچ سکتا تھا۔ رقم کے بارے میں بھی تفصیل سے بتایا تھا کہ کہاں کہاں پرانویسٹ کر کے وہ منافع کما سکتا تھا...... ساتھ میں یہ بھی ہدایت تھی کہ کم از کم ایک ڈیڑھ سال تک وہ ان چیزوں کو محفوظ رکھے اور موقع آنے پر ہی ان کا استعمال کرے ورنہ پولیس کی نظروں میں آنے کا خدشہ ہے۔

نجم نے صبح سویرے ہی دانیال کو آڑے ہاتھوں لیا اور اس سے سب کچھ اگلوا لیا۔ اسی کے کہنے پر نجم نے بیگم صدیقی سے رابطہ کیا تو وہ تمام تفصیل اسے بتانے لگی جواب وہ اپنی ہمدرد ملازمہ باربینہ کو بتا رہی تھی۔

نجم نے باربینہ کو بتایا تھا کہ یہ ایک عام موت تھی لیکن تفتیش کرنے پر اس موت میں اتنی پیچیدگی سامنے آئی کہ وہ پھر سے زندگی میں تبدیل ہو گئی تھی۔

''مجھے معاف کر دینا باربینہ...... لیکن یہ سب ضروری تھا۔'' بیگم صدیقی بولی۔ ''اگر میں تمہیں بتا کر یہ کرتی تو تم پولیس کی تفتیش کے آگے نہ ٹھہر پاتیں۔ تمہیں وہ دن یاد ہے جب میں نے تمہیں کہا تھا کہ میں فون پر ریکارڈنگ کروں گی؟''

''ہاں بیگم صاحبہ......'' باربینہ بے ساختہ بولی۔

''تمہارے جانے کے بعد میں اپنے بیڈروم کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تا کہ ان کی جانب جا سکوں اور ان کی باتیں ریکارڈ کر لوں...... لیکن اس سے پہلے ہی میری دانیال سے ملاقات ہو گئی۔'' بیگم صدیقی کی نگاہوں کا زاویہ معمولی سا تبدیل ہو کر دانیال کی جانب ہو گیا۔ ''اس نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ درندے کس قسم کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ اس کی مدد سے میری جان لینا چاہتے تھے۔ ان کا ارادہ پکا تھا اور کوئی بھی بات انہیں ان کی منصوبہ بندی سے پیچھے نہیں دھکیل سکتی تھی۔''

''تو آپ پولیس کے پاس کیوں نہیں گئیں؟'' باربینہ نے پوچھا۔

''اگر میں پولیس کے پاس جاتی تو میری جان لینے کی سازش پر انہیں بہت کم سزا ہوتی۔ وہ باہر نکل کر پھر کسی کی جان کے درپے ہو جاتے۔ میں نے ان کا کھیل انہی پر الٹانے کا سوچ لیا۔ تمہیں تتلی والی کہانی یاد ہے؟'' بیگم صدیقی کی آواز ٹی وی اسپیکر سے نکل کر کمرے میں گونج رہی تھی۔

''وہ تتلی جو سانپ کی شکل والے پر رکھتی ہے؟'' باربینہ نے کہا۔

''ہاں...... درندوں سے بچنے کا ایک طریقہ تو یہی ہے کہ آپ خود کو ایسے ظاہر کرو جیسے آپ بھی خطرناک سانپ ہو۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ خود سانپ بن جاؤ اور ان ظالموں کو ڈس لو جو آپ کی جان لینا چاہتے ہیں۔ میں کمزور تھی اور ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی...... وہ مجھے قتل کرنا چاہتے تھے اور میں نے انہیں اسی بات میں پھنسا دیا کہ انہوں نے مجھے قتل کر دیا۔ میں دانیال کی مدد نہیں چاہتی تھی لیکن اس نے خود ہی میرا ہر قدم پر ساتھ دیا۔''

''مجھے باربینہ کے ساتھ اپنی بچیوں زرینہ، شہر بینہ کی بھی بڑی فکر تھی۔'' دانیال نے قدرے غصے سے کہا۔ ''اس حرامزادے زریاب نے کہا تھا کہ وہ ہم سب پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ بس تب سے میرے دماغ میں تھا کہ اسے سبق سکھانا ہے۔''

''زریاب اور اس کی ماں نے ہر موقع پر میری ہلاکت کا سامان اکٹھا کرنے میں مدد کی جو خود ان کے ہی گلے پڑ گیا۔ الیکٹرک ٹیزر...... ٹیپ اور گاربیج بیگ بھی کا بندوبست انہوں نے خود ہی کیا تھا۔'' بیگم صدیقی نے قہقہہ لگایا۔ ''اب سوچو میرے شوہر نے جو کروڑوں میرے لیے چھوڑے تھے میں انہیں بغیر کسی پریشانی کے اڑا سکتی ہوں لیکن سوچتی ہوں کہ کہاں خرچ کروں؟''

''ہم نے ایک جعلی معاہدہ تیار کیا جس میں زریاب کو بیگم صدیقی نے اپنی جائداد فروخت کی ہو۔ پھر یہ اپنی

جیولری اور بہت سارا کیش لے کر چلی گئیں۔'' دانیال بولا تو اس کی آواز میں تشکر نمایاں تھا۔ ''انہوں نے کمال مہربانی سے مجھے بھی بہت کچھ دے دیا۔''

''بس یہ میرا بھانجا احمد فریدی بڑا خوددار ہے......''
بیگم صدیقی نے اسکرین سے نظریں ہٹاتے ہوئے اپنے کمرے میں ایک جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تھوڑا ڈرا ہوا بھی تھا کہ ہم اس طرح سے دھوکا دے کر خود ایک جرم کر رہے ہیں...... پھر میری جذباتی بلیک میلنگ کام آئی کہ یہ اپنی خالہ کو زندہ دیکھنا چاہتا ہے یا اس کا مرا منہ تب جا کر یہ کہیں راضی ہوا۔ ویسے بھی مجرموں کے مقابلے میں اپنی خالہ کو سپورٹ کرنے میں ہی فائدہ تھا۔''

اسی وقت اسکرین پر ایک پچاس اکیاون کے پیٹے میں ایک وضع دار شخص نمودار ہوا جس کا ایک بازو نہیں تھا۔ اس نے اپنا اکلوتا ہاتھ ہلا کر سب کو سلام کیا اور پھر اسکرین سے غائب ہو گیا۔

''میری وصیت میں میرا وارث احمد فریدی ہی تھا...... چھ ماہ بعد ہی پولیس نے سارا سامان یہاں بھجوا دیا۔ میں سچ مچ بھی مر جاتی تو میں نے اپنا سب کچھ اس کے نام ہی کر دیا تھا۔'' بیگم صدیقی کے لہجے میں نمی سی تھی۔

''جب زریاب اور اس کی ماں باہر تھے تو بیگم صاحبہ نے تمہیں شاپنگ کے لیے بھیج دیا اور کہا کہ اب کل ہی آنا۔'' دانیال نے تفصیل بتانا شروع کی۔ ''ہم دونوں پھر ٹیکسی کی طرف گئے اور میں نے گلوز پہن لیے۔ زریاب کے ہتھوڑے پر بیگم صاحبہ نے اپنا خون لگایا اور کچھ بال توڑ کر لگائے۔ پھر ہم نے ان کے منہ پر تھوڑی دیر کے لیے ٹیپ چپکائی۔ اسی ٹیپ پر مریم کا برش رگڑا تا کہ اس کا ڈی این اے بھی آجائے۔ بیگم صاحبہ نے ٹیزر اپنے جسم میں چھپایا تا کہ ایسا لگے کہ اسے ان پر استعمال کیا گیا ہے۔ آخر میں، میں نے بیگم صاحبہ کی مدد سے زریاب کے لیپ ٹاپ سے بینک اکاؤنٹ ہیک کرنے کی بھی کوشش کی۔''

''لگتا ہے جاسوسی فلمیں بہت شوق سے دیکھتی رہی ہیں بیگم صدیقی۔'' نجم جنجویہ سے رہا نہ گیا تو وہ بول پڑا۔ ''اتنی باریک بینی سے اپنے قتل کا ڈراما رچانے والی خاتون کوئی عام عورت نہیں ہو سکتی۔''

''صرف جاسوسی فلمیں نہیں دیکھتی، میں نے جاسوسی ناول بھی بہت پڑھے ہیں۔'' بیگم صدیقی نے اس کی ستائش کا مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''اب میرے پاس وقت ہی وقت ہے تو میں فلمیں، ڈرامے اور ناول سب سے فائدہ اٹھاؤں گی۔''

''مجھے تم سے بہت محبت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں نے شادی کے بعد تمہاری ایسے قدر نہیں کی جیسے کرنا چاہیے تھی لیکن مجھے معاف کر دینا کہ میں نے تم سے جھوٹ بولا۔'' دانیال اس وقت باربینہ کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ بیگم صدیقی کو نجم سے باتیں کرتا دیکھ کر اس نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔

''باربینہ اس بندے کا خیال کرنا...... اس نے میری خاطر اتنا بڑا رسک لیا۔ اس کی خود کی جان بھی جا سکتی تھی۔'' بیگم صدیقی نے نصیحت بھی کر دی۔ ''میں تمہیں یقیناً اپنے پاس آنے کی دعوت دیتی لیکن کسی مردہ عورت کے پاس جانے کا سوچنا بھی نہیں۔''

''اوہ بس بھی کریں بیگم صاحبہ۔'' باربینہ ہنسنے لگی۔
''خدا حافظ پیاری باربینہ۔'' بیگم صدیقی کی آواز آئی اور اس کے بعد اسکرین سے اس کا چہرہ غائب ہو گیا۔

باربینہ نے بھی اس دوران ہاتھ ہلاتے ہوئے الوداع کہا۔

سب جب نجم کے آفس سے چلے گئے تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کا یہ کیس خوش اسلوبی کے ساتھ اچھے موڑ پر اختتام پذیر ہوا تھا۔

بیگم صدیقی سے صبح بات ہونے پر اسے تقریباً سال پہلے کا واقعہ بھی یاد آ گیا تھا جب اس نے میچ کے دوران مریم پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی اور زریاب نے اسے آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

بہر حال وہ خوش تھا کہ اس دن وہ اپنی حرکت میں ناکام رہا تھا مزید خوشی اسے اس بات کی ہو رہی تھی کہ بیگم صدیقی نے اسے اپنی زبان بند رکھنے کے لیے بیس لاکھ کی رقم اس کے بینک اکاؤنٹ میں بھیج دی تھی۔

اس سب کھیل تماشے میں اس کی بہترین کمائی ہو گئی تھی تو خوش ہونا تو بنتا تھا۔

''اب تو سب میچ ختم ہیں تو میں کس پر رقم لگاؤں گا؟'' نجم کے ذہن میں سوچ آئی...... پھر اس کا خیال آیا تو اس نے فوراً ہی اپنے بینک اکاؤنٹ کی ایپ فون پر کھولی اور دس لاکھ ایک ایسی تنظیم کو ڈونیٹ کر دیے جو غزہ، فلسطین میں بھوکے بچوں کو کھانا کھلانے کا اہتمام کرتی تھی۔

نجم کے دل کو ایسا سکون محسوس ہوا جو آج تک پیسے خرچ کر کے نہیں ہوا تھا...... وہ مسکراتے ہوئے آج خود کو فلمی نہیں بلکہ اصلی زندگی کا ہیرو سمجھ رہا تھا۔

آتش خون

احمد سلیم سلیمی

خواہش اور کوشش کا ساتھ ہو تو مقصد تک قدم پہنچ جاتے ہیں... مگر زبردستی کی خواہش... ضد اور انا کے زیراثر رہنے والے کبھی اپنا مقصد نہیں پاتے... بدفطرت لوگ ہمیشہ بے چینی کا شکار رہتے ہیں... کیونکہ ان کی نظریں ہمیشہ دوسرے کے مال و اسباب پر گڑی رہتی ہیں... ان کی خباثت... منافقت اور انتہائی لالچی طبیعت کے سامنے خونی رشتے بھی اپنا وجود کھو دیتے ہیں... زر اور زمین کی ازلی جنگ کا دردناک اور خطرناک احوال... اس آتش خون کی لپیٹ میں تمام تر رشتے سلگ رہے تھے... لہولہان ہورہے تھے...

اس شخص کا المیہ جس کی نفرت، انتقام اور دشمنی نے عزت نیلام کردی تھی......

شڑاپ...... شڑاپ...... چابک برس رہا تھا۔ سخت جھلسا دینے والی دھوپ تھی۔ اس کے ننگے بدن پر چابک کا ہر وار جیسے آگ لگا رہا تھا۔

شڑاپ......شڑاپ...... کہا جاتا ہے اوپر سے رحمت برستی ہے مگر اس وقت زحمت کی انتہا تھی کہ اس نوجوان کے جسم پر چابک برس رہا تھا۔ مارنے والا ایسا سنگ دل تھا کہ اس طرح وار کرتا تھا جو دور تک جسم پر ایک خونی لکیر چھوڑتا ہوا الگ ہوتا۔ اس کے جوان بدن کی جلد پھٹ گئی تھی۔ خون کے چھینٹے یہاں وہاں پڑ رہے تھے۔

وہ ایک وسیع احاطے میں کھلے آسمان کے نیچے ایک ستون سے بندھا ہوا تھا۔ دو مضبوط جسامت کے بندے باری باری اس پر چابک سے ستم کاری کررہے تھے۔

انسانی جسم ایک خاص حد تک تکلیف برداشت کرسکتا ہے۔ اس کے بعد بے حسی طاری ہوجاتی ہے۔ جو بے ہوشی یا پھر موت کی جانب پیش قدمی کی ابتدائی صورت ہوتی ہے۔ اس نوجوان نے بھی بہت برداشت کیا تھا بلکہ پچھلے کئی دنوں سے ستم کے یہ انداز جھیل رہا تھا۔ اب درد کی شدت اس بلا کی تھی کہ اس کی قوتِ برداشت جواب دے رہی تھی۔ اس کی چیخیں بھی اب چابک کی شڑاپ، شڑاپ میں دب رہی تھیں۔ ستون کے ساتھ سیدھا کھڑے ہونا بھی اب اس کے بس میں نہیں رہا تھا۔

اسی وقت برآمدے میں آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے ایک شخص کی گونجتی آواز سنائی دی۔ ''اپنے ہاتھ روک لو شیر خان! ایسا نہ ہو وقت سے پہلے یہ کم بخت مرجائے۔'' وہ سردار حاکم علی خان تھا۔

چابک مارنے والے نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ سردار حاکم علی آرام کرسی سے اٹھا۔ وہ مضبوط جسامت کا پچاس پچپن برس کا شخص تھا۔ چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی مگر بھاری مونچھوں نے چہرے کو رعب دار بنادیا تھا۔

وہ بھاری قدموں سے چلتا ہوا ستون سے بندھے اس نوجوان کے پاس آیا۔ شدید نقاہت کی وجہ سے نوجوان کا جسم آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ رسّی سے بندھا نہ ہوتا تو اس کے لیے کھڑا ہونا بھی دشوار ہوتا۔

سردار حاکم اس کے سامنے گیا۔ اس کے ڈھلکے سر کو بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دیا پھر غراتی آواز میں کہا۔ ''بہت اونچا اُڑ رہے تھے تم۔ میں نے کہا تھا نا سردار حاکم علی سے ٹکر مت لو۔ ورنہ زندگی عذاب بنادوں گا۔''

اس نوجوان نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ تکلیف اور نقاہت کے باوجود اس کی آنکھوں میں سرکشی بھی تھی، سرفروشی بھی۔

اس کے کپکپاتے ہونٹوں سے آواز نکلی۔ ''م...... میرا جسم تمہارے قبضے میں ہے۔ تم بااختیار ہو۔ میں مجبور ہوں مگر مجھے جھکا نہیں سکو گے۔ جو تم چاہتے ہو، مجھ سے اگلوا نہیں سکو گے۔''

سردار حاکم علی نے اپنے بھاری ہاتھ سے اسے طمانچہ مارا پھر گرج کر کہا۔ ''تمہارا تو باپ بھی بولے گا۔ ابھی تم نے دیکھا کیا ہے؟ ستم کے ایسے ایسے طریقے تم پر آزمائے جائیں گے کہ تم کیا، قبر کے مردے بھی بول پڑیں گے۔''

نوجوان نحیف آواز میں بولا۔ ''تمہارا ہر حربہ ناکام ہوگا سردار چچا! تمہاری بات مان کر اپنے مرحوم بابا کی روح کو اذیت کیسے پہنچا سکتا ہوں؟''

سردار حاکم... کا غصہ بے قابو ہونے لگا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے نوجوان کے... طمانچے مارنے لگا۔ ساتھ ہی چیخ چیخ کر اسے گالیاں اور خطرناک نتائج کی دھمکیاں دینے لگا۔

نوجوان پہلے ہی بے حال تھا۔ سردار حاکم علی کے مضبوط ہاتھوں کی مار مزید سہار نہ سکا۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔ سردار حاکم علی نے غصے اور نفرت سے اس کے بے ہوش جسم کی طرف دیکھا۔ گرج کر اپنے کارندوں سے کہا۔ ''اس بدبخت پر ٹھنڈا پانی ڈالو..... اسے جلدی سے ہوش میں لاؤ۔ آج اس کے منہ سے اپنے مقصد کی بات نکلوا کے ہی دم لوں گا۔''

اس کے کارندے فوراً ایک بالٹی میں پانی لے آئے۔ ستون سے بندھے نوجوان کے سر پر پوری بالٹی انڈیل دی، نوجوان ایک ذرا کسمسایا۔ اسی وقت دوسری بالٹی کا پانی بھی اس کے سر پر ڈالو دیا گیا۔ نوجوان کے منہ اور ناک میں پانی چلا گیا۔ وہ کھانسنے لگا۔

سردار حاکم... دوبارہ اس کے سامنے آیا۔ اس کے بھیگے بالوں کو پکڑ کر جھٹکا دیا پھر غراتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں بے ہوش ہونے نہیں دوں گا حرام زادے۔ تم ہوش میں ہی رہو گے اور درد سے تڑپتے رہو گے۔ تمہارا وہ حشر کروں گا کہ گڑگڑا کر رحم کی بھیک مانگتے رہو گے۔''

نوجوان نیم بے ہوشی کی حالت میں رسّی سے جھول رہا تھا۔ سردار حاکم علی نے اپنے کارندے سے چابک لے لیا۔ نیم بے ہوش نوجوان کو مارنے کے لیے ہاتھ بلند کرلیا۔

اسی وقت حویلی کا پھاٹک کھل گیا۔ ایک جیپ بہت تیزی سے اندر آئی۔ قریب آکے رک گئی۔ ایک جوان چھلانگ مار کے نیچے اترا اور اضطراری لہجے میں کہا۔ ''سردار صاحب! غضب ہوگیا۔ اناج کے گودام میں آگ لگ گئی ہے۔ بہت نقصان ہوا ہے۔''

سردار حاکم نے چونک کر اس نوجوان کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت طاری ہوئی تھی۔

اس نے دہاڑ کر کہا۔ ''کیا بکواس کرتے ہو؟ کیسے لگی ہے آگ؟ تم لوگ کہاں مرگئے تھے؟''

''بس..... سردار صاحب! شدید گرمی کی وجہ سے

ہم اپنے کمرے میں تھے۔ جب دھواں پھیلا اور آگ کے شعلے بلند ہوئے تب ہمیں پتا چلا۔ اس وقت تک آگ اتنی پھیل چکی تھی کہ بجھانے کا موقع ہی نہیں تھا۔" وہ نوجوان لرزتی آواز میں بولا۔

سردار حاکم نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چابک کو زور سے اس کی پیٹھ پر دے مارا۔ وہ نوجوان درد کی شدت سے بلبلانے لگا۔

سردار حاکم ... نے چابک ایک طرف پھینک کر گرجتے ہوئے اپنے کارندوں سے کہا۔ "کھڑے کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو حرام خورو! فوراً گاڑیاں اور گھوڑے نکال کے تیار ہو جاؤ۔ ہم گودام کی طرف جائیں گے۔"

اس کے بعد پلٹ کر شیر خان نامی کارندے سے کہا۔ "اس حرام زادے کو اسی طرح ستون سے بندھا چھوڑ دو۔ اسے کھانا پینا کچھ بھی مت دو۔"

ذرا سی دیر میں دو تین جیپوں اور پانچ چھ گھوڑوں پر سوار وہ سب حویلی کے پھاٹک سے باہر نکل گئے۔ اب حویلی کے اندر شیر خان کے علاوہ پھاٹک پر متعین دربان رہ گیا تھا۔

اس احاطے کے ایک طرف سردار حاکم کا اصطبل تھا۔ جس میں اعلیٰ نسل کے گھوڑے رکھے جاتے تھے۔ اسی جگہ حویلی کے ملازموں اور اس کے کارندوں کے لیے رہائشی مکانات بنے ہوئے تھے۔ مشرق کی جانب احاطے کی دیوار کی دوسری طرف سردار حاکم ... کی خاندانی حویلی تھی۔ قدیم طرز کی یہ وسیع و عریض دو منزلہ حویلی سردار حاکم ... کے والد سردار ناظم علی نے بنوائی تھی۔ وہ جب تک زندہ تھے، ان کے دونوں بیٹے سردار حاکم علی اور اس سے بڑے سردار قاسم علی اکٹھے رہتے تھے۔ سردار ناظم ... کے انتقال کے بعد دنوں بھائیوں میں زمین کے بٹوارے کو لے کر زبردست اختلافات پیدا ہو گئے ... بڑا بھائی سردار قاسم علی ایک ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ زمین کی تقسیم کو بنیاد بنا کر دونوں بھائیوں میں نفرت اور دشمنی کی دیواریں کھڑی ہونے لگی ہیں تو اس نے حویلی چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔

یہ علاقہ گنٹھل کہلاتا تھا۔ ذرا فاصلے پر نالا تھا۔ اس کی دوسری طرف بھی ان کی جاگیر تھی۔ وہ علاقہ منتھل کہلاتا تھا۔ منتھل کا رقبہ گنٹھل سے زیادہ تھا۔ وہ زمین ... زیادہ زرخیز تھی۔ وہاں تقریباً دو سو گھرانے موجود تھے۔ جو سب کے سب ان کے وفادار تھے۔ منتھل میں ان کی ایک چھوٹی حویلی تھی۔ سردار قاسم اپنی مختصر سی فیملی کے ساتھ وہاں منتقل ہو گیا۔ اس کے تین بچے تھے۔ بڑا بیٹا بابر علی لاہور میں پڑھتا تھا۔ اس سے چھوٹی بیٹی تھی۔ حویلی منتقل ہونے کے چند مہینے بعد ایک بیٹا پیدا ہوا تھا۔

سردار ناظم کی جاگیر تقریباً تین سو کنال پر پھیلی ہوئی تھی۔ دو سو کنال سے زیادہ نالے کی دوسری سمت منتھل میں جبکہ ایک سو کنال کے آس پاس زمین گنٹھل میں پرانی حویلی کے اطراف میں پھیلی ہوئی تھی۔ منتھل کی یہ زمینیں صدیوں سے ان کے خاندان کی ملکیت تھیں۔ نالے کے دونوں جانب دور دور تک پھیلی ہوئی زمین میں متعدد پھل دار درخت موجود تھے۔ جن سے لاکھوں روپے حاصل ہوتے تھے۔ سالانہ سیکڑوں من اناج ان زمینوں سے وصول کرتے تھے۔

چھوٹا بھائی سردار حاکم عیاش طبع تھا۔ جوئے اور عورت بازی کا شوقین تھا۔ باپ کی زندگی میں بھی بے لگام تھا۔ اسی وجہ سے سردار ناظم اس سے اکثر نالاں رہتے تھے۔ اس لیے بعد میں جب جاگیر تقسیم کی تو بڑے بیٹے سردار قاسم علی کو نالے کی دوسری طرف منتھل کی ساری زمینیں دے دی تھیں۔ چھوٹے بیٹے سردار حاکم کو گنٹھل کی کم زرخیز اور کم رقبے کی زمین دے دی تھی۔

سردار ناظم کی وفات کے بعد یہ تقسیم ان دونوں بھائیوں کے درمیان اختلافات اور جھگڑوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ بن گئی۔ پہلے زبانی کلامی بحث و تکرار ہوتی رہی۔ اس کے بعد معاملہ عدالت میں چلا گیا۔

دس سالوں تک اس کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ دونوں بھائی ایک دوسرے سے دور دور رہے۔ ان کے گھر والے بھی ایک دوسرے کے لیے اجنبی بنے رہے۔ دس سال بعد ایک رات اچانک سردار قاسم علی کے خاندان پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

اس رات حویلی میں ڈاکو گھس آئے۔ میاں بیوی اور ان کے دس سال کے بچے کو قتل کر دیا۔ بڑا بیٹا بابر علی لاہور کی یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ بیٹی شادی ہو کر اپنی سسرال میں تھی۔ اس وجہ سے وہ دونوں محفوظ رہے۔

ڈاکوؤں نے حویلی کا سارا قیمتی سامان لوٹ لیا تھا۔ تمام الماریوں اور صندوقوں کا سامان الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ شاید سردار قاسم نے مزاحمت کی تھی اس لیے ردعمل کے طور پر ان سب کو قتل کر دیا تھا۔

سردار قاسم کا اس پورے علاقے میں بڑا اثر و رسوخ

تھا۔ وہ لوگوں میں بڑا مقبول تھا۔ بڑے خاندان کا اور بڑی حیثیت کا ہونے کے باوجود انکساری دکھاتا تھا۔ ہر ایک سے خوش مزاجی سے ملتا تھا۔ غریبوں کی مدد کرتا تھا۔ اس کے اخلاق اور انسانی ہمدردی کی وجہ سے اسے متشخل کے لوگ دل سے چاہتے تھے۔

جب ڈاکوؤں نے اسے اور اس کی بیوی بچے کو قتل کر دیا تو پورے علاقے میں کہرام مچ گیا۔ بہت سے جوانوں نے اس کے خون کا بدلہ لینے کا عہد کر لیا۔ عوامی ردِعمل کی وجہ سے پولیس نے بھی بڑے زور شور کے ساتھ ڈاکوؤں کی تلاش شروع کی مگر بہت دن گزرنے کے باوجود ان قاتل ڈاکوؤں کا کچھ پتا نہ چل سکا۔

اس دوران لاہور میں موجود اس کا بڑا بیٹا بابر واپس آ گیا۔ اس کی دنیا اجڑ گئی تھی۔ ماں باپ اور چھوٹے بھائی کا قتل ایسا عظیم سانحہ تھا کہ وہ کئی دنوں تک صدمے سے چور حویلی میں پڑا رہا۔ کچھ وقت بعد رفتہ رفتہ اس کی زندگی معمول پر آنے لگی۔

اگرچہ وہ پچھلے کئی سالوں سے تعلیم کے حصول کی وجہ سے لاہور میں رہتا تھا۔ اس کے باوجود متشخل کے لوگ اس کے والد سردار قاسم کی وجہ سے اس سے بھی محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔ وہ جہاں سے گزرتا، لوگ اسے دیکھ کر سر جھکا کر اسے عزت و احترام سے سلام کرتے۔ اس کی بات کو حکم کا درجہ سمجھتے۔ اس کے اشارے پر کوئی بھی کام کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتے۔

سردار حاکم کی حویلی کے وسیع احاطے میں چلچلاتی دھوپ میں، ستون سے بندھا نیم بے ہوش نوجوان وہی سردار بابر تھا۔

☆☆☆

احاطے میں دور دور تک کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ دھوپ ایسی تیز تھی کہ ذرا سی دیر کے لیے بھی اس کی حدت ناقابلِ برداشت لگتی تھی۔ سردار حاکم کا خاص کارندہ شیر خان بھی گرمی کی شدت کی وجہ سے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اسے ستون سے بندھے نوجوان کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اس لیے کمرے میں آ کر چارپائی پر لیٹ گیا اور ذرا ہی دیر میں سو گیا۔

حویلی کے محافظ سردار حاکم کے ساتھ چلے گئے تھے۔ شیر خان کے علاوہ پھاٹک کے پاس دربان موجود تھا۔ احاطے کے بیچوں بیچ وہ نوجوان جو سردار قاسم کا جواں سال بیٹا بابر تھا، نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا۔ احاطہ ایسا ویران لگتا تھا کہ بہ ظاہر کڑی دھوپ کے سوا کسی کی نظر اس پر نہیں پڑ رہی تھی مگر ایسا نہیں تھا۔

حویلی کی بالائی منزل کی ایک کھڑکی سے دو غم ناک آنکھیں یہ سارا منظر دیکھ رہی تھیں۔ کچھ دیر قبل جب سردار حاکم کی موجودگی میں بابر پر چابک سے تشدد کیا جا رہا تھا، وہ بھی اس کے جسم پر پڑنے والے ہر وار کے ساتھ اذیت محسوس کرتی تھی۔ بابر کی کراہیں اس تک نہیں پہنچتی تھیں لیکن وہ اس کا درد محسوس کر کے سسکیاں لیتی تھی۔

اس کا نام شاہدہ تھا۔ وہ سردار حاکم کی بیٹی تھی۔ وہ اپنے باپ کی سخت مزاجی اور سنگ دلی سے واقف تھی۔ اس لیے بھیگی آنکھوں اور تڑپتے دل کے باوجود بابر کو ان کے ستم سے بچانے کی ہمت نہیں کر سکی تھی۔

جب سردار حاکم اپنے کارندوں کے ساتھ افراتفری میں حویلی سے چلا گیا تو وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ گئی اور دوڑتی ہوئی حویلی کے مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی اس احاطے کی طرف آنے لگی۔

چاروں طرف نگاہ دوڑاتی اور اطمینان کے ساتھ اصطبل کی طرف آ گئی۔ حویلی کے اندر سے اصطبل کے لیے ایک چھوٹا دروازہ کھلتا تھا۔ اس کے ذریعے وہ اصطبل میں داخل ہو گئی پھر وہاں سے ہو کر بیرونی احاطے میں آ گئی۔ یہاں وہاں اسے کوئی بھی کارندہ نظر نہیں آیا۔ احاطے کے درمیان بابر ستون سے بندھا جھول رہا تھا۔

وہ دوڑنے کے انداز میں چلتی ہوئی اس کے قریب گئی۔ اسے بے حس و حرکت دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو اس کا دل بھی جیسے ساکت ہو گیا۔ اس نے اضطراری طور پر بابر کے گال تھپتھپائے۔ وہ اک ذرا کسمسایا۔ بڑی مشکل سے آنکھیں ذرا سی کھول کر اسے دیکھنے کی کوشش کی۔ نقاہت کے باوجود شاہدہ کو پہچان کر اسے ٹکٹکی باندھ کے دیکھتا رہا۔

شاہدہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”بابر بھائی! تم ٹھیک ہو نا! اف ظالموں نے تمہارا... کیا حال کر دیا ہے؟“

اس نے نحیف سی آواز میں کہا۔ ”ششش...... شادو! تم کیوں آئی ہو؟ چلی جاؤ تمہارے بابا بہت غصہ ہوں گے۔“

”تم اس کی فکر مت کرو۔“ وہ دکھ سے بولی۔ ”وہ اپنے کارندوں کے ساتھ باہر گئے ہیں۔ یہ بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟“

”تت...... تم کچھ نہیں کر سکتی ہو شادو!“ بابر کمزوری آواز میں بولا۔ ”بس میرے منہ میں تھوڑا سا پانی ڈال دو۔ بہت پیاس لگی ہے۔“

اس نے تڑپ کر کہا۔ ”مجھ سے تمہاری یہ حالت دیکھی نہیں جاتی ہے بابر بھائی! مجھے بتاؤ۔ اگر حویلی سے باہر نکل جانے کی ہمت ہے تو ابھی ستون سے آزاد کرا دیتی ہوں۔“

”نن...... نہیں شادو! میں اپنی ٹانگوں پر کھڑا ابھی نہیں رہ سکتا۔ ظالموں نے مجھے بہت مارا ہے۔ تم بس ایک گلاس پانی لا کر میرے ہونٹوں سے لگا دو۔ جلدی کرو۔ وہ ظالم شیر خان یہیں کہیں ہے۔“

حویلی کا اندرونی حصہ کافی فاصلے پر تھا۔ وہاں سے پانی لانے تک بہت دیر ہو جاتی۔ وہ تیزی سے دوڑنے کے انداز میں چلتی ہوئی اصطبل کی طرف آئی۔ اس کے ساتھ ملازموں کے رہائشی کمرے تھے۔ اس نے ایک کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اسے زور سے اندر دھکیلا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ اندر ایک ادھیڑ عمر شخص چارپائی پر لیٹا تھا۔ گرمی کی وجہ سے اس نے قمیص بھی اتار دی تھی۔ شاہدہ کو دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ جلدی جلدی قمیص پہننے لگا۔ وہ حویلی کا پرانا خادم جمال خان تھا۔

”شاہدہ بیٹی! کیا بات ہے؟ اتنی پریشان کیوں ہو؟“ اس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”جمال چچا! تم جانتے ہو بابا کدھر گئے ہیں؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔

”ہاں میں نے شیر خان سے سنا ہے۔ اناج کے گودام میں آگ لگی ہے۔ سردار صاحب وہاں گئے ہیں۔“

شاہدہ نے یہ سن کر پریشان ہونے کے بجائے طمانیت بھری سانس لی۔ اسے یقین ہوا بابا جلدی واپس آنے والے نہیں۔

وہ بولی۔ ”جمال چچا! تم ایک گلاس میں پانی لے جا کر بابر بھائی کو پلا دو۔ میں حویلی کے اندر سے ہو کر جلدی آ جاتی ہوں۔“

جمال خان متوحش نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”بیٹی! سردار صاحب کو پتا چلا تو مجھے نہیں بخشیں گے۔ تم ان کے غصے سے واقف ہو۔“

وہ طیش سے بولی۔ ”تمہارے سردار صاحب کے نزدیک انسان کی کوئی قدر نہیں۔ انہیں اپنا مفاد عزیز ہے۔ تم سردار دادا کے دور سے حویلی میں موجود ہو۔ بچپن میں بابر بھائی بھی تمہاری گود میں کھیلا ہے۔ کیا اس کی حالت دیکھ کر کوئی ہمدردی کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا؟“

اس نے دکھ سے کہا۔ ”میرا دل خون کے آنسو روتا ہے بیٹی! مگر تمہارے بابا کا مزاج بہت سخت ہے۔ میں ڈرتا ہوں اس بڑھاپے میں خدا جانے وہ میرے ساتھ کیسا سلوک کریں گے؟“

”کچھ نہیں ہوگا۔ میں اُن کی بیٹی ہوں۔ میں جو کہتی ہوں وہ کرو۔ میں کون سا اسے یہاں سے بھگانے کا کہہ رہی ہوں۔ اسے ایک گلاس پانی پلانا ہے۔ میں تب تک حویلی سے اس کے زخموں پر لگانے کے لیے مرہم لے کر آتی ہوں۔“

”شیر خان کدھر ہے؟ کیا وہ ایسا کرنے دے گا؟“ اس نے فکرمندی سے کہا۔

”وہ کہیں نظر نہیں آ رہا۔ شاید گرمی کی وجہ سے اپنے کمرے میں جا کر سو گیا ہے۔ اسے خبر ہونے تک ہم اپنا کام ختم کر لیں گے۔“

وہ یہ کہہ کر تیز تیز چلتی حویلی کے اندرونی حصے کی طرف جانے لگی۔ ذرا دیر بعد زخموں پر لگانے کے لیے مرہم، گرم پانی اور ایک نرم کپڑا بھی لے کر دوڑتی ہوئی آ گئی۔ اس وقت تک جمال خان نے بابر کو پانی پلا دیا تھا۔

شاہدہ نے گرم پانی میں کپڑا بھگو کے اس کے زخموں کو صاف کیا۔ اپنے نرم نرم ہاتھوں سے ان زخموں پر مرہم لگایا۔ بابر بار بار اسے منع کرتا رہا۔ اس کے بابا سردار حاکم کے غصے کی بات کرتا رہا۔

شاہدہ نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔ ”بابر بھائی! تم بابا کے غصے کی فکر مت کرو۔ میں ان کی گالیاں بھی، ان کے طمانچے بھی برداشت کر لوں گی۔ بس تمہیں تھوڑا سا آرام مل جائے۔“

بابر گہری عقیدت اور محبت سے اسے دیکھتا رہا۔ سردار حاکم جتنا بے رحم اور خود غرض تھا، اس کے باقی گھر والے بھی ویسے ہی تھے۔ ان سب میں ایک شاہدہ تھی جو شروع سے اس کے لیے ہمدردی اور محبت کے جذبات رکھتی تھی۔

بچپن سے ہی وہ دونوں ایک دوسرے کے دوست بھی تھے، چچازاد بھائی بہن بھی۔ جب وہ سب ایک ہی حویلی میں رہتے تھے تو ساتھ ساتھ کھیلتے کودتے بڑے ہوئے تھے۔ شاہدہ اس سے تین سال چھوٹی تھی۔

جب اس نے گرم پانی سے زخم صاف کر کے مرہم لگایا تو بابر کافی آرام محسوس کرنے لگا۔ جمال خان ایسا خوف زدہ تھا کہ پانی پلا کے وہاں سے غائب ہو گیا۔ شیر خان بھی اپنے کمرے میں سویا پڑا تھا۔ شاہدہ اطمینان سے اس کے زخمی زخمی بدن پر مرہم لگاتی رہی۔ اس وقت تک دھوپ

رخصت ہوگئی تھی۔ اس وسیع احاطے کی زمین سے اٹھ کر بلند دیواروں پر چڑھنے لگی تھی۔

اچانک ہی پھاٹک کی طرف سے ٹھائیں ٹھائیں گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ان دونوں نے ٹھٹک کر اُدھر دیکھا۔ پھر ایک دم اچھل پڑے۔ یکایک پھاٹک کھل گیا تھا۔ ایک کھلی چھت کی جیپ تیزی سے لہراتی ہوئی اندر آگئی تھی۔ اس پر اپنا چہرہ چھپائے چار پانچ آدمی سوار تھے۔ جیپ ان کے پاس آکے رک گئی۔ تیزی سے نقاب پوش آدمی چھلانگیں مار کے نیچے اترے۔ ان کے ہاتھوں میں جدید خودکار اسلحہ موجود تھا۔ ایک نقاب پوش نے شاہدہ کی طرف بندوق تان کر کہا کہ وہ بابر سے دور چلی جائے۔ دوسرے نقاب پوش نے بابر کو ستون سے آزاد کرانے کے لیے ایک خنجر سے رسیاں کاٹنی شروع کردی۔

شاہدہ مضطرب لہجے میں بولی۔ ''تم کون ہو؟ بابر کو کہاں لے جارہے ہو؟''

نقاب پوش نے ڈپٹ کر کہا۔ ''ہم کون ہیں، یہ جاننا ضروری نہیں۔ کہاں لے جارہے ہیں، یہ بتانا بھی ضروری نہیں۔''

اسی وقت برآمدے کی طرف سے للکارتی آواز سنائی دی۔ ''خبردار! تم سب میرے ریوالور کے نشانے پر ہو۔ اپنے ہتھیار پھینک دو۔''

وہ شیر خان تھا۔ فائرنگ، اور باتوں کے شور سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

ایک نقاب پوش نے چلا کر کہا۔ ''تمہارے ایک ریوالور کے مقابلے میں ہمارے پاس چار کلاشنکوف ہیں۔ تم ایک گولی چلاؤ گے تو ہم تمہیں چھلنی کردیں گے اس لیے شرافت سے اپنا ریوالور ہمارے حوالے کردو۔''

''مجھے اپنی موت کا ڈر نہیں۔ میرے جیتے جی تم قیدی کو کہیں نہیں لے جاسکتے۔'' اس نے بے خوفی سے کہا۔ ساتھ ہی اس نے فائر کیا۔ گولی سامنے زمین پر آکر لگی۔ اس کے ردِعمل میں ایک نقاب پوش نے تڑتڑاتڑ ایک پورا برسٹ فائر کیا۔ گولیاں شیر خان کے دائیں بائیں برآمدے کی دیوار میں پیوست ہوگئیں۔

شیر خان اپنے مالک کا ایسا وفادار تھا کہ نقاب پوش کی فائرنگ اور اس کی دھمکی کا بہ ظاہر کچھ اثر نہیں لیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا برآمدے کے سرے تک آیا۔ وہاں چھوٹا سا زینہ تھا۔ ابھی اس نے زینے پر قدم رکھا تھا کہ اسی وقت ایک نقاب پوش نے قریب ہی حیران پریشان کھڑی شاہدہ کو جھپٹ کر پکڑ لیا۔ اپنی کلاشنکوف اس کی گردن سے لگا کر شیر خان سے مخاطب ہوا۔ ''شکر کرو، ہم مفت میں کسی کی جان نہیں لینا چاہتے۔ اگر تم ایک بھی زینہ اتر کر نیچے آئے تو مجبور ہو کر تمہارے ساتھ ساتھ تمہارے سردار کی بیٹی کو بھی گولی ماردیں گے۔''

شاہدہ سمجھ گئی تھی، نقاب پوش بابر کے بندے تھے۔ وہ بھی چاہتی تھی شیر خان مزاحمت ترک کردے۔ اس نے خوف زدہ آواز میں کہا۔ ''شیر خان! پاگل مت بنو۔ ان کی بات مان لو۔ ورنہ ہم دونوں کی جان خطرے میں پڑے گی۔''

شیر خان کے چہرے پر تذبذب کے آثار نمایاں تھے۔ بالآخر اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ اپنا ریوالور فرش پر رکھ دیا۔ ایک نقاب پوش اپنی کلاشنکوف اس کی طرف تان کر قریب گیا۔ ریوالور اٹھایا اور یکایک پلٹ کر کلاشنکوف کا بٹ اس کے سر پر دے مارا۔ وہ چیخ مار کے کراہتا ہوا برآمدے کے زینے سے ٹکراتا ہوا کچی زمین پر آکے ڈھے گیا۔

وہ نقاب پوش اس کے بے ہوش جسم پر نفرت سے تھوکتے ہوئے بولا۔ ''ان کتوں نے بابر بھائی کو جتنی اذیت دی ہے، اس کے بدلے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے چاہئیں لیکن ہمیں اس کی اجازت نہیں۔''

پھر وہ بابر سے بولا۔ ''بابر بھائی! آپ کو یہاں سے نکالنے کے لیے ہم نے سردار حاکم کے گودام میں آگ لگائی تھی تاکہ وہ اپنے کارندوں کو لے کر یہاں سے چلا جائے۔ اللہ کا شکر ہے ہماری حکمتِ عملی کامیاب ہوگئی۔ اب آپ جیپ میں بیٹھ جائیں۔''

بابر کو ایک نقاب پوش نے سہارا دے رکھا تھا۔ اس نے شاہدہ کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ پاس گئی تو جذبوں کی شدت سے کہا۔

''شاہدہ! حویلی کی بلند بلند دیواروں کے اندر اذیتیں سہتے ہوئے اور نفرتیں جھیلتے ہوئے بس تمہارا خیال مجھے توانائی دیتا تھا۔ میں نہیں جانتا آئندہ کن حالات میں تمہارے سامنے آؤں گا۔ تمہارے ابا نے میرے ساتھ اعلانِ جنگ کر رکھا ہے۔ میرا جواب بھی جنگی حکمتِ عملی کے مطابق جارحانہ ہوگا۔ مگر ایک بات سمجھ لو۔ میں جنگ کے بلند ہوتے ہوئے شعلوں کے اندر بھی تمہارے خلوص اور تمہاری محبت کو یاد رکھوں گا۔''

یہ کہہ کر وہ اپنے نقاب پوش ساتھی کی مدد سے جیپ

میں بیٹھ گیا۔ باقی نقاب پوش بھی سوار ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی جیپ بڑی تیزی سے چلتی ہوئی پھاٹک سے باہر نکل گئی۔
شاہدہ یک ٹک اسے جاتے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے جھلمل کر رہی تھیں۔ اس نے ان آنسوؤں کو صاف نہیں کیا۔ انہیں آنکھوں سے چھلکنے دیا۔ ان آنسوؤں کی نمی میں اسے بڑی راحت اور طمانیت کا احساس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

سردار حاکم غم و غصے کی شدت سے بے قابو ہو رہا تھا۔ اس کے منہ سے مغلظات کا طوفان اُبل رہا تھا۔ وہ گالیاں دے رہا تھا۔ خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ اس کے گودام کو جس نے بھی آگ لگائی تھی، اس کے پورے گھر کو جلا کر راکھ کر دینے کی قسمیں کھا رہا تھا۔
آگ ایسی شدت سے بھڑکی تھی کہ حویلی سے یہاں پہنچنے تک گودام کی ساری گندم جل گئی تھی۔ یہ غنیمت ہوا کہ جس گودام میں آگ لگی تھی وہ الگ تھلگ تھا۔ اس وجہ سے باقی گودام آگ کی لپیٹ میں آنے سے محفوظ رہے تھے۔
ان گوداموں کی نگرانی پر جو کارندے مامور تھے، وہ وحشت زدہ چہروں کے ساتھ اکڑوں بیٹھے ہوئے تھے۔ سردار حاکم کسی کو لات مار تا تھا، کسی کو اپنے بھاری بھرکم ہاتھ سے طمانچہ مار رہا تھا۔ معتوب کارندے کراہتے ہوئے زمین پر ڈھیر ہو جاتے پھر سیدھے ہو کر اکڑوں بیٹھ جاتے۔
اس کے دستِ راست جہانگیر خان نے کہا۔ ”سردار صاحب! درحقیقت یہ آگ کسی نے جان بوجھ کر لگائی ہے۔ آپ کے ساتھ آخر کس نے دشمنی مول لینے کی جرأت کی ہوگی؟“
اس نے گردن اکڑا کے جلال اور اشتعال کے ساتھ کہا۔ ”اس پورے علاقے میں کئی کوس تک میری دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ کسی میں مجال نہیں کہ مجھ سے ٹکر لے سکے۔ بس یہ کل کا لونڈا بابر پچھلے کچھ عرصے سے میرے منہ کو آ رہا تھا۔ وہ خود تو اس وقت میری قید میں پر کٹے پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہا ہے لیکن منتقل میں اس کے وفادار کم نہیں۔ مجھے اندیشہ ہے یہ ان میں سے کسی ٹولے نے شرارت کی ہے۔“
”سردار صاحب! نالے کے اُس پار منتقل کے سارے علاقے میں اس کے وفادار موجود ہیں۔ یہ ہم کیسے معلوم کریں گے کہ آگ لگانے میں کس کا ہاتھ ہے؟“ جہانگیر خان نے کہا۔
وہ دبنگ لہجے میں بولا۔ ”جہانگیر خان! کمزور لوگوں کی طرح بات مت کرو۔ میں سردار حاکم ہوں۔ میرے لیے کچھ بھی مشکل نہیں۔ تم اپنے ساتھ آٹھ دس کارندے لے جاؤ۔ نالے کے اس پار منتقل سے کچھ بندے پکڑ کر لے آؤ۔ ان کی ذرا ٹھیک ٹھاک مرمت کرو۔ وہ فرفر بولیں گے۔“
اسی وقت سردار حاکم کے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے فون جیب سے نکال کر دیکھا۔ حویلی سے اس کی بیگم کی کال تھی۔ اس نے بٹن دبا کے ہیلو کہا۔ دوسری طرف سے اس کی بیگم اضطراری لہجے میں بولی۔ ”سنیے! غضب ہو گیا ہے۔ کچھ نامعلوم لوگوں نے حویلی پر دھاوا بولا تھا۔ دربان کو اور شیر خان کو بے بس کر کے وہ بابر کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔“
سردار حاکم کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اُس نے خاموشی سے رابطہ منقطع کیا مگر اس کے دل میں جیسے ہزاروں بم پھٹنے لگے۔ گودام میں لگی آگ کے لپکے ابھی اس کے دل میں روشن تھے کہ بابر بھی اس کی قید سے چھوٹ گیا تھا۔ یہ سراسر ہزیمت تھی۔ وہ بابر کو کل کا لونڈا کہتا تھا۔ اب اسی لونڈے نے ذرا سے وقت میں دو بار اسے شدید صدمے سے دوچار کر دیا تھا۔
جہانگیر خان اس کے چہرے کی بدلتی صورتِ حال دیکھ کر بھانپ گیا تھا کہ کوئی سنگین مسئلہ ہے۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ”سردار صاحب! فون سننے کے بعد آپ کے چہرے پر شدید پریشانی پھیل گئی ہے۔ خیریت ہے نا؟“
”خیریت بالکل نہیں ہے جہانگیر خان!“ وہ ہونٹ بھینچ کر طیش سے بولا۔ ”اس کُتے کے وفاداروں نے حویلی پر حملہ کیا ہے اور اسے نکال کر لے گئے ہیں۔“
اس کے سب ہی کارندے چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ اپنے سردار کے چہرے پر انہیں غصے سے زیادہ پریشانی کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ وہ جانتے تھے بابر ان کے سردار کے لیے بہت اہم تھا۔ اب اس کا ہاتھ سے نکلنے کا نتیجہ مزاحمت اور ہزیمت دونوں صورتوں میں سامنے آنے والا تھا۔
جہانگیر خان متفکر لہجے میں بولا۔ ”سردار صاحب! یہ اچھا نہیں ہوا۔ وہ کم بخت اپنے وفاداروں کے درمیان گیا تو سب شیر بن جائیں گے۔ گودام میں آگ لگانے والے مشتبہ افراد کو پکڑنا بھی ایک مشکل عمل بن جائے گا۔“
سردار حاکم بھنا کر بولا۔ ”یہ نقصان تو کچھ بھی

نہیں ہے۔ اس کمینے سے زمینوں کے کاغذات اور بھائی مرحوم کا وصیت نامہ حاصل کرنا تھا۔ اب یہ معاملہ بھی کھٹائی میں پڑ گیا۔ اسے قابو میں کرنے کے لیے دوبارہ حکمتِ عملی بنانی پڑے گی۔"

"آپ حکم کریں سردار صاحب! ہم سب آپ کے نمک خوار ہیں۔ اسی وقت جاتے ہیں اور بابر کو پکڑنے کے ایکشن پلان پر عمل کرتے ہیں۔" جہانگیر خان جوش سے بولا۔

"وقت آنے پر ایسا بھی کریں گے۔" اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "ابھی میرے پاس ترپ کا پتا موجود ہے۔"

سردار حاکم نے یہ کہا اور اپنے موبائل پر ایک نمبر تلاش کر کے بٹن دبا دیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی پھر کسی نے کال وصول کی اور چہکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "زہے نصیب سردار صاحب! بڑے دنوں بعد آج میری یاد آگئی آپ کو؟"

"مستان خان! تم میری بساط کے ایسے اہم مہرے ہو جسے خاص خاص مواقع پر استعمال کرتا ہوں۔ یوں سمجھ لو۔ ایک بار پھر تمہاری ضرورت پڑی ہے۔" سردار حاکم بھاری آواز میں بولا۔

"جو حکم آپ کا سردار صاحب! دنیا والوں کے لیے میں ایک ڈکیت ہوں۔ آپ کا خادم ہوں۔"

"یہ بتاؤ، اس وقت کدھر ہو؟"

"سردار صاحب! میں ٹھہرا بدنام زمانہ ڈاکو۔ دن کے وقت چمگادڑ کی طرح گپھاؤں میں چھپا رہتا ہوں۔ رات کو باہر نکلتا ہوں۔ اس وقت بھی ایک پہاڑی جنگل کے قریب ڈیرا ڈالے بیٹھا ہوں۔"

"مستان خان! تم فوراً جنگل سے نیچے اترو۔ آج رات ہی میری حویلی میں پہنچ جاؤ۔ باقی بات رُوبرو ملاقات میں بتادوں گا۔"

فون منقطع کر کے سردار حاکم نے چند گہری سانسیں لیں۔ سلگتی نظروں سے اپنے سامنے جل کر راکھ بنے گودام کو دیکھا۔ پھر پلٹ کر تیز تیز قدموں سے اپنی جیپ کی طرف بڑھا۔ اس کے کارندے بھی ساتھ ہو لیے۔ وہ سب جیپوں اور گھوڑوں پر سوار ہوئے اور واپس حویلی کی جانب روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

بابر کو وہ دن نہیں بھولتا تھا جب اسے اطلاع ملی تھی کہ اس کے ماں باپ اور چھوٹے بھائی کو ڈاکوؤں نے قتل کردیا ہے۔ وہ اس وقت یونی ورسٹی میں تھا۔ صبح کی پہلی کلاس لینے کے بعد اپنے چند دوستوں کے ساتھ کیفے ٹیریا میں بیٹھا تھا۔ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ فون پر گاؤں سے اس کا چچا سردار حاکم بول رہا تھا۔ اس نے بغیر کسی تمہید کے بتادیا کہ ڈاکو رات کے وقت حویلی میں داخل ہوئے تھے۔ مزاحمت پر سردار قاسم، ان کی بیگم اور چھوٹے بیٹے کو گولیوں سے بھون ڈالا تھا۔

آخر میں اس نے کہا۔ "بابر بیٹا! یہ حادثہ بہت بڑا ہے مگر تم سردار قاسم جیسے بہادر باپ کے بیٹے ہو۔ میں امید رکھتا ہوں تم حوصلے سے کام لو گے۔"

بابر کے لیے یہ محض ایک حادثہ نہیں تھا، اس پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔

دوسرا صدمہ تب پہنچا جب بیس گھنٹے کے لگاتار سفر کے بعد وہ تھل پہنچ گیا تو اس کے ماں باپ اور چھوٹے بھائی کو دفن کر دیا تھا۔ لاہور سے روانہ ہوتے وقت اس نے تاکید کی تھی کہ اس کے پہنچنے تک تدفین نہ کی جائے۔

وہ رویا، غصہ ہوا۔ تب پتا چلا کہ سردار حاکم کے حکم پر ایسا کیا گیا تھا۔ اس نے چچا سے شکایت کی تو وہ بولا۔ "بیٹا بابر! جذباتی مت بنو۔ گرمی کا موسم ہے۔ لاشیں خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔ شرع بھی یہی کہتی ہے کہ تدفین میں تاخیر نہ کی جائے۔"

اسے اطمینان نہ ہوا۔ رو پیٹ کر صبر کر لیا۔

سردار قاسم ایک ٹھنڈے مزاج کا شریف النفس انسان تھا۔ اس کی شرافت، انکسار اور حسنِ اخلاق کی سب مثالیں دیتے تھے۔ اس کی کسی سے دشمنی نہیں تھی۔ صرف اپنے چھوٹے بھائی سردار حاکم سے زمین کے بٹوارے کی وجہ سے ناچاقی چل رہی تھی۔ کیس عدالت میں تھا۔

بابر، سردار قاسم کا وارث تھا۔ روایات سے ہٹ کر اسے اعلیٰ تعلیم دلانے شہر بھیجا تھا۔ نہیں جانتا تھا حالات ایسے پیدا ہوں گے کہ وہ تعلیم جاری نہیں رکھ سکے گا۔ گاؤں واپس آکر روایتی جھگڑوں اور خاندانی چپقلشوں میں اُلجھ جائے گا۔

سردار قاسم اور اس کے خاندان کا قتل ایسا سانحہ نہیں تھا جسے آسانی سے بھلایا جاتا۔ تھل اور تھل سے نکل کر اس کا چرچا دور دور تک پھیل گیا۔ پولیس نے ابتدائی طور پر کافی پکڑ دھکڑ کی۔ خوب زور شور سے تحقیقات کیں۔ لیکن اصل مجرم پر ہاتھ نہ ڈال سکی۔ سب کی زبان پر ڈاکو مستان خان کا نام مرکزی ملزم کے طور پر موجود تھا۔ مگر پولیس اسے پکڑنے کی

جرائت نہ کرسکتی تھی۔ وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں روپوش رہتا تھا۔ رات کی تاریکی میں اچانک ہی کسی بستی میں نمودار ہوتا تھا۔ لوٹ مار کر کے اپنے پیچھے دہشت اور بربریت کے نقوش چھوڑ کے غائب ہو جاتا تھا۔

بابر نے بھی ڈاکو مستان خان کے بارے میں افسانوی قسم کی باتیں سنی تھیں۔ جب خاندان کے قتل میں اس کا نام گردش کرنے لگا تو وہ جوش اور جذبے سے بھر گیا۔ اس کا جوان خون تھا۔ اپنے خاندان کے اس بے رحم قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے وہ آتشِ انتقام میں جلنے لگا۔

مقتھل کے جوان اس کے لیے جان دینے کو تیار رہتے تھے۔ ہر رات اس کی حویلی میں جمع ہوتے تھے۔ ڈاکو مستان خان سے اس کے گھر والوں کے خون کا بدلہ لینے کی قسمیں کھاتے تھے۔

سردار حاکم دوسرے تیسرے دن اس کے پاس آتا تھا۔ اس کے جذبات ٹھنڈے کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ڈاکو مستان خان کے خلاف کسی جذباتی ردِعمل سے باز رکھتا تھا۔

وہ اکثر کہتا۔ "بابر! تم میرے مرحوم بھائی کی آخری نشانی ہو۔ تم میرے لیے بہت عزیز ہو۔ مقتھل کے نادان اور جذباتی نوجوان تمہیں ورغلاتے ہیں۔ خبردار اُن کی باتوں میں آکر ڈاکو مستان خان کے خلاف خود کسی مہم کا حصہ مت بننا۔ تمہیں کچھ ہو گیا تو میں یہ برداشت نہیں کر سکوں گا۔ پولیس اسے تلاش کر رہی ہے۔ وہ ضرور پکڑا جائے گا۔"

بابر خاموشی سے سر جھکا لیتا۔ وہ چچا حاکم سے بحث نہیں کرتا تھا۔ بچپن سے اس نے سردار حاکم کی آنکھوں میں اپنے لیے بے مہری اور بے پروائی دیکھی تھی۔ اس کی طرف سے ایک چچا کی محبت اور شفقت کبھی نہیں ملی تھی۔ اس کی اولاد بھی فطرت کے اعتبار سے اپنے باپ جیسی تھی۔ صرف شاہدہ ایسی تھی جو بچپن سے اس کے قریب رہی تھی۔

بسترِ مرگ پر سردار ناظم علی نے وصیت لکھوائی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد جب وصیت کے مندرجات سامنے آئے تو سردار حاکم نے بہت احتجاج کیا۔ بابا کی اس تقسیم کو ظلم اور ناانصافی قرار دیا۔ سب کے سامنے اعلان کیا کہ اس فیصلے کو نہیں مانتا ہے۔

سردار قاسم کو اپنے بھائی کے رویّے کا بہت دکھ ہوا۔ اس نے جھگڑے کو طول دینے کے بجائے الگ ہونے کا فیصلہ کیا۔ نالے کی دوسری جانب مقتھل کا پورا علاقہ باپ نے اسے دے دیا تھا۔ وہاں ایک چھوٹی حویلی تھی۔ اس نے فوراً اس کی تعمیرِ نو کرائی۔ اپنی بیوی بچے لے کر وہاں منتقل ہو گیا۔ اس وقت بابر کی عمر بارہ سال تھی۔

سردار حاکم نے اسے خاندانی حویلی سے نکال کر خاموشی اختیار نہیں کی بلکہ ایک نیا قضیہ کھڑا کیا۔ اس نے... جرگہ بلا کے اپنے باپ کی ناانصافی کا رونا رویا کہ اسے بڑے بھائی کی نسبت کم جاگیر ملی ہے۔

جرگے نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا کہ سردار ناظم علی کا فیصلہ حتمی تھا۔ اب ان کی موت کے بعد یہ فیصلہ تبدیل نہیں ہو سکتا۔

ادھر سے ناکام ہو کر سردار حاکم نے عدالت سے رجوع کیا۔ اتفاق سے سردار ناظم علی نے اپنی وصیت کسی اسٹامپ پیپر پر نہیں لکھی تھی بلکہ ایک عام سے کاغذ پر لکھ کر اپنے صندوق میں رکھی تھی۔ مرتے وقت اس نے ہدایت کی تھی کہ اس پر عمل کیا جائے۔

سردار حاکم نے اسی بات کو لے کر یہ شوشہ چھوڑا کہ بڑا بھائی چونکہ باپ کے قریب تھا اس لیے آخری وقت میں باپ کو ورغلا کر اپنی مرضی کی وصیت لکھوائی ہے بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ وصیت بڑے بھائی نے خود لکھی ہے اور باپ پر دباؤ ڈال کے دستخط کرا لیے ہیں۔

معاملہ عدالت میں چلا گیا تو یہ سلسلہ دراز ہو گیا۔ ویسے بھی دیوانی معاملات میں فیصلے آنے تک دُہائیاں گزر جاتی ہیں۔ جوانیاں رُل جاتی ہیں۔ پیسہ لُٹ جاتا ہے لیکن قضیے کا فیصلہ نہیں ہوتا۔

ان دونوں بھائیوں کا کیس بھی دس سال سے عدالت میں چل رہا تھا۔ ایسے میں بڑے بھائی سردار قاسم کی ناگہانی موت ہو گئی۔ لاہور کی یونی ورسٹی میں پڑھنے والا بابر تعلیم ادھوری چھوڑ کر واپس آگیا۔

اب اسے ایک طرف باپ کی وراثت کو سنبھالنا تھا۔ دوسری طرف چچا سردار حاکم کی مخاصمت کا سامنا کرنا تھا۔ تیسری طرف عدالت میں ایک فریق کے طور پر پیشیاں بھگتنا تھا۔

ایک دن شہر سے ایک مشہور وکیل مقتھل آیا۔ اس کا نام نجیب عارف تھا۔ اس نے بابر سے ملاقات کی اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارے بابا سردار قاسم کا دیرینہ دوست ہوں۔ انہوں نے اپنے انتقال سے چند دن پہلے مجھے مقتھل بلایا تھا۔ انہوں نے مجھے دو لفافے دیے تھے۔ ایک میں ان کی وصیت لکھی ہوئی ہے۔ دوسرا ایک رقعہ ہے۔ انہوں نے

مجھ سے کہا تھا کہ میری موت کے بعد یہ دونوں لفافے تمہیں دے دوں۔"

بابر نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ "کیا اس کا یہ مطلب ہے بابا کو اپنی موت کا اندازہ ہو گیا تھا؟"

"انہوں نے اپنی گفتگو میں ایسی کسی بات کی طرف اشارہ نہیں کیا تھا۔ شاید تمہارے نام جو رقعہ ہے، اس میں کچھ موجود ہو۔"

بابر نے بے تابی سے سربمہر لفافہ کھولا۔ اس میں سے زرد رنگ کے ایک کاغذ پر لکھا ہوا خط پڑھنا شروع کیا۔

"بابر بیٹے! تم میرا یہ رقعہ پڑھ رہے ہو۔ اس کا مطلب ہے میں اس دنیا میں موجود نہیں ہوں۔ تمہاری حیرانی بجا ہے۔ میں اپنی موت کا ذکر کر رہا ہوں اور ایک پُر اسرار انداز میں تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔

بابر بیٹا! یہ حقیقت ہے موت اٹل ہے مگر کب آئے گی؟ کیسے آئے گی؟ اس کا وقت سے پہلے کسی کو علم نہیں ہوتا۔ میں بھی نہیں جانتا کہ میری موت کب آئے گی اور کس شکل میں آئے گی۔ لیکن کچھ ایسے اشارے مل گئے ہیں کہ مجھے یقین ہے میں زیادہ دن زندہ نہیں رہنے والا ہوں۔ یہ اشارے مجھے ایک خواب کے ذریعے مل گئے ہیں......

میں نے اپنا خواب ایک بڑے عالمِ دین کو سنایا۔ اس بڑے عالم نے بتایا کہ سردار صاحب، آپ احتیاط کریں۔ آپ کے دشمن آپ کے خاندان کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔

بابر بیٹا! اس بڑے عالم کی باتوں سے میں سمجھ گیا کہ میری موت طبعی طور پر نہیں ہونے والی ہے۔ میرا کوئی دشمن نہیں جس آستین کے سانپ کی طرف خواب میں اشارہ ہوا ہے۔ بدقسمتی سے وہ میرا سگا بھائی حاکم علی ہے۔

اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تم اپنا خیال رکھو۔ اپنے چچا کے شر سے خود کو بچانے کی کوشش کرو۔ منتھل کی ساری جاگیر اب تمہارے حوالے ہے۔ منتھل کے لوگوں کو اپنے سے دور مت کرو۔ یہ لوگ زندگی بھر میرے وفادار رہے ہیں۔ تمہارے لیے بھی اپنی جانیں قربان کر سکتے ہیں۔

ایڈووکیٹ نجیب عارف میرا دیرینہ دوست ہے۔ میں نے ایک کاغذ پر اپنی وصیت لکھ کر اس کے حوالے کی ہے۔ اسے پاور آف اٹارنی بھی دی ہے۔ میرے بعد وہ تمہارا سرپرست ہوگا۔ میری وصیت پر عمل درآمد کرانے کا اسے اختیار حاصل ہوگا۔

بابر بیٹا! ایک بار پھر تمہیں نصیحت کرتا ہوں۔ اپنے چچا سردار حاکم کی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھو۔ وہ ایک لالچی اور خودغرض شخص ہے۔ اسے خود پر حاوی ہونے مت دو۔"

رقعہ ختم کر کے بابر بڑی دیر سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے پر کرب بھی تھا، ایک اضطراب بھی۔

ایڈووکیٹ نجیب عارف نے کہا۔ "بابر بیٹا! تمہارے چہرے پر جو تناؤ ہے، اس سے لگتا ہے خط میں کوئی پریشانی کی بات ہے؟"

اس نے سر اٹھا کے ان کی طرف دیکھا۔ "کیا آپ نے یہ رقعہ نہیں پڑھا تھا؟"

"نہیں۔ تمہارے بابا نے وصیت مجھ سے لکھوائی تھی۔ خط سربہ مہر میرے حوالے کیا تھا۔"

بابر نے ایک گہری سانس لے کر خط اُن کی طرف بڑھایا۔ نجیب عارف اس سے خط لے کر پڑھنے لگا۔ اسے پورا پڑھ کے وہ گہری سوچتی نظروں سے بابر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کہیں تمہارے دماغ میں بھی وہی بات تو نہیں جو میں سوچ رہا ہوں؟"

بابر نے سرسراتی آواز میں کہا۔ "انکل! کیا میرا چچا اس حد تک ظالم ہو سکتا ہے کہ زمین کے لیے اپنے بڑے بھائی اور اس کے خاندان کو قتل کر دے؟"

"بابر بیٹا! ایسا ناممکن نہیں۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں اس سے بھی بھیانک کیسوں سے واسطہ پڑا ہے۔ زمین کے لیے اپنے باپ تک کو مارا جاتا ہے۔ اگر سردار قاسم کو اپنے بھائی پر شک تھا تو اس کی بھی وجوہات ہوں گی۔"

بابر نے کہا۔ "میں پچھلے آٹھ دس سالوں سے یہاں موجود نہیں تھا۔ بہت کم جانتا تھا کہ بابا اور چچا کے درمیان اختلافات کی شدت کیسی تھی۔ بابا نے پہلے بھی ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس آخری خط میں چچا کے بارے میں جس شبہے کا اظہار کیا ہے، اس نے میرے غم و غصے کو بڑھا دیا ہے۔"

"صرف شک کی بنیاد پر ہم کسی کو مجرم قرار نہیں دے سکتے۔" ایڈووکیٹ نجیب عارف بولا۔

بابر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "بابا نے لکھا ہے منتھل کے لوگ میرے لیے جان بھی دینے کو تیار ہیں۔ لاہور سے واپس آ کر میں نے یہ مشاہدہ بھی کیا ہے۔ میں ان میں سے ہوشیار اور جی دار قسم کے جوانوں کی ایک فورس بناؤں گا۔ یہ میرے محافظ بھی ہوں گے۔ میرے لیے جاسوسی بھی کریں گے۔ انہی کی مدد سے میں بابا کے اصل قاتلوں تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔"

''تم فی الحال اپنے چچا پر یہ ظاہر مت کرو کہ قاتل کی حیثیت سے اس پر شبہ ہے۔ اس سے وہ ہوشیار ہو جائے گا۔ خود کو ڈاکو مستان خان سے دور کرے گا۔ سب کی طرح تم بھی ڈاکو مستان خان کو اس واقعے کا ذمے دار سمجھ کر انتقام لینے کی بات کرو۔ یہ بات بھی ذہن نشین کرو اگر تمہارے خاندان کے قتل میں سردار حاکم ملوث ہے تو تم بھی اس کا ہدف ہو گے۔ کیوں کہ اب منثھل کی ساری جاگیر کے تم اکیلے وارث ہو۔''

''آپ فکر مت کریں انکل! میں چچا سردار کے لیے ایک آسان شکار ثابت نہیں ہوں گا۔'' اس نے کہا۔ ''اب مجھے بابا کی وصیت بتا دیں۔''

ایڈووکیٹ نجیب عارف نے دوسرا لفافہ کھولا۔ ایک اسٹامپ پیپر نکال کے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس میں عدالتی زبان استعمال ہوئی ہے۔ اس لیے میں سادہ الفاظ میں تمہیں سمجھا دوں گا۔ تمہارے بابا کی وصیت کے مطابق تم منثھل کی زمینوں کے وارث ہو۔ تمہاری بہن جو شادی شدہ ہے۔ اسے طے شدہ حق دینے کے بعد باقی ساری جاگیر کے تم مالک ہو گے۔ اگر تم کسی حادثے کا شکار ہو کر دنیا سے چلے گئے تب منثھل کی ساری زمینیں وہاں کے باشندوں میں تقسیم ہوں گی۔ سردار حاکم اس جاگیر پر حق جتلانے کا مجاز نہیں ہوگا......''

بابر نے پوچھا۔ ''بابا نے یہ وصیت کیوں کی کہ میں کسی حادثے کا شکار ہوا تو ساری جاگیر منثھل کے لوگوں میں تقسیم کی جائے؟''

''اس کی وجہ ظاہر ہے۔ سردار حاکم کو یہ باور کرانا ہے کہ وہ اس لالچ میں تمہیں نقصان پہنچانے سے باز رہے کہ تمہارے بعد ساری زمین اس کی ملکیت میں چلی جائے گی۔''

''اس کا مطلب ہے بابا کو یقین تھا کہ چچا سردار ان کے بعد مجھے بھی راستے سے ہٹانے کی سازش کر سکتا ہے؟ اس صورت میں بابا کی وصیت اب ظاہر کرنی پڑے گی تاکہ اس کے مندرجات چچا سردار کے علم میں بھی آ جائیں۔'' بابر نے کہا۔

''یہ بہتر ہوگا۔ کیا سردار حاکم تم سے ملنے یہاں آتا ہے؟'' ایڈووکیٹ نجیب بولا۔

''حادثے کے بعد وہ ہر دوسرے تیسرے دن آتا تھا۔ کبھی سمجھاتا تھا، کبھی ڈراتا تھا کہ ڈاکو مستان خان کے خلاف اپنی طرف سے کوئی حرکت مت کرو۔ اب بہت دن ہوئے ہیں۔ یہاں نہیں آیا ہے۔''

''ہوں۔ پھر تو اچھا موقع ہے۔ تم خود ان سے ملنے چلے جاؤ۔ میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ اس بہانے سردار حاکم کو قریب سے سمجھنے اور پرکھنے کا موقع مل جائے گا۔''

''کیا آپ یہ بتا دیں گے کہ بابا نے آپ کو پاور آف اٹارنی دے رکھی ہے؟''

''جی ہاں۔ پیش بندی کے طور پر یہ بتانا ضروری ہے۔ کیونکہ وہ یہ نہ سمجھے کہ تم بے سہارا ہو۔ اس وقت میرے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ تم اس کے شر سے محفوظ رہو۔ وہ قاتل ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔''

☆☆☆

سردار حاکم اپنی وسیع و عریض بیٹھک میں اونچے سے تخت پر گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز تھا۔ دو کسرتی بدن والے جوان اس کی ٹانگیں دبا رہے تھے۔ اس کے چہرے پر فکر مندی اور پریشانی کے آثار تھے۔ تخت کے سامنے فرشی نشست پر اس کا دستِ راست جہانگیر خان بیٹھا تھا۔

سردار حاکم گمبھیر آواز میں بولا۔ ''مجھے بابر سے کسی اچھائی کی امید نہیں۔ وہ اپنے باپ کی طرح ٹیڑھی کھیر ثابت ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلے اسے قابو کرنا ہوگا۔''

جہانگیر خان نے کہا۔ ''سردار صاحب! آپ کے بڑے بھائی نے اپنی زندگی میں اس کے دل و دماغ میں زہر بھرا ہوگا۔ جبھی تو وہ آپ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ اگر آپ سمجھتے ہیں بابر آئندہ مسائل پیدا کر سکتا ہے تو اس کا بندوبست کرتے ہیں۔''

''نہیں، نہیں۔'' سردار حاکم نے تیزی سے کہا۔ ''ابھی ایسی کسی حرکت کے بارے میں سوچنا بھی مت۔ اس کے خاندان کا قتل مستان خان کے سر گیا ہے۔ اب بابر کو کچھ ہو گیا تو سارا الزام مجھ پر آئے گا۔ لوگ یہی کہیں گے کہ منثھل کی ساری جاگیر پر قبضہ کرنے کے لیے آخری وارث کو بھی راستے سے ہٹا دیا ہے۔''

''سوچنے کی بات یہ ہے کہ منثھل کے لوگ اس کے گرد اکٹھے ہونے لگے ہیں۔'' جہانگیر خان متفکر لہجے میں بولا۔ ''اب وہ اکیلا نہیں۔ عوام کی ایک بڑی تعداد اس کے ساتھ ہے۔ یہی حالت رہی تو دن گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ آپ کے لیے مشکلات پیدا کرے گا۔ عام انتخابات کو ایک سال سے کم وقت رہ گیا ہے۔ آپ اس دفعہ اس حلقے کے ایک مضبوط امیدوار ہیں۔ اگر بابر کو بے لگام چھوڑ دیا تو وہ

آپ کی انتخابی سیاست کو زبردست نقصان پہنچا سکتا ہے۔‘‘
’’تم میرے مشیر بھی ہو۔ دستِ راست بھی۔ مجھے کوئی تدبیر بتاؤ۔ جس پر عمل کر کے اسے یوں قابو کرلوں کہ منتھل کی زرخیز زمین بھی اور وہاں کے عوام بھی میری گرفت میں آجائیں۔‘‘
’’آپ اُسے جان سے مارنے کے لیے تیار نہیں۔ اس صورت میں ایک تجویز ایسی ہے جس پر عمل کر کے آپ اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔‘‘
’’ہاں بتاؤ نا۔ تم کس تجویز کی بات کرتے ہو؟‘‘
’’سردار صاحب! آپ اُسے اپنا داماد بنالیں۔ اس طرح منتھل کے عوام کی حمایت آپ کو حاصل ہوگی۔‘‘ جہانگیر خان بولا۔
سردار حاکم تیز نظروں سے اسے چند لمحے گھورتا رہا پھر رسان سے کہا۔ ’’ہوں۔ تجویز اچھی ہے مگر جو میں چاہتا ہوں، وہ اس طرح حاصل نہیں ہوگا۔ میری نظریں منتھل کی زرخیز زمینوں پر ہیں۔ ہمارے بابا نے جاگیر تقسیم کرتے ہوئے ناانصافی کی ہے۔ منتھل کی زیادہ زرخیز اور زیادہ رقبے کی زمین بڑے بھائی کے نام کر دی ہے۔ بابر اس ساری جاگیر کا مالک ہے۔ مستقبل میں جب میں سیاست کا ایک بڑا کھلاڑی بن جاؤں گا تو لوگوں پر رعب جمانے کے لیے منتھل کی جاگیر کا مالک بھی بن جانا ضروری ہے۔ میں اس کل کے لونڈے بابر کے سہارے وہاں کے عوام کا حاکم نہیں بننا چاہتا بلکہ مکمل خودمختاری سے منتھل اور منتھل کی زمینوں اور رعایا کا حاکمِ اعلیٰ بننے کا ارادہ ہے۔ تمہاری تجویز مانتے ہوئے بابر کو اپنا داماد بناؤں گا تو مجھے فائدہ نہیں ہوگا۔ شاہدہ میری اکلوتی بیٹی ہے۔ وہ اس کی بیوی بن گئی تو ایک طرح سے میری کمزوری بن جائے گی۔ بابر الٹا مجھ سے بیٹی کا حصہ مانگے گا۔‘‘
جہانگیر خان ایک سفاک مسکراہٹ چہرے پر سجا کر بولا۔ ’’میری تجویز کے دوسرے حصے میں اس کا حل بھی موجود ہے۔ آپ اسے اپنا داماد بنالیں۔ ایک دو سال اسے داماد کے طور پر برداشت کرلیں۔ اس دوران آپ کی بیٹی کسی بچے کو جنم دے گی۔ ہم بابر کو پُراسرار طریقے سے ختم کر دیں گے۔ اس کا الزام ایک بار پھر مستان خان پر آئے گا۔ اس کی موت کے بعد منتھل کی ساری جاگیر آپ کی بیٹی اور اس کے بچے کی ملکیت بن جائے گی۔ منتھل کے عوام بھی اپنے شہید سردار کی بیوی کی بات مان کر آپ کی حمایت کریں گے۔‘‘

سردار حاکم نے گہری سوچتی نظروں سے جہانگیر خان کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں ستائش بھی تھی تائید بھی۔
وہ قہقہہ لگا کر بولا۔ ’’تم بڑے ظالم ہو جہانگیر خان! میری بیٹی کا گھر بھی بسا رہے ہو۔ میرے ہی ہاتھوں اس کا سہاگ بھی اُجاڑ رہے ہو۔ کسی اور موقع پر یہ تجویز سن کر تمہاری زبان کھینچ لیتا مگر موجودہ صورتِ حال میں یہ قابلِ غور بات ہے۔ میں اس پر مزید سوچوں گا......‘‘
اسی وقت ایک خادم اجازت لے کر اندر آیا۔ مؤدب لہجے میں کہا۔ ’’سردار صاحب! منتھل سے بابر آیا ہے۔ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔‘‘
سردار حاکم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ’’کیا وہ اکیلا ہے؟‘‘ اس نے پوچھا۔
’’نہیں سردار صاحب! اس کے ساتھ بڑی عمر کا ایک شہری آدمی بھی ہے۔‘‘
’’ہوں۔ اسے دوسرے کمرے میں بٹھاؤ۔ چائے شربت کا پوچھو۔ آدھا گھنٹے بعد اسے اندر لے آؤ۔‘‘
خادم آداب بجالا کر باہر چلا گیا۔
جہانگیر خان بولا۔ ’’سردار صاحب! بابر کو انتظار کرانے کا مقصد کیا ہے؟ کیا اسے یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ زیادہ زمین کا مالک ہونے کے باوجود آپ کے سامنے دو کوڑی کا نہیں۔‘‘
وہ غرور سے گردن اکڑا کر بولا۔ ’’میں اس کے باپ کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اب اس کل کے لونڈے کی کیا اوقات ہے۔ اصل میں یہ سمجھنا چاہتا ہوں، وہ کیوں آیا ہے؟‘‘
یہ کہہ کر اس نے ٹانگیں دبانے والے دونوں خادموں کو اشارے سے روک دیا۔ اٹھ کر بیٹھک کے ایک طرف لمبی سی میز کے پاس گیا۔ وہاں بہت سے کمپیوٹر لگے ہوئے تھے۔ اس نے ایک کمپیوٹر کے کی پیڈ کے چند بٹن دبائے۔ اس کے ساتھ ہی کمپیوٹر کی اسکرین روشن ہوگئی۔ ایک کمرے کا منظر دکھائی دیا۔ یہ وہی کمرا تھا جس میں بابر اور ایڈووکیٹ نجیب عارف بیٹھے ہوئے تھے۔
سردار حاکم غور سے ان دونوں کی طرف دیکھنے لگا پھر پلٹ کر جہانگیر خان سے مخاطب ہو کر بولا۔ ’’بابر کے ساتھ یہ ادھیڑ عمر شخص میرے لیے اجنبی ہے۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے یہ کون ہو سکتا ہے؟‘‘
’’اپنی شکل اور حلیے سے بہت باوقار شخص لگتا ہے۔

آنکھوں کی چمک بتا رہی ہے وہ بہت گہرا اور ہوشیار آدمی ہے۔ مجھے لگ رہا ہے وہ کوئی ڈیٹیکٹیو (سراغ رساں) آفیسر ہوگا۔ شاید بابر اپنے بابا کے قاتل کا سراغ لگانے اسے شہر سے لے کر آیا ہو۔"

"ہوں۔ میرا تجربہ کہتا ہے یہ کوئی وکیل ہوگا۔ جو کیس عدالت میں زیرِ سماعت ہے، اس کی پیروی کے لیے شہر سے لے کر آیا ہوگا۔"

اس نے دوسرے کمپیوٹر کے آگے رکھے کی پیڈ پر چند بٹن دبائے۔ کمپیوٹر کی اسکرین روشن ہوئی۔ حویلی کے پھاٹک کے پاس کا منظر دکھائی دیا۔ وہاں دو جیپیں کھڑی تھیں۔ آٹھ دس جوان جیپوں کے پاس نظر آرہے تھے۔ ان میں کچھ ہتھیار بہ دست تھے۔

سردار حاکم کٹیلے لہجے میں بولا۔ "برخوردار پوری فوج لے کر آیا ہے۔ لگتا ہے کسی نیک ارادے سے نہیں آیا۔"

جہانگیر خان مضحکہ خیز انداز میں بولا۔ "یہ منتھل کے جوان ہیں۔ سردار قاسم کے بڑے وفادار تھے۔ اب بابر کے ساتھ اپنی وفاداری نبھا رہے ہیں۔ لیکن فکر کی کوئی بات نہیں۔ ہمارے پاس بھی جنگجوؤں کی کمی نہیں۔ لڑائی کی نوبت آئی تو ان میں سے کوئی نہیں بچے گا۔"

"ارے نہیں نہیں جہانگیر خان!" سردار حاکم ہاتھ اٹھا کے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "بڑے بھائی اور اس کے خاندان کو دنیا سے گئے چند ہفتے ہوئے ہیں۔ دور دور تک لوگوں کے دلوں میں ابھی تک ان کے لیے ہمدردی ہے۔ ایسے میں بابر کے ساتھ کچھ برا ہوا تو سب لوگ مجھ پر تھوتھو کریں گے۔ الیکشن کے موسم اور ماحول میں ایسی بڑی غلطی ہرگز نہیں کرسکتا۔"

اس نے میبل پر رکھی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ باہر کہیں ایک مترنم گھنٹی بجنے لگی۔ چند ہی لمحوں بعد ایک خادم اندر آیا۔

سردار حاکم نے اس سے کہا کہ بابر کو اندر بلائے۔ ذرا دیر بعد بیٹھک کا دروازہ کھلا۔ بابر اندر آیا۔ اس کے پیچھے ایڈووکیٹ نجیب عارف بھی داخل ہوئے۔

"آؤ آؤ بھتیجے! بہت عرصے بعد تمہیں حویلی میں دیکھ کر بہت خوشی ہورہی ہے۔" وہ اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجا کے بولا۔ "تم اپنے بچپن کی شرارتیں اور عادتیں نہیں بھولے ہوگے؟"

"آپ درست کہہ رہے ہیں چچا سردار! حویلی میں گزارے اپنے بارہ سالوں کی بہت سی یادیں اب بھی دماغ میں تازہ ہیں۔ بدقسمتی سے آپ اور بابا کی باہمی رنجش نے ہمارے بچپن کی خوب صورت زندگی کو بھی داغ دار کردیا تھا۔"

سردار حاکم نے قہقہہ لگایا پھر تلخ لہجے میں کہا۔ "بڑوں کے فیصلے جب دانش مندی سے اور عدل سے نہ ہوں تب ان کے اثرات آنے والی نسلوں پر پڑتے ہیں۔ ہمارے بابا نے ناانصافی کی جو دیوار کھڑی کی تھی، اس نے ہم سب کو ایک دوسرے سے دور دور کردیا تھا۔ اب تم بھی اسی ناانصافی کی میراث کے وارث ہو۔ میرے بیٹے تعلیم کے سلسلے میں بڑے شہروں میں ہیں۔ وہ دونوں فارغ ہو کر آگئے تو میری جنگ وہ بھی لڑیں گے۔"

"اُف چچا سردار! آپ تو بڑی تشویش ناک بات کر رہے ہیں۔" بابر ہنستے ہوئے بولا۔ "میرے دونوں کزن ابھی چھوٹی عمر کے ہیں۔ ان کے تعلیم سے فارغ ہونے تک کئی برس لگ جائیں گے۔ آپ کیوں ان خاندانی جھگڑوں میں انہیں اُلجھاتے ہیں۔"

"جہاں ظلم ہو۔ وہاں جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ میرے بیٹے اس ظلم کے خاتمے کے لیے جدوجہد کریں گے۔ اپنا حق حاصل کرنے کے لیے میں آخری حد تک جاؤں گا۔ میں ناکام ہوا تو میرے بیٹے اسے جاری رکھیں گے۔"

"چچا سردار! آپ کے لہجے میں ایک دھمکی پوشیدہ ہے۔ ایک طرح سے آپ مجھے یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ دادا سردار کی تقسیم کردہ جاگیر کا فیصلہ آپ نہیں مانتے ہیں۔ منتھل کی زمین حاصل کرنے کے لیے ہر تدبیر آزمائیں گے۔"

"برخوردار! تم اتنے ناسمجھ نہیں ہو۔ پچھلے دس بارہ سالوں میں ہم عدالتوں میں کیوں خوار ہورہے ہیں؟ تمہارے مرحوم بابا کے ساتھ میرے جھگڑے کی بنیادی وجہ یہی بات تو تھی۔" اس نے ناگوار سے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے چچا سردار! آپ اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ میں اپنے بابا کی میراث کے لیے اپنا کام کرتا رہوں گا۔ ان سے ملیں۔ یہ ایڈووکیٹ نجیب عارف صاحب ہیں۔ بابا کے دوست بھی رہے ہیں۔ بابا نے اپنی زندگی میں وصیت لکھ کر انہیں دے دی تھی۔ جس کے مطابق میں منتھل کی ساری زمینوں کا وارث ہوں۔"

سردار حاکم گھورتی نظروں سے ایڈووکیٹ نجیب عارف کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر کاٹ دار لہجے میں بولا۔ "اس میں نئی بات کون سی ہے۔ بھائی مرحوم بھی خود کو منتھل کا وارث سمجھتے تھے۔ اب میراث کا تمہیں مالک بنادیا ہے۔

مجھے پہلے بھی اعتراض تھا۔ اب بھی تمہیں منتھل کی زمینوں کا مالک نہیں سمجھتا۔ پہلے بھی بڑے بڑے وکیل اس کیس میں جوتیاں گھساتے اور چونچ لڑاتے رہے ہیں۔ ان صاحب کے آنے سے بھی نتیجہ وہی برآمد ہوگا۔ اس لیے زیادہ پُرامید نہ ہو جاؤ۔''

''نجیب عارف صاحب صرف میرے وکیل نہیں سردار چچا! میرے مربی اور سرپرست بھی ہیں۔'' اس نے ٹھہر ٹھہر کر مضبوط لہجے میں کہا۔ ''بابا نے انہیں پاور آف اٹارنی دی ہے۔ جس کی رُو سے یہ میرے تمام معاملات کے نگران ہوں گے۔ منتھل کی جاگیر پر آپ نے جو دعویٰ دائر کیا ہے، یہ براہِ راست اس کی پیروی کریں گے۔ اگر کسی حادثے کی وجہ سے میری جان چلی جائے تو یہ مجاز ہوں گے کہ میری ساری جاگیر منتھل کے عوام میں تقسیم کر دیں۔''

سردار حاکم کو چپ سی لگ گئی تھی پھر وہ زہر خند لہجے میں بولا۔ ''میں ان میں سے کسی بھی بات کو تسلیم نہیں کرتا۔ منتھل کی جاگیر کا معاملہ عدالت میں ہے۔ اس لیے تمہارے بابا مرحوم کو کوئی اختیار حاصل نہیں کہ متنازعہ جاگیر کے حوالے سے وصیت جاری کرے۔ نہ ہی ان ایڈووکیٹ صاحب کو یہ اختیار حاصل ہے کہ تمہارا مربی اور سرپرست بن سکے۔''

ایڈووکیٹ نجیب عارف ایک طرف سنجیدہ سی صورت کے ساتھ بیٹھے تھے۔ سردار حاکم نے اس کے حوالے سے استہزائیہ بات کی تو دل میں آیا کہ منہ توڑ جواب دے مگر کچھ قانونی مجبوری اور کچھ بابر کی وجہ سے برداشت سے کام لیا اور ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ''سردار صاحب! آپ کی باتوں کا میرے پاس بڑا مسکت جواب ہے لیکن قانونی معاملات کا جواب عدالت کے اندر ہی مناسب لگتا ہے۔ میرے حوالے سے آپ کو جو اعتراض ہے آپ اسے عدالت میں چیلنج کریں۔ آئندہ بابر کے سارے قانونی معاملات کی میں خود نگرانی کروں گا۔ سردار قاسم کا وصیت نامہ اور منتھل کی زمینوں کے کاغذات اب سے میری تحویل میں رہیں گے۔''

سردار حاکم پیچ و تاب کھانے لگا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا اپنے ہاتھوں سے ان دونوں کو گولی مار دے۔ وہ خشمگیں نظروں سے انہیں گھورتے ہوئے بولا۔ ''اے وکیل صاحب! مجھے چیلنج مت کرو۔ اپنی قابلیت پر اتنا ہی ناز ہے تو ٹھیک ہے۔ ہم عدالت میں ملیں گے۔ میں بھی دیکھتا ہوں، میرے حق سے تم مجھے کب تک محروم رکھتے ہو؟''

بابر نے نرمی سے کہا۔ ''چچا سردار! آپ سے لاکھ اختلاف سہی لیکن آپ میرے بزرگ ہیں۔ میں آپ کو یہ باور کرانے آیا ہوں کہ منتھل کی زمین سے جڑے جھگڑے عدالت تک محدود رہیں تو بہتر ہے۔ عدالت کی چار دیواری سے نکل کر ذاتی زندگی میں آ گئے تو اس کا انجام کسی کے لیے بھی اچھا نہیں ہوگا۔''

''مجھے مت سمجھاؤ برخوردار کہ کیا اچھا ہے کیا بُرا ہے؟'' وہ خشک لہجے میں بولا۔ ''تم اگر منتھل کے چند جذباتی جوانوں کو لا کر میری چھاتی پر مونگ دلنے کی کوشش کرو گے تو میں بھی خاموش نہیں بیٹھوں گا۔ میرے پاس بھی جانبازوں کی کمی نہیں۔''

''میں نے کب آپ کے خلاف کوئی شرارت کی ہے چچا سردار! منتھل کے جوان بابا کے دور سے ہمارے خاندان کے وفادار ہیں۔ وہ دلیر ہیں، شریر ہرگز نہیں۔''

''باہر دو جیپوں میں بھر کر جن دلیر وفاداروں کو لے کر آئے ہو انہیں لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔'' اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''میرا خیال تھا کہ مرحوم بھائی کے بعد اب میں تمہارا سرپرست بن جاؤں گا۔ لیکن تمہارے بابا نے ایک غیر شخص کو مجھ پر ترجیح دے کر میرا مان توڑ دیا ہے۔ اب تم سے میرا تعلق رشتے کی بنیاد پر نہیں، ایک مخالف فریق کے طور پر ہوگا۔''

اس کے ساتھ وہ اٹھا۔ اپنے تخت کے قریب ایک دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ یہ اس کا خاص کمرا تھا۔ جہاں وہ آرام کرتا تھا۔

اس کا دستِ راست جہانگیر خان شروع سے خاموش بیٹھا تھا۔ وہ بولا۔ ''سردار صاحب اب آرام کے لیے خاص کمرے میں چلے گئے ہیں۔ اس لیے اب آپ واپس جا سکتے ہیں۔''

بابر اور ایڈووکیٹ نجیب عارف اٹھ کر بیٹھک سے باہر آئے۔ بیٹھک کے باہر وسیع و عریض دالان تھا۔ جس میں سے گزر کر انہیں حویلی کے بیرونی حصے کی طرف جانا تھا۔ دالان کا یہ حصہ حویلی کے زنان خانے کے آخر میں تھا۔ بابر کا بچپن اسی حویلی میں گزرا تھا۔ اس کے دماغ میں اپنی زندگی کے ابتدائی بارہ برسوں کی یادیں کسی فلم کی طرح گردش کر رہی تھیں۔ حویلی کے کھلے دالانوں اور طویل راہداریوں میں وہ سب شرارتیں کرتے تھے۔ کھیلتے کودتے اور لڑتے جھگڑتے تھے۔

شاہدہ کے دونوں بھائی اپنے باپ کی فطرت لیے

ہوئے تھے۔ وہ بابر سے چھ سات سال چھوٹے تھے مگر بڑے فسادی اور ہتھ چھٹ تھے۔ بچپن کی شرارتوں اور جھگڑوں میں بھی وہ بابر اور اس کی بڑی بہن کے خلاف اپنی عداوت اور نفرت کا کھلم کھلا اظہار کرتے تھے۔

شاہدہ ویسی نہیں تھی۔ بابر اور اس کی بہن سے اس کا تعلق بچپن کی معصوم شوخیوں، شرارتوں اور بے غرض چاہتوں سے جڑا ہوا تھا۔ وہ بابر کے لیے چچازاد بہن بھی تھی۔ بچپن کی دوست بھی تھی۔ بارہ سال کی عمر تک اس کے دل میں شاہدہ کے لیے انسیت کا جذبہ معصومیت سے ہی گندھا ہوا تھا۔ اس جذبے میں ابھی محبت کی معروف کیفیت شامل نہیں ہوئی تھی کہ وہ دور دور ہو گئے تھے۔ گُٹھل اور منٹھل کے درمیان اگرچہ ایک چھوٹا سا نالا حائل تھا۔ آدھا گھنٹے میں ایک دوسرے کے ہاں آیا جایا جاسکتا تھا لیکن ان کے والدین جاگیر کی تقسیم کے معاملے میں ایسے حریف بن گئے تھے کہ یہ مختصر سا فاصلہ بھی بے انت مسافتوں میں بدل گیا تھا۔

سردار چچا سے تلخ وشیریں گفتگو کے بعد باہر دالان میں آکر اس کے دل میں بڑی شدت سے یہ خواہش جاگی تھی کہ اتنے طویل عرصے بعد وہ حویلی آیا ہے۔ شاہدہ کو ایک نظر دیکھ کر جائے۔ کیا پتا آئندہ کس طرح کے حالات پیدا ہوں گے؟

دس سال پہلے اسے آخری بار دیکھا تھا۔ اب سوچ رہا تھا اتنے برس بعد وہ عمر کی سیڑھیاں چڑھ کے دوشیزگی کی منڈیر پر آئی ہوگی۔ خدا جانے وہ کیسی دکھائی دیتی ہوگی؟

اس نے پلٹ کر اپنے بائیں جانب دیکھا۔ وہاں سے دور زنان خانے کی دیوار نظر آتی تھی۔ وہ حسرت سے اس طرف دیکھتا، بڑے ہی بوجھل قدموں سے چلتا باہر آنے لگا۔ وسیع دالان سے گزر کر اس بڑے چوبی دروازے تک آگئے جس کے باہر ایک کھلا احاطہ تھا۔ وہاں گاڑیاں کھڑی کی جاتی تھیں۔ ان کی جیپ بھی وہیں پر تھی۔ حویلی کے پھاٹک کے باہر ان کے محافظ دو جیپوں میں موجود تھے۔

وہ احاطے کے اندر اپنی جیپ کی طرف آئے تھے۔ اسی وقت پھاٹک کھل گیا۔ ایک لینڈ کروزر اس میں سے اندر داخل ہوئی اور ان سے ذرا فاصلے پر رک گئی۔ اس کے دروازے کھل گئے۔ ڈرائیور اور ایک محافظ باہر نکل کر مؤدب کھڑے ہو گئے۔ پھر پچھلی سیٹ کے دروازے کھول کر دو عورتیں باہر نکلیں۔ ایک ڈھلتی عمر کی۔ دوسری اٹھتی جوانی کی۔

ایک اضطراری کیفیت میں بابر کی نظریں پختہ عمر کی عورت سے گزر کر نوجوان لڑکی پر جم گئیں۔ یکا یک دل اس زور سے دھڑکا گویا سینے کی دیواریں توڑ کر باہر نکل جائے گا۔

وہ وہی تھی۔ بہت بدل گئی تھی۔ آخری بار جب اسے دیکھا تب وہ تو دس سال کی معصوم سی چنچل سی بچی تھی۔ اس وقت شباب کی بھرپور رعنائیوں کے ساتھ حُسنِ مجسم کی مکمل صورت میں شاہدہ نظروں کے سامنے تھی۔ بدن نے جوانی کا جامہ پہن لیا تھا۔ چہرے پہ بچپن کی معصومیت کی جگہ دوشیزگی کی قیامت ڈیرے ڈالے موجود تھی۔

پختہ عمر عورت اس کی امی تھی۔ اس سے بابر چند دن پہلے اس وقت ملا تھا جب اس کے خاندان کے ساتھ المناک سانحہ پیش آیا تھا۔ وہ دو تین بار منٹھل آئی تھی۔

شاہدہ نے بھی بابر کو دیکھا تھا۔ پہلے ٹھٹک پڑی تھی۔ پھر حیرت اور مسرت اپنی آنکھوں میں بھر کر اسے دیکھتی گئی تھی۔

یکا یک بابر کے اندر ایک جرأت رندانہ عود کر آئی۔ وہ مضبوط قدموں سے چلتا ان کی طرف بڑھا۔ قریب جا کے پہلے شاہدہ کی امی کو سلام کیا پھر بھرپور نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”شاہدہ! کیا تم نے مجھے پہچانا؟“

اس کی آنکھوں میں شناسائی کی ایک پُرخلوص چمک پیدا ہوئی۔ ”جی ہاں بابر بھائی! ایک نظر دیکھ کر ہی میں پہچان گئی تھی۔“

اس کی امی سپاٹ لہجے میں بولی۔ ”تم کب آئے بابر! اپنے چچا سے ملاقات ہوئی کیا؟“

”میں چچا سردار کے پاس ہی آیا تھا۔ بہت دیر سے ان کے پاس بیٹھا تھا۔“

”اچھا۔ اس وقت جلدی میں ہو گے۔ آئندہ حویلی کے اندر بھی آجاؤ۔“ اس نے سرسری سے انداز میں کہا اور پلٹ کر حویلی میں جانے لگی۔

شاہدہ اداس سے لہجے میں بولی۔ ”بابر بھائی! تایا اور باقی سب کے ساتھ جو حادثہ ہوا۔ مجھے اس سے بہت دکھ ہوا ہے۔ انہیں یاد کر کے میں بہت روتی رہی ہوں۔“

بابر نے ایک گہری سانس لے کر شاکی لہجے میں کہا۔ ”اتنے بڑے حادثے کے باوجود تم منٹھل نہیں آئیں۔ کیا چچا اور چچی نے منع کیا تھا؟“

اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا بس ہونٹ بھینچ کر اثبات میں سر ہلایا۔ پھر دکھ سے بھرے لہجے میں کہا۔ ”بچپن سے لے کر اب تک ہمارے بڑوں نے سگے ہونے کے باوجود نفرتیں پروان چڑھائی ہیں۔ ہم بھی ان کی لپیٹ

میں آتے رہے ہیں۔ کیا اب تم اسی سلسلے کو جاری رکھو گے؟"
"چچا سردار کے ساتھ میں بڑی دیر اسی موضوع پر بحث کرتا رہا ہوں۔ ان کی باتوں سے مجھے یہی تاثر ملا ہے۔ وہ اپنے مرحوم بھائی کے یتیم بیٹے سے ذرا بھی ہمدردی نہیں رکھتے۔"
اس کی امی احاطے کے آخر میں چوبی دروازے کے پاس پہنچی تھی۔ وہاں سے پلٹ کر اس نے آواز دی۔
"شاہدہ! بس کرو۔ اب آ بھی جاؤ۔" اس کے لہجے میں درشتگی تھی۔
وہ روہانسی آواز میں بولی۔ "بابر بھائی! خدا کے لیے ان جھگڑوں کو ختم کریں۔ مجھے اپنے بابا بھی عزیز ہیں۔ تمہاری بھی بہت فکر ہے۔"
یہ کہہ کر وہ پلٹ کر بھاری بھاری قدموں سے حویلی کے اندرونی حصے کی طرف جانے لگی۔ بابر نے ایک گہری سانس لی۔ ایک حسرت انگیز نظر اس پر ڈالی اور بجھے بجھے دل کے ساتھ جیپ میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کرنے لگا۔ ایڈووکیٹ نجیب عارف پہلے ہی بیٹھ گئے تھے۔
اگلے دن ایڈووکیٹ نجیب عارف شہر واپس چلے گئے۔ انہوں نے بابر کو یقین دلایا تھا کہ سردار حاکم کے خلاف کیس کی وہ خود پیروی کریں گے۔ عدالت کے اندر بھی اور عدالت کے باہر بھی اس کے سرپرست کے طور پر اپنا... دار ادا کریں گے۔ وصیت پر عمل کرا کے سردار حاکم کی ہر چال کا منہ توڑ جواب دیں گے۔
اس سے اگلی صبح کی بات ہے۔ پولیس کی ایک جیپ حویلی کے سامنے آ کے رکی۔ ایک اے ایس آئی کے عہدے کا اہلکار اتر کر باہر آیا۔ اس نے بابر سے ملاقات کی اور یہ ہولناک خبر سنائی کہ ایڈووکیٹ نجیب عارف شہر جاتے ہوئے ایک حادثاتی موت کا شکار ہوئے ہیں۔
ان کی لاش جھاڑیوں کے پاس سے برآمد ہوئی۔ انہیں بدترین تشدد کر کے ہلاک کیا گیا تھا۔
بابر یہ سن کر سناٹے میں آ گیا۔ شدید صدمے اور غصے سے اس کا خون کھولنے لگا۔ وہ فوراً اپنے جانبازوں کے ایک دستے کو لے کر تھانے روانہ ہوا۔
تھانے میں ایک پرانی سی چارپائی پر ایڈووکیٹ نجیب عارف کی تشدد زدہ لاش دھری ہوئی تھی۔ ابھی تک اس کی لاش کو ضابطے کی کارروائی کے لیے اسپتال منتقل نہیں کیا گیا تھا۔ اس کا پوسٹ مارٹم بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے باوجود ذرا سے معائنے سے بابر جان گیا کہ ان کو وحشیانہ تشدد کے بعد سر میں گولی مار کے قتل کیا گیا تھا۔
پولیس کے مطابق یہ واردات ڈاکوؤں نے کی تھی۔ بدنام ڈکیت مستان خان اور اس کے گرگے اس واردات میں ملوث تھے۔ ڈرائیور کے مطابق جس طرح اس کا موبائل، گھڑی اور نقد رقم غائب تھی اور ایڈووکیٹ نجیب عارف کا قیمتی سامان بھی موجود نہیں تھا۔ اس سے بہ ظاہر یہی لگتا تھا کہ مستان خان ہی اس میں ملوث تھا۔
بابر اس سے ہٹ کر سوچ رہا تھا۔ ان پر جس طرح سے تشدد کیا گیا تھا، ان کا سامان بکھرا پڑا تھا۔ اس کا دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا اس واردات کی پلاننگ سردار چچا کے حکم پر کی گئی تھی۔ کل ملاقات کے دوران ایڈووکیٹ نجیب عارف نے یہ کہا تھا کہ زمین کے کاغذات اور وصیت نامہ ان کی تحویل میں ہوگا۔ انہیں حاصل کرنے کے لیے سردار چچا نے اپنے کارندوں کے ذریعے ان پر تشدد کرایا۔ ان کے سامان کی تلاشی لی گئی۔ ناکام ہو کر انہیں گولی ماری گئی ہوگی۔ توجہ دوسری طرف بھٹکانے کے لیے اسے ڈاکازنی کا رنگ دے دیا۔
بابر، ایڈووکیٹ نجیب عارف کی دور اندیشی کا قائل ہو گیا۔ شہر جاتے ہوئے انہوں نے کاغذات بابر کو واپس دے دیے تھے۔ اس کے استفسار پر کہا تھا۔ "شہر تک بہت طویل سفر ہے۔ راستہ پہاڑی ہے اور سنسان ہے۔ خدا نخواستہ کوئی حادثہ ہو جائے اور اتنے اہم کاغذات کہیں کھو جائیں تو ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا۔"
شاید ان کی چھٹی حس نے کسی غیر معمولی حادثے کا اشارہ کر دیا تھا۔
بابر بہ ظاہر ایڈووکیٹ نجیب عارف کی لاش کے پاس صدمے سے سر جھکائے کھڑا تھا۔ لیکن اس کے دل و دماغ میں ایک بھونچال برپا تھا۔ سردار چچا کی سازشوں کے تانے بانے جوڑ رہا تھا۔ اس کے خلاف انتقام کی تدابیر سوچ رہا تھا۔
ایڈووکیٹ نجیب عارف کی لاش شہر روانہ کی گئی تو بابر حویلی واپس آیا۔ اپنے باپ جیسے شخص کی ناگہانی موت سے وہ شدید صدمے میں مبتلا ہو گیا تھا۔ جی میں آ رہا تھا، اپنے جانبازوں کو لے کر اسی وقت نکل جائے اور سردار چچا کو گھسیٹتا ہوا باہر نکال کر گولیوں سے چھلنی کر دے۔
مگر بہت سی مصلحتیں آڑے آ گئیں۔ سردار چچا کے جرائم کی فہرست بڑی طویل تھی۔ ساتھ ہی ان کی سماجی حیثیت بھی بڑی ٹھسے دار تھی۔ ایسے میں سوچ سمجھ کر ان کے

خلاف کوئی ایکشن کرنا تھا۔

سردار قاسم کے قاتلوں کا کُھرا بھی اس کی طرف جاتا تھا۔ خود ابا نے اپنے خط میں اس پر شک کا اظہار کیا تھا۔ اب ایڈووکیٹ نجیب عارف کے پُراسرار قتل کے اشارے بھی اسی کی طرف جاتے تھے۔

اس نے سردار حاکم کو پرکھنے کے لیے اسے فون کیا۔ رابطہ ہونے پر طنز سے کہا۔ ''چچا سردار! مبارک ہو۔ آپ کے راستے کا ایک بڑا پتھر ہمیشہ کے لیے ہٹ گیا ہے۔ ایڈووکیٹ نجیب عارف کو شہر جاتے ہوئے تشدد کے بعد گولی ماری گئی ہے۔''

دوسری جانب خاموشی چھائی رہی پھر بڑی دیر بعد اس کی بھاری آواز گونجی۔ ''بھتیجے! اس انداز میں مجھ سے بات کیونکر کررہے ہو؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو اس کے پیچھے میرا ہاتھ ہے؟''

''ارے نہیں نہیں چچا سردار! آپ تو بڑے شریف اور رحم دل انسان ہیں۔ یہ واردات تو ڈاکو مستان خان نے کی ہے۔ بس یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جو بھی آپ کے راستے کی رکاوٹ بنتا ہے، اسے ڈاکو مستان خان کیوں قتل کرتا ہے؟ میرے بابا کی مثال بھی آپ کے سامنے ہے۔''

''ہوں۔ اس کا مطلب ہے تمہیں شک ہے کہ بھائی مرحوم کے ساتھ جو سانحہ ہوا ہے، وہ میرے اشارے پر ہوا ہے؟''

''ابھی صرف شک و شبہ ہے چچا سردار!'' اس نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ ''جس وقت یقین ہوا، تب بات نہیں کروں گا۔ گھسیٹتا ہوا لے جاؤں گا اور منتھل کے سب سے اونچے پیڑ پر پھانسی چڑھاؤں گا۔''

''اپنی اوقات کے مطابق بات کرو کمینے!'' اس نے گرجتے ہوئے کہا۔ ''سردار حاکم کا اس پورے علاقے میں ایک دبدبہ ہے۔ پولیس سے لے کر حکومت کے بڑے بڑے حلقوں تک لوگ میری عزت کرتے ہیں۔ جبکہ تم...... کل کے لونڈے! منتھل کے چند جذباتی نوجوان اپنے ساتھ ملا کر، اپنے خاندان کے بزرگ سے بات کرنے کی تمیز بھی بھول گئے ہو۔''

بابر نے دکھ سے کہا۔ ''افسوس! میں آپ کو اب بھی اپنا بزرگ سمجھتا ہوں۔ جبکہ میں جانتا ہوں آپ میرے بابا کے بھی اور اب میرے بھی آستین کے سانپ ہیں۔ خاندان اور رشتے کی آڑ میں سب سے بڑے دشمن ہیں۔''

''تم میرے صبر کو آزما رہے ہو بابر!'' اس نے دہاڑ کر کہا۔ ''تمہاری ایسی ہی بے سروپا باتیں سن کر دشمن نہیں ہوں تب بھی بن جاؤں گا۔''

بابر نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''ایڈووکیٹ نجیب عارف میرے بابا کی طرح محترم تھے۔ ان کا بہیمانہ خون کر کے آپ نے مجھے پاگل بنا دیا ہے۔ تعلق آپ نے توڑا ہے، دشمنی کا آغاز آپ نے کیا ہے۔ اب اسے انجام تک میں پہنچاؤں گا۔ آج سے آپ کا یومِ حساب شروع ہوتا ہے چچا سردار!''

اس نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کردیا۔ کمرے سے باہر آیا۔ اونچا برآمدہ تھا۔ اس سے نیچے تراشے ہوئے سفید پتھروں کا زینہ تھا۔ وہ زینوں سے اتر کر سرسبز لان میں آیا۔ وہاں اس کے جانباز مختلف جسمانی مشقوں میں مصروف تھے۔ اس نے خصوصی طور پر ان کی تربیت کے لیے شہر سے انسٹرکٹر بلوایا تھا۔ جو انہیں ایسی ورزشیں اور مشقیں کراتا تھا جن سے وہ جسمانی طور پر مضبوط ہوں۔

بابر کے سامنے دو بڑے دشمن تھے۔ ڈاکو مستان خان کھلم کھلا اس کے خاندان کا قاتل تھا۔ چچا سردار بہ ظاہر اپنا تھا، درپردہ سازشی اور فتنہ گر تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اپنے جوانوں کی ایسی جسمانی اور حربی تربیت کرائے گا کہ دشمنوں کے آگے وہ کبھی کم زور نہ پڑیں۔ اس نے حویلی میں ہی ایک سرسبز لان کو تربیت گاہ بنایا۔ منتھل کے پچیس ایسے جوانوں کو منتخب کیا جو جسمانی لحاظ سے چاق چوبند تھے۔ یہ جوان رضاکارانہ طور پر اس کی خدمت میں ہر وقت حاضری کے لیے تیار تھے۔

بابر نے ان کے دو گروپ بنا لیے۔ ایک گروپ میں دس ایسے جوانوں کو شامل کیا جو ہوشیار اور چالاک تھے۔ ان کی یہ ذمے داری لگائی کہ پورے علاقے میں گھوم پھر کر ڈاکو مستان خان اور اس کے ساتھیوں کا پتا لگائیں۔ اس کے علاوہ اگر ڈاکو مستان خان اور سردار حاکم میں کوئی گٹھ جوڑ ہے تو اسے بھی معلوم کریں۔ یہ ایک طرح سے اس کے جاسوس تھے۔

دوسرا گروپ بابر کے محافظ کے طور پر خدمات سرانجام دینے لگا۔ وہ جدھر بھی جاتا، اس گروپ سے چند جوان اپنے ساتھ رکھتا۔

لان میں جسمانی مشقیں کرنے والے جوانوں کے قریب آ کے اس نے کچھ دیر ان کی سرگرمیوں کا معائنہ کیا۔ اس دوران جاسوسی کرنے والے گروپ کا کمانڈر اس کے پاس آیا۔ اس کا نام ابرار خان تھا۔

اس نے مؤدب لہجے میں کہا۔ ''بابر بھائی! آپ کی ہدایت پر ہمارے جاسوس پورے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ پہاڑ سے لے کر جنگل تک، وادی سے لے کر آبادی تک ڈاکو مستان خان اور اس کے گروہ کی کھوج لگانے کی کوشش کررہے ہیں۔''

''بہت اچھا۔ منتھل کی طرف سے کیا اطلاعات ہیں؟ چاچا سردار اور مستان خان میں کسی گٹھ جوڑ کا پتا چلا ہے؟''

''میرے جاسوس منتھل کی حویلی کے آس پاس موجود ہیں۔ ان کی طرف سے ابھی ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی ہے۔''

''ہوں۔ اپنے جوانوں سے کہو غافل نہ رہیں۔ میرا دل کہتا ہے مستان خان کسی بھی وقت منتھل میں دکھائی دے سکتا ہے۔''

''جی بہتر بابر بھائی! ایسا ہی ہوگا۔''

''ابرار! میں شہر جارہا ہوں۔'' بابر بولا۔ ''ایڈووکیٹ نجیب عارف کی نماز جنازہ میں شرکت کرنی ہے۔ میری غیر موجودگی میں تم یہاں کے ذمے دار ہوگے۔''

''آپ واپس کب آئیں گے؟ اپنے ساتھ کتنے جوان لے کر جائیں گے؟''

''عصر کی نماز پڑھ کے ان کی نماز جنازہ ادا ہوگی۔ میں آج ہی شام تک واپس پہنچ جاؤں گا۔ میرے ساتھ دو جوان کافی ہوں گے۔''

ابرار نے تشویش سے کہا۔ ''بابر بھائی! دو جوان نہیں، دو گاڑیوں میں جوان بھر کر لے جائیں۔ ڈاکو مستان خان اور سردار حاکم کی طرف سے کوئی غلط حرکت ہوئی تو منہ توڑ جواب دیں گے۔''

''ارے نہیں ابرار! ابھی حالات ایسے بھی سنگین نہیں۔ شہر سے یہاں تک ڈیڑھ دو گھنٹے کا سفر ہے۔ میں شام تک پہنچ جاؤں گا۔ ویسے بھی شہر میں اتنے جوان ہتھیار لے کر آگئے تو پولیس اور دوسری ایجنسیاں مفت میں پیچھے پڑ جائیں گی۔''

کچھ دیر بعد بابر اپنے ساتھ دو جوان لے کر شہر روانہ ہوگیا۔ ان تینوں کے پاس پستول موجود تھے۔ منتھل سے شہر تک دو گھنٹے کا سفر تھا۔ راستے میں کہیں کہیں پہاڑی علاقہ تھا۔ اکثر آبادیاں تھیں۔ پکی سڑک ان آبادیوں کے اندر سے بل کھاتی گزرتی تھی۔

دوپہر سے ذرا پہلے بابر شہر پہنچ گیا۔ ایڈووکیٹ نجیب عارف مرحوم کے گھر والوں سے تعزیت کی۔ اپنے غم و غصے کا اظہار کیا۔ قاتلوں کی گرفتاری کے لیے اپنی بھرپور کوششوں کا عزم ظاہر کیا۔ نماز جنازہ ادا ہونے تک وہ مرحوم کے لواحقین کے پاس بیٹھا رہا۔ نماز جنازہ پڑھتے ہی وہ منتھل واپس روانہ ہوگیا۔

گرمی کا موسم تھا۔ دن لمبے تھے اس لیے شام سے پہلے منتھل پہنچنے کی امید تھی۔ لیکن کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ وہ منتھل نہ پہنچ سکا۔

ابھی اس نے آدھا فاصلہ طے کیا تھا کہ گاڑی کا ٹائر پھٹ گیا۔ ڈکی میں موجود اضافی ٹائر لگا کے آگے بڑھے تو بارش شروع ہوگئی۔ بارش ایسی تیز تھی کہ آبادیوں سے گزر کر جب پہاڑی علاقے میں داخل ہوئے تو وہاں پہاڑی تودے گرنے سے سڑک بلاک ہوگئی۔ بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ سرکاری عملہ ایک بلڈوزر کی مدد سے ملبا صاف کررہا تھا۔ وہاں گھنٹا لگ گیا۔ جب روڈ صاف ہوا تو سڑک کی حالت ایسی نہیں تھی کہ گاڑی کی رفتار تیز کرتے۔ بارش ابھی تک برس رہی تھی۔ جب وہ منتھل سے بیس میل دور تھے تو شام کے سائے پھیل چکے تھے۔

اس وقت بہت کم گاڑیاں سڑک پر رواں دواں تھیں۔ ایک سرخ رنگ کی گاڑی بہت دیر سے اُن کے پیچھے آرہی تھی۔ بابر کی نظر کئی بار اس پر پڑی تھی۔ بیک ویو مرر میں اس گاڑی کو دیکھتے ہی چھٹی حس نے کسی خطرے کا اشارہ کیا تھا۔ اس نے اپنے جوانوں کو محتاط رہنے کا اشارہ بھی کیا تھا۔ ان کی گاڑی جب ایک ٹیلے سے گھوم کر دوسری طرف آئی تو سڑک پر چھوٹے بڑے بہت سے پتھر دیکھ کر وہ چونک پڑے۔ یہ سلائڈنگ ایریا نہیں تھا۔ بارش کا زور بھی ٹوٹ گیا تھا۔ ایسے میں سڑک پر پڑے یہ پتھر کسی غیر معمولی خطرے کی گھنٹیاں بجا رہے تھے۔ وہ تینوں ایک میکانکی ردعمل کے طور پر کسی پیش آمدہ صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار ہوگئے۔ تینوں نے اپنے پستول نکال کے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام لیے۔ گاڑی کے شیشوں سے باہر پھیلے اندھیرے میں کسی خطرے کی سن گن لینے کے لیے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔

یکایک وہ تینوں اچھل پڑے۔ ایک اضطراری خوف کے ساتھ گاڑی کی سیٹوں کے نیچے دبک گئے۔ ان کی گاڑی پر دو طرف سے شدید فائرنگ ہونے لگی تھی۔ گولیاں ان کی گاڑی کی باڈی سے ٹکرا رہی تھیں۔ گولیوں کی گھن گرج میں ٹائروں کے پھٹنے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔

بابر کو اندیشہ ہوا کہ یہ ان کا آخری وقت ہے۔ دشمن اندھیرے میں، پتھروں اور چٹانوں کی آڑ میں تھے۔ آٹو

مینک ہتھیاروں سے ان پر مسلسل گولیوں کی بارش کررہے تھے۔ جبکہ انہیں سر اٹھا کے یا ہاتھ بڑھا کے فائر کرنے کا بھی موقع نہیں تھا۔

اچانک ہی فائرنگ رک گئی۔ ایک خوف ناک خاموشی چھا گئی۔ بابر نے سنبھل کر اپنے حواس مجتمع کر کے دیکھا۔ اس کے جسم میں کہیں درد محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے جانباز بھی بہ ظاہر زخمی نہیں لگ رہے تھے۔

اسی وقت ذرا فاصلے سے ایک گرجتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''بابر! ہم تمہیں مارنا نہیں چاہتے تھے۔ صرف خوف زدہ کررہے تھے۔ یہ بتانا چاہتے تھے کہ تم کتنے حقیر ہو۔ اب چپ چاپ اپنے ساتھیوں کو لے کر گاڑی سے باہر نکلو۔ اپنے ہتھیار زمین پر رکھ کر ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ۔''

بابر نے سر اک ذرا اٹھا کر چلا کر کہا۔ ''تم کون ہو؟ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''ابھی تم اس پوزیشن میں نہیں ہو کہ سوال پوچھو۔'' وہی شخص دہاڑ کر بولا۔ ''شکر کرو فی الحال تمہیں مارنے کا حکم نہیں ملا ہے۔ اگر چالاکی دکھاؤ گے تو حکم بدل بھی سکتا ہے۔''

اس نے اپنے جانبازوں سے کہا۔ ''ہم بری طرح پھنس گئے ہیں۔ اتنی خطرناک فائرنگ کے بعد جان بچ گئی ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ ہمیں مارنا نہیں چاہتے۔ اسے غنیمت سمجھتے ہوئے ان بدبختوں کی بات مان لیتے ہیں۔ پتا تو چلے اس کھیل کی پلاننگ کرنے والا کون ہے؟''

وہ تینوں گاڑی سے نیچے اترے۔ اسی وقت پیچھے ذرا فاصلے پر وہی سرخ گاڑی آ کے رک گئی۔ اس کی تیز ہیڈ لائٹس میں وہ تینوں بھیگ گئے۔ اس گاڑی میں سے پانچ چھ آدمی ڈھاٹوں میں منہ چھپائے نیچے اترے۔ اپنے ہاتھوں میں پکڑے خودکار ہتھیار ان کی طرف کر کے کھڑے ہو گئے۔

اس اثنا میں ٹیلے کے اوپر سے اور سڑک کی دوسری جانب بڑے پتھروں کے پیچھے سے بہت سے ہتھیار بدست آدمی سامنے آئے۔ ان کے چہرے بھی چھپے ہوئے تھے۔

ایک شخص نے دبنگ آواز میں کہا۔ ''ہم نے سنا ہے تم نے منتھل کے جوانوں کو سردار مستان خان کے خلاف بہت بھڑکایا ہے۔ اپنے ماں باپ اور چھوٹے بھائی کی موت کا بدلہ لینے کی ٹھان لی ہے۔ ابے او گندی نالی کے کیڑے! کیا سردار مستان خان اتنے کمزور ہیں کہ تیرے جیسے کل کے لونڈے ان پر ہاتھ ڈال سکیں۔''

اس کے ساتھ ہی اس شخص نے اپنی رائفل کا بٹ زور سے بابر کے کندھے پر مارا۔ اس کے منہ سے بے اختیار کراہ نکلی۔ وہ لڑکھڑا کر چند قدم آگے گیا۔ اسی وقت سامنے موجود دوسرے شخص نے اس کے سینے پر ٹھوکر ماری۔ بابر پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ اس کا سر زور سے پتھریلی سڑک سے ٹکرایا۔ اس کی آنکھوں کے آگے روشنی کے ترمرے ناچنے لگے۔ اسی وقت باقی لوگ اس کے جانبازوں پر پل پڑے۔ ٹھوکروں سے اور رائفل کے بٹوں سے ان پر شدید تشدد... کرنے لگے۔ ذرا ہی دیر میں وہ دونوں سڑک پر بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

بابر کے حواس بحال تھے۔ اسے دو ڈاکوؤں نے جھٹکے سے کھڑا کیا۔ گھسیٹتے ہوئے لے جا کر سرخ گاڑی میں ڈال دیا۔ ایک شخص نے بابر کی آنکھوں پر سیاہ کپڑا باندھ دیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہو کر چل پڑی۔ جائے وقوعہ پیچھے رہ گیا۔ اس کے مجروح اور بے ہوش ساتھی بھی وہیں ناکارہ گاڑی کے ساتھ اندھیرے میں پڑے رہ گئے۔ بابر نہیں جانتا تھا ان کے ساتھ ڈاکوؤں نے کیا سلوک کیا ہوگا۔

گاڑی بہت دیر جھٹکے کھاتی، کبھی تیز کبھی سست روی سے چلتی رہی۔ بہت دیر بعد گاڑی رک گئی۔ اس کے کانوں نے کسی پھاٹک کے کھلنے کی آواز سنی۔ پھر گاڑی اندر داخل ہوئی۔ چند ثانیوں بعد اسے کھینچ کر گاڑی سے باہر نکالا گیا۔ گھسیٹتے ہوئے لے جا کر ایک کمرے میں دھکیل دیا گیا۔ ایک شخص نے اس کی آنکھوں سے کپڑا ہٹایا اور کٹیلے لہجے میں کہا۔ ''اگلے حکم تک تو اس کمرے میں قید رہے گا۔ اس کمرے کی کوئی کھڑکی نہیں۔ بس ایک دروازہ ہے۔ باہر سے جس پر تالا لگا رہے گا۔'' یہ کہہ کر وہ شخص باہر چلا گیا۔

بہت دیر تک سختی سے آنکھوں پر پٹی بندھی رہنے سے چند ثانیے تو وہ شدید تکلیف سے آنکھیں کھول بھی نہ سکا۔ جب اک ذرا سکون ملا تو آنکھیں کھول کر دیکھا۔ آنکھوں کے آگے گھپ اندھیرا تھا۔ ایک لمحے کو تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کہیں آنکھیں ہی ضائع نہ ہو گئی ہوں۔ پھر یاد آیا یہ رات کا وقت تھا۔ اسے کمرے میں چھوڑنے والے شخص نے کہا تھا اس کی کوئی کھڑکی بھی نہیں۔

وہ ہاتھوں سے ٹٹول کر دیوار تک گیا۔ کمرے کا فرش خالی تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ فرش پر بیٹھ گیا۔ ظالموں نے اس بے دردی سے اسے مارا تھا کہ سر، گردن اور کمر میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ کراہتا ہوا نیم دراز ہو کر اس صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔ ان حملہ آوروں کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا، وہ مستان خان کے ڈاکو ساتھی ہیں۔ یہ بات اس کی

سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ انہوں نے موقع ہونے کے باوجود اسے جان سے کیوں نہیں مارا تھا؟ اسے لاکر یہاں قید کرنے کا کیا مقصد ہوسکتا تھا؟

کیا اس واردات کے پیچھے سردار حاکم کا شاطر دماغ کام کررہا ہے؟ متحمل کی جاگیر کے کاغذات اور بابر کے ابا کی وصیت حاصل کرنے کے لیے وہ پاگل ہوا جارہا تھا۔ ایسے میں کچھ بعید نہیں کہ اس کے اغوا میں وہ ملوث ہو۔

وقت گھسٹتا رہا۔ رات گزرتی رہی۔ بہت دیر بعد اس کی آنکھ لگی۔ جب دوبارہ آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا ہی تھا۔ صرف دروازے کی ایک بال برابر درز سے معلوم ہوتا تھا یا ہر دن کا وقت تھا۔ وہ اپنی نظریں روشنی کی اس باریک لکیر پر جمائے دروازہ کھلنے کا انتظار کرتا رہا۔ لحہ لحہ اس پر بھاری پڑتا رہا۔ کئی بار وہ دروازے کے پاس گیا۔ اس لکیر کی درز پر آنکھیں لگا کر باہر دیکھنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ درز اتنی باریک تھی۔ اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ اس نے متعدد بار دروازہ زور زور سے بجایا۔ اسے ٹھوکریں ماریں۔ چلا چلا کے آوازیں دیں مگر کسی کی آہٹ سنائی دی، نہ ہی کسی بندہ بشر کی آواز۔ چیخ چیخ کر اس کی آواز ہی بیٹھ گئی۔ وہ خود بھی تھک ہار کر ایک طرف دیوار کے ساتھ بیٹھ گیا۔

یوں دیکھتے دیکھتے روشنی کی وہ لکیر بھی معدوم ہوگئی۔ ایک اور طویل اور قاتل رات کسی بھاری چٹان کی طرح اس کے سر پر سوار ہوگئی۔

وہ رات بھی گزر گئی۔ کچھ امید لے کر، کچھ ارمان لے کر نیا دن طلوع ہوا۔ روشنی کی وہ لکیر ایک بار پھر اس کے صبر کا امتحان لیتی رہی۔ وہ صبر کرتا رہا۔ گھڑیاں گنتا رہا۔ وہ دن بھی مایوسی کے گھور اندھیروں میں ڈوب گیا۔

تیسری رات بھی اس تنہا اور تاریک کمرے میں اتر آئی۔ اسے درد اور مایوسی کی لوریاں سناتی رہی۔

قید کے اس سارے عرصے میں وہ بھوکا پیاسا رہا تھا۔ پیاس سے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ بھوک سے انتڑیاں واویلا کررہی تھیں۔ اس کے وجود میں جو کچھ تھا وہ ان تین دنوں میں بول و براز کی شکل میں باہر آچکا تھا۔ ان تین دنوں میں تنہائی، تاریکی، بھوک پیاس کے علاوہ اس کے اپنے فضلے کا ناقابلِ برداشت تعفن اس کے لیے عذاب بنا رہا تھا۔

تیسرے دن جب وہ شدید مایوسی اور کم زوری سے ایک طرف فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ اچانک ہی اس کال کوٹھری کا دروازہ کھل گیا۔ روشنی کا ایک تیز جھماکا اس کی آنکھوں سے ٹکرایا۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس نے پلکیں جھپک جھپک کر دیکھنے کی کوشش کی۔ ایک شخص کا عکس دروازے پر نظر آیا۔ وہ اندر جھانک رہا تھا۔ انداز ایسا تھا گویا دیکھنا چاہتا ہو کہ قیدی زندہ ہے یا مر گیا ہے؟

اس آدمی کی نظر بابر پر پڑی۔ اس کی حالت اور نقاہت دیکھ کر تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ”ابے او کاغذ کے شیر! کس حال میں ہو؟ کیا عقل شریف کچھ ٹھکانے لگی ہے کہ نہیں؟“

بابر ایسی کم زوری محسوس کررہا تھا کہ بولنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔

اس نے بڑی مشکل سے کہا۔ ”تم لوگ کون ہو؟ اگر ڈاکو مستان خان کے آدمی ہو تو اس حال میں کیوں رکھا ہے؟ میرے اپنوں کی طرح مجھے بھی مار ڈالو۔“

اس آدمی نے زوردار قہقہہ لگایا...... ”بس...... ہوا نکل گئی تین ہی دنوں میں؟ اتنی جلدی موت کی تمنا کرنے لگے۔ ابے ہمت نہیں تھی تو پنگا کیوں لیتے ہو۔ چلو اٹھو۔ تمہیں دوسری جگہ لے جارہے ہیں۔ وہیں پر تمہاری قسمت کا فیصلہ ہوگا۔“

اس نے بابر کو ایک جھٹکے سے کھڑا کیا۔ اسے بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گیا۔ وہاں چند اور آدمی تھے۔ سب کے چہرے ڈھاٹوں میں چھپے تھے۔ ایک سیاہ رنگ کا ویگو ڈالا وہاں کھڑا تھا۔ اس شخص نے بابر کو ویگو ڈالے کے اندر دھکیل دیا۔ ایک دوسرے آدمی نے اس کی آنکھوں پر کالا کپڑا باندھ دیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ اندھیرے کا یہ سفر ایک بار پھر کسی نامعلوم منزل کی طرف شروع ہوا۔

بہت سی کچی پکی سڑکوں پر گھمانے پھرانے کے بعد ویگو ڈالا ایک جگہ رک گیا۔ اسے گھسیٹ کر باہر نکالا گیا۔ دھکیلتے ہوئے ایک کمرے میں لے جایا گیا۔ وہاں اس کی آنکھوں پر سے کپڑا ہٹایا گیا۔ اس کمرے میں روشنی تھی۔ چھت کے قریب ایک روشندان اس روشنی کا منبع تھا۔

اس نیم روشن کمرے کے ننگے فرش پر وہ پڑا رہا۔ اس کا خیال تھا پہلے والے تنگ و تاریک کمرے کی اذیت سے ایک بار پھر گزرنا پڑے گا لیکن اس شام اس کمرے کا دروازہ کھلا اور اس میں سے جو شخص اندر آیا، اسے دیکھ کر بابر کے سینے میں جیسے وحشی گھوڑے دوڑنے لگے۔ وہ ہونٹ بھینچ کر شدید نفرت سے سردار حاکم کی طرف دیکھنے لگا۔

سردار حاکم نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ”اُف بھتیجے!

کیسا بُرا حال ہو گیا ہے تمہارا؟ ان بدمعاشوں نے تھوڑا بھی ترس نہیں کھایا ہے۔"

اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ "تو یہ تم تھے چچا سردار! بہت جلدی اپنا اصل روپ ظاہر کر دیا۔"

"میرا اصل روپ تم نے ابھی کہاں دیکھا ہے برخوردار! یہ تو صرف فلم کا ٹریلر ہے۔ اصل فلم ابھی باقی ہے۔ تمہاری اکڑ اور غرور خاک میں ملانے کے لیے یہ ایک ہلکی سی جھلک ہے۔" اس نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

"ڈاکو مستان خان کے ساتھ تمہارے گٹھ جوڑ کا شک تو تھا۔ آج یقین بھی ہو گیا۔" بابر غصے سے بولا۔

"ڈاکو مستان خان کے حوالے سے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ تمہیں اٹھانے والے میرے ہی آدمی تھے۔ تمہارے ساتھیوں پر صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے ڈاکو مستان خان کا نام لیا تھا کہ وہ مجھ پر شک نہ کریں۔"

"کیا میرے جوان زندہ ہیں؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ انہیں صرف بے ہوش کر کے چھوڑا تھا۔ بعد میں انہوں نے منگھل جا کے ڈاکو مستان خان کو ہی اس کا ذمّے دار ٹھہرایا تھا۔"

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو، یہ میں جانتا ہوں چچا سردار! تم جتنا ستم ڈھاؤ گے میں سر نہیں جھکاؤں گا۔" اس نے نقاہت کے باوجود مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں جان دے دوں گا لیکن کاغذات اور وصیت نامہ تمہیں نہیں دوں گا۔"

"ضد کرو گے تو جان سے جاؤ گے۔ کاغذات اور مرحوم بھائی کی وصیت کے حوالے سے مجھے اس ایڈووکیٹ سے خطرہ تھا۔ وہ بھی اپنے انجام کو پہنچا۔ خس کم جہاں پاک۔ اب تم بھی موت کی تمنا کرتے ہو۔ ایسے میں تمہارے بعد ان کاغذات اور وصیت نامے کو کون دیکھے گا؟ سب کچھ میرا ہو گا۔ آخر اس پورے خاندان کا سرپرست جو ہوں۔" وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

"اگر ایسی بات ہے تو مجھے زندہ کیوں رکھا ہے؟" بابر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تمسخر سے کہا۔ "مجھے گولی ماردیں۔"

"مجھے چیلنج مت کرو بھتیجے! میں جب چاہوں تمہیں چٹکی میں مسل سکتا ہوں۔ تمہارے ساتھ یہ جو سلوک کیا ہے، اس دھمکی کا جواب ہے کہ تم مجھے گھسیٹتے ہوئے منگھل لے جا کر سب سے اونچے پیڑ پر لٹکانا چاہتے تھے۔ میں نے تمہیں اٹھوا کے ایک قابلِ رحم حالت میں قید رکھ کر تمہاری اوقات یاد دلا دی ہے۔ میں تمہیں جان سے مارنا نہیں چاہتا۔ اپنے مرحوم بھائی کی نسل ختم کرنا نہیں چاہتا۔ تم بھی اس حقیقت کو جان لو۔ تم میرا مقابلہ نہیں کر سکتے ہو۔ اس لیے شرافت سے منگھل کے کاغذات اور وصیت نامہ میرے حوالے کر دو۔ پکے کاغذ پر لکھ کر دو کہ میں تمہارا سرپرست ہوں۔ آئندہ تم میرے احکامات کے پابند ہو گے۔"

"میں ان میں سے تمہارا کوئی بھی مطالبہ نہیں مانتا ہوں چچا سردار!" اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ "منگھل کی جاگیر کے کاغذات اور بابا کا وصیت نامہ اس وقت میرے خاص آدمیوں کے پاس ہے۔ تم یہ مت بھولو کہ میری غیر طبعی موت واقع ہوئی تو وصیت کے مطابق ساری جاگیر منگھل کے لوگوں میں تقسیم ہو گی۔ اس لیے مجھے جان سے مارنے کی دھمکی مت دو۔ میں تمہاری مجبوری کو سمجھتا ہوں۔"

سردار حاکم خشمگیں نظروں سے اسے گھورتا رہا پھر اپنے دائیں بائیں موجود کارندوں سے کہا۔ "اس کتّے کی دم کے ہوش ابھی ٹھکانے نہیں لگے ہیں۔ اسے ایسا سبق سکھا دو کہ خارش زدہ کتّے کی طرح میرے پیر چاٹتا رہے گا یا پاگل ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ جھٹکے سے مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے دور ہوتا چلا گیا۔

اس کے بعد بابر پر ستم کے نئے سلسلے شروع ہوئے۔ دو دنوں تک مسلسل دن رات اسے سخت اذیت دی جاتی رہی۔ وہ کبھی بے ہوش ہوتا کبھی ہوش میں آ کر ظلم کے انداز سہتا رہا۔

تیسرے دن اسے بند کمرے سے نکال کر کھلے آسمان کے نیچے لایا گیا تب اس پر انکشاف ہوا کہ یہ تو سردار حاکم کی حویلی تھی۔ یہ وہی حویلی تھی جہاں اس کا بچپن گزرا تھا۔ جہاں شاہدہ اور اس کے چھوٹے بھائیوں کے ساتھ کھیلتے، لڑتے اس نے اپنے بارہ سال بتائے تھے۔

اسے حویلی کے رہائشی حصے کے باہر کھلے احاطے میں ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ اگست کا مہینہ تھا۔ دھوپ شدت سے پڑتی تھی۔ اس کی کرنیں بدن میں سرخ سرخ سلاخوں کی طرح اترتی تھیں۔

اس چلچلاتی دھوپ میں اسے ستون سے باندھ کر چابک سے مارا جاتا۔ سردار حاکم خود بھی یہ تماشائے ستم دیکھتا۔ اس کی اذیت اور بے بسی پر قہقہے لگاتا۔ اس سب کے باوجود بابر سے اپنی مرضی کی بات منوانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

پھر ایک دن بابر کے ساتھیوں نے ایک منصوبے کے تحت حویلی پر حملہ کیا۔ اس سے پہلے سردار حاکم کے گودام میں آگ لگائی۔ وہ اپنے کارندوں کے ساتھ حویلی سے چلا گیا تب بابر کے جانباز حویلی میں گھس آئے۔ دربان اور شیر خان کو بے بس کرا کے بابر کو چھڑا لے گئے۔ یہ سب شاہدہ کے سامنے ہوا تھا۔ وہ صدقِ دل سے اس کی خیریت کی دعا مانگتے اسے حویلی کے پھاٹک سے باہر نکلتے دیکھتی رہی تھی۔

☆☆☆

سردار حاکم کا غصے سے برا حال ہو رہا تھا۔ گندم کے جلے گودام سے واپس آگیا تھا۔ حویلی آ کر دربان اور شیر خان کو اپنے سامنے حاضر کروایا تھا۔ وہ دونوں ہوش میں آگئے تھے۔ انہوں نے سردار حاکم کے آگے سارا واقعہ بیان کیا کہ کس طرح بابر کے وفاداروں نے اچانک حویلی پر حملہ کیا اور ان دونوں کو بے ہوش کرا کے اسے ساتھ لے گئے تھے۔

سردار حاکم کو ایک ہی دن میں بابر کی طرف سے دو زبردست جھٹکے لگے تھے۔ اس کے وفاداروں نے گندم کے سب سے بڑے گودام کو آگ لگائی تھی۔ لاکھوں کا نقصان پہنچایا تھا۔ اس کے بعد بابر کو اس کی حویلی کی قید سے چھڑا کر لے گئے تھے۔ یہ دونوں واقعات سردار حاکم کے لیے دو بڑی ہزیمتیں تھیں۔ ان کی شدت ایسی تھی کہ رات ہونے تک وہ صدمے اور غصے سے آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ اپنی وسیع و عریض بیٹھک میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔

اس نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر اپنے دستِ راست جہانگیر خان سے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''وہ خنزیر کا بچہ مستان خان کب آ رہا ہے؟ کیا اپنی ماں کی شادی میں مصروف ہو گیا ہے؟''

جہانگیر خان سہمی سی آواز میں بولا۔ ''سردار صاحب! وہ گٹھل میں داخل ہو گیا ہے۔ بس پہنچنے ہی والا ہے۔''

''اس گندی نالی کے کیڑے کو پہلی فرصت میں گولی مار دینی چاہیے تھی۔ اس سے کچھ اگلوانے کے ارادے سے زندہ رکھ کر بڑی غلطی کی ہے۔ اب ڈاکو مستان خان کے ذریعے اسے عبرت ناک موت سے دوچار کردوں گا۔''

اسی وقت خادم نے آ کر اطلاع دی کہ مستان خان پہنچ گیا ہے۔ سردار حاکم نے اسے فوراً اندر بھیجنے کا حکم دیا۔ ذرا دیر بعد وہ بیٹھک میں داخل ہوا۔

''آؤ آؤ مستان خان! بہت انتظار کروایا تم نے ظالم!'' سردار حاکم نے خوش دلی سے کہا۔

''آپ کا حکم سنتے ہی دوڑا آ رہا ہوں سردار صاحب!'' مستان خان بولا۔ ''ڈاکو ہوں۔ آخر دیکھ بھال کے، چھپ چھپا کے کہیں آنا جانا ہوتا ہے اس لیے دیر سویر ہو جاتی ہے۔ آپ حکم کریں۔ مجھے کیوں بلایا ہے؟''

''میرا بھتیجا میرے لیے اب ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے۔ اس کا کچھ علاج کرنا ہے۔'' اس نے بھاری آواز میں کہا۔

''سردار صاحب! آپ اسے ہمیشہ کل کا لونڈا کہتے آئے ہیں۔ جنگجوؤں کی اتنی بڑی فوج بھی اس لونڈے کو قابو کرنے میں ناکام رہی ہے؟'' اس کے لہجے میں طنز تھا۔

''مستان خان! تم اس بات کو چھوڑو۔'' وہ ناگواری سے بولا۔ ''ہر واردات کے لیے میں تمہیں منہ مانگی رقم ادا کرتا ہوں۔ اس لیے اپنا فائدہ دیکھو، وجہ مت پوچھو۔''

''میں نے بہت پیسہ بنایا ہے سردار صاحب! میرے ساتھی بھی دولت میں کھیل رہے ہیں لیکن اس دولت کا کیا فائدہ۔ ہم جنگلوں اور پہاڑوں میں دربدر پھر رہے ہیں۔ ہماری دولت غاروں میں پڑی ہے۔ اس لیے کچھ عرصے سے ہم سوچ رہے ہیں اس دھندے کو ترک کر دیں۔ ہم بھی عام انسانوں کی طرح سکون کی زندگی گزاریں۔ شادیاں کریں اور گھر بسائیں۔'' ڈاکو مستان خان کے لہجے میں ایک تشنگی اور حسرت تھی۔

سردار حاکم کچھ دیر گھورتی نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر سرد لہجے میں بولا۔ ''پولیس کے ریکارڈ میں تمہارا اعمال نامہ جس طرح جرائم سے بھرا ہوا ہے... جو تم سوچ رہے ہو، ایسا ممکن ہے؟''

''میں جانتا ہوں ڈاکو مستان خان کے لیے یہ اتنا آسان نہیں۔ پولیس میرا جینا حرام کر دے گی مگر آپ کی پشت پناہی حاصل رہی تو پولیس میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' سردار حاکم نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ ''میں پسِ پردہ رہ کر تم سے کام لیتا ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سرِعام تمہاری حمایت کروں۔ تم قتل، ڈاکا زنی اور لوٹ مار کی کتنی ہی وارداتوں میں پولیس کو مطلوب ہو۔ تمہاری حمایت کرنے کا مطلب ہوا میں اپنی عزت کا خود جنازہ نکال دوں گا۔''

مستان خان نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ مجھے اپنی فرزندی میں لے لیں سردار صاحب! اپنی بیٹی کی میرے ساتھ شادی کرا دیں۔ پولیس کی مجال نہیں ہوگی سردار حاکم کے داماد پر ہاتھ ڈال سکے۔ عوام بھی کچھ

عرصہ پیٹھ پیچھے باتیں بنائیں گے پھر آپ کی طاقت اور میری دہشت سب کی زبان بند کرا دے گی۔“

سردار حاکم اس طرح جھٹکے سے اپنے تخت سے کھڑا ہوا۔ گویا اسے سانپ نے کاٹا ہو پھر گرجتے ہوئے کہا۔ ”مستان خان! کیا نشہ کر کے آئے ہو؟ اتنی بڑی بات کہنے سے پہلے ہزار بار سوچو کہ ایک ڈاکو سے میری بیٹی کی شادی کیا ممکن ہے؟“

”ایک بڑے ڈاکو کی بیٹی ہے۔ ایسے میں ایک چھوٹے ڈاکو کی بیوی بننے میں کیا حرج ہے سردار صاحب!“ اس نے مضبوط لہجے میں طنز کیا۔ ”آپ سے بڑا ڈاکو کون ہو سکتا ہے؟ آپ بھی قتل کرتے ہیں۔ آپ بھی دوسروں کی جائداد اور مال پر قبضہ جماتے ہیں۔ آپ بھی اپنے مخالفوں کو ڈرا دھمکا کے اپنا فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ میں بھی یہ سب کرتا ہوں۔ بس فرق اتنا ہے۔ میں جنگلوں اور پہاڑوں میں رہتا ہوں۔ چھپ چھپ کے ڈاکے مارتا ہوں۔ آپ مہذب سماج میں رہتے ہیں۔ سرِعام جرائم کرتے ہیں۔ پھر بھی شریف اور عزت دار سمجھے جاتے ہیں۔ میں جانتا ہوں آپ کے مہذب اور پڑھے لکھے لوگ اسے وائٹ کالر کرائم کہتے ہیں۔ میں بھی چاہتا ہوں۔ میری شناخت بدل جائے۔ آپ کے ساتھ مل کر میں بھی وائٹ کالر کرائم کرنا چاہتا ہوں۔“

سردار حاکم کچھ دیر سلگتی نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر دوٹوک انداز میں کہا۔ ”یہ ممکن نہیں مستان خان! تم اس کی جگہ بڑے سے بڑا مطالبہ کرو۔ میں ماننے کو تیار ہوں۔ بس اس بابر کو راستے سے ہٹاؤ۔ اس کے پاس سے وصیت نامہ اور منتقل کے کاغذات لا کر مجھے دے دو۔“

”آپ ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچیں سردار صاحب! بابر کو راستے سے ہٹانے کے بعد بھی آپ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کئی دنوں تک تشدد کے باوجود کاغذات حاصل نہیں کر سکے ہیں۔ میں بھی اسے مار سکتا ہوں۔ کاغذات حاصل نہیں کر سکتا۔ آپ آنے والے انتخابات میں حصہ لینے والے ہیں۔ منتقل کی جاگیر ہی نہیں وہاں کے سب ووٹرز کو بھی اپنی گرفت میں رکھنا چاہتے ہیں۔ ایسے میں جب میں آپ کے شانہ بشانہ کھڑا رہوں گا۔ تب کسی کی مجال نہیں ہوگی وہ آپ کی مخالفت کرے۔ آپ بے دھڑک سیاسی بساط پر مہرے چلائیں گے۔ پولیس اور قانون کو اپنے زیرِ اثر کریں گے۔ میں دھونس، دھمکی اور بندوق کی زبان سے آپ کے مخالفوں کو خاموش کراتا رہوں گا۔ یوں سسر اور داماد اس پورے علاقے پر حکمرانی کرتے رہیں گے۔“

سردار حاکم دھپ سے اپنے شاہانہ طرز کے تخت پر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے دستِ راست جہانگیر خان بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر تذبذب سا تھا۔ مستان خان کی باتوں کا اثر جھلک رہا تھا۔

سردار حاکم کچھ دیر سر جھکائے بیٹھا رہا پھر اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”جہانگیر خان! میں اپنے خاص کمرے میں جا رہا ہوں۔ تم میرے ساتھ آ جاؤ۔“

اس کے تخت کے ساتھ ہی ایک دروازہ تھا۔ یہ اس کا خاص کمرا تھا۔ وہ اٹھ کر خاص کمرے میں داخل ہوا۔ جہانگیر خان اس کے پیچھے چلا گیا۔

”جہانگیر خان! میں نے ہمیشہ تمہارے مشورے کو اہمیت دی ہے۔ آج تمہاری آزمائش ہے۔ مجھے بتاؤ اس ڈاکو مستان خان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟“

”سردار صاحب! میرا مشورہ ایک باپ کے لیے بہت بھاری ہوگا۔ مستقبل کے ایک لیڈر کے لیے بہت کاری ہوگا۔“ اس نے سر جھکا کے کہا۔

”کیا تم بھی اس بدبخت کی باتوں میں آ گئے ہو جہانگیر خان!“ اس نے مشتعل ہو کر کہا۔

”معافی چاہتا ہوں سردار صاحب! میں اس کی باتوں میں نہیں آیا ہوں۔ اس کی باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ فیصلہ آپ کے سیاسی مستقبل کے لیے بہت فائدہ مند ہوگا۔ ایک طرف بابر کا قصہ تمام ہوگا۔ دوسری طرف اس پورے علاقے پر آپ کا راج ہوگا۔“

”کیا لوگ ڈاکو مستان خان سے میری رشتے داری قبول کر سکیں گے؟“

”ضروری نہیں یہ شادی آج کل میں طے کی جائے۔ پہلے بابر کو ٹھکانے لگائیں گے۔ وصیت نامہ اور کاغذات کا مسئلہ حل کریں گے۔ منتقل کی جاگیر اور عوام پر اپنی گرفت مضبوط کریں گے۔ اس کے بعد ہی شادی کا مرحلہ آئے گا۔ تب تک بابر کے قتل کی شدت بھی منتقل کے لوگوں پر کم ہو گی۔ بابر کے بعد آپ کی مخالفت کرنے کی کسی میں ہمت بھی نہیں ہوگی۔ اس نئے رشتے کے خلاف باتیں کرنے والے بھی رفتہ رفتہ آپ کی اور مستان خان کی دہشت کی وجہ سے چپ ہو جائیں گے۔“

”ہوں۔ تم اس بدبخت مستان خان کو جا کے بتا دو وہ بابر کا کانٹا صاف کرے۔ کاغذات اور وصیت نامے کے

حصول کو ممکن بنائے۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد موقع محل دیکھ کر اس کی بات مان کر شادی کی بات پکی کریں گے۔''

جہانگیر خان بیٹھک میں واپس آیا۔ ڈاکو مستان خان وہاں بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ جہانگیر خان نے سردار حاکم کا فیصلہ اسے سنا دیا۔

مستان خان کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوگئی۔ دوسرے لمحے اس نے اکھڑ سے لہجے میں کہا۔ ''جہانگیر خان! میں نے برسوں تمہارے سردار کے لیے کام کیا ہے۔ اس کے مزاج سے خوب واقف ہوں۔ یہ بات یاد رکھنا مجھ سے کام نکلوا کر اگر وعدہ خلافی کی کوشش کی تب میں ڈاکو مستان خان کے روپ میں آکر اس کی بیٹی کو اٹھا کے لے جاؤں گا۔''

یہ کہہ کر وہ جھٹکے سے اٹھا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا بیٹھک سے باہر نکلا۔ کھلے احاطے میں اس کے بہت سے ساتھی ڈاکو موجود تھے۔ مستان خان کے باہر نکلتے ہی وہ سب جیپوں اور گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ رات کے اندھیرے میں حویلی کے پھاٹک سے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

بابر کو اس کے جانباز ساتھی، سردار حاکم کی حویلی سے نکال کر منتھل لے آئے تھے۔ اس کے زخموں کا فوری علاج شروع کیا گیا تھا۔ دشمنوں نے اس کی پشت پر اتنے چابک برسائے تھے کہ پیٹھ کی جلد پھٹ گئی تھی۔ اس میں سے خون بہہ بہہ کر ساری پشت پر پھیل چکا تھا۔ پھر خون خشک ہو کر پپڑی سی جم گئی تھی۔ اس کے علاوہ کئی دنوں تک کال کوٹھری میں قید رہنے اور غذا کی قلت کی وجہ سے شدید نقاہت طاری تھی۔

اس وقت رات کا وقت تھا۔ اپنوں میں آکر وہ کافی بہتری محسوس کر رہا تھا۔ اس کے جوان حویلی کے اندر اور باہر بڑی تعداد میں جمع ہو گئے تھے۔ وہ شدید غم و غصے میں تھے۔ وہ بار بار بابر سے اجازت مانگ رہے تھے کہ سردار حاکم کی حویلی پر حملہ کر کے اس کا بدلہ لیں گے۔

بابر نے ان سب کو فی الحال کسی بھی اقدام سے منع کیا تھا۔

اس کی جاسوس ٹیم کا کمانڈر ابرار خان اندر آیا۔ اس کے پلنگ کے قریب آکر دھیمی آواز میں کہا۔ ''بابر بھائی! میرے جاسوسوں نے ایک اہم خبر دی ہے۔ ڈاکو مستان خان کو منتھل میں سردار حاکم کی حویلی میں جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔''

بابر پلنگ پر نیم دراز تھا۔ یہ سن کر جھٹکے سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے زخمی بدن سے شدید ٹیسیں اٹھیں۔ اس کی خدمت پر مامور جوان آس پاس کھڑے تھے۔ وہ سب لپک کر اس کی طرف بڑھے۔ بابر نے اشارے سے انہیں روکا۔ خود ہی پلنگ کی پشت پر سر رکھ کر ایک گہری سانس لی اور رک رک کر کہا۔ ''مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں ہوئی ہے۔ پہلے ہی شبہ تھا سردار چچا اور ڈاکو مستان خان کا آپس میں رابطہ ہے۔ میرے خاندان اور ایڈووکیٹ نجیب عارف کے قتل میں بھی سردار چچا ہی کا ہاتھ لگتا ہے۔''

ایک نوجوان بڑے ہی جذباتی لہجے میں بولا۔ ''پھر آپ ہمیں مت روکیں بابر بھائی! ہمیں اجازت دیں۔ ہم ابھی جاتے ہیں۔ سردار حاکم کی حویلی پر حملہ کر کے ان دونوں شیطانوں کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔''

''ابھی اس کے لیے مناسب وقت نہیں۔ میں خود اس قابل نہیں کہ ساتھ دے سکوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری غیر موجودگی میں تم اس خطرناک مہم کے لیے جاؤ۔ میرا ایک ایک جوان میرے لیے قیمتی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے ثبوت کی تلاش ہے۔ جس دن مجھے یقین ہوا کہ سردار چچا ہی میرے خاندان اور ایڈووکیٹ نجیب عارف کا قاتل ہے۔ اس دن تم سب کو لے کر میں خود انہیں عبرت ناک انجام سے دوچار کروں گا۔''

جاسوسوں کے کمانڈر ابرار خان نے کہا۔ ''ڈاکو مستان خان کا آج سردار حاکم سے ملنے جانا کوئی معمولی بات نہیں لگتی۔ آج ہی آپ اس کی قید سے آزاد ہوئے ہیں۔ ہمارے جوانوں نے اس کے گودام کو بھی آج ہی جلا کر راکھ کر دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ کسی بُرے ارادے سے اکٹھے ہوئے ہیں۔''

''تم درست کہتے ہو ابرار خان!'' بابر نے کہا۔ ''سردار چچا کو ایک ہی دن دو بڑی ہزیمتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ وہ شاید ڈاکو مستان خان کے ذریعے اس کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔''

''اس صورت میں ہمیں یہاں کی سیکیورٹی مضبوط کرنی ہوگی۔'' ایک جوان بولا۔

''جی ہاں۔ منتھل کے داخلی راستے پر جوانوں کا پہرا بٹھا دو۔ منتھل کے آس پاس بھی ایک ٹولی گشت پر لگا دو۔ ابرار خان! تم اپنے جاسوسوں کو ہدایت کرو کہ وہ ڈاکو مستان خان کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں۔ وہ حویلی سے کب باہر نکلتا ہے؟ کہاں جاتا ہے؟ اس سے غافل نہ رہیں۔''

اس کے جانباز فوری طور پر متحرک ہو گئے۔

دو دن خیریت سے گزر گئے۔ کوئی غیر معمولی واقعہ رونما نہیں ہوا۔

ان دو دنوں میں بابر کی طبیعت کافی بہتر ہوئی تھی۔ اچھی خوراک اور مناسب دیکھ بھال سے اس کی جسمانی کمزوری دور ہو گئی تھی۔ زخم بھی بھر رہے تھے۔ آج اس نے دن کے وقت ہلکی پھلکی ورزش بھی کی تھی۔

مغرب کے بعد موسم بڑا راحت بخش ہوا تھا۔ دن بھر کی گرمی کے بعد ایک ٹھنڈک بھری ہوا جسم میں تازگی اور شگفتگی کی لہریں دوڑا رہی تھیں۔ بابر حویلی کے کھلے لان میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ چارپائی پر نیم دراز تھا۔ چند جوان اس کی ٹانگیں اور کندھے دبا رہے تھے۔

اسی وقت حویلی کے پھاٹک پر پہرا دینے والا ایک جوان ادھر آیا۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر شخص بھی تھا۔ قریب آ کر جوان نے کہا۔ ”بابر بھائی! یہ آدمی گٹھل سے آیا ہے۔ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“

گٹھل کے ذکر پر بابر نے اک ذرا چونک کر اس ادھیڑ عمر شخص کی طرف دیکھا۔ پچپن ساٹھ سال کی عمر کا وہ شخص اپنائیت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سفید داڑھی تھی۔ بابر کو اس کے چہرے پر کسی آشنا کا عکس نظر آتا تھا مگر واضح نہیں ہو رہا تھا۔

اس آدمی نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”بابر بیٹا! مجھے نہیں پہچانا کیا؟ میں جمال خان ہوں۔ گٹھل کی حویلی کا پرانا خادم۔“

بابر اچھل پڑا۔ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”اوہو! آپ جمال چچا ہیں؟ دس بارہ سال پہلے آپ کو آخری دفعہ دیکھا تھا۔ اس عرصے میں آپ تو بہت بدل گئے ہیں۔“

”آپ بھی تو بہت بدل گئے ہیں۔ میری گود میں کھیلنے والا اور میری پیٹھ پر سوار ہو کر حویلی کے لان میں مجھے گھوڑا بنا کر دوڑانے والا بچہ اب کیسا کڑیل جوان بن گیا ہے۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

بابر نے کہا۔ ”آپ کیوں آئے ہیں جمال چچا! کیا چچا سردار نے آپ کے ذریعے کوئی دھمکی آمیز پیغام بھیجا ہے؟“

جمال خان کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ کپکپاتی آواز میں بولا۔ ”کیوں غیروں جیسی بات کرتے ہیں آپ بابر بیٹا! میرے لیے آپ سب ایک گھر کے افراد کی طرح ہیں۔ میں آپ سب کی بھلائی کے لیے دعائیں مانگتا ہوں۔ آپ کی آپس کی دشمنی کی وجہ سے دل میں کڑھتا ہوں۔“

بابر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”میں اتنے دن حویلی میں قید رہا۔ مجھ پر وحشیانہ ظلم ہوتا رہا۔ اگر مجھ سے ہمدردی تھی تو اس وقت سامنے کیوں نہیں آئے تھے؟“

وہ دکھ سے بولا۔ ”میں نے کئی بار کوشش کی تھی آپ کے پاس آنے کی۔ آپ کی تھوڑی بہت مدد کرنے کی۔ لیکن سردار صاحب کے کارندے ہر وقت آپ کے آس پاس ہوتے تھے۔ خاص کر وہ مردود شیر خان تو آپ کے پاس سے ہٹتا ہی نہیں تھا۔ جس دن آپ کے جانبازوں نے حویلی پر حملہ کیا تھا، اس سے پہلے شاہدہ بیٹی نے جب آپ کے زخم صاف کیے تھے، مرہم لگایا تھا۔ اس وقت میں نے شاہدہ بیٹی کی مدد کی تھی۔ مگر میں اتنا ڈرا ہوا تھا کہ آپ کو پانی پلا کر اصطبل میں جا کر چھپ گیا تھا۔“

”آپ اس وقت کیوں آئے ہیں؟ کیا گٹھل سے یہاں آتے ہوئے سردار چچا کا ڈر محسوس نہیں ہوا؟“ اس نے طنز سے کہا۔

”مجھے شاہدہ بیٹی نے بھیجا ہے۔“ اس نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ ”وہ بہت پریشان لگتی تھی۔ ایک خط مجھے دے کر بہت جذباتی انداز میں کہا کہ ابھی منغل جا کر آپ کو یہ خط دے آؤں۔“

اس نے اپنی جیب سے ایک خاکی لفافہ نکال کر بابر کی طرف بڑھایا۔ بابر نے چند ثانیے تولتی سی نظروں سے اس خاکی لفافے کی طرف دیکھا۔ شاہدہ کے ذکر سے اس کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ بچپن کی معصوم چاہتوں کا احساس دل میں رچا بسا تھا۔ چند دن قبل گٹھل کی حویلی میں اس کے پُرشباب چہرے کا دیدار کر کے دل کی دنیا اتھل پتھل ہو گئی تھی۔ بیچ میں عداوت اور نفرت کی دیواریں تھیں لیکن دل میں اس کی محبت کا جاں فزا موسم اترا ہوا تھا۔

اس وقت جمال خان کے ہاتھ میں اس جانِ بہاراں کا رقعہ دیکھ کر دل کسی وحشی گھوڑے کی طرح اچھل کود کرنے لگا تھا۔ اس نے جھپٹ کر وہ خط لے لیا۔ تیزی سے اسے کھول کر دیکھا۔ اسکول کی کسی کاپی والے صفحے پر چند سطریں لکھی ہوئی تھیں۔

”بابر بھائی! میرے کانوں نے آپ کے بارے میں بڑی ہولناک باتیں سنی ہیں۔ آپ کی جان کو شدید خطرہ ہے۔

بات صرف یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ میں بھی وحشی

درندوں کا شکار بننے والی ہوں۔ افسوس! یہ سب میرے بابا کی مرضی سے ہونے والا ہے۔ میں تفصیل نہیں لکھ سکتی۔ ہماری حویلی کے مشرق میں نالے کے پاس جو مڈل اسکول ہے۔ میں وہاں پڑھاتی ہوں۔ اسکول کے ساتھ ہی نالے کی طرف سے بہتی نہر ہے۔ وہاں اخروٹ کا بڑا سا پیڑ ہے۔ آپ کل بارہ بجے وہاں آجائیں۔ میں جانتی ہوں آپ کے ساتھ وفاداروں کی ایک پوری فوج ہے۔ کوشش کریں وہاں زیادہ بندے لے کر نہ آئیں۔ تاکہ بابا کے کسی کارندے کو شک نہ ہو۔"

فقط

آپ کی خیر اندیش

یہ چند سطریں پڑھنے کے بعد بہت دیر اس کی نظریں رقعے پر جمی رہیں لیکن اس کا دماغ تیزی سے گردش کرتا رہا۔ اس کی جان کے حوالے سے شاہدہ نے جس خطرے کا ذکر کیا تھا، وہ بابر کے لیے حیرت انگیز بات نہیں تھی۔ سردار حاکم سے ایسی ہی کسی حرکت کی اسے توقع تھی۔

لیکن اس نے اپنے بارے میں جس صورتِ حال کا ذکر کیا تھا، وہ بابر کو سمجھ نہیں آرہی تھی۔ وہ کن وحشی درندوں کی بات کر رہی تھی؟ اس کا بابا کیوں اسے جان بوجھ کر کسی مصیبت میں ڈال رہا تھا؟

اس نے جمال خان کو رخصت کیا۔ بہت دیر تک اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ سوچتے سوچتے اضطراب اس قدر بڑھ گیا کہ جی میں آیا اسی وقت مٹھل چلا جائے۔ شاہدہ اگر کسی مشکل میں ہے تو اس سے نجات دلائے۔

یہ محض اس کے جذباتی ردِعمل کی عکاس سوچ تھی۔ حقیقت میں ایسا کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ بہت بے تابی سے اگلے دن کا انتظار کرنے لگا، جب شاہدہ کی بتائی ہوئی جگہ پر اس سے ملاقات ہونے والی تھی۔

☆☆☆

شاہدہ کی پریشانی انتہاؤں کو چھو رہی تھی۔ اس پر ایک ایسی بات کا انکشاف ہوا تھا جس نے اس کی نس نس میں آگ لگا دی تھی۔ اسے اپنے بابا کی حاکمیت اور دبدبے پر بڑا ناز تھا مگر اس وقت سخت افسوس ہو رہا تھا۔

بات ہی کچھ ایسی تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر حویلی کی طویل راہداری سے گزرتی ہوئی امی کے کمرے میں جارہی تھی۔ دروازے کے پاس گئی تھی اچانک ہی ٹھٹک گئی۔ کمرے سے اس کے بابا کی گرج دار آواز کانوں میں پڑی تھی۔ "تمہیں میرا حکم ماننا ہوگا۔ میں نے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔"

اس کی امی کی تیز اور روہانسی سی آواز سنائی دی۔ "ایسا ظلم نہ کریں۔ ہماری اکلوتی پھول جیسی بیٹی کو اس قدر بے رحمی سے زندان میں نہ ڈالیں۔"

اپنا ذکر سن کر شاہدہ کے کان کھڑے ہو گئے۔ تجسس کی وجہ سے دروازے سے کان لگا کے سننے لگی۔ اس کے بابا کہہ رہے تھے۔

"ایسی سستی جذباتی باتیں چھوڑو۔ خود بھی سمجھو اور شاہدہ کو بھی سمجھاؤ۔ مستان خان سے اس کی شادی ہم سب کے لیے فائدہ مند ہے۔ اس نے وعدہ کیا ہے شادی کے بعد لوٹ مار اور ڈاکا زنی سے توبہ کرلے گا۔ الیکشن میں اس کی مدد سے میرا ووٹ بینک بڑھ جائے گا۔ جب بابر کا پتا صاف ہوگا تب مٹھل کے لوگ بھی میری اطاعت قبول کریں گے۔ جو سرکشی کرے گا، مستان خان اسے سبق سکھائے گا۔ اس طرح میں اس پورے علاقے پر ایک طویل عرصے تک حکمرانی کرتا رہوں گا۔ مجھے اقتدار کی طاقت مل گئی تو مستان خان کو کوئی ڈاکو کی نسبت سے یاد نہیں کرے گا۔ میرے داماد کی حیثیت سے اس کی بھی سب عزت کریں گے......"

اس کا بابا خدا جانے اور کیا کچھ کہہ رہا تھا، شاہدہ کو مزید سننے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا گویا کسی نے کانوں میں سیسہ پگھلا کے ڈال دیا ہو۔ جو اس کے دل تک کو چھیدتا چلا گیا ہو۔

وہ من من بھر قدموں سے چلتی اپنے کمرے میں واپس آئی۔ دل و دماغ میں جیسے آندھیاں چل رہی تھیں۔ اسے یہ سب کسی خواب جیسا لگ رہا تھا۔ جس باپ پر سب سے زیادہ بھروسا تھا، وہی اس کے لیے مصیبتوں کے دروازے کھول رہا تھا۔

وہ تکیے میں سر دے کر روتی رہی۔ منتشر دماغی کے باوجود بغاوت، خودکشی اور گھر سے بھاگ جانے جیسے خیالات اس کے دماغ میں چکراتے رہے۔ اسے دم بہ دم بےکل کرتے رہے۔

اچانک ہی اسے ایک تدبیر سُجھائی دی۔ اس نے تیزی سے ٹیبل پر پڑی ایک اسکول کی کاپی سے صفحہ پھاڑا۔ اس پر کپکپاتی انگلیوں سے بابر کے نام خط لکھنے لگی۔ اس مصیبت کی گھڑی میں اسے بابر ہی اپنا نجات دہندہ محسوس ہوا تھا۔ خط لکھ کر اس نے ٹیبل کی دراز سے ایک خاکی لفافہ نکالا۔ اس میں خط ڈال کے گوند سے منہ بند کر دیا۔ اس کے بعد کمرے سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتی پائیں باغ کی طرف

جانے لگی۔ وہاں حویلی کا پرانا خادم جمال خان پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ جمال خان نامی یہ خادم اس سے بہت محبت اور شفقت سے پیش آتا تھا۔ بابر کا بچپن بھی اس کی نظروں میں گزرا تھا۔ شاہدہ کو یقین تھا، وہ اس کی بات مانے گا۔

اس وقت شام کے سائے پھیل گئے تھے۔ وہ اس کے پاس گئی۔ ملتجیانہ انداز میں اس سے کہا کہ ابھی مثقل چلا جائے اور یہ رقعہ بابر کو دے کر آئے۔ جمال خان کے چہرے پر خوف نے ڈیرے ڈال دیے۔

شاہدہ مضطرب لہجے میں بولی۔ ''جمال چچا! یہ بہت ضروری ہے۔ بابر بھائی کی جان کو بہت خطرہ ہے۔ میرے بابا زمین کے لالچ میں ڈاکو مستان خان کے ذریعے اسے مروانا چاہتے ہیں۔ آپ خدا کے لیے منع نہ کریں۔ یہ جلدی سے اسے دے کر آئیں۔''

وہ تشویش سے بولا۔ ''سردار صاحب کو پتا چلا تو آپ بچ جائیں گی مگر میری کھال کھینچ لیں گے۔''

''کچھ نہیں ہوگا۔ اگر کسی کو پتا چلا تو میں ذمے داری قبول کروں گی۔''

جمال خان مزید انکار نہ کرسکا۔ بابر اس کے لیے بھی اہم تھا۔ وہ سردار حاکم کی سنگ دلی اور بابر کے خلاف اس کی کارروائیوں پر دل ہی دل میں کڑھتا تھا۔

وہ اصطبل میں آیا۔ ایک گھوڑا کھول کے اس پر بیٹھا اور حویلی سے نکل گیا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ حویلی کا پرانا ملازم تھا۔ کوئی اس پر شبہ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ کچھ دیر مثقل کے کھیتوں اور راستوں پر چلتا رہا۔ اس وقت تک اندھیرا پھیل گیا تھا۔ جب تسلی ہوئی کہ کوئی اس کے تعاقب میں نہیں تب اس نے رخ موڑا اور مثقل کے راستے پر گھوڑا دوڑانا شروع کیا۔

☆☆☆

شاہدہ اپنے اسکول کی بالکونی میں کھڑی تھی۔ اس کی نظریں نشیب میں واقع نہر پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ دور دور تک دیکھتے ہوئے بڑی بے تابی سے بابر کا انتظار کر رہی تھی۔ مقررہ وقت سے ذرا دیر بعد اسے تین آدمی دکھائی دیے۔ ایک ان میں آگے تھا۔ دو آدمی تیس چالیس قدم پیچھے آرہے تھے۔ شاہدہ نے غور سے دیکھا۔ ان کے چہرے صحیح نظر نہیں آرہے تھے مگر آگے چلنے والے آدمی کی چال ڈھال سے اسے اندازہ ہوا کہ وہ بابر تھا۔ اس نے پی کیپ پہن رکھی تھی۔ آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ تھا۔

شاہدہ کو جب یقین ہوا وہ بابر ہے تب وہ دھڑکتے دل کے ساتھ تیز تیز چلتی زینے اترتی نیچے آئی۔ اسکول کی پرنسپل سے اس نے پہلے ہی طبیعت کی ناسازی کا بہانہ بنا کے گھر جانے کی اجازت لے رکھی تھی۔

وہ اسکول سے باہر آئی۔ ساتھ ہی نہر بہتی تھی۔ شاہدہ نہر پر بنی چھوٹی سی پلیا پار کرکے پگ ڈنڈی پر آئی۔ بہت آہستہ قدموں سے چلتی اس طرف بڑھنے لگی جہاں سے بابر آرہا تھا۔ نہر کے دائیں بائیں بید، کیکر، سفیدہ اور شہتوت کے درخت تھے۔ یہ کہیں گھنے تھے، کہیں چھدرے۔

ذرا ہی دیر میں بابر قریب آگیا۔ پیچھے پیچھے اس کے جانباز ساتھی بھی آرہے تھے۔ وہ ذرا فاصلے پر رک گئے اور چوکنا نظروں سے دائیں بائیں دیکھنے لگے۔

شاہدہ متوحش لہجے میں بولی۔ ''اللہ کا شکر ہے بابر بھائی! تم آگئے۔ میرے دل میں ہول اٹھ رہے تھے خدا جانے تم آسکو گے یا نہیں۔''

اس کی زبان سے اپنے لیے بھائی کا لفظ سن کر بابر کا دل کٹتا ہوتا تھا مگر کبھی اس نے دل کا حال اسے سنایا نہیں تھا، اس لیے بھائی کہنے پر ٹوکنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔

اس نے ٹٹولتی نظروں سے شاہدہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''شاہدہ! خیریت ہے نا؟ تمہارے خط کی وجہ سے میں بہت بے سکون ہوگیا تھا۔''

''خیریت بالکل نہیں بابر بھائی!'' وہ دکھ سے بولی۔ ''میرے بابا کی مت ماری گئی ہے۔ وہ مجھے اور تمہیں اپنے مفاد اور اپنے اقتدار کے لیے قربان کرنا چاہتے ہیں۔''

اس نے اپنے بابا کی زبانی جو کچھ سنا تھا، وہ سب بابر کو بتادیا۔

بابر کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا تھا۔ وہ اپنی مٹھیاں کبھی کھول رہا تھا، کبھی بند کر رہا تھا۔

اس نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''میں جانتا ہوں چچا سردار میری جان کا دشمن بنا ہوا ہے لیکن تمہیں اس درندے مستان خان کی شریک حیات بنائے گا، یہ کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ تم کیا چاہتی ہو؟ کیا اپنے بابا کے اس فیصلے کو خاموشی سے تسلیم کرلوگی؟''

''ہرگز نہیں۔ اگر ایسا ارادہ ہوتا تو تمہیں نہ بلاتی۔ اس ڈاکو مستان خان کی بیوی بننے سے بہتر ہے میں اپنی جان دے دوں۔''

''تم نے مجھ پر بھروسا کیا ہے شاہدہ! اب تم میری ذمے داری میں ہو۔ تم حویلی جاؤ اور میرے اگلے پیغام کا انتظار کرو۔ میں تب تک اس کتے کے بچے مستان خان کو

صورتِ حال کو تاڑ گئے تھے۔ وہ تیز تیز ان دونوں کی طرف آنے لگے۔ بابر نے بھی اپنے نیفے سے نائن ایم ایم پستول نکال کے ہاتھ میں تھام لیا۔

شاہدہ سہمے سے لہجے میں بولی۔ ''بابر بھائی! آپ فوراً یہاں سے چلے جائیں۔ وہ قریب آگئے تو مشکل پیش آئے گی۔''

بابر نے پلٹ کر نہر کے ساتھ ساتھ واپس جانے والی پگ ڈنڈی کی طرف دیکھا۔ ایک دم اس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ نالے کی طرف سے بھی مخصوص حلیے کے جوان اس طرف آتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ سمجھ گیا دشمنوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

پھر وہ ٹھٹک گیا۔ سردار حاکم بھی اسے نظر آگیا تھا۔ وہ اپنے کارندوں کے ساتھ ہاتھوں میں ہتھیار لہراتے ہوئے قریب آرہا تھا۔ شاہدہ نے بھی اپنے بابا کو دیکھ لیا تھا۔ خوف سے وہ جیسے سکتے کی حالت میں آگئی تھی۔

''بب...... بابر بھائی! تم بُری طرح پھنس گئے ہو۔ اس کی ذمّے دار میں ہوں۔'' اس نے پُرتاسف لہجے میں کہا۔

''اس میں تمہارا قصور نہیں۔ گھٹل آتے ہوئے شاید کسی کارندے نے مجھے دیکھ کر سردار چچا کو اطلاع دی ہو گی۔''

''اب تم کیا کرو گے؟ کیا اتنے زیادہ آدمیوں کا مقابلہ کرو گے؟''

''جی ہاں۔ میں آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالوں گا۔'' اس نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

وہ ایک دم مضبوط لہجے میں بولی۔ ''تم مجھے ایک دو دن بعد اغوا کرنے والے تھے۔ یہی مناسب وقت ہے۔ تم مجھے یرغمال بنا کے اس صورتِ حال سے نکل سکتے ہو۔ مجھے پستول کی زد میں رکھ کر بابا کو مجبور کرو۔ میری سلامتی کے لیے وہ تم پر گولیاں چلانے کا حکم نہیں دیں گے۔''

بابر کو اس کی تجویز بالکل مناسب لگی۔ اس نے ایک دم جھپٹ کر شاہدہ کی گردن اپنے بازوؤں میں جکڑ لی۔ اپنے پستول کی نال اس کے سر سے لگا دی۔ اس کے جوان بھی سینہ سپر ہو کر کھڑے ہو گئے۔

اس دوران سردار حاکم اپنے کارندوں کے ساتھ قریب آگیا۔ اپنی بیٹی کو بابر کے شکنجے میں دیکھ کر اک ذرا ٹھٹکا پھر ڈپٹ کر کہا۔ ''شاہدہ کو چھوڑ دو حرام زادے! تم اس طرح بچ نہیں سکو گے۔ آج ہر حال میں اپنے انجام کو

شکار کرنے کے لیے جال بچھاتا ہوں۔''

''تم اسے کہاں کہاں تلاش کرو گے؟ وہ بدبخت تو جنگلوں، پہاڑوں میں کہیں چھپ کر رہتا ہے۔''

''تمہارے بابا کے منصوبے کے مطابق وہ مجھے قتل کرنے کے لیے جنگلوں اور پہاڑوں سے باہر آئے گا۔ اب میں خود اسے چارا ڈالوں گا۔ ایسی چال چلوں گا وہ دوڑا ہوا سیدھا میرے پاس آئے گا۔'' بابر نے سوچتی نظروں سے ایک طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم کیا سوچ رہے ہو؟ کیا وہ تمہارے بچھائے جال کی طرف آئے گا؟''

''میں ایسا دانہ ڈالوں گا کہ وہ دوڑتا ہوا کانٹے کی طرف آئے گا۔'' بابر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں اغوا کروں گا۔ جب مستان خان کے علم میں یہ بات آئے گی تو اپنی ہونے والی بیوی کو چھڑانے کے لیے وہ ضرور میرے جال کی طرف آئے گا۔''

''اس صورت میں بابا بھی غضب ناک ہوں گے۔'' شاہدہ مضطرب لہجے میں بولی۔ ''اپنے کارندوں کی فوج لے کر تمہارے خلاف کھلم کھلا اعلانِ جنگ کریں گے۔''

''چچا سردار تو اب بھی میرے جانی دشمن ہیں۔ مجھے ختم کرنے کے لیے ڈاکو مستان خان کے ساتھ اتحاد کرنے والے سے خیر کی توقع کیسے کر سکتا ہوں؟''

شاہدہ اداس سی مسکراہٹ سے بولی۔ ''میں بہ خوشی تمہارے ہاتھوں اغوا ہونے کو تیار ہوں۔ تم وقت مقرر کرو اور اپنے منصوبے پر عمل کرو۔''

''تم ایک دو دن انتظار کرو۔ میں ضروری اقدامات کر کے تمہیں خبر کر دوں گا۔'' اس نے کہا۔

یکایک شاہدہ نے ایک طرف چونکتے ہوئے دیکھ کر اضطراری آواز میں کہا۔ ''بابر بھائی! مجھے کچھ مشکوک آدمی اس طرف آتے دکھائی دے رہے ہیں۔ احتیاط کرو۔''

بابر نے اس کی نظروں کے تعاقب میں پلٹ کر دیکھا۔ نہر کے بائیں جانب جہاں درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ وہاں کچھ مکان بھی موجود تھے۔ اُدھر سے چار پانچ آدمی تیز تیز چلتے اس طرف آرہے تھے۔ ان سے فاصلہ تقریباً تین سو گز تھا۔ ان کے چہرے واضح دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اچانک ہی شاہدہ نے سراسیمگی کے ساتھ کہا۔ ''بابر بھائی! یہ بابا کے کارندے ہیں۔ اکثر حویلی میں نظر آتے ہیں۔''

بابر کے جوان بھی اُن کی بے چینی دیکھ کر بدلتی ہوئی

ہو گے۔"

"کس کا انجام کیسا ہو گا؟ یہ کوئی نہیں جانتا سردار! " اس نے مضبوط لہجے میں چیخ کر کہا۔ "اگر اپنی بیٹی کی زندگی عزیز ہے تو میرے راستے میں مت آؤ۔ اپنے پالتو کتوں کو لے کر دور چلے جاؤ۔"

"تم میری بیٹی کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے کمینے! اسے چھوڑ دو۔ مجھ سے بات کرو۔ شاید تم پر ترس کھا کے جان بخش دوں۔"

شاہدہ سرگوشی میں بولی۔ "بابا کی باتوں میں نہیں آنا بابر بھائی!" پھر وہ بلند آواز میں شدید گھبراہٹ سے بولی۔ "بابا خدا کے لیے اس بدبخت کی بات مان لیں۔ یہ بہت خطرناک ہے۔"

"گھبراؤ مت بیٹی!" اس نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ "تم اس کمینے کے پاس کیا کر رہی تھیں؟ اس سے ملنے کیوں آگئی تھیں؟"

"بابا! میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وقت سے پہلے اسکول سے چھٹی کر کے حویلی کی طرف آرہی تھی۔ یہ اچانک میرے سامنے آگیا۔ شاید پہلے سے ہی چھپ کر میرا انتظار کر رہا تھا۔ یہ مجھے آپ کے خلاف ورغلانے کی کوشش کر رہا تھا۔"

وہ جس انداز میں بات کر رہی تھی، بابر اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ "سردار چچا! میں شاہدہ کو تمہارے ظلم و ستم اور لالچ کے بارے میں بتا رہا تھا لیکن یہ تمہاری بیٹی ہے۔ تمہاری ہی فطرت اور مزاج اس میں بھی ہے۔ میری باتوں پر یقین کرنے کے بجائے الٹا مجھے ہی بدمعاش سمجھ رہی تھی۔"

سردار حاکم کٹیلے لہجے میں بولا۔ "کمینے! میری بیٹی کو میرے خلاف بدگمان کرانا چاہتے ہو۔ مجھے اپنی بیٹی پر فخر ہے۔ یہ اچھی طرح سمجھتی ہے کہ پہلے تمہارے بابا اور اب تم بھی ہمارا حق غصب کر رہے ہو۔"

"تم اور تمہاری بیٹی میرے بارے میں کیا سوچتے ہو۔ مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا۔ اچھا ہے اس کے دل میں بھی میرے لیے عداوت ہے۔ اب مجھے بھی اس پر ترس نہیں آئے گا۔ میں آخری دفعہ کہہ رہا ہوں۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو یہاں سے جانے کا راستہ دو۔ ورنہ تمہاری بیٹی سمیت چار پانچ کو مار کے ہی ہم مریں گے۔"

ان دونوں کی حکمت عملی کامیاب ہوئی تھی۔ باتوں سے انہوں نے ایسا ظاہر کرایا تھا گویا بابر نے شاہدہ کو زبردستی یہاں روک کر رکھا تھا۔ سردار حاکم کو اپنی بیٹی پر شبہ بھی نہیں ہوا تھا۔ بابر کی سنگ دلی اور سفاکی کا احساس بھی ہوا تھا۔

شاہدہ نے ایک بار پھر سرگوشی کی۔ "بابر بھائی! منصوبے میں مزید رنگ بھرنے کے لیے ایسا ظاہر کرو جیسے مجھ پر سختی کر رہے ہو۔ میں بھی تکلیف کی شدت سے چلاؤں گی۔"

اس کے ساتھ ہی وہ گھٹی گھٹی آواز میں چلانے لگی۔ "بابا! میرا دم گھٹ رہا ہے۔ اس ظالم نے اتنے زور سے میری گردن جکڑ رکھی ہے لگتا ہے ٹوٹ جائے گی۔ خدا کے لیے اس کی بات مان لیں۔"

بابر نے گرجتے ہوئے کہا۔ "سردار چچا! میں شاہدہ کو لے کر آگے بڑھ رہا ہوں۔ اپنے کارندوں سے کہہ دو میرا راستہ نہ روکیں۔ تھوڑے فاصلے پر ہماری جیپ ہے۔ ہمیں وہاں تک جانے کا راستہ دیں۔"

سردار حاکم بے بسی اور غصے سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ بیس پچیس قدم دور ایک مخمصے کی کیفیت میں کھڑا ہوا تھا۔ اپنی نرم و نازک بیٹی کو بابر کے قبضے میں دیکھ کر اشتعال کے باوجود کچھ کرنے کی مجال نہیں تھی۔ اسے شاہدہ کے چہرے پہ خوف اور تکلیف کے آثار صاف نظر آرہے تھے۔ اس کے کارندے بندوقیں تان کر اس کے کسی جارحانہ حکم کے منتظر تھے۔

اس دوران بابر، شاہدہ کو لے کر مخالف سمت بڑھنے لگا۔ سردار حاکم ایک کشمکش کی حالت میں اسے جاتے دیکھتا رہا۔

اس کے ایک کارندے نے سرگوشی کی۔ "سردار صاحب! وہ شاہدہ بی بی کو لے کر دور ہوتا جا رہا ہے۔ آپ حکم دیں۔ اسے روکتے ہیں۔"

اس نے دھیرے سے غرا کر کہا۔ "خبردار! کوئی الٹی حرکت مت کرو۔ وہ کمینہ میری اکلوتی بیٹی کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

بابر، شاہدہ کو پستول کی زد میں رکھ کر کچھ دور چلا گیا تو سردار حاکم بھی پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اس کے کارندے بھی ساتھ چل رہے تھے۔

بابر نے پلٹ کر چلا کر کہا۔ "چچا سردار! اپنے کارندوں سے کہہ دو وہ الٹے قدم واپس چلے جائیں۔ صرف تم ہمارے پیچھے تیس چالیس قدم کا فاصلہ رکھ کر آسکتے ہو۔"

سردار حاکم نے جھنجلا کر اسے گالی دی۔ اپنے

کارندوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھنے لگا۔ اس دوران بابر نے اپنی رفتار تیز کی تھی۔ شاہدہ بھی مجبوری ظاہر کرتے ہوئے گھسٹنے کے انداز میں ساتھ چل رہی تھی۔

تقریباً ایک فرلانگ دور وہ پکی سڑک تھی جو آگے نالے سے ہو کر منگھل کی طرف جاتی تھی۔ اس پکی سڑک پر درختوں کے ایک جھنڈ میں بابر کے دو جانباز جیپ کے ساتھ موجود تھے۔ وہ منگھل سے اسی جیپ میں آئے تھے۔

بابر، شاہدہ کو لے کر جیپ کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں سے پلٹ کر دیکھا۔ ذرا فاصلے پر سردار حاکم افتاں وخیزاں چلا آرہا تھا۔ اس سے تقریباً سو قدم پیچھے کارندے بھی آرہے تھے۔

بابر نے چلا کر کہا۔ ''چچا سردار! تمہاری بیٹی کو جیپ میں اپنے ساتھ لے جارہا ہوں۔ منگھل کی حدود میں داخل ہو کر اسے چھوڑ دوں گا۔''

''کمینے! شاہدہ کو یہیں پر چھوڑ دو۔ اسے مزید پریشان مت کرو۔'' وہ متفکر لہجے میں بولا۔

''فکر مت کرو۔ تمہاری بیٹی کو اغوا کر کے نہیں لے جارہا ہوں۔ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان کی سلامتی کے لیے اسے کچھ اور تکلیف برداشت کرنا پڑے گی۔''

شاہدہ بلند آواز میں بولی۔ ''بابا! آپ فکر مت کریں۔ یہ بدمعاش میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

''نہیں بیٹی! مجھے اس بدذات پر بھروسا نہیں۔ اسے سمجھاؤ۔ تمہیں یہیں چھوڑ کر دور ہو جائے۔ اسے کچھ نہیں کہیں گے۔''

بابر نے ہنس کر کہا۔ ''مجھے بھی تم پر بھروسا نہیں سردار چچا! شاہدہ کو اپنی گرفت سے آزاد کرتے ہی تمہارے کارندے ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دیں گے۔ اس لیے میں اسے یہاں چھوڑنے کی غلطی نہیں کروں گا۔''

''پھر میں بھی شاہدہ کے ساتھ آتا ہوں۔'' سردار حاکم دو ٹوک لہجے میں بولا۔ ''اسے تمہارے ساتھ اکیلے جانے نہیں دے سکتا۔''

شاہدہ ابھی تک بابر کی گرفت میں تھی۔ پستول بھی گردن سے لگا ہوا تھا۔ وہ سرگوشی میں بولی۔ ''بابر بھائی! تمہارے کیا ارادے ہیں؟ اغوا والے منصوبے پر اسی وقت عمل کرنا ہے تو بابا کو آنے سے منع کریں۔ اگر منگھل تک مجھے یرغمال بنانا ہے تو بابا کو بھی ساتھ آنے کی اجازت دیں۔''

بابر نے اک ذرا سوچتے ہوئے کہا۔ ''معاملہ بگڑ گیا ہے۔ اسکول سے یہاں تک آتے ہوئے بہت سے لوگوں نے یہ سارا واقعہ دیکھا ہے۔ ایسے میں اغوا کا معاملہ گمبھیر ہو جائے گا۔ سردار چچا کے اثر و رسوخ کی وجہ سے پولیس حرکت میں آئے گی۔ میں ڈکیت مستان خان اور تمہارے بابا کے خلاف تو لڑ سکتا ہوں، قانون سے نہیں۔ اس لیے ابھی تمہیں منگھل تک لے جا کے آزاد کر دوں گا۔''

''اس صورت میں بابا کی بات مان لو۔ منگھل تک آنے دو۔''

بابر نے اونچی آواز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے چچا سردار! تم آسکتے ہو۔ اپنے پالتو کتوں سے کہہ دو۔ ہمارے تعاقب کی غلطی نہ کریں۔ ورنہ اس کا نتیجہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔''

ذرا دیر میں وہ سب جیپ میں بیٹھ گئے۔ بابر کے دو جانباز پیچھے کھڑے ہو گئے۔ آدھے گھنٹے سے کم وقت میں وہ نالا پار کر کے منگھل کی حدود میں داخل ہو گئے۔ بابر نے جیپ ایک جگہ روک دی۔ سردار حاکم سے اترنے کو کہا۔ اسے لے کر جیپ سے ذرا فاصلے پر گیا۔ ایک دم اپنا پستول نکال کے اس کی پیشانی سے لگایا اور سفاک لہجے میں کہا۔ ''چچا سردار! تمہیں مارنا میرے لیے کتنا آسان ہے۔ ایک ذرا انگلی دبائی۔ ٹھائیں سے گولی چلی اور تم ایک دم خلاص۔ اس لمحے اپنی موت کو یاد کرتے ہوئے یہ بھی یاد کرو کہ تم نے مجھ پر اور میرے خاندان پر کتنا ظلم کیا ہے۔ میرے پاس ثبوت نہیں لیکن کچھ ایسے اشارے ہیں جن کی بنیاد پر مجھے شبہ ہے کہ میرے خاندان کے قتل میں اور ایڈووکیٹ نجیب عارف کے قتل میں تم ملوث ہو۔ جس دن مجھے ثبوت مل گیا، وہ تمہارا آخری دن ہوگا۔ اس وقت تک اپنی خیر مناؤ۔''

اس نے پستول کی نال سردار حاکم کی پیشانی سے ہٹائی۔ اس کی آنکھوں سے ایسے شرارے پھوٹ رہے تھے کہ سردار حاکم کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔

بابر جیپ کی طرف آیا۔ شاہدہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہرے جذبے سے کہا۔ ''شاہدہ! تم پریشان مت ہو۔ ڈاکو مستان خان تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ تم اپنی آنکھیں کھلی رکھو۔ چچا جمال خان کو بھی سمجھاؤ۔ مستان خان جب بھی حویلی میں آئے، مجھے خبر کر دو۔ میں اسے جہنم واصل کرنے کے لیے منگھل آجاؤں گا۔ یہ بتاؤ۔ تمہارے پاس موبائل فون موجود ہے؟''

''جی ہاں۔ حویلی میں ہے۔ ایک ہی موبائل موجود ہے۔ میں اور امی دونوں استعمال کرتے ہیں۔''

بابر نے جیپ کے ایک خانے سے بال پین نکالا۔ کوئی کاغذ نہ ملا تو شاہدہ کا ہاتھ تھام کر اس کی ہتھیلی پر اپنا

موبائل نمبر لکھا۔ پھر بڑے ہی پیار سے کہا۔ ''شاہدہ! ہم دونوں کا بچپن بہت خوب صورت یادوں سے بھرا ہے۔ ہم چچازاد بہن بھائی بھی تھے، ایک دوسرے کے دوست بھی۔ تم سے دور جانے کے بعد مجھے پتا چلا کہ بچپن کے اس تعلق میں صرف دوستی نہیں تھی۔ محبت کا ایک کومل احساس بھی تھا۔ میں تمہیں بہت یاد کرتا تھا۔ تمہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن ایسے حالات پیدا ہوئے کہ تم سے بہت دور ہوتا چلا گیا۔ جب واپس آ گیا تو دوریاں اب بھی نصیب ہیں۔ خاندانی رشتے کی بنیاد پر تم مجھے بھائی کہتی ہو۔ آئندہ مت کہنا۔ میں تمہیں ان سب شیطانوں سے بچا کر ایک دن اپنی دُلہن بنا کر ہمیشہ کے لیے مٹھل لے آؤں گا۔''

شاہدہ کے صبیح اور حسین چہرے پر جیسے گلال رنگ بکھر گیا۔ اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ شرم سے اس کی پلکیں جھک گئیں۔

بابر نے پلٹ کر ذرا فاصلے پر موجود سردار حاکم سے کہا۔ ''سردار چچا! میرے جوان تمہیں اور شاہدہ کو اسی جیپ میں نالے تک لے جائیں گے۔ وہاں سے آگے خود چلے جاؤ۔ ایک بات یاد رکھو۔ مستان خان ایک ڈاکو ہے۔ اسے گھر کا راستہ دکھاؤ گے تو وہ گھر کی عزت پر بھی حملہ کر دے گا۔ اس لیے اُس بدبخت سے اپنا تعلق ختم کر دو۔''

وہ جب جیپ میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوئے تو بابر اپنے ایک جانباز ساتھی کے ساتھ حویلی کی جانب چل پڑا۔

☆☆☆

تین چار دن خیریت سے گزر گئے۔ بابر کو اندیشہ تھا سردار حاکم اپنی ذلت کا بدلہ لینے کے لیے پلٹ کر وار کرے گا۔ ڈاکو مستان خان سے بھی خطرہ تھا۔ اس لیے اس نے مٹھل کے چاروں اطراف پہرا سخت کر دیا تھا۔ اس کے وفادار جانباز رات دن چوکس ہو کر پہرا دے رہے تھے۔

چوتھے دن شام سے ذرا پہلے بابر کے موبائل پر کسی نامعلوم نمبر سے کال آئی۔ اس نے اک ذرا تامل کے بعد... کال وصول کی۔ ہیلو کے جواب میں دوسری جانب سے جو آواز سنائی دی، اسے بابر لاکھوں کروڑوں آوازوں میں شناخت کر سکتا تھا...... یہ شاہدہ کی آواز تھی۔

وہ مضطرب لہجے میں بولی۔ ''بابر بھائی! میں شاہدہ بات کر رہی ہوں۔ آپ کو ایک اہم اطلاع دینی ہے۔''

اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''شاہدہ! میرے لیے سب سے اہم بات تو یہی ہے کہ تم نے مجھے فون کیا ہے۔ مجھے اہم اطلاع دینے سے پہلے ایک اور اہم کام کرو۔ مجھے بھائی کہنا چھوڑ دو۔''

دوسری طرف اِک ذرا سکوت چھا گیا پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''بابر! تمہارے سارے دشمن آج رات حویلی میں اکٹھے ہو رہے ہیں۔ ایک بڑے جشن کا اہتمام کیا گیا ہے۔ بابا نے کئی بکرے ذبح کروائے ہیں۔ سنا ہے شراب بھی ہوگی اور ناچنے والی عورتیں بھی ہوں گی۔''

''ایسا کس خوشی میں ہو رہا ہے؟'' بابر نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''ان بدمست لوگوں کو جشن منانے کے لیے کسی خاص موقع کی کیا ضرورت ہے؟'' اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''دولت ہو، طاقت ہو اور عیش و مستی کا شوق ہو تو کسی بھی وقت جشن منا سکتے ہیں۔''

''تم دیکھو گی آج رات ان کے جشن کو ماتم میں بدل دوں گا۔ ڈاکو مستان خان اس بار بچ کر نہیں جا سکے گا۔ اپنے بابا، اماں اور چھوٹے بھائی کے قاتل کو عبرت ناک انجام سے دو چار کر دوں گا۔''

شاہدہ تشویش سے بولی۔ ''ان کی تعداد زیادہ ہوگی۔ کہیں تم لوگ کمزور نہ پڑ جاؤ۔''

''اس کی تم فکر مت کرو۔ میرے جوان بڑے تربیت یافتہ اور جی دار ہیں۔ تم یہ بتاؤ حویلی کے پیچھے کی طرف اخروٹ کے دو بڑے پیڑ تھے۔ کیا اب بھی موجود ہیں؟''

''جی ہاں۔ ان کی کچھ شاخیں کاٹی گئی ہیں۔ باقی موجود ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم انہی پیڑوں کے ذریعے حویلی کے زنان خانے کی چھت پر آئیں گے۔ وہاں سے نیچے اتر کر حویلی کے مردانے کی طرف بڑھیں گے۔ تم وہاں کی روشنیاں بجھا دو اور اپنی امی کو سنبھالو۔ ہمیں دیکھ کر وہ شور نہ مچائیں۔''

''امی کی تم فکر مت کرو۔ میں نے انہیں سب سمجھا دیا ہے۔ جب سے بابا نے مستان خان سے میری شادی کی بات کی ہے۔ امی کے خیالات بدل گئے ہیں۔ وہ بھی اس بدبخت مستان خان کے عبرت ناک انجام کی خواہاں ہیں۔''

''بہت اعلیٰ! میں تم سے فون پر رابطے میں رہوں گا۔ تم چچا جمال خان کے ذریعے وہاں مردانے کی صورتِ حال معلوم کرتی رہو۔ کوئی بھی نئی بات سامنے آئے تو مجھے آگاہ کر... ہم شام کے بعد مٹھل روانہ ہوں گے اور اللہ نے چاہا تو عین اس وقت جب ان کا جشن عروج پر ہوگا، ہم قیامت بن کے ٹوٹ پڑیں گے۔''

اس نے رابطہ منقطع کیا۔ فوراً اپنے خاص خاص جانبازوں کو جمع کر کے ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ایک طویل غور وخوض کے بعد انہوں نے گٹھل کی حویلی پر دھاوا بولنے کی حکمتِ عملی تیار کی۔ جب شام کے سائے گہرے ہو گئے تب بابر کی قیادت میں جانبازوں کی ایک ٹولی ضروری ہتھیاروں سے لیس گٹھل کی جانب روانہ ہوگئی۔

نالے تک وہ جیپوں اور گھوڑوں پر گئے۔ نالے کے پاس انہوں نے جیپیں چھوڑ دیں۔ ایک گھوڑے پر دو دو بندے بیٹھ کر نالے سے گزر کر گٹھل میں داخل ہو گئے۔ وہ کل سولہ آدمی تھے۔ آٹھ گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان کے پاس کلاشنکوف، پستول، ریوالور اور ضرورت کے مطابق استعمال کرنے کے لیے ہینڈ گرینیڈ بھی تھے۔ گٹھل میں ان کے جاسوس بھی ضرورت پڑنے پر مدد کے لیے تیار تھے۔

حویلی سے کچھ فاصلے پر وہ گھوڑوں سے اترے۔ درختوں کے ایک جھنڈ میں گھوڑے باندھ دیے۔ اس کے بعد پیدل ہی ٹارگٹ کی طرف چل پڑے۔ وہ گٹھل کی آبادی کے باہر باہر سے حویلی کی جانب بڑھ رہے تھے۔ حویلی بستی کے آخر میں تھی۔ اس لیے آبادی سے ہٹ کر وہاں تک جانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔

رات کے آنچل میں منہ چھپائے وہ حویلی کے پیچھے پہنچ گئے۔ بابر کا بچپن ان کھیتوں اور گلیوں میں گزرا تھا اس لیے اُسے اپنے جانبازوں کو لے کر وہاں تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔

حویلی کی عقبی دیوار کے ساتھ اخروٹ کے اونچے اور دیوہیکل پیڑ اسی طرح ایستادہ تھے۔ اخروٹ کا تنا پھسلواں ہوتا ہے۔ بابر کی جانباز فورس میں ایسے جوان بھی تھے جو درختوں پر چڑھنے میں مہارت رکھتے تھے۔ اس کے اشارے پر چار جوان اخروٹ کے موٹے تنوں پر کسی بندر کی طرح چڑھنے لگے۔ ان کی کمر کے گرد موٹے رسے بندھے ہوئے تھے۔

ذرا دیر بعد وہ شاخوں پر سے ہوتے ہوئے حویلی کی چھت پر اتر گئے۔ وہاں سے انہوں نے موٹے رسّوں کے سرے نیچے پھینک دیے۔ بابر اور اس کے باقی جانباز باری باری ان رسّوں کی مدد سے حویلی کی چھت پر پہنچ گئے۔

بابر کو حویلی کا نقشہ معلوم تھا۔ وہ شاہدہ سے رابطے میں بھی تھا۔ اس کے مطابق راستہ صاف تھا۔ وہ سب زینوں کے ذریعے حویلی کے زنانہ حصے میں آئے۔ کمروں کے علاوہ ساری روشنیاں بجھا دی گئی تھیں۔ شاہدہ اور اس کی امی ان کی منتظر تھیں۔ وہ انہیں ایک بڑے کمرے میں لے گئیں۔ ملازم جمال خان بھی اُدھر آ گیا تھا۔

حویلی کے مردانہ حصے سے شور وغل کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ابھی باقاعدہ جشن کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ جمال خان نے بتایا کہ دس بجے کھانوں کی دیگیں کھلنے والی تھیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر ناچ گانے کا پروگرام تھا۔

بابر کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ڈاکو مستان خان کے ساتھ بارہ پندرہ بندے موجود تھے۔ حویلی میں سردار حاکم کے کارندوں کی تعداد بیس کے قریب تھی۔ وہ سب جدید اسلحے سے لیس تھے۔

اس بند کمرے میں بابر نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ حملے کی منصوبہ بندی کی۔ انہوں نے پہلے سوچا تھا کہ جب ناچ گانا شروع ہوگا اور شراب کی بوتلیں کھلیں گی تب ایک دم حملہ کریں گے۔ پھر یہ ارادہ تبدیل کیا۔ اس سے خون خرابا زیادہ ہونے کا احتمال تھا۔

آخرکار مشورے سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ جب دسترخوان بچھایا جائے گا۔ سب کھانے میں مصروف ہوں گے۔ ان کے ہتھیار بھی جسموں سے الگ ہوں گے۔ تب ایکشن کیا جائے گا۔

بابر نے چچا جمال خان کو سمجھا کے مردانے کی طرف بھیج دیا تھا۔ واپس آ کے اس نے بتایا۔ ”بابر بیٹا! سردار صاحب، مستان خان اور چند خاص خاص مہمان بیٹھک میں کھانا کھائیں گے۔ باقی سارے جوانوں کے لیے احاطے کے کھلے میدان میں شامیانے لگا کے، قالین بچھا کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا ہے۔“

بابر نے اس اطلاع کے مطابق حملے کی پلاننگ کی۔ اس نے اپنے سولہ جوانوں کو دو گروپوں میں تقسیم کیا۔ ایک گروپ کی قیادت خود کرتے ہوئے پانچ جوان اپنے ساتھ الگ کیے۔ دوسرے گروپ کے دس جوانوں کو سمجھایا کہ ان کا ٹارگٹ احاطے میں موجود ڈاکو اور سردار حاکم کے کارندے ہوں گے۔ جو مزاحمت کرے اسے گولیوں سے بھون ڈالو۔ جو ہتھیار ڈالے اس کی جان بخشی کرو۔

چچا جمال خان کو یہ ذمے داری دی کہ اس گروپ کو محفوظ جگہوں سے لے جا کر باغ تک پہنچا دے پھر وہاں سے خود چلا آئے۔

انہیں رخصت کر کے اپنی ٹیم سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”میرے جوانو! ہمارا ٹارگٹ سب سے اہم ہے۔ ہم سیدھے سردار حاکم کی بیٹھک میں گھس جائیں گے۔ وہ

سب بے فکری سے کھانا کھا رہے ہوں گے۔ امید ہے آسانی سے ان پر قابو پا سکیں گے۔ یاد رکھو۔ انتہائی ضرورت کے بغیر کسی کو جان سے نہیں مارنا ہے۔"

اس نے کچھ مزید ضروری ہدایات دیں۔ انہیں لے کر اس کمرے سے باہر نکلا۔ دروازے کے پاس شاہدہ اور اس کی امی کھڑی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں خوف بھی تھا، پریشانی بھی اور ایک التجا بھی......

بابر ان کے محسوسات سمجھ کر بولا۔ "چچی! میں سمجھ رہا ہوں۔ اس وقت آپ دونوں کیا سوچ رہی ہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔ ہمارا اصل ٹارگٹ ڈاکو مستان خان ہے۔ چچا سردار سے حساب کتاب بعد میں کریں گے۔"

شاہدہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے گداز لہجے میں بولی۔ "بابر! میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ تمہیں جب تک نہیں دیکھوں گی میری جان سولی پر لٹکی رہے گی۔ پلیز اپنا خیال رکھنا۔"

بابر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جذباتی لہجے میں بولا۔ "تم اتنے پیار سے میری سلامتی کے بارے میں فکر مند رہو گی تو میں آگ کا دریا بھی پار کر کے آؤں گا۔ میں ضرور واپس آؤں گا شاہدہ! اس یقین کے ساتھ واپس... آؤں گا کہ تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنی شریک حیات بنا کے منتقل لے جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ جھٹکے سے مڑا اور کچھ فاصلے پر موجود اپنے جانبازوں کے ساتھ مل گیا۔

حویلی کے زنان خانے کی طویل راہداری سے گزر کر وہ ایک چھوٹے سے دروازے کے ذریعے ایک بڑے دالان میں آ گئے۔ اس دالان میں ایک دروازہ اُس کمرے میں کھلتا تھا جو بیٹھک سے متصل تھا۔ یہ سردار حاکم کا خاص کمرا تھا۔ بیٹھک میں مہمانوں سے ملاقات کے بعد استراحت کے لیے اکثر اس کمرے میں آتا تھا۔

دالان میں ایک بلب جل رہا تھا۔ اس کی زرد روشنی میں بابر نے خاص کمرے کے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا۔ وہ کھلتا چلا گیا۔ اندر دھیمی دھیمی روشنی تھی۔ جس میں خاص کمرے کی شان و شوکت نظر آ رہی تھی۔ درمیانی سائز کے اس کمرے کی شمالی دیوار میں وہ دروازہ موجود تھا... جو بیٹھک میں کھلتا تھا، اس بند دروازے میں سے بیٹھک میں موجود لوگوں کی باتیں سنائی دے رہی تھیں۔ شاید دستر خوان پر کھانا رکھا جا رہا تھا۔

بابر کے پانچوں جوان اس دروازے کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ ان کے ہاتھوں میں خودکار رائفلیں تھیں۔ دستی بم اور ریوالور بھی تھے۔ بابر نے بہت آہستگی سے دروازہ تھوڑا سا کھول دیا۔ ذرا سی درز بنی تو آنکھ لگا کر اندر جھانکا۔ بیٹھک کا وہ حصہ دکھائی دے رہا تھا جہاں سردار حاکم، ڈاکو مستان خان کے علاوہ کچھ عمدہ اور نفیس کپڑوں میں ملبوس اجنبی لوگ موجود تھے۔ وہ شاید سردار حاکم کے خاص مہمان تھے جو شہر سے آئے تھے۔ ان کے سامنے دستر خوان بچھا ہوا تھا۔ اس پر طرح طرح کے کھانے چنے ہوئے تھے۔

اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور ایک دم لات مار کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے دوسرے جوان بھی رائفلیں تان کر اندر آئے۔ دو تین سیکنڈز ... میں ہی انہوں نے اس طرح پوزیشنیں سنبھال لیں کہ بیٹھک کے سارے لوگ ان کی رائفلوں کی زد میں آ گئے۔

بابر نے گرجتے ہوئے کہا۔ "خبردار! تم سب لوگ ہماری گولیوں کے نشانے پر ہو۔ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ پر بیٹھا رہے۔ کسی نے بہادری دکھانے کی بے وقوفی کی تو اسے چھلنی کر دیں گے۔"

اس دوران دو جانباز بہت تیزی سے اس دروازے تک پہنچے تھے جو باہر کی طرف کھلتا تھا۔ وہاں سے کارندے کھانا اندر لا رہے تھے۔ جوانوں نے رائفلوں کی زد میں رکھتے ہوئے کارندوں کو باہر نکالا اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

بیٹھک میں آٹھ دس لوگ موجود تھے۔ یہ عام ڈاکو یا کارندے نہیں تھے۔ اونچی حیثیت کے خاص مہمان تھے۔ وہ سب جیسے سکتے میں رہ گئے تھے۔

سردار حاکم کی آنکھوں میں حیرت جیسے تصویر بن گئی تھی۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ حویلی کے زنان خانے کی طرف سے دشمن یوں گھس آئیں گے۔ باقی مہمان بھی حیرانی اور پریشانی سے ہکا بکا رہ گئے تھے۔ ڈاکو مستان خان کے چہرے پر حیرت کے ساتھ اشتعال بھی تھا۔

بالآخر یہ سکوت ٹوٹ گیا۔ سردار حاکم دھیرے سے غرا کر بولا۔ "بابر! یہ کیا مذاق ہے؟ اس طرح چوری چھپے میری خاص دعوت میں آنے کی تمہیں جرأت کیسے ہوئی؟"

"یہ مذاق نہیں ہے سردار چچا!" اس نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ "اسے شب خون مارنا کہتے ہیں۔ بہت دنوں سے ہم اسی موقع کا انتظار کر رہے تھے۔ تم سے اور ڈاکو مستان خان سے بڑے بڑے حساب لینے ہیں۔"

مستان خان پاٹ دار آواز میں غرایا۔ ”تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو۔ ہمارا بال بھی بیکا کیا تو یہاں سے بچ کر نہیں جا سکو گے۔“

بابر اس سے چار پانچ قدم دور تھا۔ چھلانگ مار کے اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اپنی رائفل کا دستہ زور سے اس کی پشت پر مارا۔ وہ کراہتا ہوا آگے کی طرف جھکا۔ بابر نے اپنا پیر اس کی جھکی ہوئی گردن پر رکھ کر دبایا۔ وہ نیچے جھکتا چلا گیا۔ پھر اچانک ہی وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر بائیں جانب مڑا اور بابر کی ٹانگ پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ بابر کا دایاں پیر اس کے کندھے پر ہونے کی وجہ سے ایک ہی ٹانگ پر کھڑا تھا۔ اب جو مستان خان نے جھٹکا دیا تو توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف گیا اور بیٹھک کی دیوار سے ٹکرایا۔ اس کا سر زور سے لگا تھا مگر چوٹ اتنی سخت نہیں تھی۔ وہ تیزی سے سیدھا ہو گیا۔

اس اثنا میں مستان خان نے اپنی جیکٹ کے اندر ہاتھ ڈال کے بغل سے لٹکا ہوا ریوالور نکال لیا تھا۔ فائر کرنے کے لیے اس نے سیفٹی کیچ پیچھے کر کے ہاتھ سیدھا کیا۔ اس کی انگلی لبلبی پر دباؤ ڈالنے والی تھی اسی وقت اُس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اس کے پیچھے بابر کا ایک جانباز کھڑا تھا۔ اس نے رائفل کا بٹ بڑے زور سے بلے کی طرح گھما کے مستان خان کے سر پر دے مارا۔ یہ ایسی کاری ضرب تھی کہ وہ گھٹی گھٹی چیخ کے ساتھ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح دستر خوان پر گر گیا۔ ڈونگوں میں موجود سالن سے اس کے کپڑے لتھڑ گئے۔ اس کے سر سے خون کا فوارا چھوٹ کر دستر خوان کو رنگین کرنے لگا۔

سردار حاکم کے مہمان شدید گھبراہٹ سے یہ کارروائی دیکھ رہے تھے۔ ان میں زیادہ تر شہر کے بزنس مین تھے۔ سردار حاکم کی طرح کا لا دھن حاصل کرنے والے تھے۔ مگر خون خرابے اور لڑائی جھگڑوں کے عادی نہیں تھے۔ ان کے لیے یہ صورتِ حال سخت پریشان کن تھی۔

بابر نے گرجتے ہوئے ان کو مخاطب کیا۔ ”میں نے کہا تھا جو شرارت کرے گا۔ اس کا انجام بُرا ہوگا۔ اس کتے نے بہادری دکھانے کی بے وقوفی کی تھی۔ اس کا انجام تمہارے سامنے ہے۔“

سردار حاکم نفرت اور غصے سے دانت پیستے ہوئے اسے گھور رہا تھا۔ اسی وقت بیٹھک کے باہر کی طرف کھلنے والے دروازے پر شور بلند ہوا۔ ساتھ ہی دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹانا شروع کیا۔ بابر کا ایک جانباز دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے بلند آواز میں کہا۔ ”یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ بیٹھک کے سبھی لوگوں کو مار دیں گے۔“

باہر سے کسی نے گالی دے کر سخت لہجے میں کہا۔ ”ہمارے سردار مستان خان کو چھوڑ دو۔ اسے کچھ ہوا تو پوری بستی کو آگ لگا دیں گے۔“

ایک اور آدمی کی غصیلی آواز گونجی۔ ”ہمارے سردار حاکم کی حویلی میں گھس کر بابر نے اپنی موت کو آواز دی ہے۔ شرافت سے دروازہ کھول دو۔ ورنہ سب کو بھون کر رکھ دیں گے۔“

بابر باہر سے آنے والی آوازوں کو غور سے سن رہا تھا۔ اس نے اپنا موبائل نکالا اور احاطے کے قریب باغ میں موجود ٹیم کے کمانڈر سے رابطہ کیا۔ اسے فوری ایکشن شروع کر کے ڈاکوؤں اور حویلی کے کارندوں کی توجہ بیٹھک سے ہٹا کر اپنی جانب مبذول کرانے کی ہدایت کی۔

رابطہ منقطع کر کے اس نے اپنے دو جوانوں سے کہا۔ ”اس حرام زادے مستان خان کو گھسیٹ کر دوسرے کمرے میں لے جاؤ۔ وہاں اس سے بہت سی باتیں اگلوانی ہیں۔“

مستان خان ابھی تک دستر خوان کے اوپر آڑھا ترچھا پڑا تھا۔ اس کے گرنے سے ڈونگے، ڈشیں اور پلیٹیں بکھر گئی تھیں۔ دو جانباز اسے گھسیٹ کر سردار حاکم کے خاص کمرے میں لے گئے۔ زنان خانے کی طرف کھلنے والے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ مستان خان کو ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا۔

اس دوران باہر کے دروازے پر شور اور دھکوں میں اضافہ ہوا تھا۔ وہ گالیاں اور دھمکیاں دے رہے تھے۔ کندھوں اور لاتوں سے دروازے پر ضربیں لگا رہے تھے۔

بابر کے جانباز نے تشویش سے کہا۔ ”بابر بھائی! انہیں روکنا ہوگا ورنہ دروازہ توڑ دیں گے۔“

بابر دروازے کے قریب ہوا۔ للکار کر کہا۔ ”میں تین تک گنتا ہوں۔ دروازے کے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ ورنہ کلاشنکوف کی گولیاں تم سب کو چھلنی کر دیں گی۔“

اس نے ٹھہر ٹھہر کر تین تک گنتی کی۔ پھر ٹانگوں کا اندازہ کر کے کلاشنکوف سیدھا کیا اور ٹریگر دبا دیا۔ تڑ تڑاتڑ، متعدد گولیاں خوف ناک گھن گرج کے ساتھ نکلیں۔ دروازے میں گھس کر دوسری طرف گئیں۔ اس کے ساتھ ہی دروازے کے باہر سے درد سے بھری بہت سی چیخیں سنائی دیں۔ اس کے تین چار سیکنڈ بعد باہر سے بھی کسی نے برسٹ

مارا۔ بابر اور اس کے جانباز پہلے ہی دروازے کے سامنے سے ہٹ گئے تھے۔

یکا یک ذرا فاصلے پر احاطے کی جانب سے شدید فائرنگ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ یہ بہت سے ہتھیاروں کی فائرنگ تھی۔ بابر سمجھ گیا اس کے جانبازوں نے کارروائی شروع کی تھی۔

بیٹھک کے حالات ان کے کنٹرول میں تھے۔ ڈاکو مستان خان دوسرے کمرے میں بے ہوش پڑا تھا۔ ایک جانباز اس کی نگرانی کر رہا تھا۔ سردار حاکم بے بسی کی حالت میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

بابر نے سردار حاکم سے کہا۔ ”چچا سردار! تم نے جس دشمنی کا آغاز کیا تھا۔ آج اسے انجام تک پہنچانے آیا تھا۔ تمہاری قسمت اچھی ہے کہ چچی اور شاہدہ سے میں نے تمہاری جاں بخشی کا وعدہ کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمہیں معاف کر دوں گا۔ بس آج ڈاکو مستان خان کا یومِ حساب ہے۔ اگر اپنی موت سے پہلے اس کُتّے نے یہ حقیقت اُگل دی کہ میرے خاندان اور ایڈووکیٹ نجیب عارف کا قتل تمہارے کہنے پر کیا ہے۔ تب چچی اور شاہدہ سے کیا وعدہ توڑ کر تمہیں عبرت ناک انجام سے دوچار کر دوں گا۔“

”تم شاہدہ اور اس کی امی کا حوالہ دے رہے ہو۔ اس کا مطلب ہے حویلی میں گھسنے کا موقع ان دونوں نے دیا ہے۔“ اس نے دانت پیس کر کہا۔ ”تم سے فارغ ہو کر میں ان دونوں کی خبر لوں گا۔“

”تم کتنے بڑے شیطان ہو چچا سردار! ان دونوں کی وجہ سے میں تمہاری جاں بخشی کر رہا ہوں اور تم انہی کے خلاف بول رہے ہو۔“

اچانک ہی ساتھ والے کمرے میں ٹھائیں ٹھائیں دو گولیاں چلیں۔ بابر اچھل پڑا۔ اس کمرے میں ڈاکو مستان خان بے ہوش پڑا تھا۔ ایک جوان بھی اس کی نگرانی پر موجود تھا۔

بابر کے جوان بیٹھک میں اپنی اپنی پوزیشنیں سنبھالے کھڑے تھے۔ وہ سب چونک چونک کر اس صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بابر نے انہیں اپنی جگہوں سے نہ ہٹنے کی ہدایت کی اور خود لپک کر اس خاص کمرے کے دروازے کے پاس گیا۔ کلاشنکوف کی نال سے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا۔ دروازہ کھلا تو اندر کا منظر دیکھ کر اسے گویا بجلی کا جھٹکا لگا۔ اس کا جانباز قالین پر پہلو کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اس کے جسم سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔ مستان خان کمرے میں موجود نہیں تھا۔ زنان خانے کی طرف کھلنے والا دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔

یکا یک خوف اور اندیشے کی ایک سرد لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ اسے صورتِ حال کی سنگینی کا شدید احساس ہوا تھا۔ مستان خان جیسا خطرناک ڈاکو حویلی کے زنان خانے کی طرف فرار ہوا تھا۔ اس نے اپنی نگرانی پر مامور جانباز سے کسی طرح ریوالور چھین لیا تھا۔ اسے گولی مار کے زخمی کر دیا تھا اور اس کا ریوالور ہاتھ میں لے کر زنان خانے کی طرف گیا تھا۔ وہاں شاہدہ اور اس کی امی بستی تھیں۔

بابر تیزی سے زخمی جوان کے پاس گیا۔ اسے سیدھا کر کے دیکھا۔ اس کے پیٹ میں گولی لگی تھی۔ وہ ہوش میں تھا مگر حالت بڑی مخدوش تھی۔

بابر نے چیخ کر اپنے ایک جانباز کو آواز دی۔ وہ کمرے میں آیا تو زخمی جانباز کو اس کے سپرد کر کے ابتدائی طبی امداد کی ہدایت کی اور اٹھ کر تیزی سے زنان خانے کے دروازے سے گزرتا ہوا باہر نکلا۔ کھلے دالان کی دھیمی سی روشنی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ مستان خان وہاں نہیں تھا۔ احتیاط سے اس نے دالان پار کیا۔ زنان خانے میں داخل ہونے کا جو چوبی دروازہ تھا، اس کے پاس آ کے باہر جھانکا تو اسے ڈاکو مستان خان دکھائی دیا۔ وہ زنان خانے کے وسیع و عریض لان سے گزر کر برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ اس کا رخ رہائشی کمروں کی طرف تھا۔

بابر نے ایک لمحے کو سوچا اگلے لمحے اپنی کلاشنکوف سیدھی کر کے ٹریگر دبایا۔ تڑتڑاتڑ کئی گولیاں اس کی طرف لپکیں مگر اسے کوئی گولی نہ لگی۔ وہ اس وقت ایک موٹے ستون کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔ وہاں سے اس نے بھی ریوالور سے جوابی فائر کیا۔ گولی بابر کے قریب دیوار پر لگ گئی۔

بابر فائرنگ کر کے دروازے کی اوٹ میں چلا گیا تھا، وہاں سے جھانک کر دیکھا۔ مستان خان ستون کی اوٹ سے نکل کر دوڑتا ہوا کمروں کی جانب جا رہا تھا۔ بابر بھی اضطراری طور پر اس جانب دوڑ پڑا۔ برآمدے میں موجود بلب کی روشنی وسیع لان پر پڑ رہی تھی۔ وہ احتیاط سے قدم اٹھاتا برآمدے کی طرف جانے لگا۔

اسی وقت بابر کو اپنے پیچھے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا۔ وہ سردار حاکم تھا۔

قریب آ کر وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ ”ساری مصیبتوں

کے تم ذمّے دار ہو۔ وہ وحشی زنان خانے کی طرف گیا ہے۔ اگر میری بیوی یا بیٹی کے ساتھ کچھ بُرا ہوا تو تم سے حساب لوں گا۔"

"اسے وحشی کہتے ہو۔ اس کو اپنی بیوی اور بیٹی کے لیے خطرناک سمجھتے ہو۔ پھر بھی اپنی معصوم بیٹی کو اس درندے کے حوالے کررہے تھے۔" بابر نے زہر خند لہجے میں کہا۔

"اس بات کا تمہیں کیسے پتا چلا ہے؟ لگتا ہے شاہدہ اور اس کی امی پس پردہ تمہارا ساتھ دے رہی تھیں۔" وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔

"مجھے بہت سی باتوں کا علم ہے سردار چچا!" اس نے دوڑتے ہوئے کہا۔ "مگر اِس وقت اُس کُتّے مستان خان کے بارے میں سوچو۔ وہ بچّی اور شاہدہ کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔"

"تم پیچھے ہٹو۔ تمہیں دیکھ کر وہ غصے سے کوئی غلط حرکت کرسکتا ہے۔ میں آگے جا کر اس سے بات کرتا ہوں۔" سردار حاکم نے کہا۔

بابر کو اس کی بات معقول لگی۔ وہ رک گیا۔ سردار حاکم اسی طرح دوڑنے کے انداز میں چلتا ہوا برآمدے میں پہنچا، وہاں سے دائیں طرف جانے والا تھا۔ ٹھٹک کر رک گیا۔ سامنے سے مستان خان اس کی بیگم کو ریوالور کی زد پر لیے چلا آرہا تھا۔ بیگم حاکم شدید خوف زدہ لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ فق تھا۔ بابر نے بھی یہ منظر بڑی تشویش سے دیکھا۔

سردار حاکم چلّا کر بولا۔ "مستان خان! یہ کیا حرکت ہے؟ میری بیگم کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کررہے ہو؟"

اس نے دہاڑ کر کہا۔ "تمہاری بیوی اسی قابل ہے سردار حاکم! زنان خانے کی طرف سے وہ کمینہ بابر اس کے کُتّے اندر آئے تھے۔ تم ذرا اپنی بیگم سے پوچھ لو۔ انہیں اندر آنے کی اجازت کیوں دی تھی؟"

"دیکھو مستان خان! یہ باتیں بعد میں بیٹھ کر کریں گے۔ میری بیگم اگر قصوروار ثابت ہوئی تو میں اپنے طریقے سے اسے سزا دوں گا۔ ابھی تم اسے چھوڑ دو۔ یہ تماشا مت کرو۔"

"یہ تماشا نہیں سردار صاحب! یہاں سے بہ حفاظت نکلنے کی تدبیر ہے۔" مستان خان نے ڈپٹ کر کہا۔ "اپنے پیچھے موجود بابر سے کہہ دو۔ وہ میرے راستے میں نہ آئے۔ ورنہ میں پہلے تمہاری بیگم کو پھر جو بھی راستے میں آیا، اسے گولی ماردوں گا۔"

بابر نے وہیں سے بلند آواز میں کہا۔ "مستان خان! تم بُری طرح پھنس گئے ہو۔ باہر سے جو فائرنگ کی آوازیں آرہی ہیں۔ میرے جانبازوں نے سارے ڈاکوؤں کو گھیر لیا ہے۔ اس لیے بہتر ہے ریوالور پھینک دو۔ خود کو میرے حوالے کردو۔"

اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "ابے جاؤ کُتّے! تم مستان خان کی طاقت سے واقف نہیں ہو۔ کئی بار پولیس اور رینجرز کے گھیرے سے ہم نکل گئے ہیں۔ تم اور تمہارے جانباز کس کھیت کی مولی ہو؟ میں آخری دفعہ وارننگ دے رہا ہوں۔ میرا راستہ خالی کردو۔ مجھے چھت تک جانے کا موقع دو۔"

وہ بیگم حاکم کو دھکیلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ سردار حاکم تقریباً دس قدم دور بے بسی کی تصویر بنا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے برآمدے کی سیڑھیوں کے پاس بابر کھڑا تھا۔ اس کا دماغ بہت تیزی سے چل رہا تھا۔ ڈاکو مستان خان کو روکنے اور بچّی کو آزاد کرانے کی کوئی تدبیر سوچ رہا تھا۔ اس کے دو جانباز بھی بیٹھک سے نکل کر اِدھر آگئے تھے۔

حویلی کے بیرونی حصے سے فائرنگ کی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ان کی شدت میں کمی ہوئی تھی۔

یکایک بابر چونک اٹھا۔ خوف اور اندیشے کی ایک تیز لہر پورے جسم میں دوڑ گئی۔ اسے شاہدہ دکھائی دی تھی۔ وہ مستان خان کے پیچھے پیچھے بہت آہستگی سے قدم اٹھاتی آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چار پانچ فٹ کا ایک سریے کا ٹکڑا تھا۔ اس کا ارادہ بھانپ کر بابر کے دل سے دعا نکلی کہ مستان خان کو اس کی آمد کا پتا نہ چلے۔

اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کے لیے بابر نے چیخ کر کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں تمہیں چھت پر جانے کا راستہ دے دوں گا۔ بس تم بچّی کو چھوڑ دو۔ کچھ شرم کرو۔ اپنی ہونے والی ساس کے ساتھ ایسا سلوک کررہے ہو۔ کل کس منہ سے شادی کی بات کروگے؟"

"شادی تو میں ہر حال میں کروں گا حرام زادے! رضامندی سے نہیں تو اٹھا کر لے جاؤں گا۔ فی الحال مسئلہ میری سلامتی کا ہے۔ اس کے لیے میں ہر طریقہ اختیار کروں گا۔" اس نے غصے سے چلّا کر کہا۔

اسے معلوم نہیں تھا شامت اس کے پیچھے پیچھے آرہی تھی۔ شاہدہ اس کے قریب پہنچ گئی تھی۔ اس نے سریے کا ٹکڑا بڑے زور سے مستان خان کے سر پر دے مارا۔ اس کے منہ سے ایک کرب ناک چیخ نکلی۔ اس کے ساتھ ہی ایک

دھماکا بھی ہوا۔ پستول کی لبلبی پر اس کی انگلی دب گئی تھی۔ ٹھائیں سے گولی چلی۔ دوسرے لمحے ایک اور چیخ بھی بلند ہوئی۔ یہ سردار حاکم کی چیخ تھی۔

بابر ایک ثانیے کو گویا سکتے میں رہ گیا تھا۔ اگلے پل اس کے حواس بیدار ہوئے۔ وہ بہت تیزی سے دوڑتا ہوا گیا۔ پندرہ بیس فٹ کا فاصلہ تین چار سیکنڈوں میں طے کیا۔ اس کے راستے میں سردار حاکم گرا پڑا تھا۔ اس سے اہم ڈاکو مستان خان پر قابو پانا تھا۔ وہ بجلی کی سرعت سے مستان خان کے سر پر پہنچ گیا۔ شاہدہ نے اس کے سر پہ سریے کی ایسی زبردست ضرب لگائی تھی کہ برآمدے کے فرش پر چکرا کر گر پڑا تھا۔ بیٹھک میں بھی تھوڑی دیر پہلے بابر کے جانباز نے بندوق کے بٹ سے اس کا سر پھاڑ دیا تھا۔

اس دوران شاہدہ اور اس کی امی چیختی چلاتی سردار حاکم کی طرف دوڑتی ہوئی گئی تھیں۔ اس کے پاس بیٹھ کر زخموں کا معائنہ کر رہی تھیں۔ اسے آوازیں دے رہی تھیں۔

بابر نے قریب جاکے دیکھا۔ سردار حاکم کے کان کے نیچے گردن میں گولی کا گہرا زخم تھا۔ خون کا فوارا سا گردن سے پھوٹ رہا تھا۔

جب شاہدہ نے مستان خان پر سریے کا وار کیا تھا تب اس کے ہاتھ کو جھٹکا لگا تھا۔ بیگم حاکم کے سر سے ریوالور کی نال ہٹ گئی تھی۔ ساتھ ہی انگلی دب گئی تھی۔ سردار حاکم کی شامت آئی تھی کہ مستان خان سے چند قدم دور کھڑا تھا۔ جب گولی چلی تو اس کے راستے میں سردار حاکم آ گیا۔ گولی اس کے گلے میں لگ کر باہر... نکل گئی تھی۔

اس دوران بابر کے دو جوان بھی دوڑتے ہوئے آگئے تھے۔ انہوں نے مستان خان کے ہاتھ پاؤں اچھی طرح باندھ دیے تھے۔ سردار حاکم کی حالت بہت نازک تھی۔ اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ جسم کو جھٹکے لگ رہے تھے۔ شاہدہ اور اس کی امی بے تحاشا رو رہی تھیں۔ دوہائیاں دے رہی تھیں۔

اچانک سردار حاکم کھرکھراتی آواز میں کچھ بولا۔ بابر نے کان قریب کیا۔ وہ بڑی مشکل سے کہنے لگا۔ ”ب...... بابر! میرے خاندان کا خیال رکھنا۔ اپنے گھر والوں کو تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔ انہیں ڈاکو مستان خان سے بچاؤ۔“

شاہدہ کی امی روتے ہوئے بولی۔ ”آپ زیادہ باتیں نہ کریں۔ ہم آپ کو اسپتال لے جاتے ہیں۔“

وہ ہکلاتی آواز میں بولا۔ ”اب ایسا ممکن نہیں۔ مجھے اپنے کیے کی سزا مل گئی ہے۔ م م...... میں زندہ نہیں بچ سکتا۔ بابر بیٹا...... ! تمہارے خاندان کی تباہی میں میرا ہاتھ ہے۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ اس کا بدلہ م...... میرے خاندان سے مت لو۔“

اتنا کہہ کر اس کی آواز ایک دم بند ہو گئی۔ اس کے جسم نے زور زور سے جھٹکے کھائے۔ پھر وہ ساکت ہو گیا۔ شاہدہ اور اس کی امی کی فلک شگاف چیخیں برآمدے میں گونجنے لگیں۔ حویلی کے بیرونی حصے سے اب فائرنگ کی آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔

اسی وقت لان میں بہت سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ بابر اور اس کے جوان فوراً اپنی بندوقیں ان آنے والوں کی طرف سیدھی کر کے کھڑے ہو گئے۔ آنے والے دشمن نہیں تھے۔ بابر کے جانباز تھے۔ انہوں نے خوش خبری سنائی کہ دشمن پر غالب آگئے ہیں۔ ڈاکو مستان خان کے ساتھیوں نے اور سردار حاکم کے کارندوں نے ہتھیار ڈال رہے ہیں۔

بابر، مستان خان کے بے ہوش جسم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ اس وقت ایک حقیر کیڑے کی طرح یہاں پڑا ہوا ہے۔ اس کی بربریت اور اس کی دہشت مٹی میں مل گئی ہے۔ ایک بچہ بھی آسانی سے اسے مار سکتا ہے۔ یہ میرے خاندان کا قاتل بھی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں اسے مارنا بہادری نہیں۔ اسے قانون کے حوالے کرنا اصل انصاف ہے۔ اس طرح ہم یہاں ہونے والے سارے دنگا فساد اور کشت و خون کے قانونی اقدامات سے بچ سکتے ہیں۔“

اسی وقت حویلی کے باہر پولیس کے مخصوص سائرن بجنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی میگافون پر اعلان ہونے لگا۔ ”خبردار! پولیس کی بھاری نفری نے علاقے کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ ہتھیار پھینک کر خود کو قانون کے حوالے کر دو۔ ورنہ بہت برا نتیجہ نکلے گا۔“

بابر نے شاہدہ اور اس کی امی کو سہارا دیا۔ رو رو کر وہ دونوں ہلکان ہو گئی تھیں۔ وہ دونوں بابر کے گلے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ بابر بڑے خلوص سے بڑی محبت سے انہیں اپنے ساتھ چمٹا کے دلاسا دینے لگا۔

وہ اب اُن کا دشمن نہیں تھا۔ اُن کا سرپرست تھا۔ سردار حاکم کے قتل کے بعد اب قاتل رشتے بھی اپنے انجام کو پہنچ گئے تھے۔

❖❖❖